زاد المعاد

حصّہ اوّل

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ وشمائل، عادات وخصائل، اسوۂ وسنّت، معمولات جات اور اصولِ زندگی، مجاہدات وغزوات، معاملات اور طرزِ زندگی، خادموں سے برتاؤ، دشمنوں سے سلوک، گھر والوں سے معاشرت اور عظیم وجلیل فوائد فقہیہ پر مشتمل علّامہ ابنِ قیّم کی لاجواب اور معرکہ آرا کتاب، جسکی مثال نہ عربی زبان میں ہے نہ کسی اور زبان میں جس سے استفادہ کئے بغیر سیرۃ نبوی پر کوئی کتاب نہیں لکھی جاسکتی!

مُترجِم
سیّد رئیس احمد جعفری

مُصنّفہ
علّامہ حافظ ابنِ قیّم

نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ ــــــــ کراچی (پاکستان)
قیمت:- [illegible]

طبع اول: ____________ اگست ۱۹۶۲ء

مطبوعہ

انٹرنیشنل پریس کراچی

فہرست

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر

آفتاب رسالت

از۔ چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

علامہ ابن قیم کی زاد المعاد اہل علم، اہل دل اور اہل نظر اصحاب کے حلقوں میں ہمیشہ سے محبوب اور پسندیدہ رہی ہے، یہ کتاب درحقیقت اپنے فن اور موضوع کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور کمال یہ ہے کہ صرف ایک علامہ دھر کے غور و فکر کا نتیجہ۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سیرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس موضوع سے متعلقہ مباحث پر دنیا کی کسی زبان میں اس سے زیادہ ہمہ پہلو کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

یہ اردو زبان کی بدقسمتی تھی کہ ایسی نادر اور جامع الفوائد کتاب سے اس کا دامن خالی تھا یہ کتاب اب پہلی مرتبہ پوری شان دلاویزی کے ساتھ اردو زبان میں منتقل ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے۔ مجھ نامۂ سیاہ کو اپنے عزم و ہمت پر حیرت بھی ہے اور فخر بھی کہ ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود ہر طرح کے وسائل سے محرومی کے باوجود، ذاتی الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود اتنی طویل ضخیم اور مفصل کتاب کی طبع و اشاعت کا سروسامان میں نے بہم پہنچا لیا۔ یہ صرف خدا کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندے کو جس طرح نوازے۔

میں بازار ادب میں ایک عرصہ سے موجود ہوں، میں نے کیا چھاپا؟ ناول اور افسانے بھی، ادب اور لٹریچر بھی تاریخ اور داستان بھی، تحقیق اور تنقید بھی، سوانح اور سفرنامے بھی۔ لیکن اپنے مطبوعات میں اس کتاب سے یہ امید رکھتا ہوں کہ یہ میرے لئے زاد المعاد، یعنی توشۂ آخرت ثابت ہوگی۔

اس کتاب کی طبع و اشاعت میں کئی مرحلوں سے مجھے گزرنا پڑا سب سے بڑا مسئلہ مترجم

کا انتخاب تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد میری نظر انتخاب مولانا سید رئیس احمد جعفری پر جاکر رک گئی۔ اور مجھے مسرت ہے کہ انہوں نے میری استدعا قبول فرمالی ان کے قلم سے کئی کتابوں کے ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں۔ سیرا امام احمد بن حنبل، آثار امام شافعی، آثار امام محمد و امام ابویوسف سیرت امام ابن تیمیہ، سیرت امام ابو حنیفہ اور تاریخ خوارج وغیرہ۔

جعفری صاحب کے ترجمہ کا اپنا ایک خاص انداز ہے اور یہ انداز ملک کے ایک بڑے طبقہ کے دلوں کو بھا گیا ہے، ان کی عبارت رواں، سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے وہ علمی مباحث کو آسان اور عام فہم اور دل نشین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ چونکہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فاضل علامہ سید سلیمان ندوی، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ اعظمی، شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا محمد شبلی صاحب فقیہہ کے شاگرد رشید ہیں وسعت مطالعہ کا جوہر انہوں نے خود پیدا کیا ہے اور وسعت نظر کا اساتذہ کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے اور ان دونوں چیزوں نے ان کے اندر تحقیق کا ملکہ پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ دینی اسلامی اور علمی مباحث سے متعلق کتابوں کے تراجم میں حسب ضرورت جہاں وہ حواشی لکھتے ہیں وہ اختصار کے باوجود ایک مستقل حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں حسب ضرورت انہوں نے حواشی لکھے ہیں۔ لیکن نہایت مناسب مواقع پر، اور نہایت موزوں انداز میں۔

مجھے امید ہے میرا پیش کیا ہوا یہ توشۂ آخرت آپ قبول کریں گے۔

نقد و نظر

یہ زادالمعاد کا پہلا حصہ ہے،!

یہ کتاب اپنی معنویت، افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے واقعی زادالمعاد یعنی توشۂ آخرت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، ہر مسلمان کے لئے اسوۂ حسنہ ہے، دلیل منزل ہے شمع راہ ہے۔ یہی ایک راستہ ایسا ہے جس پر چل کر انسان ہدایت وسعادت فلاح ونجاح اور کامرانی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے اس کے علاوہ جتنے راستہ ہیں وہ گمراہی کے ہیں وہ جنت کی طرف نہیں جاتے جہنم کی طرف اپنے رہرو کو لے جاتے ہیں، اقبال نے سچ ہی تو کہا ہے۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسلام کی تعلیمات صاف اور سادہ ہیں نہ ان میں کسی طرح کی پیچیدگی ہے نہ اغلاق ہر شخص سمجھ سکتا ہے، ہر شخص برت سکتا ہے ہر شخص ان پر عامل ہو سکتا ہے۔

اور اسلام کی ان تعلیمات وہدایات کا مکمل نمونہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ لہٰذا جب تک آپ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے نہ ہو اس وقت تک نہ ہم اسلام کو سمجھ سکتے ہیں نہ صحیح طور پر اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

اور اس اسوۂ حسنہ کے ہم اس وقت تک رمز شناس نہیں ہو سکتے جب تک آپ کی سیرت طیبہ کے تمام پہلو ہمارے سامنے نہ ہوں اور آپ کی سیرت طیبہ کے تمام پہلو اگر نظر آ سکتے ہیں تو احادیث میں حدیث ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ جو آپ کے قول و فعل دونوں پر حاوی ہے۔

منافقوں اور کج دماغوں کی ایک جماعت ہمیشہ سے اس کام میں مصروف رہی ہے کہ احادیث کی اہمیت کم کی جائے، انہیں کذب و دروغ کا پشتارہ ثابت کیا جائے، ان کی دینی اہمیت عظمت کا انکار کیا جائے، انہیں قانون کا ماخذ مانا جائے۔ ان تمام کنج کاویوں کا مقصد یہ ہے کہ سیرت رسولؐ صحیح آب و رنگ کے ساتھ سامنے نہ آسکے، اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد منزل بہت آسان ہو جاتی ہے۔ جب احادیث کی حیثیت مجروح ہو گئی اور آپ کی شخصیت کا اصل معیار نظر سے اوجھل ہو گیا تو پھر من مانی کرنے اور کرتے میں کوئی رکاوٹ نہیں باقی رہ جاتی جس طرح چاہیئے قرآن کی تفسیر کیجئے۔ جس طرح جی چاہے آپؐ کے اقوال و افعال کو دین کا ماخذ ماننے سے انکار کرنے کے بعد احکام اسلامی اور تعلیمات اسلامی کو اپنے ذہن و فکر کے سانچے میں ڈھال لیجئے یہی کیفیت دیکھ کر تو اکبر نے کہا تھا۔

حکومت کی تم خیر یارو مناؤ
گلے میں جو اتریں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر
اناالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

انکار حدیث کے بعد قرآن کی تشریح و تعبیر میں پوری آزادی حاصل ہو جاتی ہے نہ ایراد کا ڈر نہ اعتراض کا اندیشہ شاید یہی فکر و نظر کا بحران تھا جسے دیکھ کر اقبال کہہ اٹھا تھا۔

احکام ترے حق ہیں ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

اور واقعی منکرین حدیث نے نت نئی تاویلیں کر کے قرآن کو معاذاللہ پاژند ہی بنا دیا ہے۔

ان حالات میں ضرورت تھی کہ اردو خواں ناظرین کے سامنے ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس کی بنیاد و اساس حدیث پر ہو اور جو رسول اللہ کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کے بیان پر مشتمل ہو تاکہ اس فتنہ کا قلع قمع ہو سکے جو انکار حدیث کی صورت میں پاکستان کے اندر روز بروز جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر علامہ ابن قیم کی زاد المعاد (توشۂ آخرت) سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں پوری صحت استناد کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کا تفصیلی، تحقیقی اور وقت نظر کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے یگانہ اور منفرد ہے۔ اس موضوع پر اس سے اچھی اور اچھوتی کتاب کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتی یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے یہ کتاب مجامع علمی اور حلقہ علما میں دائر و سائر چلی آ رہی ہے۔

اس کتاب کے چار حصے ہیں، ان چاروں کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ ہر حصہ کے ساتھ اس کے مندرجات اور خصوصیات پر بھی بہ طور مقدمہ ایک سرسری نظر ڈال لی ہے۔

اس پہلے حصہ میں جو مواد مؤلف علام نے پیش کیا ہے وہ زیادہ تر عبادات سے متعلق ہے اور اس سلسلہ میں جو بحثیں کی ہیں، جو علمی نکتے پیدا کئے ہیں جس انداز سے اختلافی مسائل اور مباحث پر نقد و تبصرہ کیا ہے، جس طرح اسناد اور رواۃ پر جرح و تعدیل کی ہے۔ اور پھر پورے طور پر صورت مسئلہ کو منقح کرنے کے بعد جس طرح اصل مسئلہ کا لب لباب پیش کیا ہے وہ کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا تھا جو ایک طرف تفسیر کا عالم یگانہ ہو۔ دوسری طرف حدیث نبوی پر اس کی دسیع اور گہری نظر ہو تیسری طرف فن اسمار الرجال اور جرح و تعدیل کا رمز شناس ہو اور ساتھ ہی ساتھ بہترین متکلم بھی ہو علوم متعلقہ میں مہارت ہو، جملہ علوم اسلامیہ اس کی نظر میں ہوں، صرف و نحو کی باریکیاں بھی اس کی گرفت سے باہر نہ ہوں اور بلاشبہ یہ کام ایسے ہی شخص - ابن قیمؒ - نے کیا ہے۔

اس سے پہلے حصہ میں بعض ان آیات کی نہایت دل کش جامع و مانع اور ماقل و دل تفسیر ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تعلق رکھتی ہیں۔

پھر مکہ مکرمہ کے فضائل بتائے ہیں اور اس کے خواص کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لیلۃ القدر اور شب معراج کے اسرار بھی بتائے ہیں حج اکبر کا ذکر بھی ہے۔ بعثت رسل کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے بعد آپؐ کا نسب تاریخی اور تنقیدی تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے ضمناً یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے، نہ کہ حضرت اسحاق پھر اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ آپؐ کی تربیت کس طرح ہوئی ۔؟ والدین کے انتقال کا بھی ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے جو آیت آپ پر نازل ہوئی اسے پیش کیا ہے اور اس سلسلہ بعض اہم نکتے بیان کئے ہیں۔

اسمار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شرح معانی ابن قیمؒ نے کی ہے وہ صرف انہی کا حصہ ہے یہ فصل اپنی ندرت، اہمیت اور انداز بیان کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

دونوں ہجرتوں کا بیان بھی ہے نیز آپ کی اولاد، اعمام، عمات اور ازواج کے احوال پر بھی تحقیقی نظر ڈالی ہے۔
آپ کے خدام اور کتاب (کاتب) کا تذکرہ بھی ضروری بسط و تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

آپ کے مکاتیب، فرامین اور قاصدوں کا ذکر بھی ہے جن لوگوں کو آپ نے خدمت اذان سونپی اور جنھیں امارت کے منصب پر فائز کیا ان کا ذکر جمیل بھی کتاب میں ضروری تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔
آپ کے سلاح جنگ اور اثاثہ پر بھی نام بہ نام روشنی ڈالی ہے۔ آپ کے ملبوسات سواریوں اور جو کپڑے زیب تن فرماتے تھے ان کی نوعیت پر بحث کی ہے یہ بتایا ہے کہ آپ کے آداب طعام کیا تھے؟ آپ نے کتنے نکاح کئے؟ اہل خانہ کے ساتھ آپ کا سلوک اور برتاؤ کیا تھا؟ آپ کس طرح سوتے تھے؟ کیونکر جاگتے تھے؟ آپ کے آداب رکوب کیا تھے؟ خرید و فروخت کا اصول اور طریقہ کیا تھا؟
روزمرہ کی زندگی کا منہاج اور اسلوب کیا تھا؟ آپ چلتے کس طرح تھے؟ بیٹھتے کس طرح تھے؟ ٹیک کس طرح لگاتے تھے۔ قضائے حاجت کے لئے کس طرح جاتے تھے؟ آپ بات کس طرح کرتے تھے؟ سکوت کا رنگ کیا تھا؟ آپ ہنستے کس طرح تھے اور گریہ کے وقت آپ کا کیا حال ہوتا تھا؟ آپ خطبہ دینے کا انداز کیا تھا؟

یہ ساری باتیں اس پہلے حصہ میں کہیں اجمال کے ساتھ کہیں تفصیل کے ساتھ لیکن پوری شان تحقیق کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے بعد عبادات کا بیان شروع ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی چیزوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً آپ کے وضو کرنے کا طریقہ کیا تھا؟ وضو کے وقت آپ کیا پڑھتے تھے مسح۔ تیمم۔ انداز صلاۃ۔ نیت نماز۔ کی تفصیل بھی موجود ہے زیادہ تر آپ کن سورتوں کی اور کن موقعوں پر تلاوت کرتے تھے؟ اور اس کا رمز کیا تھا۔؟ یہ تفصیل بھی اس حصہ میں آپ کو ملے گی۔
نسک و عبادت سے متعلق ضروری فقہی مسائل بھی پوری مجتہدانہ شان کے ساتھ موجود ہیں۔

خصائص یوم جمعہ، تلاوت قرآن کے آداب، سفر کی صورت میں رخصت اور سہولت نماز عیدین نماز کسوف۔ نماز خوف۔ جمع بین الصلاتین۔ جنائز اور متعلقہ مباحث و مسائل نیز رفع یدین۔ سجدۂ سہو سجدہ شکر۔ قنوت نوازل۔ زیارت قبور۔ تعمیر قبور۔ قبور انبیاء۔ نماز خوف زکواۃ صدقہ۔ فطرہ۔ روزہ۔ فوائد صوم، صوم تطوع وغیرہ مسائل بھی ملتے ہیں۔

یوم عاشورا کے روزے پر جو بحث کی ہے وہ قابل دید ہے حج اور عمرہ کے سلسلہ میں نفیس مباحث موجود ہیں۔ خاص طور پر قرآن یا تمتع کے ذیل میں جو بحث کی ہے وہ بہت ہی معرکہ آرا ہے۔

غرض اس کے پہلے حصہ میں اتنا مواد موجود ہے کہ اگر ابن قیم نے صرف یہی پہلا حصہ لکھا ہوتا تو شمع نبوت کے پروانوں کے لئے وہ کفالت کرتا تھا۔! یہ حصہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے جو ہر اعتبار سے مکمل اور جامع و مانع!

رئیس احمد جعفری (ندوی)
۸۹۔ ٹیگور پارک لاہور

علامہ ابن قیم

اس کتاب کے مؤلف کی حیات گرامی کے چند پہلو

منقول من کتاب جلاء العینین للسید نعمان الالوسی البغدادی

علامہ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن بکر بن ایوب سعد زرعی، دمشقی، یگانہ روزگار فقیہہ اور مسلک حنبلیؒ پر عامل تھے۔ بلند پایہ مفسر قرآن تھے، علم نحو کے امام اور فن کلام کے استاد تھے اپنے وقت کے بہت بڑے متکلم تھے یہ ابن قیم جوزیہ کے نام سے مشہور ہیں۔

"الشذرات" میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"علامہ ابن قیم کو اگر مجتہد کہا جائے تو درست ہوگا۔ بلکہ مجتہد مطلق تھے"۔

ابن رجب کہتے ہیں۔

ہمارے شیخ (ابن قیم) ۱۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد شیخ تقی الدین ابن تیمیہؒ کے دامن علم سے وابستہ ہوگئے اور ان سے تحصیل علم کرنے لگے جملہ علوم دینیہ و اسلامیہ انہی سے حاصل کئے فن تفسیر میں اپنا جواب آپ تھے، اصول دین کے رمز آشنا تھے حدیث اور فقہ و معانی حدیث پر نہایت گہری نظر رکھتے تھے دقائق استنباط میں یکتا تھے فن فقہ اور اصول عربیہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ تصوّف کے بھی لذت آشنا تھے اپنے بعض عقائد کی پاداش میں سجن و زنداں کے آلام بھی برداشت کئے، یہ (کعبہ کے سوا) قبر رسولؐ کی زیارت کے لئے بھی سفر کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ صدرجہ عبادت گزار تھے تہجد پابندی سے پڑھتے تھے۔ نماز اتنے استغراق وانہماک سے پڑھتے تھے کہ کھو جاتے میری سے نظر سے کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جو ان کی طرح عبادت گزار ہو۔ قرآن حدیث اور حقائق ایمان کا علم تو گویا ان ہی کے لئے تھا۔ وہ معصوم نہ تھے لیکن ان جیسی ہستی کوئی اور میری نظر سے نہیں

گزری کئی مرتبہ امتحان وایذا کے سخت ترین مرحلوں سے گزرے مگر پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔ آخری مرتبہ اپنے شیخ، شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ کے ساتھ قلعہ میں قید کئے گئے لیکن ان سے الگ رکھے گئے۔ رہائی شیخ (ابن تیمیہ) کی وفات کے بعد ہوئی۔

قید و بند کا یہ وقت ابن قیم نے قرآن کی تلاوت اور اس پر تفکر و تدبر میں بسر کیا سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے خیر کثیر کے دروازے کھودیے۔ ان کے تصانیف علوم و معارف کا گنجینہ ہیں۔

کئی مرتبہ حج کیا، مکہ میں مقیم بھی رہے اہل مکہ ان کی کثرت طواف و عبادت پر سخت حیرت کرتے تھے ایک خلق کثیر نے ان سے علم اور انتفاع حاصل کیا۔ ان کے شیخ کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی۔

قاضی برہان الدین زرعی فرماتے ہیں۔

اس آسمان کے نیچے کوئی بھی ان سے زیادہ وسیع العلم نہ تھا۔

ان کی تصانیف میں تہذیب سنن ابی داوٗد وایضاح مشکلات اور سفر ہجرتین۔ اور مراحل السائرین اور الکلم الطیب اور زاد المسافرین اور زادالمعاد (چار جلد) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ بڑی بلند پایہ کتاب ہے نیز ان کی کتابوں میں نقد المنقول اور کتاب اعلام الموقعین من رب العالمین (۳ جلد) کتاب بدائع الفوائد، الصواعق المرسلہ علی الجھمیہ والمعطلہ، حادی الارواح الی بلاد الافراح، نزہتہ المشتاقین، کتاب الداء والدواء کتاب مفتاح دارالسعادۃ بھی ہیں۔ یہ کتاب بہت ضخیم ہے، نیز کتاب الطرق الحکمیہ وکتاب عدۃ الصابرین وکتاب اغاثۃ اللہفان کتاب الروح، کتاب الصراط المستقیم اور الفتح القدسی اور التحفۃ المکیہ اور الفتاویٰ وغیرہ بھی ہیں۔

ابن قیم کی وفات ۱۳ر رجب ۷۵۱ھ میں ہوئی۔ باب صغیر کے مقبرے میں دفن کئے گئے، کئی جگہوں پر ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

موت سے پہلے خواب میں اپنے استاد تقی الدین کو دیکھا اور ان سے ان کے درجہ کا حال پوچھا۔ انہوں نے بعض اکابر سے بھی اسے بلند بتایا۔ پھر کہا تم بہت جلد ہم سے آملو گے۔

علامہ حافظ ابن قیمؒ

امام ابن تیمیہؒ کے تلمیذِ رشید کی داستانِ حیات

یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم امام ابن تیمیہؒ کے تمام شاگردوں کا ذکر کریں، لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم امام ابن قیمؒ کو نظر انداز کر دیں، کیونکہ امام صاحب کے بعد وہی ان کے جانشین اور ترکۂ علم کے وارث ہوئے، تحریر و تالیف کے لحاظ سے بھی اور مجادلہ و مناظرہ کے اعتبار سے بھی وہ ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۵۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ اپنے استاذ ابن تیمیہؒ سے عمر میں تیس ۳۰ سال چھوٹے تھے۔ ابن تیمیہؒ ان کے لیے بہ منزلۂ والدِ مشفق کے تھے۔ اپنے استاذ ابن تیمیہؒ کی طرح ابن قیمؒ بھی ایسے گھر میں پیدا ہوئے جو علم و فضل کا مرکز تھا۔ ان کے والد المدرسۃ الجوزیہ کے قیم (مدیر و مہتمم) تھے، اسی مناسبت سے ان کا نام ابن قیم الجوزیہ پڑ گیا جو بعد میں صرف ابن قیم رہ گیا۔ اپنے استاذ کی طرح ان کی نشو و نما بھی حنبلی ماحول میں ہوئی۔

ابن قیمؒ صحیح معنی میں علم ابن تیمیہؒ کے حامل تھے، اپنے استاذ کے علم کو بڑھانے، پھیلانے اور اس کی توسیع و اشاعت میں انہوں نے غیر معمولی حصہ لیا۔ اسی کی طرف انہوں نے دعوت دی اسی کی جانب سے دفاع کیا اور اسی کی تائید کے لیے تحقیق و تنقیح کی پوری کوشش کی۔ جس چیز کی نشر و دعوت پر انہوں نے بہت زیادہ توجہ کی وہ فقہ ابن تیمیہؒ تھی۔ مسئلہ طلاق پر انہوں نے ابن تیمیہؒ کے افکار و آراء کی خوب خوب پشت پناہی کی ہے اور ان کے فتاویٰ اور اصول بڑی عرق ریزی سے جمع کیے ہیں۔ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں "اعلام الموقعین" اور "زاد المعاد" وغیرہ میں فقہ ابن تیمیہؒ کا ترکۂ زرخیز کثرت کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ لیکن استاذ سے اس شیفتگی اور عقیدت کے باوجود حریتِ فکر و رائے سے بھی بہرہ ور ہیں۔ انہیں متعدد علوم میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ان کے

دوست اور رفیق درس حافظ ابن کثیر (صاحب البدایہ والنہایہ) اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں:۔

"ابن قیم نے حدیث کی سماعت کی اور زندگی کا بڑا حصہ علمی مشغلہ میں بسر کیا۔ انہیں متعدد علوم میں کمال حاصل تھا۔ خاص طور پر علم تفسیر اور حدیث وغیرہ میں غیر معمولی دستگاہ کے حامل تھے"۔

ابن تیمیہ کے حلقۂ درس میں

۷۱۲ھ میں امام ابن تیمیہ مصر سے واپس آئے تو ابن قیم ان کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔ اس سے پہلے تک ان میں پختگی نہیں آئی تھی۔ لیکن اب انہوں نے امام صاحب کا دامن پکڑا، ان سے فقہ حاصل کی، ان کا منہاج اختیار کیا اور انہی کے ہو رہے، ابن کثیر کہتے ہیں:۔

"۷۱۲ھ میں جب شیخ تقی الدین مصر سے واپس آئے تو ابن قیم ان سے وابستہ ہو گئے اور ان کی وفات تک انہی کے دامن سے وابستہ رہے، علمی ذوق اور شغل تو پہلے سے رکھتے تھے۔ اب امام ابن تیمیہؒ سے علم بے نہایت حاصل کر لیا۔ دن رات طلب علم کی دھن تھی لہٰذا متعدد علوم و فنون میں یگانہ روزگار بن گئے۔ ساتھ ہی کثرت عبادت اور ابتہال کی صفت سے بھی متصف تھے"۔

خصائص گوناگوں

ابن قیم گوناگوں خصائص کے حامل تھے، نرم مزاج، قوی الخلق، اپنے استاذ سے انہوں نے علم، اخلاص اور ایمان کی دولت حاصل کی لیکن مزاج کی تیزی نہیں۔ ابن کثیر اپنے اس رفیق درس اور دوست کے بارے میں کہتے ہیں۔

"ابن قیم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ محبت سب سے، حسد کسی سے بھی نہیں، نہ کسی کے درپے آزار ہوئے، نہ کسی کی عیب چینی کی، نہ کسی پر رشک۔ میں اکثر ان کے ساتھ رہا ہوں، وہ مجھ سے بہت محبت کا برتاؤ کرتے تھے، مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے زمانہ میں کوئی شخص ان سے زیادہ عبادت گزار رہا ہو، ان کی نماز بڑی طویل ہوتی تھی، رکوع اور سجود بھی خاصے لمبے ہوتے تھے، بہت سے دوست اور ساتھی اس پر کبھی کبھی انہیں ملامت بھی کرتے تھے لیکن انہوں نے کوئی جواب دیا نہ اس معمول کو ترک کیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ"۔

تصوف سے مناسبت

ابن قیمؒ کو تصوف میں بھی بڑا درک تھا، چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے ایک یگانہ اور نادر روزگار کتاب لکھی ہے، جس کا نام مدارج السالکین

الیٰ منازل ایاک نعبد وایاک نستعین ہے۔ اس کتاب میں علم حقیقت اور علم شریعت کے اسرار و حکم بیان کیے ہیں، یہ ایسی کتاب ہے، جس میں فکر حکیم، خلق قویم اور تدین و مسلک سلف کا صحیح فلسفہ سب کچھ موجود ہے۔

ابن قیم نے بہت بڑا علمی ذخیرہ چھوڑا ہے، جو ایک طرف تو استاذ (ابن تیمیہؒ) کے علم کا خلاصہ ہے، دوسری طرف استاذ کی تحقیقات کے نتائج و ثمرات، اور تنویعات و توجیہات ہیں۔ ابن قیم نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

اعلام الموقعین، الوابل الصیب فی الکلم الطیب، مدارج السالکین، زاد المعاد، اغاثۃ اللھفان، حادی الارواح، بدائع الفوائد، مفتاح دار السعادۃ، الطرق الحکمیہ، عدۃ الصابرین، الداء والدواء، (الجواب) الکافی، اجتماع الجیوش الاسلامیہ، الصراط المستقیم، الفتح القدسی، التحفۃ المکیہ، زاد المسافرین۔

سلف کا نور اور سابقین کی حکمت

حافظ ابن قیمؒ کی تحریریں، اپنے شیخ ابن تیمیہؒ کی اکثر تصانیف کی طرح جدلی طرز کی نہیں تھیں۔ بلکہ ان میں نرم خوئی اور سکون خاطر کی جھلک موجود ہے۔ اگرچہ فکر کی گہرائی، استدلال کی قوت اور جوش بیان پورے طور پر نمایاں ہے، نیز ابن قیم کی تصانیف، حسن ترتیب، خوبی تبویب، نظم افکار اور روانی عبارت کی آئینہ دار ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ دل جمعی کے عالم میں لکھا، اس امر کی واضح تر مثال ہیں ان کی تین کتابوں کو پیش کیا جا سکتا ہے، یعنی مدارج السالکین، عدۃ الصابرین اور مفتاح دار السعادۃ ان کتابوں میں فلسفہ کی گہرائی بھی ہے اور جمال فنی بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ابن قیم کی تصانیف میں سلف کا نور اور سابقین کی حکمت موجود ہے۔ صحابہ و تابعین کے اقوال سے استشہاد وہ بھی بہت زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن اپنے استاذ سے کم۔ اگرچہ یہ سارا فیض استاذ ہی کے چشمہ صافی کا ہے۔

زاد المعاد کا اسلوب و انداز

امام ابنِ قیمؒ کے طرزِ نگارش پر ایک نظر

زاد المعاد ایک طویل و ضخیم کتاب ہے اسے اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ گرامی، آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور اعمال شب و روز کی انسایکلوپیڈیا قرار دیا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ سرورِ کائنات کی رفتار و گفتار، سیرت و صورت، خصائل و شمائل، عادات و اخلاق، اوصاف اور صفات سے متعلق کوئی جزئی سے جزئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ضبطِ تحریر میں نہ آگئی ہو، اس پر نقد و جرح نہ کی گئی ہو، اسے جانچا اور پرکھا نہ گیا ہو، اس کے رواۃ و اسناد پر تحقیقی نظر نہ ڈالی گئی ہو، اس کے مفہوم و معنی پر سیر حاصل بحث نہ کی گئی ہو۔

ظاہر ہے جو کتاب اس اہتمام سے لکھی جائے گی وہ مختصر نہیں ہو سکتی، اسے طویل اور ضخیم ہونا ہی چاہیے۔ اور اتنی طویل و ضخیم کتاب میں سہو فکر و نظر بھی بالکل طبعی اور قدرتی ہے لیکن من حیث المجموع یہ کتاب یکتا اور بے ہمتا ہے۔ اس پایہ کی کتاب عربی زبان میں نہ اس سے پہلے لکھی گئی، نہ بعد میں۔ اور شاید آئندہ بھی نہیں لکھی جا سکے گی۔

علامہ ابن قیم نے یہ کتاب درحقیقت ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو سیرت رسالت آبؐ کا تحقیقی اور تاریخی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں قرآن کی تفسیر بھی ہے اور حدیث کی تشریح بھی۔ راویانِ حدیث پر جرح بھی ہے اور فقہ کے مسائل بھی۔ غزواتِ نبویؐ کی تاریخ بھی ہے اور مکی و مدنی زندگی کی مستند تفصیل بھی۔ ضمناً اور بھی بہت سے متعلق اور غیر متعلق مباحث آگئے ہیں۔

علامہ ابنِ قیم، امام ابنِ تیمیہؒ کے شاگردِ رشید ہیں۔ انہیں اپنے استاذ پر فخر ہے، ناز ہے۔ وہ استاذ کی ہر بات کی تائید کرتے ہیں، بعض مختلف فیہ مسائل کا تذکرہ کرنے کے بعد کہیں کہیں

ایسا بھی کیا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کا قول یا مسلک بیان کر دیا ہے اور اسے حرفِ آخر اور قولِ فیصل قرار دے کر گفتگو ختم کر دی ہے۔ استاذ کی ذات گرامی سے سعادت مند شاگرد کا یہ والہانہ ربط و تعلق بڑی دلچسپ اور سبق آموز چیز ہے۔ لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ بات ذرا کھٹکتی بھی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کا مسلک، متعدد مسائل میں جمہور علماء و ائمہ اسلام سے مختلف ہے، ایسے مواقع پر ابن قیمؒ نے استاذ کا ساتھ دیا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اگر وہ اپنے اور اپنے استاذ کے تطابق فکر کے اسباب و محرکات اور بواعث و علل کو بھی ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتے تو صورتِ مسئلہ اور زیادہ واضح اور منقح ہو جاتی۔

علامہ ابن قیمؒ کا طرزِ تحریر اور اسلوب نگارش، سادہ، عام فہم اور دلکش ہے، لیکن جہاں کہیں صرفی اور نحوی بحثیں کرتے ہیں، یا معانی و بیان کے دقیق مسائل بیان کرتے ہیں، یا فلسفہ و منطق کی موشگافیوں میں مصروف نظر آتے ہیں وہاں انداز بیان زیادہ دقیق اور بلیغ ہو گیا ہے جس کا ایک عام آدمی کے لیے ــــ سمجھنا آسان نہیں ہے، لیکن ایسے مواقع زیادہ نہیں ہیں یا اگر ہیں تو زیادہ طویل نہیں ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں علامہ ابن قیمؒ کی شخصیت مجمع البحرین ہے۔ وہ علوم عقلی و نقلی میں یکساں کمال رکھتے ہیں اور اپنے مدعا کو بغیر کسی جھجک کے پورے زور شور کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور کوئی شبہ نہیں ان کے دلائل میں زور بھی ہے، وزن بھی اور قوت بھی۔ لیکن اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والوں کے لیے وہ سخت اور درشت الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں، گو یہ چیز اس زمانہ میں، جو ابن قیمؒ کا عہد تھا عام تھی۔ اور بحث و مناظرہ میں متحارب فریقین ایک دوسرے کے فکر و نظر کے ساتھ مصالحت برتنے کے قائل نہ تھے۔ اس لیے یہ چیز حیرت انگیز تو نہیں لیکن ابن قیمؒ کی علمی تحقیق اور دینی عظمت کی سطح سے مسطح نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کی طرح علامہ ابن قیمؒ کا اصول، مسلک، عقیدہ اور ایمان بھی وہی تھا جس کی ترجمانی اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے۔

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نه رسیدی تمام بولهبی است

وہ کٹر حامی سنت ہیں، بدعت کے سخت مخالف، جو چیز سنت رسولؐ کے مطابق نظر آتی ہے اسے دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں جو چیز سنت رسولؐ کے خلاف نظر آتی ہے اسے بیخ و بن

سے اکھاڑ ڈالنے میں اپنا سارا زور اور پوری قوت و توانائی صرف کر دیتے ہیں اور اس سلسلہ نہ کسی کے ساتھ رعایت کرتے ہیں، نہ مصالحت، نہ رواداری ۔چنانچہ دوسرے ائمۂ فقہ جو ان کے مسلک سے اتفاق نہیں رکھتے جب ان کا مسلک زیر بحث آتا ہے تو علامہ ابن قیم ان کے خلاف بے دھڑک وہ تمام باتیں کہہ دیتے ہیں جو ان کی نوکِ قلم پر آجاتی ہیں ۔

ایک چیز جو خاص طور پر اس کتاب کے مطالعہ سے نظر کے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ علامہ ابن قیم کا دل حبِ رسولؐ کے نشہ سے سرشار تھا، لیکن ان کا حبِ رسولؐ حدود سے تجاوز نہیں کرتا تھا، وہ کسی صورت اور کسی حیثیت میں بھی حب رسولؐ کو جذبۂ توحید سے متصادم نہیں ہونے دیتے ۔ان کی توحید اتنی سخت، بے لچک اور غیر مفاہمت پسند ہے کہ مخالفوں نے اس چیز کی آڑ لے کر انہیں اور ان کے استاذ والا شان امام ابن تیمیہؒ کو ہدف مطاعن اور ہدفِ ستم بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، انہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دی گئیں، ان پر ناواجب اور ناروا پابندیاں عائد کی گئیں، انہیں نظر بند کیا گیا، جلا وطنی کے مصائب برداشت کرنے پڑے، سجن و زنداں کی عقوبتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کے عزم واستقامت میں فرق نہیں آیا اس لیے نہیں آیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے اور کر رہے تھے ۔ وہ ان کے اعتقاد جازم کا نتیجہ تھا اور عقیدہ کی ٹکر کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں سہہ سکتی ۔

اگر امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم مفاہمت پسند ہوتے ،اصولی اور بنیادی معاملات میں مداہنت کی کارفرمائی گوارا کر سکتے ،عقیدے کو مصالح اور حالات پر قربان کر سکتے تو یقیناً انہیں دنیا میں اس سے کہیں زیادہ وقار، دبدبہ اور شکوہ وجلال حاصل ہوتا جو ان کے معاصرین کرام کو حاصل تھا، لیکن انہوں نے یہ راہ نہیں اختیار کی وہ راستہ اختیار کیا جو روح فرسا اذیتوں، آزمائشوں اور تکلیفوں کا راستہ تھا۔ اس راستے پر چلنے سے جان، جان آفریں کو سونپ دی مگر اس سے روگرداں ہونا گوارا نہ کیا ۔

کوئی شبہ نہیں بعض اجل علماء امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کی انتہا پسندی کے شاکی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس انتہا پسندی کے باعث ان کی زبان اور قلم سے ایسی باتیں نکل گئیں جنہیں زیادہ سے زیادہ فراخیٔ حوصلہ کے باوجود سہو نگر ونظر قرار دیئے بغیر چارہ نہیں اور کوئی شبہ نہیں اس قول میں وزن بھی ہے ۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں صداقت بھی ہے ۔لیکن بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور میرا خیال ہے ان کا بدترین مخالف بھی اس کے انکار کی جرأت نہیں

کرسکا کہ انہوں نے اپنے افکار وخیالات اور عقائد کی بنیاد جس چیز پر استوار کی تھی وہ تھا حبِ رسولؐ کا جذبہ، اگر یہ جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو وہ اتنی عظیم اور ناقابلِ فراموش قربانیاں نہیں دے سکتے تھے جو انہوں نے دیں۔

قرآن کی تفسیر میں یا حدیث کی شرح میں یا اجتہادی مسائل میں، رسولؐ کے سوا کسی کا قول بھی قولِ آخر نہیں ہو سکتا۔ اس پر بحث و گفتگو اور نقد و جرح کی پوری گنجائش ہے۔ چنانچہ ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور اس مکتبِ فکر کے دوسرے اکابر کے افکار و آراء، شرح و تفسیر اور مجتہدات کا جہاں تک تعلق ہے انہیں بھی بہرصورت اور بہر نوع حرفِ آخر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان میں بحث و گفتگو اور نقد و جرح کی گنجائش ہے اور ان حضرات کے زمانہ سے اب تک یہ سلسلہ جاری بھی ہے اور جب تک تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا جاری رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جہاں کہیں بھی یہ حضرات جمہور کی ڈگر سے ہٹے ہیں انہوں نے اپنے ساتھ نا انصافی کی ہے، نہ اپنے مخالفوں اور حریفوں کے ساتھ، نہ اپنے معتقدین کے ساتھ، نہ اپنے قارئین کے ساتھ، انہوں نے بلاشبہ بڑے زور شور سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور اس کو مرجح اور اولیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن دوسروں کے افکار و خیالات، دلائل اور معتقدات، اسلوبِ فکر اور منہاجِ نظر کو بھی پیش کرنے میں نہ صرف تحمل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ نا انصافی بھی نہیں کی ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ پڑھنے والا گو ان حضرات کے عمقِ مطالعہ، گہرائی فکر اور وسعتِ معلومات کا قائل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے سامنے دوسرا نقطۂ نظر بھی پوری وضاحت کے ساتھ آجاتا ہے۔ اور اس روشنی میں وہ خود بھی اپنی بصیرت اور فہم کے مطابق ایک رائے قائم کر سکتا ہے اور یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہ رائے وہی ہو جسے مرجح اور اولیٰ قرار دیا گیا ہے۔ یہ چیز عام مناظرانہ انداز سے بالکل ہٹی ہوئی ہے مناظر کا مقصد ایک اور صرف ایک ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو حریف کو زک دی جائے، اسے شکست سے آشنا کیا جائے، اس کے دلائل کو بودا ثابت کیا جائے، اس کے اولہٰ اور افکار و خیالات کو مزعومات محض ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا جائے۔ لیکن ایک حق پسند، ایک طالبِ حق یہ طریقہ نہیں اختیار کرتا۔ اس میں اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ اپنی کہے اور دوسرے کی سنے، خلوص صداقت اور دیانتِ فکر کو صرف اپنی متاع نہ قرار دے، دوسروں کو بھی اس کا مستحق سمجھے دوسروں کو بھی یہ حق دے کہ وہ آزادی کے ساتھ سوچیں، غور کریں، مطالعہ کریں، دلائل کا موازنہ کریں اور اس کے بعد ایک رائے قائم کریں اور وہ رائے صرف تقلید جامد پر مبنی نہ ہو، بلکہ

آزادیٔ فکر و نظر پر اس کی بنیاد پر رکھی گئی ہو۔

علمی اور دینی مسائل میں جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ صورتِ مسئلہ پورے طور پر منقح کر دی جائے، دلائل میں کسی طرح کا جھول نہ ہو، ہر نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی جائے، اسناد، روایات اور رواۃ کے بارے میں پوری تحقیق اور تفتیش کی جائے اور کسی کے ساتھ نہ رعایت کی جائے نہ کسی کو ہدفِ انتقام بنایا جائے۔ وہاں اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ اپنے مفہوم اور مقصد کو ایسی عبارت، ایسے الفاظ اور ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ عام فہم ہو، اس کے سمجھنے اور تہ تک پہنچنے میں کسی طرح کی دشواری نہ پیش آئے اور بلاشبہ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم نے اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔

(سید) رئیس احمد جعفری (ندوی)

زاد المعاد

فی

ہدیٰ خیر العباد

لشمس الدین أبی عبد اللہ محمد بن قیم الجوزیہ

٦٩١ — ٧٥١ ھ

آغازِ سخن

میرے مولیٰ اس بندۂ ناچیز کی مشکل آسان کر دے! اے خدائے کریم اس بندۂ مجبور کی اعانت کر اور ہمارے سیدنا محمد الامین صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت فرما! سب ستائش اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ انجام خیر ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور ہلاکت ان کے لیے ہے جو ظالم ہیں (تیرے سوا کوئی معبود نہیں (تو ہی) اگلوں اور پچھلوں کا معبود ہے، زمینوں اور آسمانوں کو تھامے ہوئے ہے۔ روز جزا کا مالک ہے، کہ اس کی اطاعت کے بغیر نہ کوئی کامرانی ہے نہ کامگاری، اس کے جلال کے سامنے عاجزی کے بغیر عزت نہیں۔ اور اس کی احتیاجِ رحمت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کے نور (ہدایت) کے بغیر کہیں راہ یابی نہیں، زندگی اس کی رضا میں ہے اور نعمت اس کے قرب میں ہے۔ قلب کی صلاح و فلاح صرف اس کا ہو رہنے میں ہے اور اس کی صحبت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس کی اطاعت کرے تو شکر گزار ہو اور اگر غلطی کر بیٹھے تو توبہ و استغفار کرے۔

اور جب اسے بلایا جائے تو (فوراً) جواب دے اور جب نیک عمل کرے تو ثواب کی امید رکھے۔ اور سب تعریفیں اس ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے ہیں کہ تمام موجودات و مخلوقات جس کے پروردگار ہونے کی شاہد ہے اور تمام مصنوعات نے اس کی الہیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بس وہی ایک اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی صنعتیں کیسی حیرت آفریں اور اس کی نشانیاں کیسی تحیر خیز ہیں۔ اس نے عجیب عجیب صنعتیں اور حیرت انگیز چیزیں پیدا فرمائیں، ہم اس کی مخلوقات کے شمار اور اس کی رضا کے مطابق اس کے عرش اور اس کے کلمات کی روشنائی کی حد تک اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اس یکتا خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، جس طرح اس کی ربوبیت میں کوئی اس کا وزیر نہیں اسی طرح الہیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کی ذات، صفات اور افعال میں کوئی اس کا شبیہ نہیں۔ وہ سب ہی سے بڑا ہے۔ وہ حمد کثیر کا سزاوار ہے اور صبح و شام اللہ تعالیٰ ہی کی پاکیزگی بیان کی جاتی ہے اور وہ ذات پاک ہے کہ آسمان اور اس کے ستارے، زمین اور اس کے ساکنین، سمندر اور اس کی مچھلیاں غرض ستارے ہوں یا پہاڑ

درخت ہوں یا چوپائے، سنگریزے ہوں یا ریت کے ذرے بلکہ ہر رطب و یابس اور ہر زندہ و مردہ اس کی پاکیزگی میں رطب اللسان ہے۔ یہ ہفت آسمان، یہ زمین اور زمین و آسمان کی مخلوقات۔ غرض ہر ایک کی زبان پر صرف اسی کی حمد و تسبیح ہے، کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی ثنا و صفت میں سرگرم نہ ہو۔ گو تمہارے کان اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ یقیناً وہ حلیم ہے بخشنے والا ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اس ذات یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہی ایک کلمہ ہے جس کے باعث زمین و آسمان قائم ہیں اور اسی حقیقت کا مظہر ہے جو تمام مخلوقات کا سبب وجود ہے۔ اسی کو لے کر اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور صحائفِ آسمانی نازل ہوتے اور شرائع مرتب ہوتے اور اسی کے رد و قبول کے لیے میزان نصب کی گئی اور صحیفے لکھے گئے اور جنت و دوزخ کا بازار لگا اور اسی رد و قبول کے باعث لوگ مسلمان اور کافر، صالح اور بدکار دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ بس یہی منشاء خلق و امر اور ثواب و عقاب ہے۔ یہی وہ حق ہے جس کی خاطر مخلوقات پیدا کی گئی اور اس کے اقرار اور اس کے ادائے حقوق ہی پر سوال و حساب ہوگا۔ اور اسی بنیاد پر قبلہ قائم کیا گیا اور اسی پر ملت کی اساس ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جس کی سربلندی کے لیے جہاد کی تلواریں میان سے باہر نکلیں۔ یہ جمیع عباد پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور یہی کلمۂ اسلام اور مفتاح دارالسلام ہے اور اسی کے بارے میں اگلوں اور پچھلوں سے پرسش ہوگی۔

اور بندہ دو سوالوں کا جواب جب تک نہ دے لے اس وقت تک اس کے پاؤں زمین سے جنبش نہ کر سکیں گے:

- ایک سوال یہ کہ تم کسے پوجتے تھے؟
- دوسرا سوال یہ کہ انبیاء کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا؟
- پہلے سوال کا جواب ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
- اور دوسرے کا جواب معرفت، اقرار، انقیاد اور طاعت کے ساتھ یہ ہے کہ بلاشبہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔

یعنی بلاشبہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے ہیں، رسول ہیں، امین وحی الٰہی ہیں۔ اس کی مخلوق میں سب سے بہترین اس کے اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر ہیں۔ وہ دین قویم اور راہ مستقیم کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمت اللعالمین اور امام المتقین اور تمام مخلوقات کے سامنے ایک حجت بنا کر بھیجا اور انبیاء علیہم السلام کے انقطاع کے بعد وہ مبعوث ہوئے۔

آپؐ نے پائیدار راہ کی ہدایت فرمائی اور طریقہ ہائے زندگی کی وضاحت فرمائی۔ اللہ نے بندوں پر

ان کی اطاعت، مدد، احترام اور الفت لازم فرمادی۔ اور ان کے ادائے حقوق کی تلقین فرمائی اور جنت کے لیے کئی راستوں کو آڑ بنا دیا، ان میں سے کوئی راستہ بھی نہیں کھل سکتا جب تک وہ آپ کا راستہ نہ ہو، خدا نے آپ کا شرح صدر فرمایا اور آپ کے ذکر کو سربلندی عطا فرمائی، آپ کا بوجھ ہلکا کر دیا اور جس نے آپ کی مخالفت کی اس پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی۔

مسند میں حضرت ابو منیب جوشی، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"مجھے قیامت کے قریب تلوار دے کر مبعوث کیا گیا تا کہ صرف خدائے یکتا کی عبادت کی جائے جس کا کوئی شریک نہیں اور میرا رزق میرے نیزے کے سایہ میں لکھ دیا اور جس نے میری مخالفت کی اس پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی گئی اور جو جس قوم سے مشابہت رکھے گا وہ اسی کا ایک فرد سمجھا جائے گا۔

چند آیتوں کی تفسیر

پس جبکہ رسوائی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے لیے مقدر ہو چکی تو اب عزت اور سربلندی ورفعت صرف آپ کے اطاعت گزاروں اور فرمانبرداروں کے لیے ہی ہے:۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ یعنی نہ سست ہو اور نہ غم زدہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے، بشرطیکہ تم ایمان رکھتے ہو۔

اور (دوسری جگہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ۔ یعنی عزت اللہ، اس کے رسول اور صرف مسلمان کے لیے ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ۔ یعنی سُست نہ ہو اور اسلام کی طرف دعوت دیتے رہو اور تم ہی سربلند رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

پھر ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تیرے اور تیری پیروی کرنے والے مسلمانوں کے لیے کافی ہے۔

صرف اللہ آپ کی مدد کے لیے کافی ہے اور آپ کے متبعین کے لیے بھی کافی ہے۔ کہ وہ اس کے علاوہ اور کسی کے محتاج نہ ہوں گے۔

یہاں دو مقدرات ہیں۔ ایک واو (جو حرف عطف ہے) تو اب مَنْ کو معطوف اور کَ کو معطوف علیہ کہا جائے گا (یاد رکھیے) کہ (علماء نحو کے ہاں یہ بھی مختار ہے کہ حرفِ جار دوبارہ لائے بغیر ضمیر مجرور پر عطف کو جائز سمجھا جائے اور (عربی زبان میں) اس کے شواہد بکثرت ملتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واو کو بہ معنی مَعَ لیا جائے اور منصوب حالت پر سمجھتے ہوئے اسی کا عطف حَسْبُ پر کر دیا جائے۔ کیونکہ حَسْبُكَ کے معنی (كَافِيكَ) (تیری مدد کو کافی ہے) ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ ہی تیری (مدد) کو کافی ہے اور جو تیرے فرمانبردار ہیں ان کے لیے بھی وہی کافی ہے۔

جیسا کہ عرب کہتے ہیں حسبك وزيدا درهم یعنی تیرے اور زید کے لیے ایک درہم کافی

ہے"۔ جیسا کہ ایک شاعر نے بھی کہا ہے ؎

اذا کانت الہیجاء وانشقت العصا
فحسبک والضحاک سیف مہند

یعنی جب میدانِ کارزار گرم ہو اور لاٹھی ٹوٹ جائے تو تیرے اور ضحاک کے لیے ہندی تلوار کافی ہے"۔
اور یہ آخری تقدیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔
یہاں پر ایک تیسری تقدیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ مَنْ کو مبتدا مرفوع مان لیا جائے اور اس کا عطف اللہ پر کیا جائے تو پھر اس کے معنی ہوں گے کہ تیرا اللہ اور تیرے ماننے والے (صحابہؓ) تیری (نصرت کے لیے) کافی ہیں۔
اگرچہ بعض لوگوں نے ایک آخری یعنی چوتھا مطلب بھی لیا ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ آیت کا مطلب اس طرح لینا بالکل ہی نامناسب ہے، کیونکہ کافی وافی ہونا تو اللہ جل شانہٗ ہی کی صفت خاص ہے جیسے اس پر توکل کرنا، اس سے ڈرنا، اس کی عبادت کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔
وَاِنْ یُّرِیْدُوْا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ۔
یعنی اگر وہ چاہیں کہ تجھے دغا دیں تو تجھے کافی ہے اللہ۔ وہی ہے جس نے تیری اور مسلمانوں کی اپنی نصرت سے تائید کی۔ تو یہاں پر حَسْب و اَیَّدَ (تائید) میں امتیاز بتا دیا اور کافی (حسب) کو اپنی صفتِ خاص کی حیثیت میں ذکر فرمایا اور اپنی مدد کے وعدے یعنی تائید کو اپنی اور بندوں کی صفتِ عامہ فرمایا (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے متوکل اور موحد بندوں کی تعریف فرمائی کہ انہوں (بندوں) نے اللہ احد کو ہی کافی سمجھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے) فرمایا:۔
"اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ"۔
یعنی جن سے لوگوں نے کہا کہ انہوں نے تمہارے مقابلے کے لیے سرو سامان جمع کیا ہے سو ان سے ڈر گئے۔ پھر ان کا ارمان بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کافی ہے ہم کو اللہ اور وہ کیا خوب کارساز ہے۔

توحید خالص بغیر شرک کے

انہوں نے یہ جواب نہیں دیا کہ ہمیں تو اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ جب انہوں نے اس طرح اقرار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی تعریف اسی (توکل علی اللہ) کی وجہ سے فرمائی۔ (تو جب خدا کے ہاں توحید اس قدر اہم ہے)، تو پھر وہ اپنے رسول صلی اللہ

علیہ وسلم سے یہ کیونکر کہہ سکتا تھا کہ اللہ اور تیرے پیروکار تیری (مدد) کے لیے کافی ہیں۔ حالانکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانبردار ہیں ۔ یعنی صحابہ کرام نے کافی ہونے کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو یکتا تسلیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ ساتھ اس کے رسول کو اس صفت میں شریک نہیں سمجھا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کافی (مددگار) ہونے کی حیثیت اختیار کر کے خود ہی اللہ تعالیٰ کے شریک بن بیٹھتے۔ یہ تو بالکل ہی انوکھی اور قطعاً غلط تربات ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗ اِنَّا اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ ۔

"یعنی (اور) اگر وہ اس چیز پر راضی ہو جاتیں جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے اور کہیں۔ اللہ کافی ہے ہم کو۔ عنقریب اللہ انہیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ یقیناً ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔"

ذرا غور تو کیجیے کہ عطا کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت قرار دیا۔ جیساکہ دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ

"یعنی جو تمہیں رسول دے اُسے لے لو۔" اور حَسْبُ (کافی ہونا) اپنے لیے ہی مخصوص رکھا اور یوں نہیں فرمایا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

یعنی ہمیں اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔

بلکہ کافی ہونا اپنا ہی حق بتایا، جیسے کہ مذکورہ آیت میں ہے۔

اِنَّا اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ ۔

"یعنی یقیناً ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔"

اور یہاں پر ساتھ ہی یہ نہیں فرمایا کہ "اور اس کے رسول کی طرف بھی"۔ بلکہ رغبت کو محض اپنی ذات کی کے لیے مخصوص فرما دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ

"یعنی پھر جب تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا۔"

تو رغبت، توکل، انابت اور حَسْبُ (کافی ہونا) صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے (بالکل اسی طرح) جیسے کہ عبادت، تقویٰ اور سجدہ محض اللہ تعالیٰ کو روا ہے اور نذر و حلف بھی اللہ جل شانہٗ کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں مذکور ہیں:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ -

"یعنی کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں؟"

حَسْبُ بھی کافی ہونا ہی ہوتا ہے تو جب اللہ نے آگاہ فرمایا کہ دیکھو وہ (اللہ) تنہا ہی اپنے بندوں کی (مدد) کے لیے کافی ہے تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کافی ہونے کے لیے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبعین کو بھی شریک بنالے۔ اس لغو تاویل کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس اتنے دلائل ہیں جن کی تفصیل غیر ضروری ہے اس جگہ مقصد صرف یہ ہے کہ جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے سے ہدایت، اصلاح نفس اور کامرانی عطا ہوتی ہے اسی طرح خدا کی طرف سے عزت، کفایت اور مدد بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری ہی کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں جہان کی سعادت آپ کی اطاعت میں ——————— اور دونوں جہان کی شقاوت آپؐ کی نافرمانی میں رکھ دی۔ اسی لیے آپؐ کے ماننے والوں کے لیے دنیا و آخرت میں ہدایت، امن، کامرانی، عزت، کفایت، مدد، کارسازی، تائید اور آسودگی زندگی کی ضمانت ہے اور آپ کے مخالفین کے لیے دنیا و آخرت میں ذلت، رسوائی، گمراہی، شقاوت اور بدبختی اٹل ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمادیا:۔

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی جان، بچوں، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب نہ رکھے۔

اور اللہ نے بھی قسم کھا کر فرمادیا۔

"جو آدمی اختلافات و تنازعات کی صورت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم نہ سمجھے۔ وہ مومن نہیں پھر ان کے فیصلہ پر قلبی رضامندی بھی ضروری ہے۔ جیسا بھی وہ فیصلہ فرمادیں، یہاں تک کہ اُن کے فیصلہ کے خلاف دل میں ذراسی بھی تنگی تک محسوس نہ ہو بلکہ دل و جان سے تسلیم کرلے اور ان کی قیادت کو کلیۃً مان لے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ -

(یعنی اور کسی مومن مرد، کسی مومن عورت کو حق نہیں کہ جس وقت اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردے تو انہیں کوئی اختیار باقی رہا ہو)

یہاں تو اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسولؐ کے حکم کے سامنے "اختیار" بھی سلب کرلیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پہنچنے کے بعد ایک مومن (تسلیم کے سوا) قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ بلکہ جب آپؐ نے حکم صادر فرمادیا تو سمجھئے کہ اب یہ حکم ایک امر لازم ہے!

رسول ؐ کے سوا کوئی مطاع نہیں

البتہ آپؐ کے علاوہ دوسروں کے اقوال میں اختیار ضرور حاصل ہوگا کیونکہ ان کا معاملہ غیر واضح ہے جیسے آپ کے علاوہ قرآن و حدیث جاننے والے کے اہل علم، و سنت ۔ پس ان شرائط کے ماتحت غیر رسول کی اطاعت واجب نہیں بلکہ اختیاری ہے، یعنی آپؐ کے سوا کسی کا اتباع "واجب" نہیں ہوگا۔ اب اگر کسی نے غیرِ رسول کا قول ترک کر دیا تو وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گنہگار نہ سمجھا جائے گا۔

ویسے بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ تمام لوگوں پر غیرِ رسول کی اطاعت کس طرح لازم اور اس کی مخالفت حرام قرار دی جا سکتی ہے؟ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول پہنچ جانے کے بعد ہر دوسرے قول کو مسترد کر دے، کیونکہ آپؐ کے حکم کے بعد کسی کا حکم قابلِ قبول نہیں۔ نہ آپؐ کے قول کے بعد کوئی قول قابلِ تسلیم ہے، نہ آپؐ کے مسلک کے علاوہ کوئی مسلک لائقِ اختیار ہے۔

غیرِ رسول کا اتباع اُسی وقت لازم ہوتا ہے جب وہ ایسی بات کا حکم دے جس کا رسولؐ نے حکم دیا ہو، اور جس سے رسولؐ نے منع کیا ہو اس سے روکے۔ اس طرح اس کی حیثیت محض ایک مبلغ اور خبر رساں کی ہوگی قطعاً اُسے کوئی بنیادی یا اساسی حیثیت حاصل نہ ہوگی، لیکن جس نے اپنی سمجھ اور تاویلات سے اصول وضع کیے اور اساسی قواعد مرتب کیے تو امت پر ان کا اتباع کرنا اور اس کے قول کو قولِ فیصل قرار دینا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ارشادات کے مطابق اور ہم آہنگ نہ ہو جسے لیکر آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ ایسے اقوال و احکام وحی و تعلیماتِ الٰہی سے متوافق ہونے کی صورت ہی میں قبول کیے جا سکتے ہیں، ورنہ بے تامل ان کا رد و اطراح لازم آئے گا اور انہیں کسی صورت میں بھی موردِ قبول نہیں قرار دیا جائے گا۔ اور اگر ہر دو صورتوں میں سے کوئی صورت بھی واضح نہ ہو، تو پھر توقف سے کام لینا پڑے گا۔ اور قولِ حسن یہی ہے کہ اس قول موقوف کے مطابق فتویٰ دینا اور نہ دینا دونوں جائز ہیں۔

ایک آیۂ کریمہ کی تفسیر

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا تنہا خالق اور مختار کل ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے:-

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ۔

یعنی، "اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اختیار کرتا ہے۔"

اس جگہ متکلمین کا بیان کردہ ارادہ و اختیار مراد نہیں کہ وہ "فاعل مختار ہے" اور اللہ اگرچہ "فاعل مختار" ہے لیکن یہاں اختیار سے ایسا مطلب مراد نہیں کہ یہ اختیار تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "یخلق ماشاء" میں داخل ہے کیونکہ وہ اختیار ہی سے تو پیدا فرماتا ہے اور اس کے فرمان "مایشاء" میں مستور ہے، کیونکہ مشیت ہی تو اختیار

ہے۔

حقیقتاً یہاں اختیار سے مراد اجتبا و اصطفا یعنی چن لینا اور پسند کر لینا، یعنی اختیار بعد خلق ہے اور اختیار عام سے مراد اختیار قبل الخلق ہے۔ پس اس امر کے پیش نظر یہ صفت عام ہے اور وہ خاص اور جو صورت متاخر ہے وہ مخلوق ہیں اختیار سے متعلق ہے اور جو پہلی صورت ہے اس سے مراد خلق کرنے یعنی پیدا کرنے کا اختیار ہے اور رہ دونوں اقوال میں صحیح تر قول، قول تبارک و تعالیٰ "یختار" پر وقف تام ہے۔

اور یہ ارشاد کہ:

مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۔

"یعنی انہیں کوئی اختیار نہیں"۔

یہ نفی ہے کہ دراصل اس اختیار کی نفی مخلوق کے لیے ہے۔ کیونکہ اختیار صرف خدائے یکتا کی صفت ہے۔ پس جس طرح وہ خالق ہونے کی حیثیت میں منفرد ہے اسی طرح مختار (اختیار کرنے والا) ہونے کی حیثیت میں منفرد اور یکتا ہے۔ لہٰذا کسی کی مجال نہیں کہ وہ "خلق" کر سکے یا "اختیار" کر سکے۔ خلق اور اختیار تو تمام تر خدا کا کام ہے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اپنے مواقع اختیار کو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور اپنے محل رضا سے آشنا ہے۔ اور مختار ہونے کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے وہ اُسے اور دوسروں کو مشترکہ طور پر حاصل نہیں ہیں ان میں کوئی بھی کسی طرح بھی اس کا شریک نہیں۔

اور وہ لوگ جنہیں تحقیق سے کوئی مس نہیں اس آیۂ کریمہ کی اس طرح شرح کرتے ہیں کہ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ میں "ما" موصولہ ہے اور یہ (جملہ) مفعول ہے اور رہا لفظ "یختار" تو اس سے مراد یہ ہے "وہ لوگ جنہیں اختیار حاصل ہے وہی اختیار کا حق استعمال کرتے ہیں"۔

یہ بات متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

منجملہ ان کے ایک یہ کہ کوئی ایسا مقام نہیں کہ جہاں مرجع محذوف سمجھا جائے۔ نیز اسی طرح جب ہم معنی اور موصولہ حرف جار سے مجرور بنایا جاتے تب ہی مجرور محذوف ہوتا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۔

"یعنی وہ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے جو تم پیتے ہو"

اور ایسی ہی دیگر امثال۔

اور نحوی طور پر بھی یہ کہنا غلط ہے۔ "جَاءَنِي الَّذِي مَرَرْتُ بِهٖ وَرَأَيْتُ الَّذِي رَغِبْتُ وغیرہ دوسرے اگر یہ مطلب لیا بھی جائے تو الخیرۃ کو منصوب ماننا پڑے گا اور صلہ کا فعل ایسی ضمیر سے متصف ہوگا۔

جو موصول کی طرف راجع رہی ہے تو اب گویا کہ کلام یوں ہوا۔ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ۔ یعنی، اور وہ اُن کو اختیار کرتا ہے کہ جنہیں اختیار حاصل ہے۔ یعنی جو عین اختیار تھا وہ انہیں کو حاصل تھا اور یہ قرأت تو کسی سے بھی مذکور نہیں علاوہ ازیں اس مطلب کو اگر مانا جائے تو کئی مزید اشکالات بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔

ایک تقدیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے متعلق ان کے مفوضہ اختیارات اور ارادوں کے جبر کی حکایت کرتا ہے اور اس صفتِ اختیار میں اپنی انفرادیت بیان فرماتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔

یعنی، اور انہوں نے کہا کیوں نہیں نازل کیا گیا یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی اور آدمی پر۔ کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنے والے ہیں۔ ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی معاش تقسیم کر رکھی ہے اور بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے درجوں کے اعتبار سے۔ تا کہ بعض بعض سے کام لے۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں"۔

تو گویا اللہ سبحانہٗ نے ان کی اختیاری حیثیت کا انکار فرمایا۔ اور واضح کر دیا کہ یہ صفت انہیں حاصل نہیں بلکہ یہ صفت تو اس کی ہے جس نے ان کی معاش یعنی رزق اور عمر تقسیم کر رکھی ہے اور اسی طرح وہی ذات پاک ہے جس نے قابل انتخاب افراد اور مناسب و غیر مناسب لوگوں سے آگاہی رکھتے ہوئے اہل ثروت لوگوں پر اپنا فضل تقسیم کر رکھا ہے اور وہی ہے جس نے کچھ لوگوں پر دوسروں کے مراتب بلند کر دیے ہیں اور انہیں ان کی معاش اور درجاتِ فضل و کرم بانٹ رکھے ہیں تو گویا تقسیم کرنے والا صرف اللہ ہی ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

اور اسی طرح یہ آیت ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے خالق اور مختار ہونے میں اپنی انفرادیت واضح کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہی مواقع انتخاب کی صحیح آگاہی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اس نے کفار کی آمد اور ان کے اعتراضات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ، اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ

یعنی، "انہوں نے کہا ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی اُس کی مثل نہ دیا جائے جیسا کہ اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں (نازل فرمائے گا) اور صرف خدا ہی انتخاب عزت اور رسالت و نبوت سے متصف ہو سکنے کی اہل ذات کو

جانتا ہے نہ کہ دوسرے لوگ!

ایک تشریح یوں ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مشرکین کے اختیار و اقتراح سے پیدا ہونے والے شرک سے پاک بتایا۔ اس لیے یوں فرمایا: مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ۔ یعنی: انہیں کوئی اختیار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ جو شرک کرتے ہیں ان کے شرک کا مقتضا یہ نہ تھا کہ غیر اللہ کو خالق ثابت کیا جائے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے (اس وجہ سے) اپنی پاکیزگی بیان فرمائی۔ پس غور کرنا چاہیے کہ یہ ایک نہایت ہی لطیف نکتہ ہے۔

ایک (تفسیر) یہ بھی ہے کہ یہ سورۂ حج کی آیت میں بیان کردہ ایک مثال کے مشابہ ہے، کہ فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ، إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ

یعنی: "بے شک وہ جو پکارتے ہیں اللہ کے ماسوا کو وہ ہرگز نہیں پیدا کر سکتے ایک مکھی بھی اور اگرچہ اس کے لیے سب اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ مانگنے والا اور جس سے مانگا گیا دونوں کمزور ہیں۔ انھوں نے نہیں مدد کی اللہ کی جیسا کہ حق ہے قدر کرنے کا، بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔"

پھر فرمایا کہ:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ۔

یعنی، "اللہ تعالیٰ فرشتوں سے اور انسانوں سے رسولوں کا انتخاب فرماتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے، جو کچھ اُن کے سامنے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے جانتا ہے اور تمام امور اللہ ہی کی طرف پلٹنے والے ہیں۔"

ایسی ایک مثال سورۂ قصص میں بھی ملتی ہے:

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ۔

یعنی: "اور تیرا رب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔"

نیز ایک مثال سورۂ انعام میں ہے کہ:

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ۔

یعنی، "اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں نازل فرمائے"۔

تو ان تمام مقامات میں حق تعالیٰ نے صراحت سے فرما دیا کہ اُسے جائے انتخاب کی تخصیص کا علم بھی ہے اور سببِ تخصیص کا علم بھی، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ فلاں فرد دوسرے سے زیادہ موزوں ہے اور کیوں موزوں ہے؟ تو ان مذکورہ آیات پر جب آپ غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہاں یہی مطلب واضح طور پر نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ اس آیت کے بعد ذکر فرما رہا ہے:۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ۔

یعنی: "اور جس دن وہ ان کو آواز دے گا۔ پس کہے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟ پس ان پر خبط کر دی جائیں گی اس دن پر خبریں۔ پس وہ کہیں پوچھے جائیں گے۔ پس جس نے توبہ کی اور مان لیا اور اچھے کام کیے تو یقیناً وہ نجات پانے والوں میں سے ہو گا۔ اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور انتخاب کرتا ہے۔

پس جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تنہا ان سب کو پیدا کیا تو ان میں سے جو جھکا یعنی جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے اُسے خدا نے چن لیا۔ اس طرح وہ (نیک افراد) اس کے بندوں میں سے منتخب اور اس کی مخلوق میں سے چیدہ تھے اور یہ اختیار (انتخاب) اللہ تعالیٰ کی حکمت اور علم کی دلیل ہے اور یہ (انتخاب) اسی کا ہے جو اس کا اہل ہو۔ نہ کہ ان مشرکین کا انتخاب اور اختیار۔ پس اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس سے بلند ہے، کہ جس کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں (سبحان اللہ وتعالیٰ عما یشرکون)

اختیار و تخصیص شانِ ربوبیت سے ہے — جب آپ صفتِ خالقیت پر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ اختیار و تخصیص دال ہے خدائے بزرگ و برتر کی ربوبیت وحدانیت، کمالِ حکمت، علم اور قدرت کاملہ پر، اور بلا شبہ وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ اس کا کوئی شریک ہے، وہ اپنی قوتِ خلق سے پیدا فرماتا ہے۔ اپنے اختیار سے انتخاب کرتا ہے اور اپنی قوتِ تدبیر سے چارہ سازی کرتا ہے۔ پس اس اختیار و تدبیر، اور تخصیص کا اثر اس سارے عالم میں اس کی ربوبیت کے عظیم ترین آیات اور اکبر شواہد

وحدانیت اور صفاتِ کمال اور صدق رسل میں مشہود اور نمایاں ہے، اس کی جلوہ گری ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔

اب ہم تھوڑی سی وضاحت بھی اپنے مطلب اور مدعا کی کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ ایک روایت اس امر پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کیے اور سب سے اونچے (آسمان) کا انتخاب فرما لیا تو اُسے اپنے مقرب ملائکہ عظام کا مستقر قرار دیا اور اسے اپنی کرسی اور عرش کا تقرب عطا فرمایا۔ وہ اپنی پسند کے مطابق مخلوق کو وہاں بسایا تو اس (آسمان) کو دوسرے تمام آسمانوں پر ایک خاص شرف اور فضیلت حاصل ہے اور یہ نہ ہو تو بھی اسے اللہ تبارک و تعالیٰ سے قرب کی مزیت و فضیلت تو حاصل ہی ہے، باوجودیکہ اس کا مادہ وہی ہے جو دوسرے آسمانوں کا ہے۔ لیکن اس (آسمان) کا شرف و تخصیص حق شانہٗ کی کمال حکمت اور قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے انتخاب فرماتا ہے۔

اور اسی طرح جنتِ فردوس کو باقی تمام جنتوں پر فوقیت اور تخصیص عطا کی۔ اور (جنت الفردوس) کی چھت اپنے فرش سے بنائی۔ اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اس جنت میں اپنے دستِ مبارک سے (باغات) لگائے اور اپنی مخلوق میں سے چیدہ چیدہ لوگوں کو منتخب فرما لیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص خاص ملائکہ جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کو باقی فرشتوں میں سے منتخب فرمایا، (یہاں تک) کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرمایا کرتے تھے:

اللھم رب جبریل ومیکائیل واسرافیل فاطر السمٰوات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ یختلفون۔ اھدنی لما اختلف فیہ من الحق باذنک انک تھدی من تشاء الی صراط مستقیم۔

یعنی: اے اللہ، اے رب جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام زمینوں اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے، غیب و شہود کے عالم تو ہی اپنے بندوں کے اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا۔ ان کے اختلاف میں جو حق ہے اس کی مجھے اپنے اذن سے ہدایت فرما۔ بے شک تو ہی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تو آں حضرتؐ نے ان تینوں فرشتوں کا اللہ تعالیٰ سے قربِ خصوصی اور انتخاب کے باعث ذکر کیا۔ آسمانوں پر اور بھی بہت سے فرشتے ہیں۔ لیکن ان تینوں کے سوا اور کسی کا نام نہیں لیا، کیونکہ جبرائیل علیہ السلام صاحبِ وحی ہیں کہ جس سے قلوب و ارواح کی زندگی قائم ہے اور میکائیل علیہ السلام اس قطر کے

نگران ہیں کہ جس میں زمین، جاندار اور نباتات نمو پاتے اور زندہ رہتے ہیں اور اسرافیل جس کے سپرد صور پھونکنا ہے کہ جب وہ صور پھونکیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے اذن سے مُردوں کو زندہ کردے گا اور مردے قبروں سے نکل آئیں گے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے انبیاء علیہم السلام کو منتخب فرمایا، جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور پھر رسولوں کو چنا اور اختیار کیا کہ ان کی تعداد امام احمد اور ابن حبان نے اپنی کتاب میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت سے تین سو تیرہ بیان کی ہے:

اور ان (انبیاء اور رسل) میں سے پانچ کو منتخب فرمایا، جن کا تذکرہ سورۃ احزاب اور شوریٰ میں بالفاظ ذیل آتا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ۔

یعنی: اور جب ہم نے انبیاء سے وعدہ لیا اور تجھ سے بھی اور نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) سے بھی۔

اور اسی طرح حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔

یعنی: مشروع کیا دین کو جس کی نوح کو وصیت کی اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کی وصیت کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کی طرف کہ دین قائم رکھیں اور اس میں متفرق نہ ہوں۔

پھر ان میں سے اللہ تعالیٰ نے دو اولوالعزم ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوست بنایا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی آدم میں سے اولاد اسماعیل علیہ السلام کا انتخاب فرمایا۔ پھر ان میں بنی خزیمہ کے قبیلہ بنی کنانہ کو چنا، پھر کنانہ سے قریش اور قریش سے بنو ہاشم کو اور آخر بنو ہاشم میں سے سارے انسانوں کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب فرمایا اور اس طرح تمام جہانوں میں سے ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتخاب کیا اور ان میں سابقون الاولون یعنی سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں کو پھر اہل بدر اور بیعت رضوان والوں کا انتخاب کیا اور ان کے لیے سب سے مکمل دین اور سب سے اعلیٰ شریعت اور سب سے پاکیزہ، طیب اور نفیس اخلاق کا انتخاب فرمایا اور آپؐ کے لیے تمام

امتوں سے بہتر امت کا انتخاب کیا۔ جیسے کہ مسند امام احمد وغیرہ میں ہے کہ بہز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم ستر امتوں کے برابر ہو اور تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر اور اعلیٰ ہو۔ علی بن مدینی اور امام احمد نے فرمایا کہ بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے جو روایت کرتے ہیں یہ صحیح ہے اور انتخاب خداوندی کا اثر ان کے اعمال و اخلاق، توحید (حتیٰ کہ) ان کے مقامات جنت میں بھی ملتا ہے۔ کیونکہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ایک بلند و بالا مقام پر فائز ہیں۔

اور ترمذی شریف میں بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کی ایک سو بیس جماعتیں ہوں گی، ان میں سے اسی امت محمدی کی اور چالیس دوسری تمام امتوں کی ہوں گی۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

ابو سعید خدریؓ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بعث النار کی جو روایت ہے اس میں ہے کہ:۔

جس ذات کے قبضہ میں میری جان ہے اس کی قسم، میں چاہتا ہوں کہ تم جنت کا ایک حصہ ہی بن جاؤ اور مزید کچھ نہ فرمایا۔

اس قول نبوی سے مراد یا تو یہ ہے کہ یہ زیادہ صحیح بات ہے اور یا یہ مطلب ہوگا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آرزو تھی کہ ان کی امت اہل جنت کا حصہ بن جائے، لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک سو بیس صفوں میں سے اسی صفیں آپ کی امت کی ہوں گی۔ پس اب دونوں روایات میں کسی طرح کا تناقض باقی نہ رہا۔

امت مسلمہ کی فضیلت کا سبب

اور اس امت کی فضیلت و انتخاب کا سبب یہ ہے کہ اسے وہ علم اور حلم عطا کیا گیا جو دوسری امتوں کو نہیں ملا اور مسند بزار و دیگر کتب حدیث میں ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بتایا کہ میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تیرے بعد ایک امت پیدا کروں گا کہ اگر اس امت کے لوگوں کو دل پسند چیز ملے گی تو حمد و شکر کریں گے اور اگر تکلیف پہنچی تو ایسے صبر و تحمل سے کام لیں گے کہ گویا حلم اور علم نہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، یا اللہ کیا کوئی حلم اور علم نہیں ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اسے اپنے علم اور حلم کا حصہ عطا کروں گا!

مکّہ مکرمہ کے فضائل اور خصوصیات

اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے اماکن اور بلاد کا انتخاب ہوا۔ خدائے بزرگ و برتر نے مکہ مکرمہ کو سب سے اچھا اور برتر شہر قرار دیا کیونکہ یہی وہ شہر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے منتخب فرمایا۔ اور اپنے بندوں کے لیے مناسک (حج) ادا کرنے کا مرکز قرار دیا اور دور و نزدیک علاقوں اور دشوار گزار خطوں سے یہاں آنا ہر بندۂ مومن پر لازم فرما دیا، سو اب وہ خشوع و خضوع اور انکسار کے ساتھ یوں حاضر ہوتے ہیں کہ ان کے سر ننگے ہوتے ہیں، وہ اہلِ دنیا کے لباس فاخرہ سے محروم ہو کر آتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو "حَرَم" قرار دیا، جائے امن بنایا، نہ یہاں خون ریزی کی اجازت ہے اور نہ درخت کاٹا جا سکتا ہے اور نہ شکار کیا جا سکتا ہے، نہ یہاں کے سبزہ و گیاہ کو چھیڑا اور اکھاڑا جا سکتا ہے اور نہ یہاں کی گری پڑی اشیاء کی تملیک ہو سکتی ہے۔ یہاں جو لوگ حاضر ہوتے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ گزشتہ گناہوں کا کفارہ ادا کریں، جو لغزشیں، خطائیں اور فرو گزاشتیں ہو چکی ہیں، ان کی تلافی کریں۔ جیسا کہ بخاری و مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اس گھر میں حاضر ہوا اور نہ فساد میں مبتلا ہوا، نہ فسق سے آلودہ ہوا، تو اس کی مثال (معصومیت میں) اس بچے کے مانند ہے۔ جسے اس کی ماں نے ابھی ابھی جنا ہو، اور خدائے بزرگ و برتر کی رحمت و شفقت کا یہ عالم ہے کہ وہ خود اس گھر کی زیارت کرنے والے کے لیے جنت سے کم کسی چیز پر راضی نہیں چنانچہ سنن میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حج اور عمرہ کے فرائض ادا کرو۔ کیونکہ یہ دونوں افلاس اور گناہوں کو اس طرح زائل کرتے ہیں کہ جیسے بھٹی لوہے پر میل کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ حج مبرور کا اجر جنت سے کم نہیں۔ صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمرہ اپنے پہلے عمرہ تک کی مدت (کے گناہوں) کا کفارہ ہے اور حج مبرور (مقبول) کی جزا صرف جنت ہے۔"

پس اگر بلد امین خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک خیر بلاد نہ ہوتا اور تمام شہروں سے زیادہ مکرم نہ ہوتا

تو خدا اُس کی وادیوں کو اپنے بندوں کے لیے جائے عبادت (حج) قرار نہ دیتا کہ جس کی طرف جانا بندوں کیلئے فرض مؤکدہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ اسی حرمت، شرف اور احترام کے باعث ہے۔

خدا نے قرآن کریم میں دو جگہ اس (شہر) کی قسم کھائی ہے، جیسا کہ فرمایا:۔

وَهَـٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۔

اور اس بلدِ امین کی قسم۔

اور فرمایا: لَا أُقْسِمُ بِهَـٰذَا الْبَلَدِ یعنی قسم ہے اس شہر کی۔

اور کرۂ ارض پر اس جگہ کے سوا کوئی ایسا خطہ نہیں کہ جس کی طرف بشرط، استطاعت سفر کرنا اور جس گھر کا طواف کرنا فرض ہو۔ اور زمین پر حجرِ اسود اور رکن یمانی کے سوا کوئی ایسی جگہ نہیں کہ جسے چومنا یا لمس کرنا جائز ہو۔ اور جس (کے لمس یا چومنے) سے گناہ دھلتے ہوں۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ مسجد حرام میں ایک دفعہ نماز پڑھنا ثواب میں (باقی عام مساجد) میں ایک لاکھ مرتبہ نماز پڑھنے کے برابر ہے۔ نسائی اور مسند میں سندِ صحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اس مسجد (نبوی) میں ایک بار نماز پڑھ لینا، سوا مسجدِ حرام کے، تمام مساجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، اور مسجدِ حرام میں پڑھی ہوئی ایک نماز میری اس مسجد (نبوی) سے سو گنا (اجر) والی ہے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔

اور یہ تو ایک واضح امر ہے کہ مسجد حرام کا خطہ کرۂ ارض پر علی الاطلاق سب سے زیادہ محترم ہے۔ اسی لیے اس طرف شدِ رحال (عزم سفر) فرض ہے اور باقی کی طرف مستحب و واجب اور مسند (امام احمد) ترمذی اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن عدی بن حمراء سے روایت ہے کہ انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جب کہ وہ مکہ کے قریب مقامِ حزورہ میں تشریف فرما تھے اور فرما رہے تھے کہ:۔

"اے مکہ خدا کی قسم تو اللہ کی سرزمین پر خیر ارض ہے اور اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ مقام ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کر دیا گیا ہوتا تو میں ہر گز یہاں سے قدم باہر نہ نکالتا۔" اس روایت کے بارے میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

خیرِ ارض اور قبلۂ واحد

مکہ مکرمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے تمام اہل زمین کا قبلہ قرار دیا۔ سطح ارض پر اس کے سوا کوئی قبلہ نہیں۔ نیز اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سارے کرۂ ارض پر یہ ایک ایسا قطعۂ ارض ہے جس کی طرف قضائے حاجت کے وقت پیٹھ کرنا یا منہ کرنا حرام ہے۔ اور اس مسئلہ میں صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ یہ پابندی ہر جگہ ہے خواہ وہ میدان ہو یا بیابان۔ اس کی تائید میں

اس سے زیادہ دلائل میرے پاس ہیں جن کا کسی دوسرے موقع پر میں نے ذکر کیا ہے اور ان دلائل کی بقاوت میں کوئی دوسری بات نہیں کہی جا سکتی، نہ میدان اور بنیان کی مقدار کی تعیین کے سلسلے میں کوئی اختلاف و تناقض ہے، لیکن دو فریقوں نقطہ ہائے نظر کی تائید یا مخالفت میں بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔

اور اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسجد حرام خدا کی اس سرزمین پر پہلی مسجد ہے جیساکہ صحیحین (بخاری مسلم) میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس پہلی مسجد کے متعلق دریافت کیا جو کرۂ ارض پر تعمیر کی گئی۔ آپ نے جواب دیا کہ "وہ مسجد حرام ہے" میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سی مسجد ہے؟ ارشاد ہوا: "وہ مسجد اقصیٰ ہے"۔ میں نے عرض کیا "دونوں کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟" فرمایا "چالیس سال کا"۔

بعض لوگ صحیح طور پر اس حدیث کا مطلب نہیں سمجھتے وہ اشکال میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان لوگوں کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام تھے جنہوں نے مسجد اقصیٰ تعمیر کی اور ان کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار برس کی مدت حائل ہے۔ لیکن تامل کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معترض کا اعتراض نافہمی پر مبنی ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صرف مسجد اقصیٰ کی مرمت کرائی تھی تعمیر نہیں کی تھی ورنہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر درحقیقت پہلے پہل حضرت یعقوب بن اسحاق علیہما السلام کے ہاتھوں انجام پائی تھی اور یہ واقعہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بناء کعبہ ڈالنے کے بعد کا ہے اور یہ مدت چالیس سال کی ہے۔

اور مکہ مکرمہ کی افضلیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے "اُمُّ القریٰ" یعنی بستیوں کی ماں فرمایا۔ تو گویا باقی دوسرے تمام شہر اس کے تابع اور فروع ہوئے اور تمام بستیوں کی اصل مکہ مکرمہ قرار پایا۔ پس لازم آیا کہ دوسری تمام بستیوں میں کوئی بھی اِس کے شرف و احترام میں اس کی عدیل و مثیل نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیساکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ اُمُّ القرآن (یعنی قرآن کی ماں) ہے۔ لہٰذا تمام صحف سماوی میں ایسی سورۃ کے مساوی اور کوئی سورۃ نہ ہوئی۔

اور مکہ مکرمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس شہر میں ان لوگوں کے سوا جو یہاں کے مستقل باشندے ہیں ——— دوسرے لوگوں کو احرام باندھے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے کہ اس میں کوئی شہر اس کا ہم پایہ اور ہم مرتبہ نہیں اور یہ مسئلہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو بتایا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت ہے۔ جسے حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کہ مکہ مکرمہ میں کوئی بھی، عام اس سے کہ وہاں کا باشندہ ہو یا نہ ہو، بغیر احرام باندھے داخل نہیں ہو سکتا۔ ابو احمد بن عدی نے

اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ اور بعض دوسرے راوی ایسے ہیں جو ضعیف راویوں سے بھی روایت کر ڈالتے ہیں اور فقہا کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں۔

ایک قول کی رُو سے نفی ثابت ہے، دوسرے کے لحاظ سے اثبات ہوتا ہے اور تیسرے کے پیش نظر ان لوگوں کے مابین فرق کیا جائے گا، جو مواقیت (حدِ احرام) کے اندر داخل ہوں یا ابھی حدِ میقات سے باہر ہوں جو لوگ ابھی باہر ہیں وہ احرام کے بغیر میقات سے نہیں گزر سکتے اور جو داخل میقات ہیں اُن کے بارے میں وہی حکم ہوگا جو اہلِ مکہ کے بارے میں ہے یعنی دونوں مساوی الحیثیت ہیں۔ یہ آخری قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور پہلے دونوں اقوال امام شافعی اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کے ہیں۔

اور مکہ مکرمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں پر صرف ارادۂ معصیت پر بھی خدا کے ہاں مواخذہ ہوگا۔ اگرچہ عملی طور پر اس معصیت کا مداوانہ ہوا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

"یعنی اور جو شخص اس میں ظلم والحاد کا ارادہ کرتا ہے ہم اسے المناک عذاب چکھائیں گے۔"

پس مقامِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ با (بالحادٍ) سے ارادۂ معصیت کو قابلِ عقاب قرار دیا۔ کیونکہ جب ایسی طور پر قصدِ فعل ہو تو اردت بکذا (میں نے یہ ارادہ کیا) نہیں کہا کرتے بلکہ اُس وقت ھممت بکذا (میں نے اس کام کا عزم کر لیا) کہا کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارادۂ معصیت پر وعید کی، کہ جو یہاں ظلم کرتے ہوئے حد سے تجاوز کرنے کا ارادہ کرے گا اُسے بھی حق سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے الم انگیز سزا ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں مقادیر سیئات — کیفیت کے اعتبار سے نہ کہ کمیت کے اعتبار سے — مضاعف ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ برائی کا بدلہ برائی ہے اور اگر برائی بڑی ہوگی تو اُس کی سزا بھی اسی تناسب سے ہوگی اور اگر برائی کم ہوگی تو اس کے بدلے میں جو سزا ملے گی وہ بھی ویسی ہوگی۔ پس اللہ کے حرم اور اللہ کے شہر اور فرشِ الٰہی پر جو برائی کی جائے گی وہ اِن تمام برائیوں سے بڑی متصور ہوگی جس کا ارتکاب کرۂ ارض کے کسی اور گوشہ میں کیا گیا ہو اور اس کی مثال یوں ہے کہ جس خطا اور معصیت کا ارتکاب بادشاہ کے محل میں کی جائے وہ اس خطا اور معصیت سے زیادہ سنگین متصور ہوتی ہے، جو محل شاہی سے دور دراز کسی مقام پر کی گئی ہو۔ بہرحال تضعیف سیئات کے بارے میں یہ نزاع ہے، اصل حقیقت کا علم صرف خدا ہی کو ہے کہ وہی پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے۔

اور مکہ کی اس افضلیت اور خصوصیت کا راز اس بات سے بھی آشکارا ہو جاتا ہے کہ دل خود بخود اس کی طرف کھنچتے ہیں، طبیعت بے ساختہ اس جانب راغب ہوتی ہے۔ یہ انجذاب، یہ کشش، یہ انعطاف، یہ لگاؤ، یہ محبت جو اس بلدِ امین کے لیے پیدا ہوتی ہے جو مقناطیس کے آہن میں ہوتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے شاعر نے:۔

محاسنہ ھیولی لکل حسن　　ومغناطیس افئدۃ الرجال

یعنی اس (شہر) کے محاسن ہر خوبی و رعنائی کا پیکر ہیں اور بلاشبہ یہ (شہر) دلوں کے لیے مقناطیس کی کشش رکھتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ حق شانہٗ نے اس شہر کے متعلق فرمایا:-

اِنَّہٗ مَثَابَۃٌ لِلنَّاسِ،

"یعنی بے شک وہ لوگوں کے اجتماع کی جگہ ہے۔ یعنی، لوگ ہر گوشہ اور چپہ سے مسلسل اس کی زیارت کے لیے آیا کریں گے اور سیر نہ ہوں گے بلکہ جتنی مرتبہ زیارت کریں گے۔ اتنا ہی اشتیاق میں اضافہ ہوگا۔

لا یرجع الطرف عنھا حین ینظرھا

حتی یعود الیھا الطرف عشتاقا

یعنی آنکھ اُسے دیکھ کر ابھی پلٹتی بھی نہیں کہ پھر شوق (زیارت) سے اسی طرف لوٹ آتی ہے پس نہ جانے کتنے اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کے لیے شہید ہوگئے، کتنوں کی کھال کھنچی اور کتنے گھائل ہوئے اور کتنوں نے اس کی محبت میں اپنی جان و مال قربان کر دیا اور کتنوں نے اپنے اہل و عیال، وطن، و جگر گوشوں کی مفارقت رضائے محبوب کی خاطر سہی حالانکہ اُن کے سامنے گوناگوں خوف، لالچ، تکالیف اور مصائب حائل تھے، لیکن زائرِ حرم ان اذیتوں میں لذت اور ان تکلیفوں میں راحت محسوس کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دل میں بھڑکنے والا جذبۂ شوق ہر طرح کی بہتر سے بہتر نعمتوں، آسائشوں اور لذتوں سے بڑھ کر ہے

ولیس محبا من یعد شقاءہ

عذابا اذا ماکان یرضی حبیبہ

یعنی اسے دعوائے محبت کب رہتا ہے، جو مرضی (مصائب) کے مقابلہ میں دکھ کو مصیبت خیال کرے۔

اور یہ سب درحقیقت سرّ الٰہی ہے جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے، وَطَھِّرْ بَیْتِیَ، یعنی: اور میرے گھر کو صاف ستھرا کر دو۔ تو گویا اس خاص اضافت کا سبب اس گھر کا اجلال و اکرام ہے، اور وہ بھی محبت کا تقاضا ہی تو ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے اپنے بندے اور رسول کی اضافت اپنی جانب فرمائی، اور اسی طرح صاحبِ ایمان بندوں کی طرف اضافت جتا کر انہیں بھی وقار، محبت اور عزت سے نوازا اور جب کبھی خدائے بزرگ و برتر کسی کی نسبت اپنی جانب کرے گا تو یہ مزیت اور اختصاص جو اسے حاصل ہوگا، یہ غیر اللہ پر اللہ کا اختصاص ہوگا، کہ اجتباء و اصطفا یعنی انتخاب و اختیار صرف اسی کو ہے، اور پھر اس اضافت سے اللہ تعالیٰ کی نسبت سے تفضیل و تخصیص اور جلالت مزید حاصل ہوگی، جو اضافت و نسبت سے قبل کی تفضیل و تخصیص اور جلالت

سے بالا ہو گی، اور یہ نکتہ اس کوتاہ بین کی فہم سے ماوراء ہے جو اعیان و افعال اور ازمان و اماکن کو یکساں سمجھتا ہو اور گمان کرتا ہو کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت و مزیت حاصل نہیں اور یہ جو کچھ ہے ترجیح بلا مرجح ہے، لیکن اس گمانِ فاسد کے خلاف چالیس سے زیادہ دلائل میرے پاس موجود ہیں جنہیں میں نے دوسری جگہ وضاحت سے بیان کیا ہے، اس جگہ اس فاسد نظریے کے ابطال کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر اسے مان لیا جائے تو انبیاء علیہم السلام اور اعداءِ انبیاء (کفار و مشرکین) کی حیثیت ایک ہو جائے گی۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تفضیل صرف صفات و مزایا کے باعث ہی اختصاص ذوات کی طرف راجع نہیں ہو جاتی جو دوسروں کو حاصل نہ ہوں۔ اور اسی طرح ایک خطۂ ارض محض بالذات دوسرے خطے پر فوقیت و مزیت نہیں رکھتا بلکہ یہ فوقیت و مزیت جو حاصل ہوتی ہے یہ مبنی ہوتی ہے ان اعمال صالحہ پر جو وہاں واقع ہوتے ہیں پس اسی طرح کعبہ مکرمہ، مسجد حرام، منیٰ، میدانِ عرفات اور مشاعر کو زمین کے دوسرے خطوں پر بالذات فضیلت و مزیت نہیں حاصل ہے۔ بلکہ ان کی افضلیت کچھ خارجی اوصاف کے باعث ہے۔

اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اس قول کو اس آیت میں فرمایا ہے: فاذا جاتھم کی آیت کے بعد:

لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ

یعنی: "ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہمیں اُس کی مثل نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔"

اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

یعنی: اللہ زیادہ جانتا ہے کہ وہ رسالت کو کہاں نازل فرمائے۔

یعنی ہر فرد تحمل رسالت کی اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس اہلیت و صلاحیت کے لیے کچھ خصوصیتیں درکار ہیں کہ ان کے بغیر یہ بات سج نہیں سکتی اور ان خصوصیتوں کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، وہی جانتا ہے کہ تم میں سے کون ان خصوصیات کا جامع ہے ورنہ بہ نظر ظاہر سب آدمی برابر ہی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس خیال کا ردّ نہ فرماتا۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۔

یعنی: اور ایسے ہی ہم نے بعضوں کو بعضوں سے آزمایا تاکہ وہ کہیں کہ کیا یہی ہیں کہ جن پر اللہ نے احسان کیا ہے ہم میں سے۔ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو خوب نہیں جانتا؟

یعنی اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس کی نعمتوں پر شکر گذار ہوتے ہیں اور انہی پر اپنا فضل خاص کرتا ہے، وہ احسان ناشکروں پر نہیں (بلکہ) شکر گذاروں پر کرتا ہے۔

اشخاص و اماکن کی ایک دوسرے پر فضیلت

پس ہر محل اللہ تعالیٰ کے شکر و احسانات اور شرف کا اہل نہیں ہوتا۔ پس ذوات کو ــــ از قبیل اعیان و اماکن و اشخاص ــــ اللہ نے مختار اور منتخب فرمایا۔ وہ ایسے صفات اور امور سے متصف ہیں جو ان کے عہد میں کسی اور میں نہیں پائے جاتے۔ چنانچہ اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں انتخاب فرمالیا۔

اور حق سبحانہٗ نے ان کو اپنے اختیار (انتخاب) سے افضلیت و خصوصیت عطا فرمائی، پس یہ ہے اس کا خلق اور یہ ہے اس کا اختیار۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ

یعنی: اور تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور انتخاب فرماتا ہے ۔

اور اس سے بڑھ کر مہمل اور باطل بات کیا ہو سکتی ہے کہ مکان بیت الحرام تمام دیگر خطوں کے ہم ہے اور حجر اسود کا ٹکڑا کرۂ ارضی کے دوسرے پتھروں کی طرح ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی مساوی ہے دوسرے انسانوں کے۔ درحقیقت تفضیل کا معاملہ ان امور سے متعلق ہے جو خارج از ذات اور وابستۂ صفات مخصوصہ ہیں اور یہ اقاویل و امثال متکلمین کی ان یاوہ گوئیوں میں سے ہیں جو انہوں نے شریعت پر روا رکھی ہیں اور اس کی جانب منسوب کر دی ہیں، حالانکہ وہ قطعاً ان ہفوات و مہملات سے بری ہے۔ اور ان (متکلمین) کے پاس بعض عام امور میں مساوات کے سوا کوئی دلیل نہیں اور اس عمومی مساوات سے حقیقی مساوات بہرحال حاصل نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ مختلفات کا اشتراک امور عام میں، اختلافِ صفات کے باوجود نہ مستبعد ہے نہ ناممکن[1]۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کبھی مشک اور پیشاب میں مساوات نہیں قائم کی۔ اسی طرح نہ پانی اور آگ میں برابری رکھی۔ پس مقامات مقدسہ اور عام مقامات، بزرگ ہستیاں اور عام لوگ، یکساں اور مساوی نہیں، ان کے مابین تو مشک اور بول، آگ اور پانی سے بھی کہیں زیادہ واضح اور نمایاں فرق مراتب موجود ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی شخصیتوں میں بھی اسی طرح کا فرق موجود ہے، یوں ہی کعبہ کا جو احترام ہے، وہ محل سلطانی کے احترام و اجلال سے قطعاً جدا اور متفاوت ہے، پس دو ایسے خطے کس طرح شرف و فضل میں یکساں ہو سکتے ہیں جب کہ

---

[1] مثلاً رسول و غیرِ رسول میں شکل و صورت، کھانا، پینا، سونا، اٹھنا بیٹھنا مشترک عادات ہیں۔

ایک خطہ کی تفضیل ذکر و عبادت اور دعا کے لیے مخصوص ہونے کے باعث ہے۔ اور دوسرے کو یہ خصوصیت حاصل نہیں، اس مردود و مرذول مسلک کو زیادہ تفصیل سے رد کرنے کا ہمارا ارادہ نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ انصاف دوست، دانا، اور صحیح قوتِ فیصلہ رکھنے والے اصحاب کے سامنے معاملے کی اصل تصویر پیش کر دیں اور اللہ تعالیٰ اور اسکے بندے اس کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ جب کبھی بھی کسی کو تخصص اور شرف عطا کرتا ہے تو اُس کے تخصص اور شرف کا کچھ اقتضا ہوتا ہے۔ بلاشبہ ترجیح و تخصیص کا عطا کرنے والا اور بخشنے والا خدا ہی ہے، وہی پیدا کرتا ہے، پھر اختیار کرتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ۔

یعنی: "اور تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اختیار کر لیتا ہے۔"

ایام و شہور کی ایک دوسرے پر فضیلت

اور یہیں سے بعض دنوں اور مہینوں کی دوسرے دنوں اور مہینوں پر فضیلت ثابت ہو جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر دن یوم النحر (قربانی کا دن) ہے یعنی حج اکبر کا دن۔ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ کے نزدیک سب سے افضل دن "یوم النحر" ہے۔ پھر یوم النفر، ایک قول ہے کہ عرفات کا دن اس سے افضل ہے اور اصحاب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔ ان کا قول ہے کہ حج اکبر کا دن اور اس دن کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے لیکن یوم عرفہ سے زیادہ خدا کسی دن بھی گناہ گاروں کو بند جہنم سے آزاد نہیں فرماتا، یہی دن ہے جب حق سبحانہٗ و تعالیٰ بندوں سے قریب آجاتا ہے۔ پھر وقوف کرنے والوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے، لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ کیونکہ حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے اور اس کی مقاومت کوئی چیز نہیں کر سکتی۔

اور صحیح یہ ہے کہ حج اکبر کا دن یوم النحر (قربانی کا دن) ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ۔

اور صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ انہیں یوم النحر کو اذن ملا نہ کہ یوم عرفات کو اور سنن ابو داؤد میں بالکل صحیح اسناد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم حج اکبر ہی یوم النحر ہے۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ یوم عرفہ یوم نحر (قربانی) سے مقدم ہے۔ کیونکہ یہ دن (یوم عرفات) وقوف، عاجزی، توبہ اور گریہ وزاری کا ہے۔ پھر یوم النحر کا دن ہے جو قربانی اور زیارت کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طواف کو طوافِ زیارت (کعبہ) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ یوم عرفات کو جب گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں

تو یوم النحر کو انہیں بیت اللہ میں حاضر ہونے اور زیارت کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔اسی لیے اس دن قربانی کرنا، سر کا منڈوانا اور رمی کرنا اور حج کے اعمال کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لیکن یوم عرفات کے اعمال جیسے "طہارت اور غسل" یہ اس سے قبل ہوتے ہیں۔

اور ذی الحجہ کے دس دن دوسرے ایام سے افضل ہیں، کیونکہ یہ دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک باقی تمام دنوں سے زیادہ محترم ہیں اور صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان دس دنوں کے اندر کیے ہوئے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں باقی تمام دنوں میں کیے گئے تمام اعمال سے زیادہ محبوب ہیں۔

صحابہؓ نے عرض کیا "اور جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں"؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں جہاد بھی ان سے زیادہ (محبوب) نہیں ہاں! اگر کوئی انسان اپنی جان و مال لے کر نکلے اور کچھ بھی واپس نہ لائے[1]۔

اور یہ وہ دس دن ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قسم کھائی ہے۔

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ۔ یعنی: قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی: اور اسی لیے ان میں تکبیر و تہلیل (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه) اور حمد کی کثرت کرنا مستحب ہے، جیسا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ان راتوں میں کثرت سے تکبیر و تہلیل اور حمد الٰہی کیا کرو۔

اور باقی ایام کے ساتھ ان ایام کی نسبت ایسے ہی ہے کہ جیسے مقاماتِ حج کی نسبت خطہ ہائے ارض سے ہے۔

اور اسی طرح ماہِ رمضان کی افضلیت تمام دوسرے مہینوں پر ہے اور آخری عشرہ کی افضلیت باقی راتوں پر اور لیلۃ القدر کی ایک ہزار ماہ پر ہے۔ تو اب اگر یہ خیال ہو کہ کونسی دس راتیں زیادہ افضل ہیں۔ ذی الحج کی دس راتیں یا رمضان کی دس راتیں اور دو راتوں یعنی لیلۃ القدر اور معراج کی رات میں سے کونسی افضل ہے۔ تو میں کہوں گا کہ پہلے سوال کا جہاں تک تعلق ہے تو اس باب میں زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ رمضان کی آخری دس راتیں ذی الحج کی دس راتوں سے افضل ہیں اور ذی الحج کے دس دن رمضان کے دس دنوں سے افضل ہیں اور اس تفصیل سے تمام اشکال وضع ہو جاتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رمضان کی دس راتیں اس لیے افضل ہیں کہ لیلۃ القدر انہی میں ہوتی ہے۔ اور ذی الحج کے دس دن اس لیے افضل

---

[1] یعنی صرف ایسا شخص زیادہ ضرور محبوب ہے (رئیس احمد جعفری)

کیونکہ انہی ایام میں یوم النحر (قربانی کا دن) یوم عرفات اور یوم ترویہ آتا ہے۔

شب معراج اور شب قدر کے مابین تفاضل کا مسئلہ

رہا دوسرا سوال تو حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ معراج کی رات لیلۃ القدر سے افضل ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ لیلۃ القدر زیادہ افضل ہے تو دونوں میں سے کونسا راستی پر ہے؟

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے جواب دیا، جو یہ کہتا ہے کہ معراج کی رات لیلۃ القدر سے افضل ہے تو اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی، لہٰذا لیلۃ القدر کی نسبت افضل ہے کہ اس رات کو ہر سال، قیام کرنا اور دعا مانگنا لیلۃ القدر سے زیادہ ثواب ہے تو یہ بات غلط ہے۔ کسی مسلمان نے ایسا فتویٰ نہیں دیا اور یہ واضح طور پر فاسد خیال ہے، اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور یہ عبادت و دعا اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ معین طور پر معلوم بھی ہو لیکن — شب معراج کے بارے میں اس کے مہینے، عشرا اور تعین پر کوئی دلیل موجود نہیں، بلکہ اقوال مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ شرعی طور پر شب معراج کی عبادت مسلمانوں کے لیے خاص نہیں کی گئی ہے، اس کے برعکس لیلۃ القدر کا معاملہ دوسرا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص لیلۃ القدر کو ایمان اور احتساب کے ساتھ عبادت میں سرگرم رہے تو اس کے گزشتہ تمام گناہ بخش دیے گئے اور صحیحین میں ہے کہ لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ رات ایک ہزار ماہ سے افضل ہے، کیونکہ اسی میں قرآن مجید نازل فرمایا گیا۔

اور اگر اس کی مراد اس مخصوص رات سے ہو کہ جس رات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی اور وہ (علوم و خزانے) حاصل ہوئے جو اور راتوں میں نہ ملے۔ بغیر اس بات کے کہ اس رات کو قیام یا عبادت کے لیے مخصوص کیا جائے تو اس رات کی بزرگی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

اور یہ بات بھی صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی مخصوص جگہ یا کسی مخصوص وقت میں کوئی نعمت عطا فرمائی تو اس جگہ یا وقت کو جمیع امکنہ یا ازمنہ سے زیادہ احترام حاصل ہو گیا، یہ بات تو اس وقت صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے جب یہ ثابت کر دیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر معراج کی رات کو جو انعام ہوا وہ لیلۃ القدر کی رات کو قرآن پاک کے نازل فرمانے کے انعام سے اور ان دوسری نعمتوں سے جو آپ کو عطا فرمائی گئیں زیادہ ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ان معاملات پر اس وقت گفتگو کی جا سکتی ہے جب نعمتوں کی مقدار (کا یقینی) اور اشیاء کی اصلیتوں کا صحیح علم ہو۔ اور یہ علم وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور علم کے بغیر

ان مباحث میں حصہ لینا کسی کے لیے بھی روا نہیں۔

متقدمین میں سے کسی کے متعلق منقول نہیں کہ اس نے معراج کی رات کو باقی راتوں خصوصاً لیلۃ القدر پر افضل قرار دیا ہو اور نہ صحابہ کرام اور تابعین عظام معراج کی رات کسی امر (عبادت وغیرہ) کے ساتھ مخصوص کرتے تھے بلکہ وہ تو (اس انداز سے) اس کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ اور یہ بات بھی معلوم نہیں کہ وہ رات (متعین طور پر) کونسی تھی؟ اگرچہ معراج کی رات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائلِ مبارکہ میں ایک عظیم الشان حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود شرعاً اس رات یا اُس جگہ (جہاں سے معراج ہوئی تھی) کوئی عبادت ضروری قرار نہیں دی گئی، بلکہ غار حرا جس میں ابتداءً وحی نازل ہوئی اور بعثت سے پہلے جہاں آپؐ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ بعثت کے بعد مکہ میں رہتے ہوئے بھی آپؐ نے یا کسی صحابی نے اس (غار) میں عبادتِ مخصوصہ کا قصد نہیں کیا اور نہ نزول وحی کے دن نزول وحی کے باعث آپؐ نے یا صحابۂ کرام نے کسی عبادت کی تخصیص کی اور نہ جس جگہ اور جس وقت وحی کی ابتدا ہوئی، کوئی عبادت مخصوص کی گئی۔

اور جن لوگوں نے مقامات اور اوقاتِ مخصوصہ کو ایسے واقعات کی بنا پر عبادات کے لیے مخصوص کیا ہے وہ اہلِ کتاب ہیں جنہوں نے مسیح علیہ السلام کے حالات (پڑھ) کر مواسم عبادات مقرر کر لیے۔ جیسے یوم میلاد اور یوم تعمید وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک مخصوص جگہ جا کر (تبرکاً) نماز پڑھتے ہیں انہوں نے معلوم کیا یہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ جگہ وہ ہے جہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی تو انہوں نے فرمایا:

کیا تم چاہتے ہو کہ انبیاء علیہم السلام کے آثار کو عبادت گاہیں بنا لو؟ تم سے پہلے کے لوگ انہی حرکتوں کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ اگر تم یہاں ہو اور نماز کا وقت آجاتا ہے تو بے شک نماز پڑھ لو ورنہ اپنی راہ چلتے رہو۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ معراج کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں لیلۃ القدر سے زیادہ افضل ہے اور لیلۃ القدر امت کے حق میں معراج کی رات سے زیادہ افضل ہے لہٰذا امت کے حق میں ہونے کے سبب اس کے لیے بہتر ہے اور معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہونے کے باعث ان کے لیے زیادہ افضل ہے۔

یوم جمعہ اور یوم عرفہ میں تفاضل کا سوال

اور اگر کہا جائے، جمعہ اور عرفہ میں سے کونسا دن افضل ہے؟ تو ابن حبان نے اپنی کتاب میں حضرت ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج جمعہ کے دن سے زیادہ افضل دن پر طلوع نہیں ہوا اور ایسی ہی تمیم بن اوس کی روایت بھی ہے کہ سب سے بہتر دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ بعض علمائے کرام اس حدیث کی دلیل سے جمعہ کے دن کو عرفہ کے دن پر افضلیت دیتے ہیں اور قاضی ابو یعلیٰ نے احمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ جمعہ کی رات قدر کی رات سے افضل ہے اور صحیح یہ ہے کہ جمعہ کا دن ہفتے کے تمام دنوں سے افضل ہے اور عرفہ و نحر (قربانی) کا دن تمام سال کے دنوں سے افضل ہے اور اسی طرح قدر کی رات اور جمعہ کی رات کا حکم ہے۔ اور اسی وجہ سے یوم جمعہ کو عرفات میں وقوف کرنا تمام دنوں سے کئی طرح افضل ہے۔ ایک تو یہ کہ دو ایسے دن جو تمام ایام میں افضل ہیں جمع ہو گئے، دوسرے یہ وہ دن ہے کہ اس دن قبولیتِ دعا کی ایک خاص یقینی گھڑی ہے اور اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ گھڑی عصر کے بعد کی ہے اور وقوف کرنے والے جب وہاں دعا اور عاجزی کرتے ہوئے کھڑے ہوں تو وہ ساعت بھی مستجاب ہے۔ نیز یہ کہ اسی دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقوف فرمایا تو اس سے بھی موافقت ہو گئی۔ علاوہ ازیں اسی دن اطرافِ ارضی سے مخلوقات خطبہ اور جمعہ کے لیے جمع ہوتی ہے اور یوم عرفہ کو اہلِ عرفات کا یہ اجتماع عرفہ کے مطابق ہوتا ہے تو مساجد میں مسلمانوں کے اجتماع اور عاجزی میں توقف سے وہ مراتب حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے مواقع پر حاصل نہیں ہوتے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اہلِ عرفہ کو یوم جمعہ کی عید اور عرفہ کی عید بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے عرفات والوں کو روزہ رکھنا مکروہ ہے اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ عرفات کو مقامِ عرفات میں روزہ سے منع فرمایا۔ اس کی سند میں شبہ ہے، کیونکہ مہدی بن حرب جوزی غیر معروف ہے اور اس روایت کا مدار اس پر ہے۔ لیکن ام فضل کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں نے یوم عرفات کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روزے کے بارے میں شک کیا بعض نے کہا کہ آپ کا روزہ ہے اور بعض نے کہا کہ نہیں آپ کا روزہ نہیں ہے۔ پھر ایک دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ آں حضرتؐ میدان عرفات میں اپنے اونٹ پر تشریف فرما تھے تو آپ نے نوش فرمایا۔

اور میدانِ عرفات میں یوم عرفہ کو افطار کے استحباب کی حکمت میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ "تاکہ دعا میں (بدنی) قوت حاصل ہو سکے" یہ حربی وغیرہ کا قول ہے۔ ان کے علاوہ اور حضرات سے بھی منقول ہے، جن میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ عرفہ کا دن اہل عرفہ کے لیے عید ہے۔ اس لیے انہیں روزہ رکھنا مناسب نہیں اور فرمایا اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو سنن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

اے اہلِ اسلام یوم عرفات، یوم قربانی اور ایام منیٰ ہمارے لیے عید ہیں۔

ہمارے شیخ (ابن تیمیہ) کا قول ہے کہ یومِ عرفات اہلِ عرفات کے حق میں ان کے اجتماع کے باعث عید ہے۔ بخلاف باقی لوگوں کے کہ وہ یوم النحر کو جمع ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی وہی عید ہوتی ہے اور مقصود یہ ہے کہ یوم عرفہ اگر جمعہ کے دن ہو تو دو عیدیں اکٹھی ہو گئیں۔ نیز یہ کہ اس دن کا توافق اُس دن سے ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے لیے دینِ حق مکمل کیا اور نعمت کی تکمیل فرمائی، جیسا کہ صحیح بخاری میں طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہا۔

"اے امیرالمومنین آپ اپنی کتاب میں ایک آیت پڑھتے ہیں۔ اگر ہماری قوم یہود پر یہ آیت اترتی اور ہمیں اس دن کو جاننا بھی ہوتا جس دن نازل ہوئی تھی تو ہم اس دن کو یومِ عید قرار دے دیتے"۔

آپ نے پوچھا کونسی آیت؟

اس نے عرض کیا کہ یہ آیت جس میں فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

یعنی: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لیے اسلام کے دین پر ہی راضی ہوا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اُس دن کو جانتا ہوں کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی اور جس جگہ یہ نازل ہوئی۔ یہ آیت جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عرفات کے میدان میں نازل ہوئی اور ہم عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

علاوہ بریں یہ کہ یہ دن قیامت کے دن کے جمِ غفیر اور اجتماعِ عظیم سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ قیامت جمعہ کے دن قائم ہوگی، جیسا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے بہتر دن کہ جس پر سورج طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدمؑ کو پیدا کیا گیا اسی دن جنت میں داخل کیا گیا اور اسی دن اُس سے نکالا گیا اور اسی دن قیامت آئے گی اور اسی دن ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے کہ اُس وقت کوئی بندہ اگر کوئی چیز مانگ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے ضرور وہی چیز عطا فرماتا ہے۔

اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے ایک یومِ اجتماع قرار دیا کہ جس میں وہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور اس دن آغاز و انجام جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جمعہ کا دن اسی امت کے لیے یوم اجتماع قرار دیا۔ کیونکہ یہ دن مبدا اور معاد کا دن ہے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں "سورہ سجدہ" اور "ھل اتی علی الانسان" پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں سورتیں اس دن کے جب آدم علیہ

السلام پیدا کیے گئے تھے تمام کان ومایکون پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں مبداء ومعاد، دخول جنت ونار کا ذکر ہے تو گویا اس دن امت مسلمہ اس کان ومایکون کا ذکر کرتی ہے۔ تو اس طرح انسان دنیا کے سب سے بڑے موافق اور دنیا کے سب سے بڑے موقف کی یاد تازہ کرتا ہے اور یہ عرفہ کا دن ہے کہ ایک عظیم اجتماع پروردگار کریم کے سامنے اس دن اس طرح کھڑا ہوگا جب تک کہ اہل جنت اپنے منازل میں نہ پہنچ جائیں اور اہل جہنم اپنے منازل میں!

ایک بات تو یہ ہے کہ جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کو مسلمان باقی ایام کی نسبت کثرت سے عبادت کرتے ہیں حتیٰ کہ اکثر فاسق لوگ بھی جمعہ کے دن اور جمعرات کا احترام کرتے ہیں اور وہ بھی سمجھتے ہیں کہ جو اس روز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عقوبت کا جلد ہی سزاوار ہو جاتا ہے۔ اُسے مہلت بھی نہیں ملتی اور یہ عقیدہ اُن کے ہاں راسخ ہے اور تجربات سے انہوں نے سمجھا ہے اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ یہ دن، اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعظمت اور محترم ہے۔ اور اللہ نے باقی ایام میں سے اِسے اختیار فرمایا ہے۔ یقیناً اس کا تطابق غیر جمعہ پر باعث شرف ہے۔

ایک سبب یہ بھی ہے کہ جمعہ کا دن جنت کے یوم زیارت سے مشابہت رکھتا ہے اور یہ وہ دن ہے کہ اہل جنت ایک وادیٔ وسیع میں اکٹھے ہوں گے اور ———— موتیوں، سونے، زبرجد، یاقوت اور مشک کے ٹیلوں پر سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت کریں گے اور وہ ان کو اپنی تجلی سے نوازے گا۔ یہ لوگ اس دن خدا کو آنکھوں سے دیکھیں گے اور اعمال حسنہ کا اجر فوراً پالیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسجد کی طرف جانے میں سب سے زیادہ تیز رو ہوں گے اور جو امام کے زیادہ قریب ہوگا وہ اللہ سے زیادہ قریب ہوگا۔ اس لیے اہل جنت یوم زیارت کے مشتاق ہوں گے اور وہ یہی دن ہوگا جب وہ کرامت و بزرگی حاصل کریں گے اور یہ جمعہ کا دن ہوگا اور اگر اس دن (جمعہ) کا توافق یوم عرفہ سے ہو جائے تو پھر اسے جو فضل، مزیت اور اختصاص حاصل ہوگا وہ سب سے بالا ہوگا۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عرفہ کی رات کو وقوف کرنے والوں کے قریب ہو جاتا ہے پھر اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر فرماتا ہے اور کہتا ہے:

"میرے یہ بندے، کیا چاہتے ہیں؟ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو بخش دیا۔"

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے قرب کے باعث انہیں وہ ساعت بھی نصیب ہو جاتی ہے کہ جس میں سائل کا کوئی معقول سوال رد نہیں ہوتا۔ پس وہ دعا کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں اور اللہ ان کے قریب ہو جاتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا قرب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو قبولیتِ دعا کا قرب اور دوسرا اہلِ عرفات اور ملائکہ کے سامنے خدا کے اظہار فخر کا قرب۔ پس اہلِ ایمان ان امور سعادت کو محسوس کرتے ہیں اور اپنے رب کے فضل و کرم سے ان کی قوتِ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ از حد فرحت و انبساط محسوس کرتے ہیں اور امیدوارِ رحمت ہو کر خوشی مناتے ہیں۔ ان اسباب کے باعث جمعہ کا وقوفِ عرفات باقی ایام پر فضیلت رکھتا ہے۔

لیکن یہ جو زبان زدِ عام ہے کہ یہ (جمعہ کا وقوفِ عرفات) بہتر حجوں کے برابر ہے، بالکل غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

خدا کے نزدیک ہر طیّب چیز پسندیدہ اور مرغوب ہے

مقصد گفتگو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہر جنس میں سب سے پاکیزہ چیز کا انتخاب فرمایا ہے اور اپنے لیے اُسے مخصوص فرمایا اور اختیار کر لیا، چونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، لہٰذا پاکیزہ چیز ہی کو پسند فرماتا ہے، اس طرح پاکیزہ قسم کا قول و فعل اور صدقہ قبول کرتا ہے تو یوں سمجھیے کہ "ہر طیّب" اللہ تعالیٰ ہی کا انتخاب کردہ ہے۔ باقی رہا پیدا فرمانا، تو یہ صفت دونوں کے لیے عام ہے۔ اور یہیں سے بندے کی سعادت اور شقاوت کا فرق معلوم ہو جاتا ہے، کیونکہ طیّب کی مناسبت طیّب ہی سے ہو سکتی ہے، پس طیب، طیب کے سوا کسی اور چیز کو پسند نہیں کر سکتا، نہ اُس کے علاوہ کسی اور چیز کو وہ گوارا کر سکتا ہے نہ اُس کی طرف مائل ہو سکتا ہے، نہ کسی اور چیز سے اُسے سکون مل سکتا ہے، نہ اُس کا میلانِ قلب کسی اور طرف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جو کلام بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہوتا ہے اس کا بھی طیب اور پاکیزہ ہونا ضروری ہے، وہ فحش مقال اور تفحش لسان، نیز جھوٹ، غیبت، چغل خوری، بہتان طرازی، غلط گوئی بلکہ ہر بے ہودہ کلام سے سخت متنفر ہوتا ہے۔ اور یہی حال اعمال کا ہے۔ وہ اچھے اعمال سے مانوس ہوتا ہے اور یہ اعمال صالحہ صرف وہ ہیں کہ جس پر متشرع اور سلیم طباع مطمئن ہیں اور جن کے تقدس کی (گواہی) صحیح اذہان نے دی ہے۔ تو اس طرح ان اعمال کے درست ہونے پر شریعت عقل اور فطرت سب کا اتفاق ہو چکا ہے۔ مثلاً ایک ہی اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کا شریک کسی کو نہ مانا جائے۔ اپنی خواہشات کو اُسی کے تابع کرایا جائے اور پوری جدوجہد کے ساتھ اس کی محبت حاصل کی جائے اس کی مخلوقات سے بقدرِ استطاعت احسان کیا جائے اور دوسروں سے وہی سلوک کرے، جس سلوک کا اپنے لیے ان سے متوقع ہو، ان سے وہی معاملت روا رکھے جو ان سے اپنے لیے چاہتا ہو۔ دعوت بھی اس انداز سے دے اور تبلیغ بھی ایسے ہی اسلوب سے کرے جو اپنے لیے محبوب رکھتا ہو۔ دوسروں کے بارے میں بھی ایسا ہی فیصلہ کرے جیسا اپنے لیے چاہتا ہو۔ دوسروں کی پہنچائی ہوئی اذیتیں گوارا کرے، لیکن خود کسی کو ایذا نہ پہنچائے۔ ان کی عزت کی حفاظت کرے ——— اور ان سے بدلہ لینے کی فکر نہ کرے۔ اگر ان کی نیکی معلوم ہو تو تحسین کرے، لیکن برائی پر پردہ ڈالے اور ان کی معذرتیں قبول

کرے جب تک کہ شرع شریف اور اللہ تعالیٰ کے امر ونہی کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔

اسی طرح اخلاق بھی انتہائی پاکیزہ اور اعلیٰ ہونا چاہیے۔ مثلاً بردباری، وقار، سکونِ خاطر، جذبۂ رحمت، صبر، وفاشعاری، اعتدال، نرم مزاجی، صداقت، فراخ دلی۔ نیز بغض وحسد، فریب و دروغ سے اجتناب، نیز انکسار اہلِ ایمان کے ساتھ تواضع، ان کی عزت (کا جذبہ)، اللہ کے دشمنوں کے مقابلہ میں سخت غیر اللہ کے سامنے عجز و فروتنی کے اظہار سے احتراز، پاکدامنی، شجاعت، سخاوت، مروت اور شرعِ عبث وفطرت اور عقل سے پوری پوری ہم آہنگی۔

اسی طرح پاکیزہ خورد و نوش کا اہتمام والنصرام جو حلال اور خوش گوار ہو اور جسم و روح کا بہتر تغذیہ کرے (اور جس سے) جذبۂ بندگی بھی سلامت رہے۔

اسی طرح نکاح میں بھی پاکیزگی ملحوظ رہے، ماحول بھی بہتر اور طیب مہیا رہے۔ احباب اور ہمنشینوں کا انتخاب اسی اصول پر ہو۔

اسی طرح، جسم، اخلاق وعمل اور بات چیت لباس اور خورد و نوش، گھربار، اٹھنا بیٹھنا سب طیب اور پاکیزہ ہونا چاہیے، ایسے ہی لوگوں کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب موت کے وقت ملائکہ آتے ہیں تو کہتے ہیں۔

سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔

یعنی: "تم پر سلامتی ہو، جو اعمال صالحہ تم کرتے رہے ان کی برکت سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

اور (قیامت کے دن)، جنت کے فرشتے کہیں گے:

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ

یعنی: "تم پر سلامتی ہو، خوش رہو، بس اب تم جنت میں ہمیشگی کی زندگی بسر کرو۔"

آیت مذکورہ کی فا (فادخلوھا) سبب کا معنی رکھتی ہے۔ یعنی تم پاکیزہ خاطر ہونے کی وجہ سے داخل ہو جاؤ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ

یعنی: خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے، پلید مرد پلید عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے، خبیثوں کی باتیں بھی خبیث اور پاکیزہ لوگوں کی باتیں بھی پاک ہوتی ہیں اور یہ بھی تفسیر بیان کی جاتی ہے کہ پاک بیبیاں پاک مردوں کی خاطر اور ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے

ہوتی ہیں۔ اس آیت کا مطلب عمومی حیثیت رکھتا ہے، یعنی پاکیزہ لوگوں کا کلام اور اعمال اور بیبیاں سب پاکیزہ اور خبیث لوگوں کا کلام اعمال اور عورتیں سب خبیث ہوتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام پاک سیرت لوگوں کو جنت میں جمع فرما دیا اور تمام بدکردار لوگوں کو دوزخ میں اکٹھا کر دیا۔

تو اللہ تعالیٰ نے تین "دار" قرار دیے۔ پاک لوگوں کی خاطر علیحدہ کر جو ناپاک لوگوں پر حرام ہے اور اس میں ہر طیب چیز فراہم کر دی اس کا نام جنت ہے۔ اور خبیث لوگوں کے لیے علیحدہ گھر بنایا۔ اس میں صرف ناپاک لوگ ہی داخل ہوں گے اور یہ دوزخ ہے۔ تیسرا گھر دنیا ہے جس میں پاک و ناپاک مخلوط ہے۔ اسی امتزاج و اختلاط کے باعث یہاں مصائب و آلام آتے ہیں اور یہ سب حکمتِ خداوندی کا نتیجہ ہے تو جب قیامت برپا ہوگی اللہ تعالیٰ پاک اور ناپاک کو علیحدہ علیحدہ کر دے گا۔ چنانچہ پاک لوگوں اور ان کے اہل و عیال کو علیحدہ گھر عطا ہوگا۔ جہاں دوسرا نہیں جائے گا اور ناپاک لوگوں کو علیحدہ جگہ ملے گی جہاں ان کے سوا دوسرا نہ ہوگا اب اُس وقت دو ہی گھر باقی رہ جائیں گے ایک جنت جو پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ اور دوسرے دوزخ جو خبیث لوگوں کے رہنے کی جگہ ہے اور اللہ دونوں جماعتوں سے اعمال کے مطابق ثواب و عقاب کا معاملہ کرے گا تو ان کے اپنے ہی افعال و اقوال اور اخلاق کو انعامات و لذات میں بدل دے گا اور فرحت و سرور کے مکمل اسباب مرحمت کرے گا۔ (نیز) ناپاک لوگوں کے اپنے افعال و اقوال اور اخلاق، آلام و مصائب میں بدل دیں گے۔ اس طرح حق تعالیٰ اُن کی سزا و عذاب کے کامل اسباب پیدا کر دے گا (اس کی) حکمت عظیم ہے اور اس کی عظمت بلند و بالا ہے، تاکہ اُس کے بندے اس کی کمالِ ربوبیت و حکمت اور کمال علم و عدل و رحمت کا نظارہ کر سکیں اور حق تعالیٰ شانہ کے دشمن کو بھی یقین ہو جائے کہ وہ خود ہی بہتان طراز اور جھوٹے تھے، نہ کہ انبیائے صادقین علیہم السلام اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لَا یَبْعَثُ اللّٰہُ مَنْ یَّمُوْتُ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ لِیُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّھُمْ کَانُوْا کٰذِبِیْنَ۔

یعنی: اور انہوں نے اللہ کے ساتھ سخت قسم کھائی کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو مر جاتے ہیں پھر سے نہیں اُٹھائے گا۔ یوں انہوں نے اپنے آپ پر وعید کی ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ وہ چیز بیان کرے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور جان لے کہ جو لوگ کافر ہوئے وہ بے شک جھوٹے تھے۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سعادت و شقاوت کو نشانِ فرق قرار دیا، لہٰذا پاک طینت اور سعید روح پاکیزگی ہی کے مناسب ہے اور پاکیزہ ہی اعمال کرتی ہے اور ان کے اقوال و افعال بھی پاکیزہ

ہوتے ہیں۔ ناپاک طینت اور شقی روحیں خباثت ہی کا ارتکاب کرتی ہیں، انہیں خباثت ہی سے انس ہوتا ہے اوران سے خبیث قسم کے اعمال ہی سرزد ہوتے ہیں۔ اس طرح ناپاک خصلت کی زبان و جوارح خباثت ہی کے مظہر ہوتے ہیں اور نیک سرشت انسان کی زبان و جوارح منبع حسنات ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایک انسان میں دونوں قسم کی عادتیں ہوتی ہیں۔ پھر جب اور جس کا غلبہ ہوا اُسی قبیل سے بن گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس سے بھلائی کا ارادہ کرے تو موت سے پہلے ہی اُسے گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ قیامت کے دن اُسے پاک ہی اُٹھاتا ہے اور اُسے پاک کرنے کی خاطر دوزخ میں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی (دنیا میں) کبھی تو صحیح توبہ اور نیکیوں کی توفیق دے کر بندے کے گناہوں کو مٹایا جاتا ہے اور کبھی مصائب میں مبتلا کر کے اس کی (بداعمالیوں) کا کفارہ کر دیا جاتا ہے۔ آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس طرح پیش ہوتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے تطہیر مذکورہ (کی توفیق) روک لی جاتی ہے۔ پس وہ قیامت کے دن نیکیوں اور بدیوں کو لیے ہوئے پیش ہوتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ کوئی آدمی اُس کے جوارِ رحمت میں (گناہوں کی) نجاست لے کر نہ آئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اس بُرے آدمی کو دوزخ میں ڈالتا ہے۔ تاکہ اُسے طہارت، صفائی اور تنزیہ حاصل ہو جائے اور جب اس کا ایمان کھوٹ سے صاف ہو جائے گا تو پھر بے شک اُس کے جوارِ رحمت اور اس کے بندوں کے مقامِ طیبہ میں ٹھہرنے کے قابل ہو جائے گا۔

اور اس قسم کے لوگوں کا وقوفِ جہنم ان کی نافرمانیوں کی کثرت و قلت پر منحصر ہوگا۔ اس طرح کہ جس کے گناہ جلدی دھل جائیں گے وہ جلدی دوزخ سے نکل آئے گا اور دیر سے پاک ہونے والا دیر سے نکل سکے گا بے شک انہیں پوری جزا ملے گی اور تیرا پروردگار اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا (جزاء وفاقا وما ربك بظلام للعبید) اور جب حالت یہ ہو کہ مشرک جیسے نجس عین کو آگ پاک نہ کر سکی بلکہ اس کو نکال (کر دیکھا گیا) تو ناپاک کا ناپاک رہا۔ جیسے ایک کتا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ سمندر میں بھی نہا کر باہر آئے (تو بھی وہ ناپاک ہی رہتا ہے) پس یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک پر جنت حرام کر دی ہے اور جب پاکیزہ صفت مومن نجاستوں سے منزہ ہوگا تو آگ اُس پر حرام ہو گی، کیونکہ اس میں کوئی خرابی نہیں کہ جسے زائل کرنے کے لیے آگ کی ضرورت ہو۔ پس اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ اس کی حکمتیں عقل و دانش سے بالاتر ہیں۔ بندوں کی فطرتِ سلیمہ اور عقل نے بھی گواہی دے دی کہ وہی احکم الحاکمین ہے، سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

بعثت رسل کی ضرورت

اس بحث سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اور ان پر نازل شدہ وحی کی تصدیق کا کس قدر محتاج ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاعات اور اطاعت کا ضروری طور پر کس درجہ پابند ہے، کیونکہ دنیا و آخرت میں سعادت و کامرانی صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دستِ حق پرست میں پنہاں ہے اور اُن کے بغیر پاک و ناپاک کی مفصل معلومات محال ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا بھی انہیں حضرات کے مبارک ہاتھوں سے ملتی ہے۔

اسی طرح اعمال صالحہ اقوال حسنہ اور اخلاق عالیہ انہیں کا تحفۂ باسعادت اور وحی ہے۔ ان کی حیثیت ایک کسوٹی کی ہے کہ ان کے اقوال و افعال اور اخلاق پر تمام اقوال، افعال اور اخلاق پرکھے جاتے ہیں اور ان ہی کے اتباع سے ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگوں میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ تو ان حضرات کی احتیاج حقیقت میں جسم کے لیے روح آنکھ کے لیے نور اور روح کے لیے جان سے بھی شدید تر ہے۔ احتیاج چاہے کتنی لازمی بلکہ فرض بھی ہو۔ لیکن تمام انسانوں کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی احتیاج و ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ ذرا اندازہ تو کرو کہ اگر تمہیں شریعت اور وحی کا پیغام صرف ایک لمحہ بھر کے لیے نہ پہنچے تو تمہارا قلب (روح دینی) فوراً بگڑ جائے گا اور تم ایسے ہو گے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر دگرم توے پر ڈال دیا جائے تو ایک مومن بندے کی حالت دینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی کے انقطاع پر ایسی بلکہ اس سے بھی زیادہ پریشان کن بن جاتی ہے اور صرف قلبِ بیدار کو ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور مردہ دل کے لیے تو احساس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب دونوں جہان کے اندر بندے کی سعادت صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام ہی سے وابستہ ہے تو ہر وہ آدمی جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اور نجات و سعادت کا متمنی ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ آپ کے تحفہ مبارکہ (وحی) سیرت اور شانِ رسالت کا گہرا مطالعہ کرے۔ یہی چیز اُسے جہالت سے نکال کر آپ کے اتباع، شیعہ اور جماعت میں داخل کر دے گی اور کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو بالکل ہی محروم ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو تھوڑی پر اکتفا کر رہے ہیں اور بعض

خوب خوب سعادت سے بہرہ ور ہیں۔اور فضل و کرم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحبِ فضل عظیم ہے۔

دشواری راہ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ و شریعت مطہرہ کو خوب سمجھنا چاہتا ہو اُس کے لیے تو یہ مباحث بہت کم ہیں۔علمی کم مائیگی اور پریشان حالی کے باوجود چند الفاظ لکھے ہیں، جن سے نہ تو ابواب علم کھل سکتے ہیں اور نہ طالبان (علم وفن) کا اس طرف میلان ہو سکتا ہے۔کیونکہ (یہ سب کام) حضر کی بجائے سفر میں کرنا پڑا ہے، قلب سوگوار، حالات پریشان، علمی مواد اور کتابیں مفقود۔غرض کوئی ایسا معقول ذریعہ نہیں جس سے معلومات میں اضافہ ہو سکتا۔اس طرح وہ علوم جو مفید اور سعادت مندی کی ضمانت بھی ہوں، عنقا اور ناپید ہو چکے ہیں۔اہلِ (علم) پر وحشت چھا چکی ہے اور جہلاء کے غلبہ کے باعث علما کی زبانیں گنگ ہو چکی ہیں۔بددیانت اور بدعتی عناصر کی کثرت کے باعث علم کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا ہے۔اس لیے صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اور بس اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حامی و ناصر نہیں۔ وھو حسبنا ونعم الوکیل۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب

خاندان، والدین اور دیگر مباحث

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان کرۂ ارض پر سب سے بہتر خاندان تھا۔ ان کے خاندانی شرف کی گواہی دشمن تک دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ابوسفیان نے شاہِ روم کے دربار میں اس حقیقت کی گواہی دی کہ ان کی قوم تمام اقوام سے محترم، ان کا قبیلہ تمام قبائل سے زیادہ باوقار اور ان کے آباؤ اجداد تمام لوگوں سے زیادہ ذی شرف ہیں۔

(آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب) اس طرح چلتا ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف، بن قصی بن کلاب، بن مرۃ بن کعب، بن لوئی بن غالب، بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکۃ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد، بن عدنان اور یہ حضرت اسماعیل الذبیح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ صحابۂ کرام تابعین اور جمہور علمائے کرام کی یہی تحقیق ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ یہ غلط ہے اور اس کے بیس سے زیادہ دلائل بھی ہیں۔ اور میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، فرمایا کرتے تھے "یہ قول (ثانی) اہل کتاب کی اسرائیلیات کا ایک حصہ ہے جو ان کی کتاب کے ہی خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ باوجود نہ چاہنے کے اپنے بیٹے کو اور ایک روایت کے مطابق اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کریں۔ اب اہل کتاب اور مسلمان دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کی نرینہ اولاد میں سے تھے۔ جن لوگوں نے قول ثانی کی تائید کی ہے۔ انہیں تورات کی اس عبارت سے مغالطہ ہوا کہ "اسے اسحٰق اپنے بیٹے کو ذبح کر۔" حالانکہ تورات کی یہ تحریر یہودیوں کی تحریف کا نتیجہ ہے اور یہ تورات کی دوسری آیت کے خلاف بھی ہے۔

"کہ اپنے ابنہ اور اکلوتے بیٹے کو ذبح کر۔"

یہودی بنی اسماعیل سے ان کے خاندانی شرف کی بنا پر حسد کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ شرف

(نبوت) حربوں کی بجائے اپنی طرف لے جائیں، حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ شرف صرف اہل ہی کو عطا فرمانا چاہا، دوسرے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسحٰق علیہ السلام ذبیح ہوں جبکہ اللہ تعالیٰ اسحٰق علیہ السلام کی والدہ کو یعقوب بیٹے کی خوشخبری دے رہے ہیں جیساکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری دینے کے لیے فرشتے حاضر ہوئے اور خدائے قدوس کا فرمان سنایا:

لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحٰقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبَ.

یعنی: ڈرو نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور ان کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں تو وہ ہنس دیں، سو ہم نے انہیں اسحٰق کی خوشخبری دی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی۔

پس یہ ناممکن ہے کہ پہلے بیٹے کی خوشخبری دے اور پھر ذبح کر دینے کا حکم دے دے اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری ضرور دی گئی اور یہ خوشخبری اسحاق علیہ السلام پر صادق آتی ہے یہ تو الفاظ کا ظاہری مطلب تھا اور اگر کوئی اعتراض کرے کہ اگر بات اسی طرح ہوتی جیسا تم نے کہا ہے تو یعقوبؑ کو اسحٰقؑ پر معطوف سمجھ کر مجرور ہونا چاہیے تھا اور پھر عبارت یوں ہوتی وَمِن وَرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبٍ۔ یعنی یعقوب اسحٰق کے بعد ہوں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حالت رفعی یعقوب کو بشارت بننے سے نہیں روک سکتی، کیونکہ بشارت ایک کلام خاص ہے اور وہ خبر مقدم کے طور پر مذکور ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ کلام وَمِن وَرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبَ: جملہ نحوی قواعد کے مطابق ہے۔ تو یہ شہادت بلکہ جملہ خبریہ ہونے کی وجہ سے ایک حقیقی بشارت کا درجہ رکھتی ہے اور اگر یہ مذکورہ کلام طریقہ ادائیگی کے مطابق منصوب ہوتا تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ وَقُلْنَا لَهَا مِن وَرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبَ یعنی ہم نے اُس عورت کو اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی اور جب کہنے والا یہ کہتا ہے کہ:

بشرت فلانا بقدوم اخیه وثقله فی اثرہ۔

یعنی میں نے فلاں کو اس کے بھائی اور ساتھ ہی اُس کا سامان آنے کی خوشخبری دی۔

تو دونوں باتوں کی بشارت پائی جاتی ہے اور ذی شعور آدمی کے لیے (یہ قاعدہ نحو) قطعاً مخفی نہیں۔ اور حالت جر میں ایک اور بھی سقم ہے۔ جیسے تم کہو، مررت بزید ومن بعدہ عمرو: یعنی میں پہلے زید کے پاس سے ———— اور پھر عمر کے پاس سے گزرا۔ اس میں عاطف خود حرف جر کا قائم مقام ہے تو اس کے اور مجرور کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جیسا کہ جار و مجرور ہوا کرتا ہے۔ سورہ الصافات میں ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ذبیح بیٹے کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ -

یعنی: پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا اُسے ماتھے کے بل اور ہم نے اس کو پکارا یوں کہ اے ابراہیم! تونے سچ کر دکھایا خواب، ہم یوں دیتے ہیں بدلا نیکی کرنے والوں کو بیشک یہی ہے بلاء مبین، اور اس کے بدلے ہم نے ایک بڑا جانور ذبح کر دیا اور باقی رکھا ہم نے اسے بعد کی مخلوق میں سلام ہو ابراہیم پر، ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔ وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے ہے۔

پھر فرمایا: وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ

یعنی: اور ہم نے اس کو اسحٰق نبی کی بشارت دی جو صالحین میں سے ہوں گے۔

تو اس طرح اللہ تعالیٰ کے اوامر پر صبر کرنے کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اُسے خوشخبری دی اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ جس چیز کی خوشخبری دی جائے وہ پہلے موجود نہیں ہُوا کرتی بلکہ بعد میں ہوتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں بتایا گیا اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بشارتِ ثانیہ سے مراد نبوت ہے، یعنی والد نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر صبر کا مظاہرہ کیا اور بیٹے نے بھی حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس اطاعت پر انعامِ نبوت عطا فرمایا؛ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ بشارت کا اطلاق مجموعہ ذات نبی وجود نبی اور نبوت پر ہے اور اسی وجہ سے لفظ نَبِيًّا منصوب ہے، یعنی نبی بھی ہو گا۔ اس طرح بشارت کا اطلاق ذات نبوت سے جو اصل ہے، علیحدہ کر کے صفت نبوت پر نہیں ہو سکتا، کیونکہ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ کا حصہ جملے کا زاید حصہ ہے اور بشارت کا اطلاق صرف اتنے ہی حصہ پر کرنا قواعد نحوی کے اعتبار سے یکسر غلط ہے۔ جب اطلاق بشارت نبوت پر ہو گا۔ تو ذاتِ نبوت پر بدرجہ اولیٰ ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذبیح علیہ السلام مکہ میں تھے۔ اسی واسطے یوم النحر کو قربانیاں بھی وہیں کی جاتی ہیں جیسا کہ صفا مروہ کے درمیان سعی اور رمی جمار وغیرہ تاکہ اسماعیل اور ام اسماعیل کی شان کا مظاہرہ ہو اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

ذبیح حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ

اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مکہ میں اسحاق اور ام اسحاق نہیں بلکہ اسماعیل اور ام اسماعیل رہتی تھیں۔ اس لیے ذبح کی جگہ اور اوقات بھی بیت اللہ شریف کے قرب و جوار میں تھے کہ جو حضرت

ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام نسل کی تعمیر فرما گئے تھے اور مکہ میں ذبح کرنا تکمیل حج کے لیے شرط ہے جیسا کہ ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ میں رواج تھا اور اگر یہ شام میں رہتے ہوئے (اور یہ واقعہ ذبح وہیں پیش آتا، جیسے کہ اہل کتاب کا خیال ہے تو قربانیاں وغیرہ مکہ کی بجائے شام میں ہوا کرتیں، نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت ذبیح علیہ السلام کو صابر بتایا ہے اور فی الواقعہ اُن سے زیادہ کوئی بھی صابر نہیں ہو سکتا کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی خاطر اپنے آپ کو ذبح تک کے لیے پیش کر دیا۔ حالانکہ جب اسحاق علیہ السلام کا تذکرہ آیا تو انہیں جاننے والا بتایا جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ اور آخر فرمایا کہ قَالُوا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ

یعنی کیا تمہیں ابراہیم کے معزز مہمان کی بات پہنچی جب وہ اُس کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کیا۔ اُس نے سلام کا جواب دیا (دیا (اور) کہا یہ اجنبی قوم ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ واقعہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ

یعنی: انہوں نے کہا ڈرو نہیں اور اس کو ایک علیم (با خبر لڑکے کی خوشخبری دو)

اور یہ خوشخبری اسحاق علیہ السلام کے متعلق ہے، کیونکہ یہ صاحبزادے ان کی بیوی کے بطن سے تھے اور اسماعیل علیہ السلام تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تولد ہوئے اور دوسرے ان دونوں (ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی جو اُمّ اسحاق ہیں) بڑھاپے اور عالم یاس میں بشارت دی گئی تھی۔ بخلاف اسماعیل علیہ السلام کے کہ ان کا تولد اس سے قبل ہو چکا تھا۔ نیز حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے انسان کو سب سے زیادہ اولاد (نرینہ) کی محبت عطا فرمائی ہے اور ابراہیم نے جب اپنے پروردگار سے بیٹے کا سوال کیا اور اللہ جل شانہٗ نے دعا کو شرف قبولیت بخشا اور بیٹا عطا فرمایا تو ان کے قلب میں انتہائی شدت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک مخصوص تعلق پیدا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا خلیل ہی بنا لیا۔ اور مقام خلیل یہ ہے کہ قلب میں محبوب کے متعلق ایک ایسی منفرد محبت پیدا ہو جائے کہ جس کے بعد (حب قلبی) میں کسی دوسرے کا خیال (شرک) تک نہ رہے، تو جب بچے کی محبت خلیل علیہ السلام کے قلب میں آنے لگی تو غیرت خُلّت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے اپنے خلیل علیہ السلام کو بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب وہ اس اقدام پر بھی آمادہ ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت بیٹے سے کہیں زیادہ تھی تو خلیل علیہ السلام کی خلت (محبت خداوندی) شرک کے تمام شائبوں سے بھی نکھر کر سامنے آگئی۔ تو اب ذبح

کی بھی ضرورت نہ تھی، بلکہ (یہ مقصد) تو فقط عزم اور آمادگی سے ہی حاصل ہو گیا۔ اس لیے حکم خداوندی بھی منسوخ ہو گیا اور ذبیح علیہ السلام کا فدیہ (جنت کا ایک مینڈھا) دے دیا گیا۔ خلیل علیہ السلام نے بھی اطاعت کر دکھائی۔ اور پروردگار کا مقصود (امتحان) بھی پورا ہو گیا۔

اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ امتحان وابتلاء تو پہلے بچے پر ہی تھا اور پہلے کی بجائے (اس شدت کا ابتلاء) دوسرے بچے پر ناممکن تھا، بلکہ جو تقاضائے ذبح یعنی خلوص خُلتِ خداوند قدوس تھی وہ دوسرے بچہ کے ذریعہ ہرگز اصولاً نہیں ہو سکتی تھی نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کے متعلق ایک طبعی سی غیرت تھی کیونکہ یہ باندی تھیں۔ تو جب .... ان کے ہاں لڑکا تولد ہوا اور ابراہیم علیہ السلام کی فرطِ محبت دیکھی تو حضرت سارہ کو سخت طیش آیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو اس سے دور لے جاؤ اور مکہ کی زمین میں بسا دو۔ تاکہ حضرت سارہ کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و نظر التفات کی ایک قسم تھی تو اب خود ہی غور کیجئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد پھر (حضرت سارہ) کے بیٹے (اسحاق) کو ذبح کرنے اور ہاجرہ (ایک باندی) کے بیٹے کو چھوڑ دینے کا حکم دے بلکہ اُس کی حکمت دیکھیے کہ اس باندی کے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تو اب حضرت سارہ کا دل بھی (حضرت اسماعیل) کی حالت پر تڑپ اُٹھا اور ان کا غصہ بھی رحمت میں بدل گیا۔ آخر ان کے سامنے بھی اس بچے اور اس کی ماں کی برکات کھل کر آ گئیں۔ اور دکھایا کہ اللہ اس جیسی ماں اور حلیم بچے کو ضائع نہیں کرتا اور اپنے بندوں پر آشکارا کر دیا کہ دُکھ کے بعد سکھ اور یاس کے بعد کامرانی آیا کرتی ہے۔

چنانچہ اس بچے اور اُس کی ماں حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے تنہائی مسافرت اور غریب الدیار ہونے کے باوجود جس صبر و سکون کے ساتھ اپنے آپ کو ذبح کے لیے پیش کر دیا (اس عدیم النظیر قربانی پر) ان کے قدموں کی علامات کو بھی بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ ہدایت اور مسلمانوں کے لیے قیامت تک ان کے نشانِ پا کو جائے عبادت اور مناسک حج مقرر کر دیا۔ فروتنی، انکساری اور ضعف کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس پر احسان کرنا چاہتا ہے وہاں اپنی اس سنتِ عجیبہ کو تازہ کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔

یعنی: اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم ان پر احسان کریں جو زمین میں کمزور ہیں اور اُن کو امام

بنا دیں۔ اور ان کو وارث بنا دیں اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔
اور اللہ پاک بہت بڑے فضل والا ہے۔

سیرت و اخلاق اور وحی

اب ہم پھر اپنے مطلب کی طرف آتے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اخلاق اور وحی (تحفہ مبارکہ) بیان کرتے ہیں۔
اس میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مکہ میں ہوئی اور ان کا سن پیدائش عام الفیل ہے اور یہ واقعہ (اصحاب فیل کا) بہت اوائل کا ہے۔ یہ اہل کتاب عیسائی تھے اور ان کا دین اہلِ مکہ سے بہتر بھی تھا کیونکہ اس زمانے میں اہلِ مکہ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ پھر بھی اللہ نے انہیں اہلِ کتاب پر فوقیت عطا فرمائی اس میں کسی بشر کا کوئی دخل نہیں بلکہ یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا ایک پیش خیمہ اور معجزہ تھا۔

والدین کا انتقال اور واقعات مابعد

آپ کے والد ماجد کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی شکمِ مادر میں تھے کہ ان کی وفات ہو گئی اور بعض آپ کے تولدِ مسعود کے بعد بتاتے ہیں لیکن پہلا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے قول کے مطابق آپ کے والد ماجد آپ کی پیدائش کے سات ماہ بعد فوت ہو گئے اور آپ کی والدہ ماجدہ کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ مدینہ سے واپسی پر مقامِ ابواء میں فوت ہوئیں۔ اُس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ابھی سات برس کی نہ تھی پھر آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ جب ان کی وفات ہوئی تو اُس وقت آپ کی عمر بعض روایتوں کے مطابق آٹھ برس بعض کے مطابق چھ یا دس برس تک بتائی گئی۔ پھر آپ اپنے چچا ابو طالب کی کفالت میں چلے گئے اور اس چچا نے عرصہ تک آپ کی خدمت کی۔ جب آپ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو آپ چچا کے ہمراہ شام کی طرف تشریف لے گئے۔ بعض روایتوں میں نو برس کی عمر میں سفر بتایا گیا ہے اس سفر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک عیسائی راہب بحیرا سے ہوئی اس نے آپ کے چچا کو مشورہ دیا کہ آپ انہیں شام نہ لے جائیں کیونکہ یہود سے (قتل) کا خطرہ تھا۔ تو آپ کے چچا نے اپنے غلام کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس مدینہ بھیج دیا۔ ترمذی میں روایت آتی ہے کہ آں حضرت صلعم کے ساتھ بلال رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا، لیکن یہ روایت بالکل غلط ہے کیونکہ بلال رضی اللہ عنہ تو اُس وقت وہاں تھے ہی نہیں یا اگر تھے بھی تو بہر حال نہ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے پاس تھے نہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بزاز نے بھی اس حدیث کا اپنی مسند میں ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ آپ کے ساتھ ابو طالب

نے بلال کو بھیجا بلکہ "ایک آدمی" لکھا ہے۔

سفر شام اور خدیجہ بنت خویلد سے شادی اور سلسلۂ وحی

جب آں حضرت صلی اللہ کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو آپ تجارت کی غرض سے شام تشریف لے گئے۔ بصرہ تک آپ نے سفر فرمایا، پھر واپس ہوئے اور واپسی کے بعد خدیجہ بنت خویلد سے نکاح فرمایا۔ بعض روایتوں میں آپ کی اس وقت کی عمر تیس برس اور بعض میں اکیس برس بیان کی گئی ہے۔ ام المومنینؓ کی عمر چالیس برس کی تھی اور آپ کی پہلی بیوی تھیں جن سے نکاح فرمایا۔ اور اُن کی وفات تک آپ نے کوئی اور نکاح نہیں فرمایا اور جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے فرمایا کہ آپ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنے پروردگار کی طرف سے سلام کہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب میں تنہائی اور اپنی عبادت کا جذبہ القاء فرمایا، چنانچہ غارِ حرا میں مسلسل راتوں کو عبادت کرتے تھے۔ آپ کے دل میں اپنی قوم کے دین اور بتوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو ان (قبیح افعال) سے دبعثت سے قبل ہی) سخت تنفر ہو چکا تھا۔ تو جب آپ کی عمر مبارک چالیس برس کی ہو گئی تو آپ پر انوار نبوت ضو فشاں ہوئے اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا اور مخلوق کی طرف مبعوث کیا اور اپنے فضل و کرم سے نوازا۔ اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان امینِ وحی قرار دیا۔

آپ کی بعثت بالاتفاق دو شنبہ کو ہوئی، لیکن مہینے میں اختلاف ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ آٹھ ربیع الاوّل کی تاریخ تھی اور عام الفیل کے اکتالیسواں سال آپ کو مبعوث فرمایا گیا۔ بعض حضرات نے رمضان شریف کا مہینہ بتایا ہے اور ان کی دلیل قرآن مجید کے الفاظ میں یہ ہے:-

شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ۔

یعنی: رمضان کا مہینہ کہ جس میں قرآنِ پاک نازل کیا گیا۔

اور ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ یہی مہینہ تھا کہ جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا فرمائی گئی اور قرآن مجید نازل کیا گیا۔ علمائے کرام کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے جن میں یحییٰ الصرصری بھی ہیں جو اپنے قصیدہ نونیہ میں فرماتے ہیں:-

واتت علیہ اربعون فاشرقت
شمس النبوۃ منہ فی رمضان،

یعنی: اور جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو آپ کو رمضان

کے مہینہ میں نورِ نبوت سے سرفراز کیا گیا"۔

اور پہلے قول کے ماننے والے فرماتے ہیں کہ قرآن مجید تو رمضان شریف میں قدر کی رات کو بیت العزۃ (پہلے آسمان) پر ایک ہی دفعہ سارا نازل فرما دیا گیا۔ پھر تئیس برسوں میں حسبِ واقعات نازل ہوتا رہا۔ اور ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید کو رمضان شریف کی عظمت و شوکت جتانے کے لیے اس ماہ میں نازل کیا گیا۔ چنانچہ اس ماہ کے روزے فرض ہوئے۔ بعض نے وحی کی ابتداء رجب کے مہینہ میں بھی روایت کی ہے۔

درجاتِ وحی

نیز حق تعالیٰ شانہٗ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے تمام مکمل درجات عطا فرمائے۔ ایک طریقۂ وحی رویائے صادقہ تھا۔ یہ طریقہ زیادہ تر آغاز میں تھا۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ صبح صادق کی طرح بالکل سچا نکلتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ آپ کے دل میں القاء کر دیتا۔ اور فرشتۂ وحی آپ کو نظر نہ آتا تھا۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے میرے دل میں القاء کیا کہ کوئی جاندار تب تک قطعاً نہ مرے گا جب تک اُس کا رزق مکمل نہیں ہو جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اچھے انداز سے طلبِ رزق کرو۔ اور رزق پہنچنے میں دیر ہو جانے پر اللہ کی نافرمانی کر کے اُسے تلاش نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو نعمت ہے وہ صرف اس کی اطاعت پر ہی عطا ہوتی ہے۔ تیسرا یہ طریقہ تھا کہ فرشتہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک آدمی کی صورت میں حاضر ہوتا اور آپ سے مخاطب ہوتا تا آنکہ آپ وحی کو یاد کر لیتے۔ اس صورت میں کبھی کبھی صحابہ کرام بھی اس فرشتے کی زیارت کر لیتے۔ چوتھی صورت یہ تھی کہ وہ گھنٹی کی آواز کی صورت میں حاضر ہوتا۔ وحی کا یہ طریقہ آپ پر بہت سخت ہوتا اور فرشتہ بھی خلط ملط ہو جاتا۔ حتیٰ کہ آپ کی جبین مبارک سخت سردی کے دن بھی پسینہ سے تر بتر ہو جاتی۔ اور اگر آپ سواری پر ہوتے، تو سواری بوجھ کے باعث زمین کے ساتھ لگ جاتی۔ اور ایک مرتبہ وحی آئی اور آپ کی ران مبارک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر تھی تو انہیں اس قدر بوجھ محسوس ہوا کہ جیسے ان کی ران ٹوٹنے لگی ہے۔ وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ آپ فرشتے کو اُسی صورت میں دیکھتے کہ جس میں اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس طرح جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا وحی کی جاتی۔ اور یہ طریقہ دو مرتبہ پیش آیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم میں ذکر فرمایا۔ چھٹی صورت وہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خود وحی فرمائی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات کو آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ جب نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔ ساتویں صورت یہ تھی کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے بغیر فرشتے کے واسطہ سے کلام فرمایا۔ ایسے

آپ سے بھی بلا واسطہ کلام فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو نص قرآن سے اس قسم کا کلام ثابت ہے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث الاسراء (معراج کی رات) سے ثابت ہے۔ بعضوں نے آٹھویں صورت وحی بھی بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی حجاب کے (دیکھ کر) کلام فرمانا، اور یہ ان حضرات کا مسلک ہے کہ جن کے خیال میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی حجاب کے اللہ تبارک و تعالیٰ کی زیارت کی۔ اور یہ مسئلہ سلف اور خلف ہر جگہ مختلف فیہ ہے۔ اگرچہ جمہور صحابہ کرام مع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے قائل ہیں۔ جیسا کہ عثمان بن سعید الدارمی نے صحابہ کرام کا اس مسئلہ میں اجماع بتلایا ہے۔

آں حضرتؐ کا مختون ہونا: اس مسئلہ میں تین مختلف اقوال ہیں:۔
ایک یہ کہ آں حضرت مختون تولد ہوئے تھے، لیکن اس باب میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے، وہ صحیح نہیں۔ ابوالفرج جوزی نے اُسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی۔

اور یہ بات آپ کے خواص میں سے بھی نہیں سمجھی جا سکتی۔ کیوں کہ کئی انسان مادر زاد مختون ہوتے ہیں۔

میمونی کا قول ہے :۔

"میں نے ابو عبداللہ سے کہا کہ ایک مسئلہ بتائیے، ایک ختنہ کرنے والے نے ختنہ کیا۔ لیکن کاٹا نہیں تو اب ؟

انہوں نے کہا کہ اس نے نصف حشفے تک (کاٹ لیا) ہے۔ پھر تو دوبارہ ختنہ نہ کرے کیونکہ اب حشفہ موٹا ہو جائے گا اور جب یہ مطلب حاصل ہو جائے تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اگر نصف حشفہ سے کم رہا تو پھر اعادہ ختنہ ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ اعادہ کرنے سے سخت تکلیف ہوگی تو وہ کہنے لگے، میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں۔

پھر میں نے کہا یہاں ایک آدمی ہے۔ اُس کے ہاں مختون لڑکا پیدا ہوا ہے، اس بات پر وہ بے حد ملول ہوا، تو میں نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے تجھے تکلیف سے بچا لیا تو کس بات کا غم کرتا ہے؟

اور مجھے ابو عبداللہ، محمد بن عثمان خلیلی بیت المقدس کے محدث نے واقعہ بتایا کہ ان کے ہاں بھی ایسا ہی ایک مختون لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اس کے گھر والوں نے ختنہ نہیں کیا۔

اور لوگوں میں مشہور ہے کہ جو اس طرح ختنہ شدہ پیدا ہوا اُسے چاند ختنہ کر دیتا ہے لیکن یہ سب

خرافات ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی بکریاں چراتے ہوئے جب فرشتوں نے شق صدر کیا تو اُس وقت ختنہ کیا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ آپؐ کو آپ کے دادا عبدالمطلب نے ساتویں روز ختنہ کے لیے بٹھایا اور ایک دعوتِ عام کی۔ نیز آپؐ کا نام محمدؐ رکھا۔ یہ روایت ابوعمرو بن عبدالبر کی ہے۔ مسند کی یہ روایت غریب ہے۔

ہمیں روایت پہنچی، احمد بن محمد بن احمد سے انہیں محمد بن عیسیٰ سے انہیں یحیی بن ایوب علاف سے انہیں محمد بن ابی السری عسقلانی سے انہیں ولید بن مسلم سے انہیں شعیب، پھر عطا خراسانی پھر عکرمہ سے انہیں ابن عباس سے کہ عبدالمطلب نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتویں روز ختنہ کیا اور ایک دعوت کی اور محمدؐ نام رکھا۔

یحییٰ بن ایوب کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو تلاش کیا لیکن کسی محدث کے پاس نہیں ملی صرف ابن ابی سری کے ہاں سے یہ روایت ملی۔ اور یہ مسئلہ علمائے خاص کے درمیان باعث اختلاف ہے۔ ایک صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے اور لکھا ہے کہ آپؐ ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے روایات بھی تحریر کی ہیں۔ لیکن ان کا کوئی ثبوت قطعاً نہیں۔ یہ صاحب کمال الدین بن طلحہ ہیں۔ چنانچہ کمال الدین بن عدیم نے ان پر تنقید کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عربوں کے معمول کے مطابق ختنہ کیا گیا اور عربوں کے ہاں ختنہ کرنا ایک عمومی رواج کے علاوہ نشانِ شرف بھی سمجھا جاتا تھا۔

آں حضرتؐ کی رضاعی مائیں

ان میں سے ایک ابولہب کی باندی ثوبیہ تھیں جس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چند دن دودھ پلایا حضرت ثوبیہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ رضاعت میں ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاشد مخزومی کو بھی اپنے بیٹے مسروح کے علاوہ دودھ پلایا اوران کے علاوہ اس نے آپؐ کے چچا حمزہؓ بن عبدالمطلب کو بھی دودھ پلایا (محدثین) نے ثوبیہ کے اسلام لانے میں اختلاف کیا ہے۔

اس کے بعد حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے عبداللہ کے ساتھ ساتھ آپ کو دودھ پلایا۔ ان کی اولاد میں انیسہ اور جذامہ جو شیما کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ دو بچے اور بھی تھے۔ حضرت حلیمہ حارث بن عبدالعزی بن رفاعۃ سعدی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والدین کے اسلام میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ آں حضرتؐ کے علاوہ حضرت حلیمہ نے آپ کے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اور یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عداوت رکھتا تھا لیکن فتح مکہ کے موقع پر یہ مسلمان ہوگئے اور دل وجان سے اسلام کو قبول کرلیا۔

نیز حضرت حمزہ بنی سعد بن بکر کے ہاں شیرخوار مہمان تھے تو ان کی ماں نے آپؐ کو بھی دودھ پلادیا۔ اور حضرت حمزہ اُس وقت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے۔ لہٰذا حمزہؓ آپؐ کے دو طرح سے رضاعی بھائی بھی ہوئے، ایک ثوبیہؓ اور دوسرے حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے۔

کس کس کی آغوش میں آپؐ رہے: پہلے آپ اپنی والدہ حضرت آمنہ بنت وہب بن عبدالمناف بن زہرہ بن کلاب کی گود میں پرورش پاتے رہے۔ نیز حضرت ثوبیہؓ اور حلیمہؓ اوران کی بیٹی شیما جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں اور یہی وہ خاتون ہیں جو بنی ہوازن کے وفد میں تشریف لائی تھیں تو آپ نے ان کے حق کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھاکر اس پر بٹھایا تھا۔

ان کے علاوہ حضرت ام ایمن کے گود میں بھی آپ کھیلتے رہے اور یہ آں حضرتؐ کو والدین کی طرف سے ملی تھیں۔ یہ باندی تھیں۔ ان کے خاوند زید بن حارثہ تھے اور اسامہ بن زید انھی کے

لڑکے تھے اور یہی وہ خاتون ہیں کہ آپؐ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ان کے پاس تشریف لائے، تو یہ رو رہی تھیں، انہوں نے فرمایا:

کہ اے ام ایمن کیوں روتی ہو؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے رسولؐ کے لیے یہاں سے کہیں بہتر نعمتیں ہیں۔

فرمانے لگیں میں جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے رسولؐ کے لیے یہاں کی نسبت بہت عمدہ انعامات ہیں، لیکن میں تو اس وجہ سے روتی ہوں کہ آسمان سے جو خبر آیا کرتی تھی وہ اب منقطع ہو چکی ہے۔

اس پران دونوں حضرات کا بھی جی بھر آیا اور یہ بھی رونے لگے۔

بعثت اور ابتدائے وحی

اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس برس کی عمر میں مبعوث فرمایا اور یہ کمالِ عقل کا وقت ہوتا ہے۔

روایت ہے کہ انبیاء علیہم اسی عمر میں مبعوث ہوا کرتے ہیں اور وہ جو مسیح علیہ السلام کے متعلق روایت ہے کہ جب انہیں آسمان پر اٹھایا گیا تو ان کی عمر تینتیس ۳۳ برس کی تھی، تو اس کے متعلق کوئی متصل سند کی حدیث نہیں ملتی کہ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

وحی کی ابتدا رویائے صادقہ سے ہوئی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی خواب دیکھتے تو صبح صادق کی طرح سچا نکلتا۔ کہتے ہیں کہ یہ حالت چھ ماہ تک رہی اور نبوت کی کل مدت تئیس ۲۳ برس تھی اور رویائے صادقہ بھی نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے شرف سے مشرف فرمایا۔ آپؐ غارِ حرا میں تشریف رکھتے تھے کہ فرشتہ حاضر خدمت ہوا۔ اس زمانہ میں آپ یہاں خلوت گزیں رہنے لگے تھے۔ سب سے پہلی آیت جو آپؐ پر نازل ہوئی وہ یہ تھی:۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور جمہور علمائے کرام سے یہی مسلک منقول ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سب سے پہلے یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ نازل ہوئی، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول کئی لحاظ سے زیادہ درست ہے۔ من جملہ ان وجوہ کے۔

ایک تو یہ کہ آیت مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ صراحتاً بتا رہی ہے کہ آں حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل بالکل امی تھے۔

دوسرے ترتیب بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ پہلے پڑھنے اور بعد میں انذار (ڈرانے) کا فریضہ ادا کیا جائے، کیونکہ جب آپؐ نے دل میں یوں پڑھا۔

اَنْذِرْ مَا قَرَأَہٗ

یعنی جو پڑھا ہے وہ لوگوں کو بتا کر ڈرائیے۔

تو ظاہر بات ہے کہ پڑھنا پہلے اور ڈرانا بعد میں ہو سکتا ہے۔

تیسرے اس آیت کے متعلق حضرت جابرؓ کا جو قول ہے وہ ان کا ذاتی ہے، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے براہِ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

چوتھے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی وضاحت ہو رہی ہے کہ یاایھا المدثر کے نزول سے قبل بھی فرشتہ حاضر ہوا تھا کیونکہ حضرت جابر کی روایت کے الفاظ اس طرح مرقوم ہیں:

"پس میں نے سر اٹھایا تو وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا موجود دیکھا۔ آخر میں اپنے گھر لوٹ آیا اور میں نے کہا کہ مجھ پر کمبل ڈال دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔"

تو اللہ تعالیٰ نے سورہ مُدَثِّر نازل فرمائی اور یہ روایات تو واضح ہی ہے کہ جو فرشتہ حرا میں حاضر ہوا۔ اس کے ذریعہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ہی نازل کی گئی تو حضرت جابر کی روایت سے بھی یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّر کا نزول بعد میں بھی ثابت ہوتا ہے۔ حجت اور دلیل صحیح حدیث ہو گی نہ کہ کسی کی ذاتی رائے۔

مراتبِ دعوت اور اس کا طریق کار

پہلی حیثیت: نبوت

دوسری حیثیت: اپنے اقرباء کو تبلیغ

تیسری حیثیت: اپنی قوم کو دعوت۔

چوتھی حیثیت اُس قوم کو دعوت کہ جس کے پاس پہلے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور یہ لوگ اکثر عرب ہی تھے۔

پانچویں حیثیت قیامت تک تمام جن وانس کے لیے اس دعوت کا توسع، جس جس تک یہ دعوت پہنچ سکے۔ اس کے بعد آپ تین برس پوشیدہ طور پر دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ پھر آپ کو علانیہ تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ۔

یعنی جس کا حکم دیا گیا اُسے علانیہ بیان کر اور مشرکوں سے اعراض کر۔

پس آنحضرتؐ نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی، لیکن آپ کی قوم نے معاندانہ رویہ اختیار کر لیا۔آپ پر اور مسلمانوں پر مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ آخر کار دو مرتبہ ہجرت کی بھی اجازت دی گئی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ

آپ کے اسمائے مبارکہ محض ستائش بیان کرنے کے لیے صفاتی "اعلام" نہیں بلکہ اسمائے مشتقہ ہیں جو مکمل طور پر صفاتِ مدح و کمال کے ترجمان ہیں۔

ان میں سے ایک اسم محمدؐ ہے، اور یہ اسم مبارک زیادہ مشہور ہے اور تورات میں صراحت کے ساتھ یہ نام مذکور ہے۔ ہم نے جلاء الافہام میں خیر البشر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کرتے ہوئے مفصل یہ مسئلہ بیان کیا ہے۔اس مضمون سے متعلق یہ ایک منفرد کتاب ہے کہ جس میں اس سلسلہ سے متعلق کثیر معلومات دیے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کے متعلق احادیث بھی بیان کی ہیں۔ نیز ان کے حسنِ صحت اور علل سے بحث کی ہے۔مزید برآں معلول روایات کی علل پر خوب تبصرہ کیا ہے۔ پھر درود کے اسرار و فضائل اور فوائد و حکم بیان کیے ہیں۔ پھر اس کے مواقع اور محل نیز وجوب کی مقدار، علمائے کرام کے اختلافی پہلوؤں، عللِ ترجیح، تحریفِ محرفین اور طریقہ ہائے تبلیغ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

الحاصل اہلِ کتاب کے علماء کا بھی یہی نظریہ ہے کہ تورات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمدؐ ہی مذکور ہے۔

آپ کا ایک نام احمدؐ ہے۔ یہ وہ نام مبارک ہے جو مسیح علیہ السلام نے بتایا تھا اور اس (نام) میں ایک راز ہے جسے ہم نے اُس باب میں ذکر کیا ہے۔

نیز آپ کے اسمائے مبارک متوکل، ماحی، حاشر، عاقب، مقفی، نبی التوبہ، نبی الرحمۃ، نبی الملحمۃ، فاتح اور امین بھی مذکور ہیں۔

ان اسماء کے علاوہ شاہد، مبشر، بشیر، نذیر، قاسم، ضحوک، قتال، عبداللہ، سراج المنیر، سید ولد آدم، صاحب لواء الحمد، صاحب مقام المحمود وغیرہ بھی تحریر ہیں۔

اس کے علاوہ بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی اسمائے حسنہ ہیں۔اور جب بھی کسی مخصوص تعریفی کلمہ سے آپ کو یاد کیا جائے گا۔ وہ دراصل آپ کا اسم مبارک ہی تو ہو گا لیکن آپ کے مخصوص اور مشترک صفاتی ناموں میں امتیاز قائم رکھنا نیز مشتق اور اغلب صفات کے ترجمان ناموں میں فرق ضروری ہے اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے

اسمائے مبارکہ کا خود تذکرہ کیا اور فرمایا۔

"میں محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی (مٹانے والا) ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ کفر مٹا دے گا۔ اور میں حاشر (جمع کرنے والا) ہوں کہ میرے قدموں میں لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔ عاقب (آخری) ہوں کہ جس کے بعد کوئی اور نبی نہ ہوگا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ دو قسم کے ہیں۔ بعض صرف آپؐ کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں کوئی دوسرا پیغمبر شریک نہیں ہے۔ جیسے محمد، احمد، عاقب، حاشر، مقفی، نبی الملحمہ اور بعض ایسے اسمائے مبارکہ ہیں کہ جن میں دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی شریک ہیں، لیکن آپ کا ان اسمائے مبارکہ سے کامل اور خاص قسم کا تعلق ہے، جیسے رسول اللہ، نبی اللہ، عبد اللہ، شاہد، مبشر، نذیر، نبی الرحمۃ، نبی التوبہ۔ اور اگر جمیع اوصافِ حمیدہ کو اسماء قرار دیا جائے تو آپ کے اسمائے مبارکہ دو صد سے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً صادق، مصدوق، رؤف، رحیم، وغیرہم۔

اور اسی سلسلہ میں کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ہزار نام ہیں۔ یہ قول ابو الخطاب بن دحیہ کا ہے۔ اس کا مطلب بھی مع اوصاف کے ہے۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ کی شرح

محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ حمد کا مفعول ہے۔

چونکہ آپؐ ان گنت خصائل حمیدہ سے متصف تھے۔ اس لیے آپ کا نام محمد (بہت تعریف کیا گیا) رکھا گیا۔ اسی لیے یہ نام محمود سے زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ محمود ثلاثی مجرد کا صیغہ ہے اور محمد مفعّل کا صیغہ ہے جس میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی آپؐ کی تعریف تمام انسانوں سے زیادہ کی جاتی ہے اور شاید اسی وجہ سے تورات میں آپ کا یہی اسم مبارک ذکر کیا گیا اور آپ کی امت اور شریعت کی اس قدر تعریف کی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام نے آپ کے امتی ہونے کی خواہش ظاہر کی اور اس مطلب کے متعلق ہم نے وہیں دلائل دیے ہیں۔ اور ابو القاسم سہیل جس نے اس مبحث کو از حد خلط ملط کر دیا ہے۔ ہم نے براہین سے اُسے غلط ثابت کیا ہے۔

اور امر واقعہ یہ ہے کہ تورات میں آپ کا نام احمد مرقوم ہے جو لفظ حمد سے مشتق ہے۔ اور افعل التفضیل کے وزن پر ہے۔ اس کے معنی (وزن) میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت فاعل کا معنی لیتی ہے یعنی آپؐ نے خدا کی دوسروں سے زیادہ حمد کی۔ اس طرح اس کا مطلب ہوگا "اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔" انہوں نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے کیونکہ

افعل التفضیل کا صیغہ مفعول پر واقع فعل سے نہیں بلکہ فاعل کے فعل سے مشتق ہوتا ہے۔ مزید دلیل دیتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ مفعول پر فعل واقع ہونے کے اعتبار سے یہ جملہ نہیں بولا جاتا۔ ما أضرب زيداً۔ زید اضرب من عمرو اور نہ یہ کلام منقول ہے ما اشربه للماء ماآكله للخبز وغیرہ۔ کیونکہ افعل التفضیل اور فعل التعجب دونوں صیغے فعل لازم سے بنتے ہیں۔ اس لیے فعل لازم کا عین کلمہ مفتوح مکسور اور مضموم ہر طرح سے آتا ہے۔

اور یہ جو فعل پر ہمزہ کا اضافہ کرتے ہیں تو اس لیے تاکہ ہمزہ کا اضافہ کر کے اُسے مفعول کی طرف فعل متعدی بنایا جائے۔ اب ہمزہ تعدیہ کا شمار ہوگا جیسے ما اظرف زيداً ما اكرم عمراً ان دونوں کا اصل ظرُف اور کرُم ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ اصل میں متعجب تو فاعل ہے۔ تو اب امر لازم یہی ہے کہ فعل بھی متعدی نہ ہو، باقی رہی یہ مثال ما اضرب زيداً لعمرو ان کا عین کلمہ مفتوح اور مضموم ہی مذکور ہے۔ انہیں البعد میں فعل متعدی بنایا گیا اور اس کی دلیل یہ دی گئی کہ عمرو سے قبل لام کا اضافہ کر کے مذکورہ فعل کو متعدی بنایا گیا۔ اس کی مثال جیسے کہ ما اضرب زيداً لعمرو (اس جملہ میں عمرو سے قبل لام تعدیہ کے لیے ذکر کیا گیا) اور اگر یہ صیغہ ویسے ہی متعدی ہوتا تو (لام ذکر کیے بغیر) یوں جملہ ہوتا ما اضرب زيداً عمراً کیونکہ یہ فعل ایک اسم کی طرف تو ویسے ہے اور دوسرے کی طرف ہمزہ کے اضافہ سے فعل متعدی بن جاتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک اسم کی طرف تو ہمزہ سے اور دوسرے اسم کی طرف لام کے اضافہ سے فعل کو متعدی بنانا پڑا۔ اسی وجہ سے انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ دونوں (افعل التفضیل اور فعل تعجب) مفعول پر واقع فعل سے نہیں بلکہ فاعل کے فعل سے مشتق ہیں۔

دوسرے حضرات نے اس بحث میں ان سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں صیغے مفعول پر واقع اور فاعل کے ہر دو فعل سے مشتق ہو سکتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے:

ما اولعه بكذا۔ یعنی وہ اس بات کا کتنا حریص ہے؟

اب یہ مفعول پر واقع فعل سے مشتق فعل متعدی ہے۔ اسی طرح ما اعجبه بكذا ما احبه الیّ جیسے جملوں میں تعجب اور محبت جیسا فعل متعدی مفعول پر واقع ہو رہا ہے۔ اس کی مزید مثالیں ما ابغضه الیّ وغیرہ ہیں اور امام سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ ایک علمی نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ جب تم ما ابغضه له کہتے ہو تو اگر اس وقت تم خود ہی (فاعل) یعنی بغض رکھنے والے، محبت کرنے والے، عداوت رکھنے والے ہو تو پھر گویا تم فاعل کے

فعل پر تعجب کر رہے ہو اور جب تم ما ابغضنی الیہ۔ ما امقتنی الیہ اور ما احبنی الیہ کہتے ہو اور تمہارے ساتھ بغض، عداوت یا محبت کی جا رہی ہو تو گویا کہ تم مفعول پر واقع فعل پر تعجب کر رہے ہو تو جو فعل لام سے متعدی ہو گا وہ فاعل کے فعل سے اور جو الی سے متعدی ہو گا وہ مفعول پر واقع فعل سے اشتق ہو گا۔

دوسرے نحوی حضرات نے یہ علت بیان نہیں کی حقیقتاً تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ باقی جو علت بتائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ لام معنوی طور پر فاعل کی تملیک بتانے) کے لیے ذکر کیا جاتا ہے جیسے سوال ہو لمن ھذا (یہ کس کا ہے ؟)، تو جواب ہو گا لزید (زید کا ہے) تو زید اور من سے قبل لام کا اضافہ کر دیا گیا اور یا الی کا ذکر ہو گا۔ جیسے کہ الی من یصل ھذا الکتاب ؟ (یہ کتاب کس کو ملے گی ؟) تو یہ مفعول (کی طرف اشارہ) کے لیے استعمال کیا گیا۔ تو اس کا جواب الی عبد اللہ ہو گا (عبد اللہ کو ملے گی) اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ لام ملک، اختصاص اور استحقاق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور مالک و مستحق بننے والے فاعل کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اور الی انتہائے مقصود ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور انتہائے مقصود تقاضائے فعل پر منحصر ہے۔ اس لیے الی مفعول کے لیے زیادہ موزوں ہے لیکن وہی تقاضائے فعل کی انتہا ہوتی ہے اور آں حضرت کے متعلق کعب بن زہیر کا یہ شعر:

فلھو اخوف عندی اذ اکلمہ

وقیل انک محبوس و مقتول ،

یعنی: "جب میں ان سے مخاطب ہوتا ہوں تو وہ سب سے زیادہ پُر رعب نظر آتے ہیں اور مجھ سے کہا جاتا ہے کہ تم یا تو قید ہو جاؤ گے یا قتل کر دیے جاؤ گے۔"

تو یہاں اخوف خیف سے مشتق ہے جس کے معنی پُر رعب ہیں۔ اس کا مطلب خوف ڈرنا نہیں۔

ایسے ہی ما اجن زیداً من جن۔

یعنی جن زید کو کتنا ڈرانے والا ہے ؟!

یہاں بھی مذکورہ ترکیب ہی ہے اور یہ کوفہ والوں کا مذہب ہے۔ البتہ بصرہ والے کہا کرتے ہیں کہ یہ مندرجہ بالا امثلہ شاذ اقوال ہیں۔ اس لیے قواعد پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ایسی امثلہ کے متعلق قواعد کی بجائے سماع پر اکتفاء کرنا مناسب ہے لیکن کوفی اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مذکورہ قسم کی مثالیں چونکہ عربی زبان میں بکثرت مستعمل ہیں اس لیے انہیں شاذ قرار نہیں دیا جا سکتا

کیونکہ شاذ کلام تو عام زبان کے خلاف اور بہت کم مستعمل ہوتی ہے اور یہ کلام قواعد کے مخالف نہیں۔ اور کوئی حضرات مزید کہتے ہیں کہ فعل کو لازم فرض کر کے فعل کی طرف منسوب کرنا محض زیادتی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

باقی رہا وہ جو فعل پر ہمزہ بڑھا کر اُسے متعدی کرنا پڑتا ہے۔ تو امر واقعہ اس طرح نہیں جیسا کہ آپ نے (غلط) تحقیق کی ہے۔ نیز ہمزہ تعدیہ کی علامت بھی نہیں بلکہ وہ تو صرف تعجب اور افعل التفضیل کے معنی دے رہا ہے جیسے کہ فاعل میں الف مفعول میں م اور واو را فتعال وغیرہ میں تا مخصوص علامات ہیں۔ ثلاثی مجرد کے افعال پر یہ اضافات، علامات مخصوصہ ہیں۔ اسی طرح ہمزہ کا اضافہ بھی علامت تعدیہ نہیں بلکہ اضافہ مذکورہ بالا ہے۔

باقی جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جو فعل ہمزہ لگانے سے متعدی ہو سکتا ہے وہ صرف جر لگانے یا مضاعف بنانے سے بھی متعدی ہو سکتا ہے مثلاً جلست بہ - اجلستہ' - قمت بہ - اقمتہ' وغیرہ (میں اس کے پاس بیٹھا۔ میں نے اسے بٹھایا۔ میں اس کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میں نے اُسے کھڑا کیا) چونکہ ان امثلہ میں کوئی دوسرا حرف ہمزہ کے قائم مقام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے واضح ہے کہ یہاں ہمزہ محض علامتِ تعدیہ نہیں۔ دوسرے یہاں تعدیہ کی اصل علامت "با" بھی مذکور ہے۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ ایک فعل میں تعدیہ کی دو علامات جمع نہیں ہو سکتیں۔

یہ مقولہ مشہور ہے۔ مَا أَعْطَاهُ لِلدَّرَاهِمِ۔ مَا أَكْسَاهُ لِلثِّيَابِ یہ دونوں جملے اعطیٰ اور ما اکسا متعدی افعال سے ہیں تو اس اعطیٰ کو عطو قرار دے کر اس پر ہمزۂ تعدیہ کا اضافہ کرنا قطعاً درست نہیں، بلکہ ان کا ہمزہ تو علامتِ تعجب و تفضیل ہے۔ جب اُس کا ہمزہ حذف کر دیا گیا تو اب یہ کہنا غلط ہے کہ وہ تعدیہ کا ہمزہ تھا۔ رہی یہ مثال ما اضربہ' لزیدٍ۔ یہاں زید سے قبل کا لام فعل لازم کے باعث اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے غیر متصرف ہونے کے ضعف کو دور کرنے کے لیے لام کا اضافہ کیا گیا۔

اب ہم پھر اپنے مطلب یعنی اصل موضوع کی طرف عود کرتے ہیں۔

دونوں اقوال میں سے جو بھی مراد لیا جائے اپنے رب کی سب سے زیادہ حمد کرنے والا یا دوسرا قول کہ سب لوگوں سے زیادہ تعریف کا مستحق بہر صورت گویا معنوی طور پر بھی آپ کا نام محمد ہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ محمدؐ کا لفظ حمد کے کثیر خصائل کی حامل ہستی پر بولا جائے گا اور احمد کا مطلب دوسروں سے زیادہ حمد کا سزاوار ہونا ہے۔ پس محمد کثرت و کمیتِ (حمد) اور احمد صفت و کیفیتِ (حمد)

کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

الحاصل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے زیادہ حمد کے سزاوار اور دوسروں سے زیادہ افضلیت کے حامل ہیں۔ آج تک معاشرۂ انسان نے آں حضرتؐ سے زیادہ کسی کی حمد نہیں کی۔ یہ دونوں آپؐ کے نام ہیں۔ مدح اور معنی کے لحاظ سے یہ دونوں نام سب سے زیادہ بلیغ اور کامل ہیں اور اگر اس کا مفہوم "فاعل" کا لیا جائے تو پھر آپؐ کا نام حمّاد ہو گا، کیونکہ آپ نے تمام مخلوق سے زیادہ اپنے پروردگار کی حمد فرمائی۔ اس لیے کثرتِ حمد باری تعالیٰ کی وجہ سے آپؐ کو احمد کہا جائے تو آپ کا نام حمّاد زیادہ موزوں ہے جس طرح آپ کی امت کا بھی یہی نام مذکور ہے۔

دوسرے یہ دونوں نام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اوصافِ حمیدہ کے مظہر ہیں اس وجہ سے آپ محمدؐ اور احمدؐ دونوں اسمائے مبارکہ کے مستحق ہیں۔ زمین و آسمان اور دنیا و آخرت کی تمام مخلوق آپ کے خصائل حمیدہ کے باعث آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ یہ اوصاف و خصائل اتنے ہیں کہ ان کی تعداد حساب و شمار سے باہر ہے۔ کتاب الصلوٰۃ والسلام میں ہم نے اس مبحث پر مکمل طور پر بحث کی ہے اور اس جگہ پریشانیٔ خاطر اور سفر کے باعث ہم نے مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حامی و ناصر ہے اور اسی پر بھروسہ ہے۔

المتوکل: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام متوکل بھی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول مذکور ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

میں نے تورات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پڑھا کہ:

"محمد اللہ کا رسول میرا بندہ، میرا پیامبر ہے۔ میں اس کا نام متوکل رکھا۔ نہ وہ بد اخلاق ہے، نہ درشت مزاج، نہ کوچہ و بازار میں شور کرنے والا ہے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دے گا۔ بلکہ عفو اور درگزر سے کام لے گا اور میں اسے ہرگز موت سے ہم آغوش نہ کروں گا۔ جب تک اس کے ذریعہ ایک ملت بیضانہ پیدا کر دوں۔ جو یہ کہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس نام کے سب لوگوں سے زیادہ اہل ہیں کیونکہ آپ نے اقامتِ دین کی خاطر اللہ تعالیٰ پر اس شدت سے اعتماد کیا کہ اس اعتماد میں قطعاً شرک نہیں کیا۔

رہا ماحی، حاشر، مقفی اور عاقب تو ان اسمائے مبارکہ کی جبیر بن مطعم کی روایت میں وضاحت کی گئی ہے۔

ماحی سے مراد یہ ہے کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کفر مٹایا۔ اور تمام مخلوق سے زیادہ آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کفر و عصیان کو نابود کیا۔ کیونکہ جب آپ کو مبعوث فرمایا تو اس وقت ساری زمین پر چند اہل کتاب کے سوا سب کافر آباد تھے۔ مثلاً بت پرست، مغضوب یہودی، گمراہ نصرانی، دہریے جو نہ پروردگار اور نہ معاد کے قائل ہیں، ستارہ پرست، آگ کے پجاری، فلسفی جو نہ انبیاء کے دین کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کفار کو مٹایا حتیٰ کہ اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب آگیا اور اسلام کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہونی شروع ہوگئی اور آپ کی دعوت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

حاشر، حشر کا مطلب جمع کرنا ہوتا ہے۔ گویا آپ حشر کے قریب ہی مبعوث ہوئے۔

عاقب، جو تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں تشریف لائے۔ چنانچہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، کیونکہ عاقب آخر ہی میں ہوتا ہے جس طرح (مضمون یا خط) کے آخر میں خاتم (مہر) لگائی جاتی ہے اس لیے آپ کو مطلقاً عاقب الانبیاء قرار دیا گیا۔

مقفی بھی اسی طرح ہے جو اپنے بزرگان سلف کے نقش قدم پر چلتا ہو۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کے ذریعہ (دنیا والوں کو) انبیاء سابقین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشتا ہے۔ اور آپؐ ہی ان میں سے آخری اور خاتم النبیین ہیں۔

رہا نبی التوبہ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا پر توبہ کا دروازہ کھولا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس طرح (رحمت سے) توبہ قبول فرمائی کہ آپ سے قبل کسی کو اس قدر شرف حاصل نہ ہوا تھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو سب لوگوں سے زیادہ توبہ و استغفار کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں سو سو بار۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔

یعنی: میرے پروردگار مجھے بخش دے، میری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا بخشنے والا ہے۔

اور فرمایا کرتے تھے "اے لوگو! اپنے پروردگار کے سامنے توبہ کرو کیونکہ میں بھی دن میں سو بار توبہ کرتا ہوں۔ پس آپ کی امت کی توبہ تمام سابقہ امم سے زیادہ کامل، زیادہ سہل اور بسرعت مقبول ہے۔ حالانکہ پہلی امتوں کی قبولیت توبہ سب سے مشکل امر تھا۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کو اس پاداش میں کہ وہ گئو سالہ پرستی کرتے تھے۔ اپنے آپ کو قتل کرنا پڑا۔ لیکن اس امت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا یہ عالم ہے کہ ان کی ندامت کو بھی توبہ قرار دے دیا۔

نبی الملحمۃ : اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت نے پچھلی تمام امتوں سے بڑھ چڑھ کر جہاد کیا ہے۔ چنانچہ اس امت اور کفار کے درمیان جس قدر عظیم معرکے ہوئے اس سے قبل کسی امت کو ایسے ہولناک حالات سے دوچار نہیں ہونا پڑا، کیونکہ یہی ایک ایسی امت ہے جس نے ہر زمانہ میں دنیا کے چپہ چپہ پر دینِ خدا کے دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ کیا ورنہ ماضی کی کسی قوم کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

نبی الرحمۃ : آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا۔ اس لیے آپ نے تمام اہلِ دنیا پر عام اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا کافر سب پر رحم فرمایا، اہلِ اسلام آپ کی رحمت سے خوب بہرہ ور ہوئے۔ لیکن کفار اور ان میں سے اہلِ کتاب خاص طور پر ہمیشہ تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ جود و سخا میں اطمینان سے زندگی گزارتے رہے۔ ہاں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ شروع کر دی۔ انہوں نے خود ہی جہنم کو خوش آمدید کہا اور انہیں زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے جو دراصل ان کو شدید تر عذاب کی طرف لے جا رہی تھی

فاتح : کھولنے والا، اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر دوبارہ ہدایت کا دروازہ کھولا دیا۔ اندھوں کو بصارت، بہروں کو شنوائی عطا فرمائی اور زنگ آلود دل صیقل کر دیے کفار کے علاقے فتح ہوئے جنت کے دروازے کھلے، نئے نئے علوم اور اعمالِ حسنہ کی بنیاد رکھی گئی۔ غرض دل و دماغ، بصارت و شنوائی بلکہ دنیا و آخرت تک فتح ہو گئی۔

امین (امانت دار) حقیقتاً عالم رنگ و بو میں صرف نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس نام کے اہل ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی وحی اور شریعت کے امین ہیں۔ زمینوں اور آسمانوں کی ہر ہر مخلوق کے امین ہیں۔ بلکہ نبوت سے قبل بھی آپ امین کے مبارک نام سے مشہور تھے۔

ضحوک، قتّال۔ یہ دونوں نام آپس میں اس قدر مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا ذکر نہیں کیے جاتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے سامنے (ضحوک) (ہنس مکھ) ہیں۔ نفرت، حقارت، غصہ اور بدمزاجی کا نام تک نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے قتّال (قتل کرنے والے) کی حیثیت بھی رکھتے تھے اور (ظالموں کو سزا دیتے ہیں) کسی کے طعن و تشنیع کی پرواہ نہیں کرتے۔

بشیر (خوشخبری دینے والا) یعنی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا اُسے آپ جنت کی خوشخبری دینے والے ہیں۔

نذیر: (ڈرانے والا) جو آپ کی نافرمانی کرے گا اُسے عذابِ خدا سے ڈرانے والے ہیں۔
نیز قرآن پاک میں بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ سے بھی خطاب فرمایا ہے جیسے:
لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ .

اسی طرح
تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ
یعنی پاک ہے وہ ذات کہ جس نے (عبداللہ) اللہ کے بندے پر قرآن نازل کیا۔
فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى
وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں اولادِ آدم کا سردار ہوں مگر فخر نہیں کرتا۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام سراج منیر (روشن چراغ) رکھا اور سورج کو سراج دھاج (جلانے والا چراغ) قرار دیا۔ منیر جلائے بغیر روشنی دیتا ہے اور دھاج کی روشنی میں حرارت اور جلانا بھی شامل ہوتا ہے۔

آں حضرتؐ کی ہجرت

اولاد، ازواج اور خاندان کا بیان

پہلی اور دوسری ہجرت کا بیان

جب مسلمانوں کی آبادی بڑھ گئی اور کفار کو ان سے خطرہ لاحق ہُوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ترین مصائب اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناچار آپؐ نے صحابہ کرام کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی فرمایا کہ وہاں ایک بادشاہ ہے جو اپنی رعایا پر ظلم نہیں کرتا۔ پس بارہ مردوں اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ جن میں حضرت عثمان بن عفانؓ بھی تھے اور یہ صحابہ پہلے مہاجر تھے جنہوں نے ہجرت کا آغاز کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ یہ حضرات حبشہ میں بڑے سکون سے زندگی گزارتے رہے۔ پھر انہیں اطلاع ملی کہ قریش مسلمان ہو چکے ہیں، گو یہ خبر غلط تھی مگر یقین کر کے مکہ واپس آ گئے۔ یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ قریش تو مسلمانوں کے پہلے سے زیادہ دشمن ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ واپس چلے گئے اور کچھ مکہ ہی میں ٹھہر گئے۔ اب یہ حضرات پہلے سے بھی زیادہ قریش کے نشانۂ ستم بنے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی۔ اس بار تراسی [۸۳] مردوں اور اٹھارہ [۱۸] عورتوں نے ہجرت کی، ان میں عمارؓ بھی تھے (لیکن راوی کو شک ہے)، یہ حضرات شاہ نجاشی کے پاس بڑے اطمینان سے ٹھہرے۔ جب قریش کو اطلاع ملی تو انہوں نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن زبیرؓ مخزومی کے ساتھ ایک جماعت حبشہ بھیجی تاکہ نجاشی کو ورغلا سکیں۔ لیکن ان کی ساری چالاکی کام نہ آئی۔

اس کے بعد قریش کی ایذا رسانیاں بڑھ گئیں، جس کے باعث نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کو شعب ابی طالب میں تین برس اور ایک قول کے مطابق دو برس تک کے لیے محصور رہنا پڑا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے تو آپ کی عمر اُنچاس برس اور ایک روایت کے مطابق اُنچاس

برس کی تھی اس واقعہ کے چند ماہ بعد آپ کے چچا ابو طالب ستاشی برس کی عمر میں فوت ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اسی نظر بندی کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کو کفار سے زیادہ ایذائیں پہنچیں۔ اس کے فوراً ہی بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا انتقال فرما گئیں (ان کی وفات کے بعد) کفار کی ایذا دہی میں اور اضافہ ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی طرف تشریف لے گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ دونوں حضرات تبلیغ دین کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ چند دن وہاں تشریف فرما رہے۔ لیکن وہاں کے لوگ اسلام قبول کرنے کے بجائے آپ کو ایذائیں دینے پر اتر آئے۔ شہر سے نکال دیا، آپ پر پل پڑے اور اس قدر پتھر برسائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس مکہ تشریف لے آئے۔ راستے میں ایک عیسائی حاضر خدمت ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اور آپ کی تصدیق کی۔ نیز واپسی پر جب آپؐ وادی نخلہ میں پہنچے تو جنات کی ایک جماعت آپؐ کو ساتھ لے گئی اور آپ سے قرآن مجید سن کر اسلام لے آئی۔ نیز پہاڑوں پر متعین فرشتہ حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو یہ پہاڑ اہل طائف پر ڈال کر انہیں کچل دوں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نہیں!

"مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ ان کے صلب سے ایسے لوگ ضرور پیدا کرے گا جو اس کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ قطعاً کسی کو شریک نہ کریں گے۔ راستہ میں ہی آپ نے وہ مشہور دعا کی جو حدیث میں مذکور ہے:۔

اللھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی

یعنی: اے میرے اللہ میں اپنی توانائی کی قلت اور اسباب کی کمی کے بارے میں تجھ ہی سے فریاد کرتا ہوں۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مطعم بن عدی کے گھر کے قریب سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ہی آپ کو جسم وروح کے ساتھ مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی گئی۔ پھر آپ ایسے ہی جسم وروح کے ساتھ ہی آسمانوں سے ہوتے ہوئے اللہ جل شانہٗ کے دربارِ اعلیٰ میں حاضر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور نمازیں فرض کی گئیں۔

معراج اور اس کی نوعیت وکیفیت

صحیح روایت کے مطابق آپ کو ایک ہی بار معراج جسمانی ہوئی۔

بعض کا خیال ہے کہ حالتِ خواب میں معراج ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ یوں کہنا چاہیے کہ

آپ کو معراج کرائی گئی، لیکن بیداری اور حالتِ خواب کے تعین میں خاموش رہنا چاہیے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بیت المقدس تک بیداری میں اور آسمانوں پر حالت خواب میں تشریف لے گئے۔

بعض حضرات دوبارہ معراج کے قائل ہیں ایک بار بیداری اور ایک بار حالتِ خواب میں ایک قول تین بار کا بھی ہے۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معراج بعثت کے بعد ہوئی۔ رہی وہ بات جو شریک کی روایت میں مذکور ہے کہ معراج وحی سے قبل ہوئی، یہ غلط ہے۔ اور یہ ان کے ضعفِ حافظہ کا نتیجہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وحی سے قبل حالتِ خواب میں اور وحی کے بعد حالتِ بیداری میں معراج ہوئی، بعض کا خیال ہے یہاں "وحی" وحی مقید ہے، مطلق نہیں کہ جو بعثت کی ابتداء ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معراج کی حقیقت بتانے سے قبل اچانک یہ واقعہ پیش آیا۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدت تک مکہ میں مقیم رہے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتے رہے۔ ہر میلے اور تہوار میں تشریف لے جاکر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے کہ جو بھی تبلیغ دین میں مدد دے گا اس کے لیے پروردگار کے ہاں جنت کی بشارت ہے۔ لیکن کسی قبیلہ نے دعوت پر کان نہ دھرا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے یہ شرف انصار (مدینہ) کی قسمت میں لکھا تھا۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو سربلندی و عزت بخشنے، اپنا وعدہ پورا کرنے اپنے نبی کی مدد کرنے، اپنا کلمہ بلند کرنے اور اعدائے اسلام سے انتقام لینے کا ارادہ فرمایا تو انصار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دیا، کیونکہ یہ شرف الٰہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ چنانچہ چھ اور ایک روایت کے مطابق آٹھ آدمی حج کے موسم میں یہ مقام عقبہ حلق کے ارادے سے بیٹھے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے۔ انہیں اسلام کی دعوت دی اور قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔

ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا اور وہاں سے جب مدینہ آئے تو اپنی قوم کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اسلام کی آواز کچھ اس طرح پھیلی کہ انصار کا کوئی گھر ایسا نہ تھا۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ کا ذکر جمیل نہ ہو رہا ہو۔

مدینہ میں پہلی مسجد جہاں قرآن مجید کی علانیہ تلاوت کی گئی، مسجد بنی زریق تھی۔ اس کے بعد اگلے سال مدینہ سے بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے، جن میں سے پانچ وہ تھے جو اس سے قبل بھی حاضری سے مشرف ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے مقامِ عقبہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، اور مدینہ واپس ہوئے۔ اس سے اگلے سال مدینہ سے تہتر مرد اور دو عورتیں حاضر ہوئیں اور یہ

آخری جماعت تھی جو مدینہ سے حاضر خدمت ہوئی۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی جس بات سے آپ منع فرمائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنی عورتوں، اولاد اور اپنے آپ کو ۔ ۔ ۔ ۔ باز رکھیں گے۔

ہجرت کی اجازت

آخر آپؐ اور آپ کے صحابہؓ بھی ہجرت فرما کر ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بارہ نقیبوں یعنی (مبلغوں) کا انتخاب فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ ایک جماعت خفیہ طور پر روانہ ہوئی۔ بعض کے نزدیک ابوسلمۃ بن عبدالاشد مخزومی اور بعض کے خیال میں مصعب بن عمیر سب سے پہلے اس سفر پر نکلے اور مدینہ میں انصار کے ہاں اقامت پذیر ہوئے۔

انصار نے ان کی خوب خدمت تواضع کی اور مدینہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہجرت کی اجازت دے دی۔ اور آپ ربیع الاول اور ایک روایت کے مطابق صفر کے مہینہ میں منگل کے دن مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ترپن۵۳ سال تھی اور آپ کے ہمراہ ابوبکر صدیق اور ان کے غلام عامر بن فہیرہ تھے۔ عبداللہ بن اریقط لیثی راہ نمائی کر رہے تھے۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار ثور میں تشریف لے گئے اور تین دن وہیں قیام فرمایا۔ پھر ساحل کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوئے آپ ربیع الاوّل کی بارھویں رات کو منگل کے دن مدینہ پہنچے۔

مسجد قبا کی تعمیر

بعض نے لکھا ہے کہ آپ مدینہ سے باہر وادیٔ قباء میں بنی عمرو بن عوف اور ایک روایت کے مطابق کلثوم بن ہزم کے ہاں مہمان ہوئے۔ ایک روایت سعد بن خیثمۃ کی بھی ملتی ہے۔ آنحضرتؐ ان کے ہاں چودہ دن ٹھہرے رہے اور مسجدِ قباء تعمیر فرمائی۔ پھر آپ جمعہ کی صبح کو یہاں سے چلے۔ بنی سالم کے علاقہ میں نماز جمعہ کا وقت ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک سو کے قریب آدمی تھے۔ یہ سب جمع ہو گئے۔ نماز جمعہ کے بعد آپ ناقہ پر سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف چل پڑے۔ لوگ ناقہ کی مہار پکڑتے اور درخواست کرتے کہ آپ ہمارے ہاں تشریف رکھیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ یہ مامور من اللہ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود ہی جہاں اللہ کو منظور ہو گا بیٹھ جائے گی) چنانچہ اونٹنی اس جگہ بیٹھ گئی جہاں آج کل مسجد نبوی ہے اور یہ زمین بنی نجار کے دو لڑکوں سہل اور سہیل کی ملکیت تھی۔

آپ یہاں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف فرما ہوئے۔ پھر آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مل کر اس خالی زمین پر کچی اینٹوں اور کھجور کے تنوں سے مسجد تعمیر فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے مسجد کے ساتھ ہی اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے حجرے تعمیر کیے۔ سب سے پہلا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا۔ پھر سات ماہ بعد حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے مکان سے منتقل ہو گئے۔ جب ان صحابہ کو، جو حبشہ میں مقیم تھے آپ کی ہجرت مدینہ خبر ملی تو ان میں سے تینتیس ۳۳ آدمی واپس آ گئے، جن میں سے سات راستہ میں مکہ کے کفار نے گرفتار کر لیے اور باقی بخیریت مدینہ منورہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گئے۔ اس کے بعد باقی صحابہ فتح خیبر کے سال ۷ھ کو کشتی کے ذریعہ واپس ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ مسعود

سب سے پہلا بچہ القاسم تھا، اسی نام پر آپ نے اپنی کنیت "ابوالقاسم" رکھی۔ لیکن بچپن ہی میں ان کا انتقال ہو گیا، لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ اُن کی اتنی عمر ہوئی کہ انہوں نے سواری بھی فرمائی اور سفر بھی کیا۔

قاسم کے بعد زینب رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ ایک قول کے مطابق حضرت زینب کی عمر قاسم سے زیادہ تھی۔

بعد ازاں حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں۔ ان کی عمروں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا باقی تینوں سے بڑی تھیں اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا چھوٹی تھیں۔ پھر حضرت عبداللہ پیدا ہوئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کی ولادت بعثت سے بعد یا قبل ہوئی؟ صحیح یہ ہے کہ ان کی ولادت بعثت کے بعد ہوئی۔ ان کے لقب میں بھی اختلاف ہے، آیا طیب اور طاہر دونوں لقب ان ہی کے ہیں؟ محتاط روایت کے مطابق یہ دونوں القاب حضرت عبداللہ علیہ السلام ہی کے ہیں، واللہ اعلم۔

یہ تمام اولاد ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھی۔ دوسری ازواج مطہرات سے اولاد نہیں ہوئی۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ۸ھ میں ابراہیم پیدا ہوئے۔ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ نے ولادت کی خوشخبری پہنچائی۔ یہ سن کر آپ نے انہیں ایک غلام عنایت فرمایا۔ لیکن ابھی ان کا دودھ نہیں چھوٹا تھا کہ وفات پا گئے۔ آیا آپ ان کے جنازہ میں شریک ہوئے یا نہیں؟ اس باب میں دو قول مروی ہیں۔ حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی تمام اولاد آپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئی۔ البتہ حضرت فاطمہؓ نے آپ کی وفات کے چھ ماہ بعد رحلت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے صبر و استقلال پر انہیں تمام جہانوں کی عورتوں پر فضیلت بخشی، انہیں خواتین عالم کا سرتاج بنا کر بلند درجات عطا فرمائے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی تمام اولاد میں زیادہ افضل ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تمام جہانوں کی خواتین سے افضل ہیں۔ بعض ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو افضل سمجھتے ہیں، بعض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کے قائل ہیں۔ اور بعض کا خیال یہ ہے کہ اس معاملہ میں سکوت بہتر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ رشتے دار

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام (چچاؤں) میں ایک اسد اللہ، اسد رسول اللہ سید الشہداء حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب ہیں نیز حضرت عباسؓ، علاوہ ازیں ابو طالب جن کا اصل نام عبد المناف تھا اور ابو لہب جس کا نام عبد العزیٰ تھا اور زبیر اور عبد الکعبہ اور مقوم اور ضرار اور قثم اور مغیرہ جس کا لقب حجل تھا اور عیداق جس کا اصل نام مصعب اور ایک قول کے مطابق نوفل ہے۔ بعض نے نوفل کے ساتھ "العوام" کا اضافہ کیا ہے۔

ان میں سے صرف حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما اسلام سے مشرف ہوئے آپ کی پھپھیوں میں ایک صفیہؓ والدہ حضرت زبیر بن عوام تھیں۔ نیز عاتکہ، برۃ، اَروی، امیمہ، ام حکیم بھی تھیں۔ ان میں سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اسلام لائیں۔ حضرت عاتکہ اور حضرت اروی کے اسلام میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے حضرت اُروی کے قبول اسلام کو صحیح مانا ہے۔

حارث آپ کے بڑے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ چھوٹے چچا تھے اور پھر ان کی اولاد کرہ ارضی پر پھیل گئی چنانچہ خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں ان کی مردم شماری ہوئی تو ان کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی[1]۔ اسی طرح ابو طالب حارث، ابو لہب سب کی اولاد میں کافی اضافہ ہوا۔ بعض روایتوں میں حارث اور مقوم ایک آدمی کے دو نام ہیں۔ بعض لوگوں نے عیداق اور حجل کو ایک ہی انسان قرار دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بیوی حضرت خدیجہ بنت خویلد قرشیہ اسدیہ تھیں جن سے

---

[1] تاریخی و تحقیقی اعتبار سے یہ تعداد حد درجہ مبالغہ آمیز ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

بعثت سے قبل ہی آپ کا نکاح ہو گیا تھا۔ اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی، ان کی وفات تک آپؐ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا تمام اولاد حضرت خدیجہ ہی کے بطن سے ہوئی۔ آپ کی ہی وہ اہلیہ تھیں، جنھوں نے آپؐ کے ساتھ مصائب برداشت کیے، تبلیغ کے سلسلہ میں تعاون کیا اور کسی قسم کی جانی و مالی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کو حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سلام بھیجا۔ اور یہ اعزاز ہے جو خدیجہؓ کے سوا کسی کو بارگاہ الٰہی سے عطا نہیں ہوا[1]۔ ہجرت سے تین برس قبل ان کی وفات ہو گئی۔

حضرت سودہ: پھر آپ نے کچھ عرصہ کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہ قرشیہ سے نکاح کیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے بعد میں اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی تھی۔

حضرت عائشہ: ان کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام عبداللہ حضرت عائشہ بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما سے نکاح کیا، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے محبوب بیوی تھیں اور انہیں کے متعلق عرش سے اللہ تعالیٰ نے برأت کی آیات نازل فرمائیں۔ اور نکاح سے قبل ہی ریشم کے ایک ٹکڑے پر ان کی تصویر نازل کی گئی اور بتایا گیا کہ یہ آپ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ شوال میں جب ان سے نکاح ہوا تو اس وقت ان کی عمر چھ برس کی تھی[2]۔ ہجرت کے بعد ان کی رخصتی ہوئی تو اس وقت ان کی عمر نو برس کی تھی[2]۔ ان کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کنواری عورت سے نکاح نہیں کیا نہ ان کے علاوہ کسی کے بستر پر وحی نازل ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ ان ہی سے محبت رکھتے تھے۔ آسمان سے ان کی برأت نازل ہوئی۔ جس نے ان پر تہمت لگائی وہ سب کے نزدیک بالاتفاق کافر ہے[3]۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تمام ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ عالم اور فقیہہ بلکہ امت مسلمہ کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ ماہر فقہ (مسائل دینی) اور عالم تھیں۔ چنانچہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی طرف (حل مشکلات کے لیے) رجوع کیا کرتے اور مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ دیر کے لیے مقاطعہ بھی کیا تھا، لیکن یہ روایت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی۔

حضرت حفصہؓ: پھر آپ نے حفصہؓ بنت عمر بن خطاب سے نکاح کیا۔ ابوداؤد میں مروی

---

[1] اس طرح کی ایک روایت حضرت عائشہ کے بارے میں بھی ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

[2] حضرت عائشہ کی عمر نکاح و رخصتی کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

[3] یہ صحیح نہیں کیونکہ تہمت لگانے والوں میں سے شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت بھی تھے جن پر حد قذف بھی جاری ہوئی مگر انہیں کوئی کافر نہیں مانتا۔ (رئیس احمد جعفری)

ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق دی، لیکن پھر رجوع فرمالیا۔

حضرت زینب بن خزیمہ: ان کے بعد بنی ہلال بن عامر کی ایک خاتون حضرت زینب بنت خزیمہ بن حارث قیسیہ سے نکاح فرمایا۔ آپ کے ہاں منتقل ہونے کے دو ماہ بعد ان کی وفات ہوگئی۔

حضرت ام سلمہ: پھر آپ نے ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ قرشیہ سے نکاح کیا۔ ابی امیہ کا اصل نام حذیفہ بن مغیرہ تھا۔ حضرت ام سلمہ نے سب سے آخر میں وفات پائی۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت صفیہ کی وفات سب سے آخر میں ہوئی۔ ان کے ولی نکاح میں اختلاف ہے۔ طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق ان کے ولی نکاح سلمۃ بن ابی سلمہ تھے اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمۃ بن ابی سلمہ کے نکاح میں ولی بن کر ان کا امامہ بنت حمزہ سے نکاح کیا۔ تو فرمایا: "اے سلمہ یہ اُس بات کا بدلہ ہوگیا۔" آپ نے یہ اس لیے فرمایا تھا کیونکہ ام المومنین حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ان کے سب گھر والوں میں سے صرف سلمۃ بن ابی سلمۃ ہی ولی نکاح ہوئے تھے۔ طبقات ابن سعد نے حضرت سلمۃ رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں یہ واقعات ذکر کیے ہیں۔ واقدی نے ام سلمۃ کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مجمع بن یعقوب سے اور انہیں اپنے والد سے روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمۃ رضی اللہ عنہا سے منگنی کی پھر ان سے نکاح فرمایا۔ اس وقت ان کا لڑکا عمر بن ابی سلمۃ بہت چھوٹا تھا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں لکھا ہے کہ ہمیں عفان سے انہیں حماد بن ابی سلمۃ سے انہیں ثابت سے روایت پہنچی اور انہوں نے فرمایا کہ مجھے ابن عمر بن ابی سلمۃ سے اور انہیں اپنے والد سے روایت پہنچی کہ ان سے ام سلمۃ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب انہوں نے ابو سلمۃ کی عدت پوری کر لی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیغام نکاح بھیجا۔ ام سلمۃ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہا۔ اور عرض کیا کہ میں ایک پریشان حال اور مصیبت زدہ عورت ہوں اور میرا کوئی ولی موجود نہیں، نیز یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے عمر سے کہا کہ اُٹھ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح پڑھ تو اس نے آپ کا نکاح پڑھا، لیکن یہ روایت محل نظر ہے، کیونکہ ابن سعد نے ذکر کیا ہے کہ ان دنوں عمر بن ابی سلمہ کی عمر نو برس تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمۃ رحمہا سے ۴ھ شوال کے مہینہ میں نکاح کیا اور اس وقت ان کی عمر تین برس کی تھی۔ اور اتنی چھوٹی عمر کا بچہ ولی نکاح نہیں ہوا کرتا۔ ابن سعد اور دوسرے مورخین نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ روایت سنائی گئی تو فرمانے لگے کہ کون کہتا ہے کہ وہ (عمر بن ابی سلمہ) اُس وقت چھوٹے تھے؟

ابو الفرج بن جوزی نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاید امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول عمر بن ابی سلمہ کی اصل عمر معلوم ہو جانے سے قبل کا ہے۔ ابن سعد وغیرہ مؤرخین کی ایک جماعت نے بھی ان کی عمر ذکر کی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی نکاح عمر بن خطاب رضؓ تھے۔ باقی رہی یہ بات کہ روایت میں ام سلمہؓ کے قُمْ یَا عُمَرُ (اٹھو اے عمر) کے الفاظ مذکور ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ عمر بن ابی سلمہ کے نسب میں لفظ "کعب" مشترک آجانے سے غلط فہمی ہو گئی ہے، کیونکہ عمر بن خطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن رباح بن عبد اللہ بن قرط بن رواح بن عدی بن کعب اور ام سلمہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم بن یقظہ بن مرۃ بن کعب دونوں روایتوں میں سلسلہ نسب کعب پر ختم ہوتا ہے، تو جب ام سلمہؓ نے کہا قُمْ یَا عُمَرُ (اے عمر اٹھو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح پڑھا دو) تو اس روایت کو دیکھ کر بعض محدثین کو اشتباہ ہوا اور انہوں نے عمر کو عمر بن ابی سلمہ سمجھ لیا۔ اور اس معنوی اشتباہ کی بنا پر محدثین نے اس طرح ذکر کر دیا "تو ام سلمہؓ نے اپنے بیٹے سے کہا" حالانکہ اس فریضہ کی ادائیگی ان کی صغر سنی کے باعث محال تھی۔ اسی طرح یہ بھی فقہاء کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قول کو منسوب کر دیا کہ "اے لڑکے اٹھ اور اپنی والدہ کا نکاح پڑھا۔" ابو فرج بن جوزی نے لکھا ہے کہ حدیث میں ہم نے یہ روایت کہیں نہیں پڑھی اور فرمایا کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ازراہِ مذاق فرمایا ہوگا۔ ورنہ اُس وقت تو عمر بن ابی سلمہ کی عمر صرف تین سال تھی کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۴ھ میں نکاح کیا اور جب آپ کی وفات ہوئی تو اُس وقت عمر بن ابی سلمہؓ کی عمر نو سال تھی، نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیِ نکاح کے بھی محتاج نہ تھے۔ ابن عقیلؒ نے بتایا ہے کہ امام احمدؒ کے ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں ولی کی شرط نہ تھی۔ اور یہ خصوصیاتِ نبویہ میں سے ہے۔

زینب بنتِ جحش

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان اسد بن خزیمہ کی ایک عورت زینب بنت جحش سے نکاح فرمایا۔ یہ آپ کی چچی امیمہ کی لڑکی تھیں اور انہیں کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا۔

یعنی: جب زید کی اس سے مطلب برآری ہو گئی، تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت زینبؓ امہات المومنین کے سامنے فخریہ فرمایا کرتی تھیں، کہ تمہارا نکاح تمہارے گھر والوں نے کیا لیکن میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اُوپر سے فرمایا۔ اور یہ ان کا خصوصی شرف ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کا ولی نکاح تھا، جس نے رفعت فلک پر سے ان کا نکاح کر دیا۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد خلافت کے ابتدائی ایام میں ان کی وفات ہوئی پہلے ان کا حضرت زید بن حارثہ سے نکاح ہُوا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ جب انہوں نے طلاق دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح آپؐ سے فرما دیا۔ تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اپنے متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کر سکنے کی سہولت ہو جائے۔

حضرت جویریہ بنت حارث، نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ بنت حارث بن ابی ضرار مصطلقیہ سے بھی نکاح فرمایا۔ یہ بنی مصطلق کے قیدیوں میں آئی تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کتابت کی رقم ادا کرنے کے لیے مدد کی درخواست کرنے حاضر ہوئی تھیں۔ آپ نے ان کی کتابت کی رقم ادا کر کے انہیں آزاد کرا دیا۔ اور حبالہ عقد میں لے لیا۔

حضرت ام حبیبہ؛ پھر آپ نے ام حبیبہ سے نکاح کیا جن کا اصل نام رملہ بنت ابی سفیان صخر بن حرب قرشیہ امویہ ہے۔ ایک روایت میں ان کا نام ہند بھی مذکور ہے۔ ہجرت کے دوران میں جب یہ حبشہ میں تھیں تب ان کا نکاح آپؐ سے ہُوا تھا۔ شاہ نجاشی نے چار سو دینار ان کا حق مہر خود ادا کیا تھا۔ وہاں سے مدینہ آئیں یہ اپنے بھائی معاویہ کے عہد حکومت میں فوت ہوئیں۔ اہل سیر اور مورخین کے نزدیک یہ روایت متواتر و مشہور ہے۔ ان کے خیال میں ان کے نکاح کی یہی صورت ہے، جس طرح حضرت خدیجہؓ کی مکے میں حضرت حفصہؓ کی مدینہ میں اور حضرت صفیہؓ کی خیبر کے بعد تھی۔ رہی حضرت عکرمہؓ کی روایت کہ ابو سفیانؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ "میں آپ سے تین باتوں کی درخواست کرتا ہوں، جو آپ نے قبول فرمائیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ میرے پاس عرب کی سب سے حسین عورت ام حبیبہؓ ہے۔ میں آپ سے اس کا نکاح کر دیتا ہوں۔" یہ روایت قطعاً غلط ہے۔ ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے اور ابن جوزی کہتے ہیں کہ یقیناً یقیناً اس روایت میں بعض راویوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور عکرمہ بن عمار متہم بالکذب ہے۔ کیونکہ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ام حبیبہؓ عبداللہ بن جحش کی زوجیت میں تھیں۔ ان سے اولاد بھی ہوئی اور انہیں کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی لیکن بعد میں ان کا خاوند عیسائی ہو گیا۔ اور حضرت ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے ذریعہ ان کے لیے

پیغامِ نکاح بھیجا، تو اس نے ان کا نکاح کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انہیں چار سو دینار رقم مہر دی۔ یہ واقعہ ۶ھ کا ہے۔ ایک مرتبہ ابو سفیانؓ ان کے ہاں آئے، تو ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر لپیٹ دیا۔ تاکہ اُس پر ابو سفیانؓ نہ بیٹھ سکیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ابو سفیانؓ اور معاویہؓ ۸ھ کو فتح مکہ کے موقع پر ساتھ ساتھ اسلام لائے۔ نیز روایت کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں کفار سے جنگ کروں جس طرح کہ پہلے مسلمانوں کیخلاف لڑتا رہا ہوں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں!

اور یہ یقینی نہیں کہ آپؐ نے ابو سفیانؓ کو ضرور ہی حکم دیا تھا۔ اس روایت پر کافی جرح بھی کی گئی ہے۔ اور اسناد میں بھی اختلاف ہے۔ نیز بعض سے منقول ہے: "صحیح روایت یہ ہے کہ آپ نے ان سے فتح مکہ کے بعد نکاح کیا۔" لیکن محض مورخین کے کہنے پر یہ روایت غلط قرار نہیں دی جا سکتی۔ اور جو فن تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو وہ سمجھتا ہے کہ (تنقید) کا یہ انداز قطعاً غلط ہے۔ ایک جماعت اس خیال کی ہے کہ ابو سفیانؓ نے آپ سے دوبارہ نکاح کی درخواست کی تھی۔ تاکہ اسے قلبی فرحت حاصل ہو۔ کیونکہ آپؐ نے اس سے اجازت لیے بغیر نکاح کیا تھا۔ لیکن یہ روایت بھی لغو ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قسم کا غلط گمان نہیں کیا جا سکتا اور ابو سفیانؓ جیسے عقل مند سے بھی یہ حرکت بعید از قیاس ہے۔ امام بیہقیؒ اور امام منذریؒ نے فرمایا ہے، ہو سکتا ہے کہ ابو سفیان نے مدینہ کے اس سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی ہو، جبکہ اسے ام حبیبہؓ کے شوہر کی ..... حبشہ میں وفات کی اطلاع ملی ہو۔ تو جب محدثینؒ کو قتل کفار اور اپنے بیٹے کا کاتب وحی بنائے کی روایت ملی تو انہیں خیال ہوا کہ شاید یہ دونوں درخواستیں فتح مکہ کے بعد کی گئیں۔ اس لیے راوی نے تینوں باتوں کو ایک ہی حدیث میں جمع کر دیا۔ اس روایت میں اس قدر شدید اشکالات ہیں کہ جو خارج از بحث ہیں۔ محدثین کے ایک گروہ نے اس حدیث کی ایک اور طریقہ سے بھی وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ (ابو سفیانؓ نے درخواست کی کہ) میں اس سے قبل اگرچہ ام حبیبہؓ سے آپ کے نکاح پر راضی نہ تھا، لیکن اب راضی ہوں۔ بلکہ درخواست کرتا ہوں کہ ان سے نکاح فرمالیں۔ اِس قسم کی وضاحت کتابوں اور متعلق تاریخ میں نہیں ملتی اور اکابر سے مروی ہے اس قسم کی روایات کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ سینوں کے خزینے نہیں بلکہ غلط مرویات ہیں۔

ایک روایت یہ بھی مذکور ہے کہ جب ابو سفیان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ ایلاء میں افواہ سنی کہ آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے تو مدینہ حاضر ہوا۔ اور یہ سمجھتے ہوئے

درخواست کی کہ آپ نے باقیوں کے ساتھ ساتھ انہیں بھی طلاق دے دی۔ حالانکہ یہ بھی مذکورہ زنا ت کی طرح غلط ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حدیث تو ٹھیک ہے لیکن کسی راوی سے ام حبیبہؓ کے نام لینے میں التباس ہو گیا ہے۔ بلکہ ابو سفیانؓ نے ان کی بہن رملہ سے نکاح کی درخواست کی اور یہ تو کسی سے بھی مخفی نہیں کہ دو بہنوں کو بیک وقت زوجیت میں رکھنا حرام ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ ان کی بیٹی کی ۔۔۔۔ نظروں سے اوجھل ہو۔ حالانکہ وہ ابو سفیان سے بھی زیادہ عالم تھیں اور یہ روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کیا آپ میری بہن دختر ابوسفیان کی بیٹی کو چاہتے ہیں؟ اور آپ نے جواب دیا، تمہاری مراد کیا ہے؟ تو عرض کیا، کیا آپ اُس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، کیا تم بھی چاہتی ہو؟ انہوں نے عرض کیا میں آپ سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی۔ البتہ میں چاہتی ہوں کہ اس نیکی میں میری ہمشیرہ بھی شریک ہو جائے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ وہ میرے لیے حلال نہیں ؟

اصل واقعہ یہ تھا اور یہی ابو سفیان کی درخواست ہو سکتی تھی، مگر راوی نے غلط فہمی سے امّ حبیبہؓ کا نام روایت کر دیا۔ ایک روایت میں ان کی کنیت بھی ام حبیبہ آتی ہے۔ اگر یہ الفاظ حدیث میں نہ بھی ہوں تو بھی یہ جواب زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

"نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیانؓ کی ہر درخواست قبول کی" یہ مذکورہ الفاظ بھی راوی سے سہواً روایت ہوئے۔ کیونکہ آپ نے بعض درخواستیں ہی قبول فرمائیں۔ راوی کے یہ الفاظ کہ آپؐ نے اُسے جو مانگا دیا" ان کا یہ مطلب ہے کہ جو مناسب تھا دیا۔ یا راوی نے مخاطب کے ذہن کے مطابق ہی بات کہہ دی، کہ جو درخواست تھی قبول فرمالی۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں

حضرت صفیہ: نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برادران موسیٰ اولادِ ہارون بن عمران اور بنی نضیر (یہود) کے سردار حی بن اخطب کی لڑکی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ یہ خاتون (از راہ قرابت) نبی کی بیٹی تھیں اور نبی ہی کی زوجہ بنیں۔ اور یہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ حسین تھیں، یہ باندی بنالی گئیں آپؐ نے انہیں آزاد کرایا۔ اور یہ عتق (رقم آزادی) ہی مہر قرار پائی۔

اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل امت کے لیے سنت قرار دیا گیا کہ ایک آدمی اپنی لونڈی کو آزاد کرے۔ اور بعد میں نکاح کرنا چاہے تو آزاد کرنے (عتق) ہی کو مہر سمجھ لے۔ اس کا نکاح جائز ہوگا۔ امام رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہی ہے کہ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی لونڈی کو آزاد کیا اور اس کا عتق ہی مہر قرار دیا۔ یا یوں کہے کہ میں نے اپنی لونڈی کے عتق کو مہرِ نکاح سمجھا۔ تو عتق اور نکاح دونوں

درست ہو گئے اور اب یہ لونڈی تجدید نکاح اور ولی کے بغیر ہی اس کی زوجہ بن جائے گی۔ اکثر محدثین کا یہی مسلک ہے، لیکن بعض علمائے کرام کہتے ہیں کہ یہ طریقہ (نکاح) آپ ہی کے ساتھ مختص تھا۔ اور یہ آپ کے خصوصیات میں سے ہے جو امت کے لیے نہیں۔ تینوں آئمہ کا یہی مسلک ہے، لیکن پہلا قول زیادہ درست ہے کیونکہ مسئلہ کی اصل نوعیت عدم اختصاص کی ہے جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہو۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کردہ ام المومنین رض سے نکاح کا حکم دیا، تو فرمایا:

خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

یعنی، "صرف تمہارے لیے دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں۔"

اور یہ نہیں فرمایا کہ عتق (آزاد کرنے) کی وجہ سے! اور نہ آپ نے اس میں امت کی سہولت کا ذکر فرمایا، بلکہ امت کی سہولت کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے متبنیٰ کی مطلقہ زوجہ سے نکاح کی اجازت دی تاکہ امت پر اپنے متبنیٰ کی منکوحہ سے نکاح کی آسانی ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب آپ نے کوئی نکاح کیا تو اس میں امت کو بھی سہولت ہوئی۔ ہاں اگر اللہ اور اس کے رسول کا کوئی واضح حکم نصِ قطعی سے آپ کی تخصیص کر دے تو پھر اس کی عمومیت ختم ہو جائے گی۔ اس کی مزید تفصیلات اس کو حجت قرار دینا اور اس سے قیاساً مسائل کا انبساط کسی دوسرے مقام پر واضح کیے جائیں گے۔

حضرت میمونہ: آپ نے میمونہ رض بنت حارث ہلالی سے نکاح کیا اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بیوی تھیں۔ سب سے آخر میں آپ نے مکہ میں عمرہ ادا کرنے اور احرام اتار دینے کے بعد ان سے نکاح کیا۔ ابنِ عباس رض کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے احرام اتارنے سے قبل ہی نکاح کیا، لیکن یہ قول (اگر صحیح ہے) تو راوی رض کی غلط فہمی ہوئی ہے، کیونکہ حضرت ابو رافع رض جو اس نکاح کا اصل سبب تھے وہ اس واقعہ سے زیادہ آگاہ ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ آپ نے احرام اتارنے کے بعد نکاح کیا اور حضرت ابو رافع رض نے فرمایا کہ میں ان دونوں میں پیغام رساں تھا۔ نیز حضرت ابن عباس رض کی عمر اس وقت صرف دس سال یا اس سے کچھ زیادہ تھی اور وہ موقع پر موجود بھی نہ تھے بلکہ غیر حاضر تھے۔ اور ابو رافع رض بالغ تھے اور انہی کے ہاتھوں یہ کام مکمل ہوا۔ اور وہ دوسروں کی نسبت اس واقعہ سے زیادہ باخبر تھے اور یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ حضرت ابو رافع کے قول ہی کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

حضرت میمونہ رض نے حضرت معاویہ رض کے عہدِ حکومت میں وفات پائی اور مقام سرف میں دفن ہو گئیں۔

حضرت ریحانہ: ایک روایت کے مطابق حضرت ریحانہؓ بنت زید نضریہ بھی ازواج مطہرات میں سے تھیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ موخر الذکر قرظی خاتون تھیں جو بنی قریظہ کے فیصلہ کے دن گرفتار ہوئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں آئیں۔ آپ نے آزاد کرکے ان سے نکاح کر لیا، لیکن پھر ایک طلاق دے دی اور طلاق دینے کے بعد رجوع فرما لیا۔ محدثین کا ایک گروہ ان کو آپؐ کی باندی بتاتا ہے کہ یہ حضورؐ کی آزاد اور موطؤہ تھیں"۔ چنانچہ اس وجہ سے ان کو ازواج مطہرات سے نہیں بلکہ جاریہ سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ وہ خواتین ہیں جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا۔ لیکن کچھ ایسی خواتین بھی کتب میں مذکور ہیں کہ جن کو آپؐ نے پیغام نکاح بھیجا یا انہوں نے خود کو زوجیت کے لیے پیش کیا۔ لیکن آپ نے انکار فرما دیا اور نکاح نہ ہو سکا۔ ان کی تعداد چار یا پانچ ہے۔ ایک قول کے مطابق ان کی تعداد تیس ہے۔ لیکن اہل سیر حضرات کی تحقیق کے مطابق یہ مؤخر الذکر روایت غلط ہے۔

نیز یہ قول بھی مشہور ہے کہ آپ نے جونیہ کو پیغامِ نکاح دیا۔ اس کے ہاں آپ تشریف لے گئے اور پیغام دیا، لیکن اس نے معذرت چاہی۔ آپ نے معذرت قبول فرمالی۔ اسی طرح کلبیہ اور اُس عورت کا واقعہ ہے کہ جس کے جسم پر آپ نے سفیدی دیکھی۔ نیز جس نے اپنے آپ کو زوجیت کے لیے خود پیش کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور صحابی کے ساتھ قرآن کی چند سورتیں سکھانے کے مہر پر نکاح کر دیا۔ یہ اصل واقعات ہیں۔ باقی اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو آپ کی نو ازواج مطہرات زندہ تھیں، جن میں سے آٹھ کی باری بھی مقرر تھی اور اُن کے نام حسبِ ذیل ہیں:۔

حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش، حضرت ام سلمہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت جویریہؓ ۶۲ھ بہ عہد یزید حضرت سلمہؓ نے وفات پائی۔ رضی اللہ عنہن اجمعین۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جاریہ

ابوعبیدہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار جاریہ تھیں۔

حضرت ماریہؓ: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ ہیں۔

حضرت ریحانہؓ، حضرت جمیلہ: یہ بھی جاریہ تھیں جو گرفتار ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں آئی تھیں۔ ایک اور جاریہ ان کے علاوہ حضرت زینب بنت جحش نے بھی ایک لونڈی

پیش خدمت کی تھی۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام

ان میں سے ایک حضرت زید بن حارثہ بن شراحیل تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کو آپ نے آزاد کرایا اور ام ایمنؓ سے نکاح بھی کر دیا جن سے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔

ان کے علاوہ حضرت اسلم، ابو رافعؓ، ثوبان، ابو کبشہ سلیم، شقران جس کا نام صالح ہے۔ رباح نوبی، یسار نوبی جو جنگ حرنین میں قتل ہوئے مدعم، کرکرۃ نوبی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رخت سفر کے محافظ تھے اور غزوہ خیبر میں انہوں نے آپ کے ناقہ کی مہار ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ بخاریؒ کی روایت کے مطابق نوبی ایسا غلام جس نے ایک غزوہ کے موقع پر چادر چھپا لی تھی۔ جب یہ قتل ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ چادر اس پر آگ بن کر جل رہی ہے، لیکن موطا میں روایت ہے کہ جس نے چادر چرائی تھی۔ اس کا نام مدعم ہے، اور یہ دونوں غزوہ خیبر میں مارے گئے تھے۔

ان کے علاوہ آپ کے غلام انجشہ، حاوی۔

سفینہ بن فروخ جس کا اصل نام مہران ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سفینہ (جہاز) کا خطاب دے رکھا تھا۔ کیونکہ یہ آپ کا سامان سفر اٹھایا کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "تو جہاز ہے"

ابو حاتمؒ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ان کو آزاد کر دیا تھا، لیکن دوسرے حضرات کا قول ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے انہیں آزاد کیا تھا۔

ان کے علاوہ انیسہ جن کی کنیت ابو مشروح تھی۔

افلح، عبیدۃ، طہمان اور ایک روایت میں ان کا نام کیسان بھی آتا ہے۔ نیز ذکوان، مہران اور مروان بھی آپ کے غلام تھے۔

بعض اقوال میں طہمان کے نام سے متعلق اختلاف بھی آتا ہے ان کے علاوہ حنین، سندر، فضالہ یمنی، مابور خصی، واقد، ابو واقد، قسام، ابو عسیب اور ابو مویہبہ بھی آپ کے غلام تھے اور باندیوں میں سے سلمیٰ، ام رافع، میمونہ بنت سعد، خضیرۃ، رضوی، رزینہ، ام ضمیرہ، میمونہ بنت ابو عسیب، ماریہ اور ریحانہ کا تذکرہ ملتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام

ان میں:۔

---

[1] ان کا شمار بھی درحقیقت ازواج مطہرات ہی میں ہے (رئیس احمد جعفری)

حضرت انس رضؓ بن مالک تھے جن کے سپرد آپؐ کے عام امور تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن کے پاس آپ کی نعلین مبارک اور مسواک رہتی تھی۔ عقبہ بن عامر جہنی جو سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کی لگام تھامے رہتے۔

اور اسلع بن شریک جو آپ کے رفیقِ سفر رہتے تھے۔

حضرت بلال رضؓ بن رباح موذن تھے۔ ان کے علاوہ حضرت سعدؓ یہ دونوں پہلے حضرت ابوبکر کے غلام تھے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوذر غفاریؓ، ایمن بن علیہ اور ان کی والدہ حضرت ام ایمن رضؓ جو آپ کی باندی تھیں۔ یہ سب آپ کے خدام میں شامل تھے۔

حضرت ایمنؓ بن عبید اور ان کی والدہ ام ایمن کے ذمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو و طہارت کی خدمت تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبانِ وحی

ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ، عامرؓ بن فہیرہؓ، عمروؓ بن عاصؓ۔ ابی بن کعبؓ، عبداللہؓ بن ارقم، ثابتؓ بن قیس بن شماس بن حنظلہؓ بن ربیع اسدی۔ مغیرہؓ بن شعبہ، عبداللہؓ بن رواحہ، خالدؓ بن ولید، خالد بن سعید ابن العاص۔

روایت ہے کہ آپؐ کے پہلے کاتب معاویہؓ بن ابو سفیان اور زیدؓ بن ثابت تھے۔ اور اکثر یہی دونوں حضرات اس فریضہ کو سرانجام دینے کے لیے مخصوص تھے۔

آں حضرتؐ کے مکاتیب و خطوط

ایک مکتوب صدقات کے متعلق تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس تھا اور حضرت ابوبکرؓ ہی نے حضرت انسؓ بن مالک کے لیے لکھا۔ جب انہیں بحرین بھیجا گیا تھا، اس مکتوب پر جمہور مسلمانوں کا عمل بھی ہے۔

ایک مکتوب آنحضرتؐ نے اہلِ یمن کو ارسال فرمایا۔ یہ وہ مکتوب ہے کہ جس کے متعلق ابوبکر بن عمرو بن حزم نے اپنے والد سے اور انہوں نے دادا سے روایت کی ہے اور اسے امام حاکمؒ نے اپنی صحیح مسند میں اور امام نسائی وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ ابوداؤدؒ وغیرہ نے مرسل روایت ذکر کی ہے یہ ایک طویل مکتوب ہے جس میں فقہ کے مختلف مسائل، زکوٰۃ دیت اور احکام سے متعلق مذکور تھے۔ نیز کبائر، طلاق، عتق، ایک پارچہ میں احکامِ نماز اور اسے لپیٹنا اور لمس قرآن پاک وغیرہ تفصیل سے ذکر فرمائے تھے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ واقعہ تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکتوب تحریر

فرمایا اُسی سے بعد کے فقہاء نے دیات کی مقداریں متعین کی ہیں۔

نیز آپ نے بنی زہیر کی جانب ایک مکتوب بھیجا۔

اس کے علاوہ ایک مکتوب حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس تھا جس میں زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل درج تھے۔

سلاطین و ملوک کی طرف آپؐ کے نامے

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر واپس مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مختلف بادشاہوں کو خطوط لکھے اور انکے ہاں اپنے نامہ بر ارسال فرمائے۔ اس طرح آپ نے شاہِ روم کو ایک مکتوب ارسال فرمایا، آپ سے عرض کیا گیا۔ کہ جب تک خط پر مہر نہ ہو اس وقت تک یہ لوگ خطوط نہیں پڑھا کرتے تو آپ نے ایک سونے کی انگوٹھی بنوائی اور اس پر تین سطریں کندہ کروائیں۔ محمد ایک سطر، رسول ایک سطر اور اللہ ایک سطر تھی۔ مکتوبات کے آخر میں یہی مہر لگایا کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ کو ایک ہی دن چھ آدمیوں کو نامہ بھیجا۔

سب سے پہلے عمرو بن امیہ ضمیری کو شاہ نجاشی کی طرف روانہ کیا۔ ان کا اصل نام اصحمۃ بن ابجر مذکور ہے۔ عربی زبان میں اصحمۃ کے معنی "عطیہ" ہوتے ہیں۔

شاہِ نجاشی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب شریف کی خوب تکریم کی، اسلام قبول کیا اور کلمہ حق کی شہادت دی اور وہ (شاہِ نجاشی) انجیل کا سب سے زیادہ عالم تھا جس دن شاہ نجاشی فوت ہوا اُس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ محدثین کی ایک جماعت نے جن میں واقدی بھی شامل ہیں، یہی روایت کی ہے۔

لیکن واقعات اس طرح نہ تھے، کیونکہ شاہِ نجاشی جس کی آپؐ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی تھی، یہ وہ نہیں جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خط ارسال فرمایا تھا۔ مکتوب الیہ تو دراصل دوسرا تھا، جس کے اسلام کا کچھ علم نہیں۔ یہ دراصل پہلا شاہِ نجاشی تھا، جو حالتِ اسلام میں فوت ہوا۔

مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ، قیصر اور نجاشی کو خطوط لکھے اور یہ وہ نجاشی نہ تھا جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پڑھا۔ ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں کہ جس نجاشی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نامہ مبارک ارسال فرمایا تھا اُس کے نام یہ خط لے کر عمرو بن امیہ ضمیری گئے تھے۔ یہ نجاشی مسلمان نہیں ہوا۔ پہلا قول ابن سعد وغیرہ کا ہے اور دوسرا قول

ابن حزم کا ہے۔

نیز آپؐ نے وحیہ بن خلیفہ کلبی کو قیصر شاہ روم کی طرف بھیجا۔ اس کا اصل نام ہرقل تھا۔ اس نے اسلام لانے کا عزم کر لیا۔ لیکن پھر اس کا ارادہ فسخ ہو گیا۔ ایک قول کے مطابق اسلام قبول بھی کیا، لیکن یہ قول غلط ہے۔ ابوحاتم اور ابن حیان نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو میرا یہ مکتوب قیصر کو پہنچا دے وہ جنت کا سزاوار ہوگا۔"

ایک آدمی نے عرض کیا "خواہ وہ (اسلام) قبول نہ بھی کرے؟"

آپ نے فرمایا "ہاں، اگر وہ قبول نہ بھی کرے۔"

وہ قیصر سے ملا جب وہ بیت المقدس جا رہا تھا اس نے مکتوب فرش پر پھینک دیا اور ایک طرف چھپ گیا۔ قیصر نے آواز دی کہ "جو یہ خط لایا ہے اُسے امان ہے۔" اس آدمی نے کہا "میں لایا ہوں۔" قیصر نے کہا کہ جب میں واپس آؤں تو ملنا۔ چنانچہ قیصر کی واپسی پر آپ کا نامہ بر اُس سے ملا۔ قیصر نے محل کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا، آخر دروازے بند کر لیے گئے۔ پھر ایک منادی سے کہا کہ آواز دے دو کہ قیصر نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا اور عیسائیت چھوڑ دی۔ اس آواز کے بعد اس کی مسلح فوج دربار میں گھس آئی، تو قیصر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ بر سے کہا:

"تم دیکھ چکے ہو کہ مجھے اپنی حکومت چھٹ جانے کا اندیشہ ہے۔"

پھر اُس نے منادی سے کہا کہ اعلان کر دو کہ قیصر تم لوگوں کے دین پر راضی ہے اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا کہ میں اسلام لے آیا، اور آپ کی خدمت میں دیناروں کی تھیلی بھیجی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا، وہ مسلمان نہیں، بلکہ عیسائی ہے اور دیناروں کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

ان کے علاوہ عبداللہ بن حذافہ سہمی کو کسریٰ کی طرف بھیجا۔ اس کا نام پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں تھا۔ اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک چاک کر ڈالا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی۔ "اے اللہ! اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔"

پھر اللہ نے اس کے ملک اور اس کی قوم کو پارہ پارہ کر دیا۔

آپؐ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو مقوقس کی طرف روانہ فرمایا۔ اس کا نام جریج بن مینا شاہ اسکندریہ تھا۔ یہ قبطیوں کا سردار تھا۔ اس نے جواب دیا، "بہت خوب، اور اب وقت آپہنچا

ہے، اس نے اسلام قبول نہیں کیا، ہاں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لونڈی ماریہؓ اور اس کی دو بہنوں سیرین اور قیسری کو بھیجا۔ آپ نے سیرین حضرت حسانؓ بن ثابت کو عطا فرمادی۔ نیز اُس نے ایک اور لونڈی، ایک ہزار مثقال سونا، بیس قبطی جوڑے، ایک سفید خچر جو دلدل کے نام سے مشہور ہے۔ ایک سفید گدھا جسے عفیر کہا جاتا تھا۔ ایک خصی غلام جس کا نام مابور تھا۔ ایک قول کے مطابق یہ غلام ماریہ کے چچا کا لڑکا تھا، ایک گھوڑا جو لزاز کے نام سے مشہور تھا۔ ایک شیشہ کا پیالہ اور شہد یہ چیزیں خدمتِ اقدس میں روانہ کیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس بدبخت نے اپنی حکومت پر بخل کیا۔ حالانکہ اس کی سلطنتِ (دنیا) کو بقا نہیں ہے۔"

نیز شجاع بن وہب اسدی کو بلقاء کے حکمران حارث بن ابی شمر غسانی کی جانب روانہ فرمایا۔

اسحٰق واقدی نے فرمایا کہ اس میں کئی اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ جبلہ بن ایہم کی طرف بھیجا۔ ایک روایت کے مطابق دونوں کی طرف اور ایک روایت کے مطابق اسے وحیہ بن خلیفہ کے ساتھ ہرقل کی طرف بھیجا۔

آپ نے سلیط بن عمرو کو ہوذہ بن علی حنفی کی طرف یمامہ میں بھیجا اس نے نامہ بر کی خوب تکریم کی۔

ایک قول کے مطابق آپ نے ہوذہ اور ثمامہ بن آثال حنفی کی طرف نامہ بر بھیجا۔ ہوذہ نے تو اسلام قبول نہیں کیا البتہ ثمامہ اسلام لے آیا۔

غرض یہ چھ حکمران تھے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ نے انہیں نامے لکھے۔

اور ۸ھ ذی قعدہ کے مہینہ میں عمرو بن عاص کو شاہ عمان کے دونوں لڑکوں جیفر اور عبداللہ کے پاس بھیجا گیا۔ یہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور عمرو بن عاص وہیں صدقہ کی رقم جمع کرنے ٹھہر گئے۔ یہ صحابی وہیں تھے کہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع ملی۔

نیز آپ نے جعرانہ سے واپسی سے قبل ہی علاء بن حضرمی کو منذر بن ساوی عبدی شاہ بحرین کے پاس بھیجا۔

ایک روایت کے مطابق فتح مکہ سے قبل ہی خط لکھا۔ پھر یہ مسلمان ہو گیا اور تصدیق کی۔

آپ نے مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو یمن میں حرث ابن عبد کلال حمیری کی طرف بھیجا۔ اس

نے جواب دیا میں غور کروں گا۔

نیز غزوہ تبوک سے واپسی پر ابو موسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبل کو بھی یمن کی طرف بھیجا۔

ایک روایت کے مطابق ۱۰ھ میں ان حضرات کو اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجا تو وہاں کے اکثر لوگ بے لڑے بھڑے مسلمان ہو گئے۔

اس کے بعد علی بن ابی طالب کو وہاں بھیجا اور مکہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر ملاقات فرمائی۔

ان کے علاوہ آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو ذی کلاع حمیری اور ذی عمر کی طرف روانہ فرمایا۔ انہیں اسلام کی دعوت دی گئی اور یہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ جریرؓ ابھی وہیں تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

آپ نے عمرو بن امیہ ضمری کو مسیلمہ کذاب کے پاس ایک خط دے کر روانہ فرمایا۔ نیز سائبؓ بن عوام برادر زبیرؓ کے ہاتھ بھی اسے ایک خط بھیجا۔ لیکن اس نے اسلام قبول نہ کیا۔

حزوہ بن عمرو جذامی کے پاس بھی اسلام کے لیے دعوت نامہ بھیجا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی طرف دعوت نامہ نہیں بھیجا۔ فروہ معان میں قیصر کی طرف سے گورنر تھا، یہ مسلمان ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام لانے کا عریضہ ارسال کیا اور مسعود بن سعد کے ہاتھ ایک سفید خچر کا ہدیہ پیش کیا، جو فضہ کے نام سے مشہور ہے۔ نیز ایک "مزب" نام کا گھوڑا اور ایک گدھا جس کا نام یعفور تھا پیش خدمت کیا۔ محدثین کے ایک گروہ کی یہی تحقیق ہے۔ عفیر اور یعفور دونوں کا ایک ہی مطلب ہے صرف فرق اتنا ہے کہ عفیر یعفور کی تصغیر ہے۔ مزید برآں کچھ پارچہ جات۔ ایک سنہری کڑھی ہوئی قبا بھی ارسالِ خدمت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایا قبول فرما لیے اور حضرت مسعود بن سعد کو بارہ اوقیہ مرحمت فرمایا۔

ان کے علاوہ آپؐ نے عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی کو ایک نامہ دے کر قبیلہ حمیر کے سرداران حارث، مسروح اور نعیم بن عبد کلال کی طرف ارسال فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن

آنحضرتؐ کے چار مؤذن تھے۔ دو مدینہ منورہ میں۔ ایک بلالؓ بن رباح، جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سب سے پہلے اذان دی۔ دوسرے نابینا صحابی حضرت عمرو بن ام مکتوم قرشی عامری تھے۔ تیسرے مسجد قباء میں حضرت سعدؓ قرظ جو حضرت عمارؓ بن یاسر کے غلام تھے۔ چوتھے مکہ میں ابو محذورہؓ مؤذن مقرر تھے، جن کا اصل نام اوس بن مغیرہ جمحی تھا۔ ابو محذورہؓ اذان میں رجعت فرمایا کرتے اور اقامت کو دو دو بار کہتے۔ اور حضرت بلالؓ اذان میں رجعت نہ فرمایا کرتے اور اقامت کے الفاظ

ایک ایک بار پڑھا کرتے۔ چنانچہ اہل مکہ اور امام شافعیؒ نے ابو محذورہؓ کی اذان اور حضرت بلالؓ کی اقامت اختیار کرلی اور حضرت ابوحنیفہؒ اہل عراق نے حضرت بلالؓ کی اذان اور ابو محذورہؓ کی اقامت اختیار کر لی۔ امام احمدؒ و دیگر اہل ظاہر محدثینؒ و اہل مدینہ نے حضرت بلالؓ کی اذان و اقامت دونوں اختیار کر لیں۔ اور امام مالکؒ نے دو مقامات پر اعادہ تکبیر کی اور الفاظ اقامت کو دو دو بار پڑھنے کی مخالفت کی۔ وہ اُن کی تکرار نہیں کرتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ حکام

ایک باذان بن ساسان تھے جو بہرام کے لڑکے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کی موت کے بعد ان کو تمام اہل یمن کا حاکم مقرر فرمایا۔ یہ یمن کے پہلے حاکم تھے، جو عہد اسلام میں متعین کیے گئے اور شاہان عجم میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ باذان کی وفات کے بعد آپ نے ان کے لڑکے شہر بن باذان کو صنعاء کا حاکم مقرر فرمایا۔ شہر بن باذان کو بعد میں قتل کر دیا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن سعید بن العاص کو صنعاء بھیجا اور مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو کندہ اور صوف کا حاکم بنا دیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ کی وفات ہو گئی اور کوئی نئی فوج روانہ نہ ہوئی۔

بعد ازاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتد قبائل کے خلاف فوج روانہ فرمائی اور زیادؓ بن امیہ انصاری کو حضرموت کا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو زبید، عدن، زمع اور ساحل کا، حضرت معاذؓ بن جبل کو جند کا، حضرت ابوسفیانؓ کو نجران کا۔ یزان کے بیٹے یزید کو تیماء کا حاکم مقرر کر دیا۔ علاوہ ازیں عتاب بن اسید کو مکہ کا اور موسم حج میں امور اہل اسلام کا ناظم مقرر فرمایا۔ نیز حضرت علیؓ بن ابی طالب کو یمن میں خمس اکٹھا کرنے پر مامور کیا اور عہدہ قضا پر متعین کر دیا۔ حضرت عمروؓ بن عاص کو عمان اور اس کے گردونواح کا حاکم مقرر کیا، صدقات وصول کرنے کے لیے صحابہ کی ایک جماعت کو مقرر فرمایا کیونکہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان ہی میں سے آدمی مقرر کیا جا سکتا تھا جو ان سے صدقات کی رقوم وصول اور جمع کر سکے۔ اسی باعث صدقات جمع کرنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ رکھے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو سنہ ۹ھ میں حج کی اقامت پر مامور فرمایا۔

پھر بعد میں حضرت علیؓ کو روانہ کیا گیا تاکہ لوگوں کو سورہ براۃ پڑھ کر سنائیں (احکام حج بتائیں)، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ کی ابتدائی آیات حضرت ابوبکرؓ کی مدینہ کی غیر حاضری میں نازل ہوئی تھیں۔ دوسرا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل عرب اہل خانہ کے سوا اغیار کی بات پر مکمل اعتماد نہ کرتے تھے۔ چنانچہ علی کو بھیجا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کو حضرت ابوبکرؓ کا معاون اور

مساعد بنا کر روانہ فرمایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔ کہ تم امیر ہو یا مامور تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں مامور ہوں! رافضی لوگ .... کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کو معزول کر کے حضرت علیؓ کو امیر بنا دیا گیا۔ یہ محض اسس فرقہ کی بہتان تراشی اور اختراع ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ ذی الحج یا ذی قعدہ کے مہینہ میں پیش آیا۔ دونوں اقوال میں اختلاف محض نسیان کے سبب سے ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ صحابہؓ

غزوہ بدر میں مقام عریش پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا۔ تو سعدؓ بن معاذ آپ کے پہرے پر مقرر ہوئے۔

غزوہ احد میں محمد بن مسلمہ آپ کے نگران تھے۔

غزوہ خندق میں حضرت زبیرؓ بن عوام کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ نیز حضرت عباد بن بشر بھی آپ کے حارس تھے۔

ان کے علاوہ کئی دوسرے صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ بننے کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

یعنی: "اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔"

آپ نے لوگوں کو یہ حکم سنایا اور تمام پہرہ چوکی ہٹا دیا۔

بعض صحابہؓ کی دوسری ذمہ داریاں

ان حضرات کے اسمائے گرامی جو مجرموں اور دشمنوں کو سزائے قصاص دیتے تھے یہ ہیں:

علیؓ بن طالب، زبیرؓ بن عوام، مقدادؓ بن عمرو، محمدؓ بن مسلمہ، عاصمؓ بن ثابت ابن ابی فلح، ضحاکؓ بن سفیان کلابی، حضرت قیسؓ بن سعد عبادہ انصاری بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیوں میں شامل تھے۔ یوم حدیبیہ کے موقع پر مغیرہ بن شعبہ آپ کے پس پشت تلوار لیے کھڑے تھے۔

آپ کے ذاتی امور کے منتظم

حضرت بلالؓ کو اخراجات خانہ کا انتظام سپرد کر رکھا تھا۔ معیقیبؓ کے پاس مہر ہوتی تھی۔ مسواک اور نعلین مبارک حضرت ابن مسعودؓ کے پاس رہتی تھیں۔ نیز رباح اسودؓ آپ کی لونڈی انیسہؓ، انسؓ بن مالک اور حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کے ذمہ بھی کچھ انتظامات تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطیب اور شاعر

حضرت کعبؓ بن مالک، عبداللہ بن رواحہ اور حضرت حسانؓ بن ثابت آنحضرت کے شعراء تھے، جو اسلام کی طرف سے دفاع کرتے تھے۔ حضرت حسانؓ بن ثابت اور کعبؓ بن مالک کفار کے مقابلہ میں بہت سخت تھے۔ انہیں کفر و شرک پر عار دلاتے تھے۔ آپ کے خطیب ثابت بن قیس بن شماس تھے۔

حالتِ سفر میں آنحضرتؐ کے حدی خواں

ان حضرات کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن رواحہؓ، انجشہؓ، عامر بن اکوع، ان کے چچا سلمہ بن اکوع۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نہایت خوش آواز حدی خواں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی خوش آوازی پر) فرمایا:

اے انجشہؓ ذرا آہستہ، آبگینے نہ توڑ دینا!

یعنی: کمزور عورتوں کا خیال رکھو!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات، وفود اور سرایا

آپ کے تمام غزوات، وفود اور فوجی مہمات، ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہونے کے بعد صرف دس سال کی مدت میں ہی ہوئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تعداد ستائیس ۲۷ ہے۔ پچیس ۲۵ اور انتیس ۲۹ کی روایات بھی ملتی ہیں۔ اس سے کم و بیش تعداد بھی بتائی جاتی ہے۔

نو غزوات میں آپ نے شرکت فرمائی، غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوۂ خندق، غزوہ بنو قریظہ، غزوہ بنو مصطلق، غزوہ خیبر، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ طائف۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے غزوہ بنی نضیر، غزوہ غابہ اور خیبر کے قریب، وادی قریٰ کے جہاد میں شرکت فرمائی۔ رہے آپ کے وفود اور چھوٹے چھوٹے حملے تو وہ ساٹھ کے قریب ہیں۔ لیکن بڑے بڑے غزوات سات ہی ہوئے غزوہ بدر، احد، خندق، خیبر، حنین، تبوک اور فتح مکہ۔ انہیں غزوات کے متعلق آیاتِ قرآن مجید نازل ہوئیں۔

سورۂ انفال کی آیات غزوہ بدر کے متعلق، سورہ آل عمران کی آخری آیات غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ الخ

اور غزوہ خندق و بنو قریظہ اور خیبر کے متعلق سورۃ احزاب کی ابتدائی آیات نازل فرمائی گئیں۔ نیز سورہ حشر میں غزوہ بنی نضیر کے متعلق فرمایا گیا۔ صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے متعلق سورہ فتح میں آیات اتریں اور ان آیات میں فتح (مکہ) کی خوشخبری دی گئی اور سورہ نصر میں تو صراحتاً فتح کا ذکر فرمادیا۔ نیز غزوہ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے۔ غزوہ بدر اور غزوہ حنین میں ملائکہ نے بھی جنگ میں شرکت کی۔ غزوہ خندق میں فرشتوں کا نزول ہوا، جنہیں دیکھ کر کفار کے پاؤں اکھڑ گئے اور بری طرح شکست کھا کر بھاگے اور اس غزوہ میں کافروں کے منہ پر فرشتوں نے پتھر مارے۔ آخر ذلیل ہو کر انہیں بھاگنا پڑا۔

غزوہ بدر اور حنین میں بڑی شاندار فتح حاصل ہوئی۔ غزوہ طائف میں آپ نے منجنیق بھی استعمال کیا۔ غزوہ احزاب میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر خندق کھود کر دفاع فرمایا۔

آپؐ کے سلاح جنگ اور سامان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نو تلواریں تھیں۔ ایک کا نام ماثور تھا، جو آپ کو والدین کی طرف سے وراثۃً ملی تھی۔ دوسری عضب تیری ذوالفقار اور ذوالفقار کو مکسور اور ق کو منصوب پڑھا جائے گا) جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے اور کسی وقت بھی الگ نہ کرتے تھے۔ اس تلوار کا دستہ اور دیگر تمام لوازمات چاندی کے تھے۔

ان کے علاوہ آپ کے پاس قلعی، بتار، حتف، رسوب، مخذم، قضیب نام کی تلواریں بھی تھیں۔ موخر الذکر کی نعل سیف چاندی کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا حلقہ بھی چاندی کا تھا۔ ذوالفقار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ بدر میں ملی جسے آپؐ نے رویا میں ملاحظہ فرمایا تھا۔ جس دن آپ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کی اس تلوار پر سونے اور چاندی کا کام تھا۔

آنحضرتؐ کے سلاح جنگ اور آپؐ کا اثاثہ

ذات نبویؐ کے املاک کی ضروری تفصیلات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سات زرہیں تھیں۔

ایک ذات الفضول جسے آپ نے ابوشحم یہودی کے پاس اپنے اہل وعیال کے لیے تیس صاع جَو کے بدلے رہن رکھا تھا۔ یہ قرض ایک سال کے لیے لیا گیا تھا اور یہ زرہ لوہے کی تھی۔ اس کے علاوہ ذات الوشاح، ذات الحواشی، سعدیہ، فضہ، بتراء اور خرنق نام کی زرہیں بھی تھیں۔

نیز آپ کے پاس چھ کمانیں تھیں جن کے نام زوراء، روحاء، صفراء، بیضاء، کتوم تھے۔ موخرالذکر غزوہ احد میں ٹوٹ گئی چنانچہ قتادہ بن نعمانؓ اور شدادؓ کو مرحمت ہوئی۔

آپؐ کے پاس تیروں کی ایک تھیلی تھی جس کا نام کافور تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہمیانی تھی اور اس پر تین حلقے سونے کے اور چاندی کے تار لگے تھے اس کے اردگرد بھی چاندی جڑی ہوئی تھی۔ یہ بعض حضرات کی تحقیق ہے، لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں کوئی ایسی روایت نہیں پہنچی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر میں ہمیانی باندھی ہو۔

نیز آپ کے پاس زلوق نام کی ایک ڈھال تھی اور فتق ڈھال بھی تھی۔ ایک ڈھال آپؐ کی خدمت میں بطور ہدیہ کے پیش کی گئی، اس پر تصویر تھی۔ آپ نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور اللہ تعالیٰ نے وہ تصویر مٹا دی۔

آپ کے پاس پانچ نیزے تھے۔ ایک کا نام مثوی اور دوسرے کا نام منثنی تھا نیز آپؐ کے پاس ایک حربہ تھا جس کا نام نبعہ تھا۔ ایک اور بہت بڑا بیضاء نام کا حربہ بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا عکازی شکل کا تھا۔ جسے عنزہ کہا جاتا تھا اور عید کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے

آگے لے کر اسے چلتے تھے اور نماز میں آپ کے سامنے گاڑ دیا جاتا تھا اور نماز کے لیے اُسے سُترہ (آڑ) بنا لیا جاتا تھا۔ گاہے گاہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسے لے کر باہر تشریف لے جایا کرتے۔

آپ کے پاس ایک خود نما (لوہے کی ٹوپی) جسے موشح کہتے تھے۔ اس پر تانبا لگا ہُوا تھا۔ ایک اور مسبوغ یا ذوالمسبوغ نام کا خود بھی تھا۔

آپ کے تین جبّے تھے، جنہیں آپ جہاد کے موقع پر زیبِ تن فرمایا کرتے۔ ان میں سے ایک سبز ریشم کا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت عروہؓ بن زبیر کے پاس ایک ریشمی جبّہ تھا جس کے اندر سبز ریشم لگا ہوا تھا اور وہ اسے جہاد میں پہنا کرتے۔ امام احمدؒ کے نزدیک ان روایتوں کی بنا پر جہاد میں ریشم پہننا جائز ہے۔

آپ کے پاس عقاب نام کا ایک سیاہ پرچم تھا۔ سنن ابوداؤد میں ایک صحابیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم دیکھا جس کا رنگ زرد تھا ویسے اکثر اوقات جھنڈے کا رنگ سیاہ ہوتا۔

نیز آپ کے پاس کِن نام کا ایک خیمہ تھا۔

اور ایک گز یا اس سے قدرے طویل ایک عصا تھا، اُسے لے کر آپ چلتے تھے اور اس کے سہارے سواری پر بیٹھتے تھے اور اُسے اپنے اونٹ پر لٹکا دیا کرتے۔

آپ کے پاس عرجون نام کا ایک مخصرہ (ٹیک لگانے کے لیے ڈنڈا سا)، نیز ایک ممشوق نام کا عصا بھی تھا۔ اور یہی وہ عصا ہے جو خلفائے راشدین کے پاس رہا۔

آپ کے پاس ایک پیالہ تھا، جس کا نام ریان تھا۔ اس کا نام مغیا بھی مذکور ہے۔ ایک اور پیالہ تھا جس کے ساتھ سونے کی زنجیر لگی ہوئی تھی، نیز ایک شیشے کا پیالہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی چارپائی کے نیچے رات کو پیشاب کرنے کے لیے ایک لکڑی کا پیالہ رکھا رہتا۔

آپ کے پاس صادر نام کا ایک مشکیزہ تھا۔ آپکے پاس ایک پتھر کا برتن بھی تھا کہ جس سے آپ وضو فرماتے، نیز ایک کپڑے دھونے کا برتن، آپکے پاس سعہ نام کا ایک بڑا پیالہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھ دھونے کا ایک برتن تیل کی ایک شیشی ایک تھیلا ساتھ ہی آئینہ اور کنگھی پڑی رہتی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی کنگھی ساگوان کی بنی ہوئی تھی۔ ایک سرمہ دانی تھی کہ جب آپ رات کو سوتے تو ہر آنکھ میں اثمد کی تین سلائیاں ڈالتے (اثمد سرمہ کی ایک اعلیٰ قسم ہے)

نیز آپ کے تھیلے میں دو قینچیاں اور مسواک رہتی۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس ایک بہت

بڑا پیالہ تھا جس کے چار کُنڈے تھے اور چار آدمی اُسے اُٹھاتے تھے۔ ایک صاع ایک مُد (یہ پیمائش کے پیمانے ہیں) اور ایک چادر بھی تھی۔ آپ کی چارپائی کے پائے ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ اور سعد بن زرارہ نے ہدیہ کے طور پر پیش کیے تھے۔ ان کے علاوہ آپ کا لبنہ چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ یہ کل سامانِ رسالت تھا جو مختلف احادیث میں مروی ہے۔ امام طبرانی نے اپنی معجم طبرانی میں آپ کے برتنوں کے متعلق معجم میں ایک جامع حدیث نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تلوار تھی جس کا دستہ نقرئی تھا اور اس کے اردگرد چاندی ترچھی ہوئی تھی یہ ذوالفقار کے نام سے مشہور تھی۔

آپ کے پاس مسداد نام کی ایک کمان بھی تھی۔ آپ کے پاس ایک ترکش تھا جسے جمع کہا جاتا تھا اور آپ کے پاس ایک زرہ تھی، جس پر تانبے کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اُسے ذات الفضول کہتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس نبعاء نام کا ایک حربہ و قن نام کی ایک لاٹھی، موجز کی ایک سفید ڈھال، سکب نام کا مٹیالہ گھوڑا، داج نام کی ایک کاٹھی، دلدل نام کا ایک سفید خچر، قصواء نام کی ایک اونٹنی، یعقور نام کا ایک حمار، کرد نام کی ایک چٹائی، قمر نام کی ایک بکری صادر نام کا ایک پیالہ اور جامع نام کی ایک قینچی تھی۔

علاوہ ازیں آپ کے پاس ایک آئینہ اور ایک ڈنڈا تھا جس کا نام موت تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانور

ایک سکب گھوڑا تھا، یہ پہلا گھوڑا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ جس اعرابی کے پاس یہ گھوڑا تھا اس سے آپؐ نے دس اوقیہ میں اسے خریدا تھا۔ یہ گھوڑا سفید پیشانی کھلتے ہوئے بدن کا، سیاہ آنکھیں، اس کا رنگ بھی سیاہی مائل تھا۔ دوسرا مرتجز نام کا گھوڑا تھا، جو سفید تھا جس کے بارے میں خزیمہؓ بن ثابت نے گواہی دی تھی۔

ان کے علاوہ لحیف، لزاز، ظرب، سبحہ اور ورد نام کے گھوڑے بھی تھے، ان کی تعداد سات تھی، جس پر سب راویوں کا اتفاق ہے اور امام ابوعبداللہ محمد بن اسحاق بن جماعۃ، شافعی المسلک نے ان کے نام ایک ہی شعر میں جمع کر دیے ہیں۔

لخیل سکب لحیف سبحہ ظرب
لزاز مرتجز ورد لہا اسرار

یہ ان کے صاحبزادے امام عزالدین عبدالعزیز ابوعمرو نے مجھے بتایا۔

ایک روایت کے مطابق آپ کے پاس ان کے علاوہ پندرہ گھوڑے تھے۔ لیکن اس روایت میں اختلاف ہے۔ آنحضرتؐ کی کاٹھی کے اطراف کھجور کی چھال سے بھرے تھے۔ نیز آپؐ کا ایک خچر دلدل تھا۔ شاہ مقوقس نے اسے ہدیۃً پیش کیا تھا۔ ایک اور فضہ نام کا خچر جسے فروۃ جذامی نے پیشِ خدمت کیا تھا، نیز ایک اور سفید خچر جسے حاکمِ ایلہ نے بھیجا تھا اور ایک دومۃ الجندل کے حاکم کی جانب سے ہدیۃً بھیجا گیا تھا۔

ایک قول کے مطابق شاہ نجاشی نے بھی ایک خچر ارسالِ خدمت کیا تھا جس پر آپ سواری فرماتے۔ ان کے علاوہ ایک عفیر نام کا سفید حمار تھا، جسے قبطی حکمران مقوقس نے بھیجا تھا۔ ایک حمار فروہ جذامی نے بھی بھیجا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ایک حمار پیش کیا اور آپؐ نے سواری فرمائی، آپ کے پاس ایک بہت عمدہ اونٹ تھا جس کا نام قصوی تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی پر آپ نے ہجرت فرمائی۔ نیز عضباء، جدعاء نام کے اونٹ بھی تھے۔ ان کے کان، ناک تو درست تھے اور کوئی عیب نہ تھا، لیکن یہ یوں ہی اس نام سے مشہور تھے۔ ایک قول کے مطابق اس کا کان کٹا ہوا تھا، اس لیے اُسے عضباء کہتے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جدعاء اور عضباء دو مختلف وجود یا ایک ہی کے دو نام ہیں۔ عضباء اتنی تیز رفتار تھی کہ کسی اونٹنی کو آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی۔ ایک بار ایک اعرابی آیا تو اس کی اونٹنی مقابلہ میں آگے نکل گئی۔ مسلمانوں کو اس بات سے سخت رنج پہنچا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ دنیا کی ہر فانی چیز اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھتی، جب تک مائل بہ زوال نہ ہو لے۔

غزوہ بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مالِ غنیمت میں سے ابوجہل کا اونٹ ملا۔ اس کی ناک میں چاندی کی لگام تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیبیہ کے موقع پر پیش کیا گیا۔ تاکہ مشرکین اسے دیکھ کر جلیں۔ آپ کے پاس پینتالیس جوان اونٹنیاں تھیں۔ آپ کے پاس ایک اور اونٹنی تھی، جسے سعد بن عبادۃ نے بنی عقیل کے قبیلہ والوں سے لے کر ارسالِ خدمت کیا تھا۔ آپ کے پاس ایک سو بکریاں تھیں۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ ان میں اضافہ ہو۔ چنانچہ کوئی بچہ پیدا ہوتا تو آپ ایک جوان بکری ذبح فرمالیتے۔ نیز آپ کے پاس سات (پہاڑی قسم کی) بکریاں تھیں، جنہیں حضرت امِ ایمنؓ چرایا کرتی تھیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس | آپ کے پاس ایک عمامہ تھا، جس کا نام سحاب تھا۔ حضرت

علیؓ نے بھی اُسے باندھا۔ آپ عمامہ کے نیچے ٹوپی بھی رکھا کرتے۔ نیز آپ کی عادت مبارک عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی پہننے کی بھی تھی۔ نیز جب آپ عمامہ باندھتے تو اس کے پلو دونوں کاندھوں پر ڈال دیتے جیساکہ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن حریث سے روایت ہے:

فرمایا، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر تشریف فرما دیکھا۔ آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا اور اس کے دونوں سرے دونوں کاندھوں پر لٹکا دیے تھے۔ نیز مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سیاہ عمامہ زیبِ سر تھا۔ لیکن اس روایت میں پلو کو (لٹکانے کا) ذکر نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پلو کو ہمیشہ نہیں لٹکایا کرتے تھے۔ ایک یہ روایت بھی ہے کہ آپ جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے جسم مبارک پر جنگ کا لباس تھا اور آپ کے سر پر خود (لوہے کی ٹوپی) تھا۔ گویا آپؐ نے ہر موقع پہ حسبِ موقع لباس زیبِ تن فرمایا۔

اور ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ (اللہ تعالیٰ آپ کو مزید روحانی تقدیس عطا فرمائے) پلو لٹکانے کے متعلق ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں خواب دیکھا کہ آپ نے رب العزت کی زیارت کی، تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: "اے محمد! ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے کس بات کے متعلق جھگڑ رہے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا: "مجھے علم نہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دونوں کاندھوں کے درمیان رکھا۔ تو جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان تھا سب کا علم مجھے حاصل ہو گیا"۔

یہ روایت ترمذی میں بھی ہے۔ امام بخاریؒ سے دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا، یہ روایت صحیح ہے۔ پوچھا گیا کہ یہ الفاظ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کاندھوں پر پلو لٹکا لیتے تھے۔ (کیا یہ بھی درست ہیں؟) انہوں نے فرمایا: صرف جاہل لوگوں کی زبانیں اور دل اس کا انکار کر سکتے ہیں۔ اور میں تو آپؐ کے سوا اور کسی کے متعلق پلو لٹکانے کی بات ثابت کرنا بھی فضول سمجھتا ہوں۔

نیز آپ نے قمیص بھی پہنی، قمیص آپ کو نہایت ہی پسند تھی اور اس کی آستینیں پہونچوں تک تھیں۔ نیز آپ نے جبہ اور فروج جو کہ قبا کی طرح ہوتا ہے، زیب تن فرمایا۔ آپؐ نے قبا بھی پہنا۔ حالتِ سفر میں آپ کا جبہ تنگ آستین کا تھا۔ آپ نے تہبند اور چادر بھی استعمال فرمائی۔ واقدی بیان کرتے ہیں کہ آپ کی چادر کا طول چھ ذراع اور عرض تین ذراع اور ایک بالشت تھا۔ آپ کا تہبند عمانی سوت کا تھا جس کا طول چار ذراع ایک بالشت اور عرض دو ذراع ایک

بالشت تھا۔ آپ نے سُرخ (حلّہ) لباس بھی زیب تن فرمایا۔

حلّہ (لباس) دو کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ حلّہ بالکل ہی سُرخ تھا اُسے غلط فہمی ہوئی بلکہ سُرخ جوڑے سے مراد دو یمنی چادریں تھیں، جن پر عام یمنی چادروں کی طرح سُرخ اور سیاہ لکیریں تھیں، چونکہ ان میں سرخ لکیریں ہوتی ہیں اس لیے وہ سرخ چادروں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں، کیونکہ بالکل سُرخ لباس تو اسلام میں بڑی شدت سے ممنوع ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں روایت آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھوں کی سُرخ کاٹھیوں سے منع فرمایا۔ سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے بدن پر زعفرانی رنگ سے رنگی ہوئی ایک چادر دیکھی آپ نے فرمایا کہ یہ کیسی چادر ہے جو تم نے اوڑھ رکھی ہے؟ میں نے آپ کی ناراضی محسوس کرلی، میں واپس گھر آیا، تو تنور گرم ہو رہا تھا میں نے چادر تنور میں ڈال دی۔ پھر دوسرے دن حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا، عبداللہ تم نے اُس چادر کا کیا کیا؟ میں نے تمام واقعہ عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا تم نے اُسے گھر میں کسی عورت کو کیوں نہ پہنا دیا؟ کیونکہ عورتوں کے لیے اس رنگ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

صحیح مسلم میں انہی صحابیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر دو معصفر (کسم میں رنگی ہوئی) چادریں دیکھیں، تو آپ نے فرمایا، کہ انہیں مت پہنو یہ کفار کا لباس ہے اور صحیح مسلم میں ایک روایت حضرت علیؓ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کو کسم کا رنگ دینے سے منع فرمایا اور یہ سب کو معلوم ہے کہ کسم کے رنگ سے کپڑا سُرخ رنگ کا ہو جاتا ہے اور حدیث کی ایک کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ صحابہؓ کسی سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے تو آپ نے اُن کے سامان میں چادریں دیکھیں، جن پر سرخ دھاریاں تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمہاری سواریوں پر یہ سرخی نہ دیکھوں! چنانچہ ہم فوراً تیزی سے اُٹھے حتیٰ کہ ہمارے بعض اونٹ بدک گئے اور ہم نے تمام سُرخ کپڑے اتار لیے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ سُرخ لباس اور سیاہ صرف (احمر) رنگ کے لباس کا پہننا بحث طلب امور ہیں۔ اس کی کراہت تو بہت ہی شدید ہے اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ آپ نے گہرا سُرخ لباس پہنا ہو، اللہ تعالیٰ نے انہیں یقیناً اس سے محفوظ رکھا۔ البتہ سُرخ جوڑے کے لفظ پر شبہ ہو سکتا ہے۔

نیز آپ نے نشان زدہ سیاہ کپڑا بھی پہنا اور سادہ کپڑا بھی زیب تن فرمایا۔ سیاہ لباس اور سبز ریشم کی آستینوں والا بڑا لبادہ بھی پہنا۔ امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ اپنی اپنی اسناد سے حضرت انس بن مالکؓ

کی روایت نقل کرتے ہیں کہ شاہِ روم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سندس کا ایک قیمتی جبہ بھیجا، آپ نے پہنا، گویا مجھے اب بھی آپ کے دونوں ہاتھ باہر نکلے نظر آرہے ہیں۔ اصمعی فرماتے ہیں کہ وہ جبہ بڑا سا لبادہ تھا جس کی آستینیں لمبی تھیں۔ خطابی فرماتے ہیں، ہوسکتا ہے اس جبہ پر کچھ ریشم (سندس) لگا ہو۔ ورنہ عام طور پر جبہ ریشم کا نہیں بنا کرتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پاجامہ بھی خریدا ظاہر ہے اسے آپ نے پہننے ہی کے لیے خریدا ہوگا۔ ایک روایت میں آپ کا پاجامہ پہننا بھی مذکور ہے اور صحابہؓ تو آپ کی اجازت سے پاجامے پہنا ہی کرتے تھے۔ نیز آپ نے موزے پہنے۔ پاپوش مبارک جو آپ پہنتے تھے اس کا نام "تاسومہ" تھا۔ آپ نے انگشتری بھی پہنی، لیکن اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ آپ نے دائیں ہاتھ میں پہنی یا بائیں ہاتھ میں۔ یہ تمام روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح ہیں۔

نیز آپ نے خود پہنا جس کا نام "خود" تھا اور آپ نے زرہ یہ نام کی زرہ بھی زیب تن فرمائی، اور غزوۂ احد میں تو معلوم ہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو زرہیں پہنیں۔

صحیح مسلم میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک ہے اور آپ نے ایک خسروانی بہترین جبہ نکال کر دکھایا جس پر ریشم کا کام تھا اور اس کے کناروں پر بھی ریشم لگا ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا یہ جبہ حضرت عائشہؓ کے پاس تھا جب وہ انتقال فرما گئیں تو ہیں نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہنا کرتے تھے۔ ہم اسے دھو کر اس کا پانی مریضوں کو دیا کرتے تو انہیں صحت ہو جاتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو سبز چادریں ہیں۔ ایک سیاہ کمبل، ایک سُرخ سلا ہوا کمبل اور ایک بالوں کا کمبل تھا۔ آپ کی قمیص سوتی تھی، اس کی لمبائی بھی کم تھی، اور اس کی آستینیں بھی چھوٹی تھیں۔ البتہ لمبی اور چوڑی آستینوں والی قمیص نہ آپ نے اور نہ صحابہؓ نے کبھی پہنیں۔ یہ سنت کے خلاف ہیں اور ان کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ یہ متکبرین کا لباس ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قمیص اور حِبرہ (چادر) کو بہت پسند فرماتے۔ حِبرہ چادر کی ایک قسم ہے، جس میں سُرخ دھاریاں ہوتی ہیں۔ آپ کو سفید رنگ سب سے زیادہ پسند تھا اور آپ نے فرمایا:۔

یہ سب سے بہتر کپڑا ہے، یہی پہنا کرو اور اسی سے مُردوں کو کفن دیا کرو۔

حضرت عائشہ ؓ سے ایک صحیح روایت مروی ہے کہ انہوں نے ایک پرانا کمبل اور موٹے سوت کی ایک چادر نکالی اور فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کپڑوں میں فوت ہوئے۔ آپ نے سونے کی انگوٹھی پہنی۔ پھر اُسے پھینک دیا اور سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔ اس کے بعد

آپ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی، اور اس سے منع نہیں کیا۔
رہی ابوداؤد کی روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض باتوں سے منع فرمایا تو اس میں یہ بھی ہے کہ:
آپ نے حاکم وقت کے سوا باقی سب لوگوں کو انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔
میں اس روایت کی صحت وعدم صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔
نیز آپ کی انگوٹھی کا نگینہ اندر کی طرف رہتا تھا۔ امام ترمذیؒ حدیث نقل کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو انگوٹھی اتار دیتے۔ امام ترمذیؒ نے اسے صحیح قرار دیا اور ابوداؤد نے اسے منکر قرار دیا۔ باقی طیلسان (سبز چادر جو عجمیوں کا لباس ہے) کے متعلق کچھ منقول نہیں کہ آپ نے پہنا یا نہیں اور نہ صحابہؓ سے متعلق کچھ منقول ہے، بلکہ صحیح مسلم میں حضرت نواسؓ بن سمعان کی روایت سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ اصفہان کے ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ خروج کرے گا جو یہ سبز چادریں پہنے ہوں گے۔ حضرت انسؓ نے ایک جماعت دیکھی جن کے بدن پر سبز چادریں (طیلسان) تھیں۔ تو انہوں نے فرمایا یہ لوگ خیبر کے یہودیوں سے کس قدر مشابہ ہیں۔ چنانچہ سلف کی ایک جماعت ان کا استعمال مکروہ سمجھتی تھی۔ کیونکہ ابوداؤدؒ اور حاکمؒ نے مستدرک میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جس نے جس قوم کا چلن اختیار کیا وہ اسی میں شمار ہوگا۔
اور ترمذی میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جو ہمارے سوا کسی دوسری قوم کا چلن اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں۔
باقی حدیث ہجرت میں جو یہ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کے پاس سر اور منہ ڈھانپے ہوئے تشریف لائے تو یہ کام آپ نے حالات ومصالح کے ماتحت کیا تاکہ کفار کی نظر سے پوشیدہ رہ سکیں۔ یہ عادت نہ تھی بلکہ ایک وقتی ضرورت کی بناء پر کیا گیا۔ نیز حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ اکثر سر اور منہ ڈھانپ لیا کرتے تو اس کے متعلق اصل بات کا تو اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ گرمی یا کسی دوسری ضرورت کے باعث ایسا کر لیتے ہوں، لیکن یہ اقدام تصنع یعنی تطلیس (عادتاً سر اور منہ ڈھانکنا) کے ماتحت نہ تھا۔

سوت، اون اور کتان کا لباس

اکثر اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سوتی لباس زیب تن فرماتے۔ گاہے گاہے صوف اور کتان کا لباس بھی پہن لیتے۔
شیخ ابو اسحاق اصفہانی صحیح سند سے حضرت جابر بن ایوب سے روایت کرتے ہیں انہوں

نے بتایا کہ حضرت صلت بن راشد حضرت محمد بن سیرین کے پاس تشریف لے گئے، ان کے بدن پر صوف (سیاہ) کا جبہ، صوف کا تہ بند اور صوف کا عمامہ تھا۔ امام محمد بن سیرین کو سخت کوفت محسوس ہوئی۔ فرمایا: میرا خیال یہ ہے کہ بعض لوگ اُون پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بھی تو یہ لباس پہنا تھا۔ حالانکہ مجھ سے اس شخص نے روایت کی، جسے میں کذب سے متہم نہیں کرتا کہ آپؐ نے کتان، صوف اور کپاس ہر طرح کا لباس پہنا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت زیادہ قابلِ اطاعت ہے۔ امام ابن سیرینؒ کی مراد یہ تھی کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سیاہ لباس مستقل طور پر استعمال کرنا دوسرے ملبوسات سے افضل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہی لباس پہنتے ہیں اور دوسرے لباسوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس طرح وہ صرف ایک ہی لباس اختیار کر لیتے ہیں اور ایسے ایسے رسومات اور مخصوص وضع قطع اختراع کر لیتے ہیں جس کا ترک کرنا موجبِ معصیت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایک ہی لباس کو لازم کر دینا اور اسی کو درست سمجھنا یہ ہے گناہ اور سب سے بہتر طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، جو مسنون ہے جس کا آپؐ نے حکم فرمایا، ترغیب دی اور خود اس پر مسلسل گامزن رہے۔

آپؐ کا طریقہ (سنت) لباس یہ ہے کہ کپاس کا ہو تو صوف یا کتان کا ہو تو کوئی سا اور جو بھی لباس میسر آئے پہن لیا جائے، آپؐ نے یمنی چادریں، سبز چادریں، جبہ، قباء، قمیص، پاجامے، تہ بند، چادر (سادہ) موزہ، جوتا ہر چیز استعمال فرمائی۔ نیز آپؐ نے کبھی عمامہ کا پلو پیچھے کی طرف لٹکا دیا اور کبھی نہیں لٹکایا اور گردن کے نیچے تک عمامہ کے بل لپیٹ لیا کرتے اور جب نیا کپڑا پہنتے تو پہلے اس کا نام لیتے اور پھر دعا پڑھا کرتے۔

اللھم انت کسوتنی ھذا (القمیص او الرداء او العمامۃ) اسالک خیرہ وخیر ماصنع لہ واعوذبک من شرہ وشرما صنع لہ۔

یعنی: اے اللہ تو نے مجھے یہ (قمیص، چادر یا عمامہ) پہنایا، میں تجھ سے اس کی بھلائی اور جس کے لیے بنی ہے اس کی بھلائی چاہتا ہوں اور اس کے شر سے اور جس کے لیے بنی ہے اس کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

اور جب آپ قمیص پہنتے تو دائیں طرف سے شروع فرماتے۔ اس طرح آپؐ نے سیاہ بالوں کا کمبل بھی اوڑھا۔ صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے اور آپ کے بدن پر سیاہ بالوں کا کمبل تھا۔

اور صحیحین (مسلم و بخاری) میں حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت انسؓ سے عرض

کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کونسا لباس زیادہ پسند تھا۔ انہوں نے فرمایا، حِبرہ اور حِبرہ یمنی چادروں میں سے ایک قسم کی چادر ہے، کیونکہ اس چادر کا زیادہ تر سوت یمن کا ہوتا تھا۔ اور یہ علاقہ قریب بھی تھا، بعض دفعہ شام اور مصر کا بنا ہوا لباس بھی پہن لیتے، جیسے قباطی چادر جو کتان سے بنائی جاتی تھی اور قبطی لوگ اس کا سوت کاتتے تھے۔

سنن نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صوف کی چادر بنائی تو آپ نے اوڑھ لی۔ جب آپ کو پسینہ آیا تو آپ نے صوف کی بو محسوس فرمائی۔ چنانچہ آپ نے اُسے اتار دیا، کیونکہ آپ خوشبو کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ سنن ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر بہترین لباس بھی دیکھے ہیں۔ سنن نسائی میں حضرت ابو رمثہؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ ارشاد فرماتے دیکھا۔ تو آپ پر دو سبز چادریں تھیں۔ سبز چادر میں سرخ جوڑے کی طرح سبز دھاریاں تھیں جو شخص حلۃ الحمراسے مراد گہرا سُرخ جوڑا سمجھتا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ یہاں بھی گہرا سبز رنگ کہے۔ حالانکہ محدثین میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔

آپ کا تکیہ چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اس طرح کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو حلال کر رکھا ہے اُسے حرام کرنے اور اُس کے استعمال سے روکنے کو زہد، پرہیزگاری اور تقویٰ کی ضمانت قرار دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ صرف اچھے اچھے لباسوں اور بہترین کھانوں ہی میں منہمک ہیں اور موٹا کپڑا اور گھٹیا کھانا، تکبر اور رعونت کے باعث استعمال نہیں کرتے۔ یہ دونوں گروہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف کی عادت تھی کہ وہ بہترین لباس و طعام یا بالکل ہی گھٹیا زندگی اختیار کر کے کسی طور پر بھی متعین صورت میں شہرت حاصل نہ کرنا چاہتے تھے اور سنن میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے شہرت کی خاطر لباس پہنا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔ پھر دوزخ میں اسی کے شعلوں میں جلے گا کیونکہ اس نے تکبر اور غرور کیا۔ لہٰذا اللہ نے اُسے ذلیل کیا، جیسے اس شخص کو سزا دے گا جو ازراہِ غرور و تکبر۔ تہ بند یا کپڑے کو لٹکاتا ہوا چلتا ہے، وہ زمین میں دھنسا دیا جائے گا، قیامت تک دھنستا ہی رہے گا اور صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو تکبر سے ازار گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نظر نہیں ڈالے گا۔ نیز سنن میں ان ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسبال

(تکبر سے کپڑا لمبا کرنا یا لٹکانا) تہ بند قمیص اور پگڑی سب میں ہوتا ہے۔ جس نے بھی ان میں سے کسی کو تکبر کی وجہ سے گھسیٹا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر بھی نہ اٹھائے گا۔ اور سنن میں حضرت ابن عمرؓ سے وہی مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ تہ بند کے متعلق فرمایا وہی قمیص کے متعلق بھی فرمایا، اسی طرح معمولی لباس کسی وقت قابلِ مذمت اور کسی وقت قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ اگر شہرت کے لیے ہو تو قابلِ مذمت۔ لیکن عاجزی اور مسکنت مقصود ہو تو قابلِ تعریف۔ جیسے کہ دکھاوے اور تکبر کے لیے بڑھیا لباس مذموم ہے۔ لیکن اگر اس سے اللہ کی نعمت کا اظہار مقصود ہو تو قابلِ ستائش ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہ جائے گا اور جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں کہ میرے کپڑے اچھے ہوں اور میرا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی کبر میں شامل ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو ہی پسند فرماتا ہے۔ کبر سے مراد حق سے سرکشی اور لوگوں کو ذلیل سمجھنا ہے۔

آں حضرتؐ کی غذا اور ماکولات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کھانے پینے میں بھی ایک مستقل سنت ہے۔ موجود کو رد نہ کرتے اور جو چیز موجود نہ ہوتی اس کا تکلف نہ کرتے، جو حلال اور پاک کھانا میسر آتا اسے کھا لیتے۔ ہاں اگر عزتِ نفس مجروح ہوتی تو حلال ہوتے ہوئے بھی اسے چھوڑ دیتے۔ آپؐ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ جی چاہا تو کھا لیا ورنہ چھوڑ دیا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عادت نہ ہونے کی وجہ سے گوہ نہ کھائی۔ لیکن امت پر حرام نہیں فرمائی، بلکہ آپکے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی اور آپ دیکھتے رہے۔ آپ نے حلویٰ اور شہد تناول فرمایا، یہ دونوں چیزیں آپ کو پسند تھیں۔ نیز آپ نے اونٹوں، بھیڑوں، مرغیوں، سرخاب، جنگلی گدھے، اور خرگوش کا گوشت تناول فرمایا۔ نیز سمندری جانور کا گوشت (مچھلی) کھایا۔ اس کے علاوہ آپنے بکری کا گوشت بھی استعمال فرمایا، اور تر اور خشک کھجور بھی تناول فرمائی۔ خالص دودھ، پانی ملا دودھ، ستو، اور شہد کو پانی میں ملا کر بھی نوش فرمایا، کھجور کا میٹھا پانی بھی پیا، نیز آپ نے خزیرہ بھی کھایا، جو دودھ اور آٹے سے بنتا ہے۔ تر کھجور کے ساتھ ککڑی کھائی، نیز پنیر کھایا، روٹی کے ساتھ خشک کھجور کھائی، سرکہ کے ساتھ بھی روٹی کھائی، ثرید بھی کھایا جو روٹی کو گوشت میں بھگو دینے سے بنتا ہے۔ اہالہ سے بھی

روٹی کھائی۔ اہالہ چربی کو کہتے ہیں جسنی ہوئی کلیجی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھائے۔ پکا ہوا کدو تو آپ کو بہت ہی محبوب تھا۔ ثرید گھی میں ملا کر پنیر، روٹی زیتون اور تر کھجور کے ساتھ خربوزہ اور خشک کھجور مکھن کے ساتھ بھی تناول فرمائی۔

آپ خوشبو کا ہدیہ ردّ نہ فرماتے اور نہ اس پے مجبور کرتے۔ بلکہ آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جو میسّر آیا کھا لیا۔ اگر کھانے کو نہ ملتا تو صبر کرتے، یہاں تک کہ آپ نے بھوک کی شدت کے باعث پیٹ پر پتھر باندھے۔ تین تین ماہ گزر جاتے اور آپ کے گھر میں (کھانا پکانے کے لیے) آگ نہ جلتی۔ سفر میں اکثر اوقات آپ زمین پر بیٹھ کر ہی کھانا تناول فرماتے اور یہی آپ کا دسترخوان ہوتا۔ آپ تین انگلیوں سے کھاتے اور فارغ ہونے کے بعد انہیں صاف کر لیتے۔ یہ کھانا کھانے کا سب سے بہترین طریقہ ہے، کیونکہ متکبر آدمی ایک انگلی سے کھاتا ہے اور حریص اور لالچی آدمی پانچوں انگلیوں سے کھاتا ہے۔ اور ہتھیلی سے منہ میں لقمہ دھکیلتا ہے۔

آپ سہارا لگا کر نہیں کھاتے تھے۔ آپ تین طرح سے تکیہ لگاتے۔ کبھی ایک طرف سہارا لگا کر بیٹھتے، کبھی پلتھی مار کر اور کبھی ایک ہاتھ سے سہارا لگاتے اور دوسرے سے کھاتے۔

آپ کھانے کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھتے اور آخر میں حمد کہتے۔ یعنی آخر میں آپ یہ دعا پڑھتے:

الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ غیر مکفی ولا مودع ولا مستغنی عنہ ربنا۔

کبھی آپ یوں حمد فرماتے:۔

الحمد للہ الذی یُطعِمُ ولا یُطعَمُ من علینا فھدانا والمعمنا واسقانا وکل بلاء حسن أبلانا الحمد للہ الذی اطعم من الطعام وسقی من الشراب وکسی من العری وھدی من الضلالۃ وبصر من العمی وفضل علی کثیر ممن خلق تفضیلا الحمد للہ رب العالمین۔

یعنی: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا، ہم پر اُس نے احسان کیا کہ ہمیں ہدایت دی، ہمیں کھلایا اور ہمیں پلایا اور اچھی آزمائش ہی میں ڈالا۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا۔ تن ڈھانکنے کو لباس دیا اور گمراہی میں ہدایت دی۔ دیدۂ کور کو بصارت دی اور اپنی کثیر مخلوق پر شرف عطا فرمایا۔ سب تعریفیں اللہ کی ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اور کبھی کبھی یوں پڑھا کرتے: الحمد للہ الذی اطعم وسقی وسوغہ، یعنی سب تعریفیں

کے لیے ہیں کہ اس نے کھلایا اور پلایا اور اسے خالص کر دیا"۔

اور جب آپ کھانے سے فارغ ہوتے تو اپنی انگلیاں صاف کر لیتے۔ آپ کے ہاں رومال نہ تھے کہ جن سے ہاتھ پونچھے جائیں۔ اور نہ یوں عادت مبارک تھی کہ جب بھی کھانا کھائیں تو ضرور ہی ہاتھ دھوئیں۔ اکثر اوقات بیٹھ کر پیتے بلکہ کھڑے ہو کر پینے پر زجر فرمایا ایک مرتبہ کھڑے ہو کر نوش فرمایا، لیکن مجبوری کے باعث اور اس واقعہ کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ آپ زمزم کے چشمہ پر تشریف لائے لوگ پانی پی رہے تھے۔ آپ نے ڈول لیا اور کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔ اس سلسلہ میں صحیح صورت مسئلہ یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔ اس موقع پر آپ مجبور تھے کہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس بحث سے تمام احادیث میں مطابقت ہو جاتی ہے۔

اور آپ جب کچھ پلاتے تو پہلے دائیں طرف سے شروع فرماتے۔ خواہ بائیں طرف کوئی بزرگ ہی کیوں نہ کھڑا ہوتا۔

ازدواجی معاملات اور معمولاتِ حیات میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصول اور اسوۂ حسنہ،

حضرت انس سے حدیث صحیح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔
مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، ایک عورت اور دوسری خوشبو۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں اور جن راویوں نے "تین چیزیں پسند ہیں" کی روایت کی ہے انہیں غلط فہمی ہوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین نہیں فرمائیں، کیونکہ نماز کی طرف اگر تیسری کی نسبت کی جائے تو یہ تو دنیا کی چیز نہیں ہے۔ عورتیں اور خوشبو آپ کو محبوب تھیں[1]۔ آپ ایک ہی رات میں تمام ازدواج مطہرات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آپ میں تیس[2] مردوں کے برابر قوت تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے

---

[1] آپ کو عورت اس لیے محبوب تھی کہ اس وقت انسانیت، معاشرے اور قوم کا مظلوم ترین طبقہ یہی تھا چنانچہ اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے جس نے حقوق میں اور فرائض میں، تعزیر اور عقوبت میں اور اجر و رحمت میں، ترکہ اور وراثت میں، حریت عقد و نکاح میں، حریت طلاق میں، حریت فکر و رائے میں، حریت انتخاب میں، مرد و زن کے حقوق کے درمیان کوئی تفرقہ روا نہیں رکھا، عورت کی مستقل حیثیت تسلیم کی اور اسے مستقل حقوق دیے (رئیس احمد جعفری)

[2] اس طرح کی روایتیں قطعاً ناقابلِ اعتماد ہیں، یہ واعظوں کی اختراعات ہیں۔ ابن قیم بہترین محدث ہونے کے باوجود اس جگہ ایک نکتہ جو اصولِ حدیث کا ایک بڑا اہم نکتہ ہے فراموش کر گئے یعنی کسی حدیث کی صحت کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے، کہ وہ صحاح ستہ میں آئی ہے، یا اس کے راوی غیر مجروح، عدول اور ثقہ ہیں، یا سند میں کسی طرح کا اختلال نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ روایت "درایت" کے معیار پر بھی پوری اترتی ہو، جس نبی کا کردار یہ ہو کہ ۲۵ سال کی عمر میں ۴۰ سال کی خاتون سے شادی کرلے، جس کی ایک کے سوا تمام ازواج بیوہ یا مطلقہ ہوں جس نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی ہو اور ازواج مطہرات سے کہہ دیا ہو کہ اگر اس طرح رہ سکتی ہو تو رہو، ورنہ پوری عزت کے ساتھ حق مہر دے کر میں رخصت کر دیتا ہوں، جو رات میں (باقی حاشیہ صفحہ ۱۲۲ پر)

میں جتنا کچھ آپؐ کے لیے مباح کیا تھا، امت کے لیے نہیں کیا تھا۔ آپ ازواج مطہرات کے حقوق میں پوری مساوات اور عدل ملحوظ رکھتے، کسی طرح کا فرق نہ کرتے۔ رہی محبت سو آپؐ فرمایا کرتے یا اللہ جس کا مجھے اختیار ہے اسکی تقسیم تو میں نے مساوی طور پر کر دی لیکن جو بات میرے بس میں نہیں اس پر مجھے ملامت نہ کیجیو۔[1] غیر اختیاری چیز محبت اور مباشرت تھی اور ان امور میں مساوات لازمی بھی نہیں۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری چیزیں ہیں۔
کیا آپؐ پر مساوات برتنا واجب تھا یا آپ کے اوقات بغیر کسی تقسیم کے تھے؟ اس میں فقہا مختلف الرائے ہیں۔ اس امت میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا! شادی کرو۔ کیونکہ اس امت کی زیادہ تعداد عورتوں پر مشتمل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق بھی دی لیکن پھر رجوع فرما لیا۔ ایک ماہ تک ازواج مطہرات سے ایلاء بھی کیا۔ لیکن آپؐ نے ظہار کبھی نہیں کیا اور جس[2] نے آپ کے ظہار کا ذکر کیا اس نے بالکل ہی غلط کہا۔ یہاں (ظہار بتانے والے، کی غلطی کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود آپؐ کو اس سے بری قرار دیا۔ آپ کے ازدواجی تعلقات حسن معاشرت اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی لڑکیوں کو حضرت عائشہؓ کے پاس کھیلنے کے لیے بلایا کرتے تھے اور جائز امور میں آپؐ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ اور جب عائشہ پانی پیتیں تو آپ ان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر وہیں لب مبارک لگا لیتے، جہاں سے انہوں نے پیا ہوتا اور جب وہ ہڈی پر سے گوشت کھاتیں تو آپ وہ ہڈی جس پر گوشت ہوتا لے کر وہاں منہ لگا لیتے، جہاں سے حضرت عائشہؓ نے کھایا ہوتا اور آپ ان کے زانو سے ٹیک بھی لگا لیتے اور اسی حالت میں قرآن کی تلاوت بھی کرتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ ایام سے ہوتیں مگر آپؐ انکی طرف متوجہ

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۱) اتنی عبادت کرتا ہو کہ پاؤں مبارک پر ورم آجاتا پھر اور لوگ جب یہ کہیں کہ آپؐ کو اتنی عبادت کی کیا ضرورت ہے جبکہ آپؐ معصوم ہیں اور وہ جواب دیتے کہ "کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"؟ اس کے بارے میں اس طرح کی روایتیں قطعاً ناقابل قبول ہیں اس لیے کہ درایت انہیں تسلیم نہیں کرتی۔ (رئیس احمد جعفری)

[1] آپ کو حضرت عائشہؓ سے زیادہ محبت تھی اور بلاشبہ محبت اختیاری چیز نہیں، لیکن اس میں بھی ایک اہم رمز ہے۔ اللہ نے آپؐ کے دل میں حضرت عائشہ کی محبت اس لیے زیادہ پیدا کی کہ آپؐ کا یہ اسوہ بھی تعدد ازدواج پر عمل کرنے والے لوگوں کے سامنے آجائے کہ ایک بیوی سے انتہائی محبت ہونے کے باوجود دوسری بیویوں کے حقوق میں کس طرح کامل مساوات قائم رکھی جا سکتی ہے ورنہ اگر آپؐ کو حضرت عائشہؓ سے زیادہ محبت نہ ہوتی تو امت، ایک بہت بڑے اسوہ سے محروم رہ جاتی۔ (رئیس احمد جعفری) (باقی حاشیہ ص۱۲۳ پر)

ہو جاتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ بہ حالت صوم تقبیل کرتے۔ یہ سب آپ کا اپنی ازواج مطہرات سے حسنِ اخلاق اور لطف و کرم کا نتیجہ تھا کہ آپ ان کے ساتھ کھیل بھی لیتے انہیں حبشی لڑکوں کا کھیل بھی دکھا دیتے جب وہ مسجد میں کھیل رہے ہوتے، ام المومنین آپ کے کندھوں کی اوٹ سے یہ منظر دیکھتیں۔ دو مرتبہ آپ ان سے دوڑ میں آگے بڑھ گئے۔ ایک مرتبہ ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہوئے باہر تشریف لائے۔

جب آپ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے، جس کے نام کا قرعہ نکل آتا وہی ساتھ جاتیں پھر کسی کے لیے کوئی عذر نہ رہ جاتا جمہور کا یہی مسلک ہے۔

آپ فرمایا کرتے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرتا ہو اور میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ تم سب سے بہتر سلوک کرتا ہوں۔

کبھی کبھی آپ نے تمام ازواج مطہرات کی موجودگی میں بھی کسی ایک کی طرف (از راہِ التفات) ہاتھ بڑھا دیا جب آپ نماز عصر پڑھ لیتے تو تمام ازواج مطہرات کے گھروں میں تشریف لے جاتے، ان کے پاس بیٹھتے، ان کے حالات معلوم کرتے۔ جب رات ہوتی تو وہاں تشریف لے آتے، جہاں باری ہوتی اور شب وہیں بسر کرتے حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ باری کی اتنی پابندی فرماتے کہ کبھی ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے۔ اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا کہ آپؐ سب ازواج مطہرات کے ہاں تشریف نہ لے گئے ہوں، آپ ہر ایک کے پاس بیٹھتے اور آخر کار جس کی باری ہوتی اس کے ہاں تشریف لے جاتے اور رات گزارتے۔ نو ازواج مطہرات میں سے آٹھ کی باری مقرر تھی۔

صحیح مسلم میں حضرت عطاءؒ کا قول منقول ہے کہ جن کی باری نہ تھی ان کا نام صفیہ رضؓ بنت حی ہے حالانکہ یہ حضرت عطاءؒ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے بلکہ یہ صاحبہ حضرت سودہؓ ہیں۔ حضرت سودہ نے سہولت سن کے سبب رضا کارانہ اپنی باری حضرت عائشہ رضؓ کو بخش دی تھی۔ چنانچہ آپؐ حضرت عائشہ رضؓ کے پاس ان کے اور حضرت سودہ رضؓ کے حصہ کے دو دو دن گزارتے۔

ایک اور روایت بھی ہے اور اصل واقعہ کا علم خدا ہی کو ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ رضؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۲) ؎۱ یہ مصنف کی اپج ہے، نہ حدیث ہے، نہ اثر۔ (رئیس احمد جعفری)

؎۲ یہ فقہ کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لیے بیوی سے علیحدگی رکھی جائے، لیکن طلاق نہ دی جائے۔ (رئیس احمد جعفری)

کس بات پر ناراض ہو گئے۔

حضرت صفیہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اگر تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے راضی کرا دو تو اپنی باری تمہیں بخش دوں گی۔ انہوں نے کہا اچھی بات۔ چنانچہ حضرت صفیہؓ کے باری کے دن حضرت عائشہؓ آپ کے پاس حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا، عائشہؓ تم کیسے آگئیں؟ واپس جاؤ، یہ تو صفیہؓ کی باری ہے۔[1] انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور سارا واقعہ عرض کر دیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہؓ سے خوش ہو گئے۔ اس وقت سے انہوں نے اپنی باری انہیں بخش رکھی تھی۔ یہ باری مخصوص تھی۔[2] اگر تقسیم اس طرح نہ کی جائے تو پھر باری سات ازواج ہی پر شمار کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح حدیث کے خلاف ہے، بلکہ باری آٹھ بیویوں کی مقرر تھی۔

اگر کسی ایسے آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آ جائے جس کی دو سے زیادہ بیویاں ہوں اور ایک بیوی اپنی باری دوسرے کو بخش دے تو کیا یہ جائز ہے؟ کہ خاوند اس بیوی کے پاس شب موہوبہ اور اصلیہ دونوں گزار سکے؟ اگرچہ شروع میں ان دونوں کی راتیں مسلسل نہ آ رہی ہوں، یا وہ اُسی رات اس کے پاس رہے جس میں بخشش کرنے والی کے پاس رہا کرتا تھا؟

امام احمد اور دوسرے حضرات کے اس باب میں مختلف قول ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے آخری اور پہلے ہر حصہ میں ازواجِ مُطہرات کے پاس جایا کرتے تھے۔ آپ کبھی غسل فرما کر سوتے اور کبھی وضو کر کے سو جاتے۔ ابو اسحاق سبیعی نے اسود سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے کہ "آپ بعض اوقات پانی کو چھوئے بغیر ہی سو جاتے"۔ ائمہ حدیث کے نزدیک یہ غلط روایت ہے اور ہم نے تہذیب سنن ابو داؤد میں اس روایت پر کافی تبصرہ کیا ہے، اور اس کے اشکالات اور علل کو واضح کر دیا ہے۔ نیز آپ ایک ہی غسل سے ازواج مطہرات سے قربت فرمایا کرتے تھے اور کبھی کبھی الگ الگ غسل بھی فرمایا۔

اور جب آپ سفر میں ہوتے تو واپسی پر رات کو گھر تشریف نہ لاتے بلکہ اس سے منع فرماتے تھے۔

---

[1] آپ کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناراضی کی حالت میں بھی آپ ازواج کے مابین عدل کا کس درجہ خیال رکھتے تھے؟ اور اس حالت میں بھی حضرت عائشہ کو ان کا دن دینے پر رضامند نہ ہوئے۔

(رئیس احمد جعفری)

[2] یعنی یہ پیش کش مستقل نہ تھی، ایک دفعہ کی نہ تھی۔ (رئیس احمد جعفری)

خواب اور بیداری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ

کبھی آپ بستر پر ہوتے، کبھی چمڑے پر، کبھی چٹائی بلکہ زمین پر بھی سوجاتے، کبھی چارپائی پر اور کبھی سیاہ کمبل پر آرام فرماتے۔ عباد بن تمیمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں چت لیٹے دیکھا کہ آپ نے ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا ہوا تھا اور آپ کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ آپ کے پاس ایک بالوں کا کمبل تھا، جسے دہرا کر کے بچھا دیا جاتا۔ ایک دفعہ چار تہیں کر کے بچھا دیا گیا تو آپ نے روک دیا اور فرمایا: اسے پہلے کی طرح (دوہرا) کر دو۔ کیونکہ آج کی رات اس نے مجھے نماز پڑھنے سے روک دیا تھا۔ الغرض آپ بستر پر بھی سوئے اور لحاف بھی اوڑھا اور اپنی ازواجِ مطہرات سے فرمایا کہ تم میں سے عائشہؓ کے سوا کوئی اور ایسا نہیں کہ جبریل اس کے بستر پر آئے ہوں۔

آپ کا تکیہ چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اور جب آپ سونے کے لیے بستر پر تشریف لے جاتے تو پڑھتے۔ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَحْيَا وَاَمُوْتُ۔ یعنی: اے اللہ تیرے ہی نام پر میں جیتا اور مرتا ہوں۔" نیز آپ دونوں ہاتھ اکٹھے کر کے ان میں قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر پھونک مارتے، پھر آپ انہیں اپنے جسم مبارک پر جہاں تک ممکن ہوتا پھیر لیتے۔ آپ سر، چہرہ اور سامنے کے حصہ سے ابتداء فرماتے۔ آپ یہ عمل تین مرتبہ کرتے۔ آپ دائیں پہلو پر سوتے، دایاں ہاتھ دائیں رخسارے کے نیچے رکھتے، پھر دعا فرماتے:۔

اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ۔ یعنی: اے اللہ مجھے اس دن کے عذاب سے بچالے جس دن اپنے بندوں کو اٹھائے گا۔

جب آپ بستر پر تشریف لے جاتے تو یہ دعا پڑھتے: الحمد اللہ الذی اطعمنا وسقانا وکفانا وآوانا فکم ممن لا کافی لہ ولا موؤی (مسلم) یعنی "سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، ہمیں پلایا ہمارے لیے کافی ہوا، ہمیں پناہ دی کیونکہ کتنے ہی ایسے ہیں جنہیں کفایت کرنے والا کوئی نہیں اور نہ پناہ دینے والا ہے۔"

نیز لکھا ہے کہ جب آپ بستر پر تشریف لے جاتے تو یہ دعا پڑھتے: اللھم رب السموات والارض ورب العرش العظیم، فالق الحب والنوی منزل التوراۃ والانجیل والقرآن۔ اعوذ بک من شر کل ذی شر انت آخذ بناصیتہ انت الاول فلیس قبلک شیٔ وانت الاخر فلیس بعدک شیٔ وانت الظاہر فلیس فوقک شیٔ وانت الباطن فلیس دونک

شیئٍ اقض عنی الدین واغننی من الفقر۔

یعنی "اے اللہ، اے آسمانوں اور زمینوں کے رب اور عرش عظیم کے پروردگار، دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے تورات، انجیل اور قرآن نازل کرنے والے میں ہر شر والی چیز کے شر سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں کہ تو ہی اسے قابو میں رکھنے والا ہے۔ تو ہی اوّل ہے تجھ سے پہلے کچھ نہ تھا تو ہی آخر ہے، تیرے بعد کچھ نہیں اور تو ہی ظاہر ہے، تیرے اوپر کچھ نہیں تو ہی باطن ہے، تیرے ماسوا کچھ نہیں۔ میرا قرض ادا فرما دے اور مجھے فقر سے غنی کر دے۔"

اور رات کو جب کسی وقت آنکھ کھلتی تو یہ دعا پڑھتے:۔

لا الٰہ الا انت سبحانك اللھم استغفرك لذنبی واسألك رحمتك اللھم زدنی علماً ولا تزغ قلبی بعد اذ ھدیتنی وھب من لدنك رحمۃ انك انت الوھاب۔

یعنی: (اے اللہ) تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ اے اللہ، میں اپنے گناہوں کی تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تیری رحمت کا سوالی ہوں۔ اے اللہ میرا علم زیادہ کر دے اور ہدایت کے بعد میرے دل کو کھوٹا نہ کر دینا، مجھے اپنی رحمت سے نواز۔ بے شک تو ہی بخشنے والا ہے۔"

اور جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔

یعنی: سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کے پاس (دوبارہ) جمع ہو کر حاضر ہونا ہے۔"

پھر آپ مسواک فرماتے اور بسا اوقات سورۃ آل عمران کی آخری دس آیات ان فی خلق السموات والارض الخ سے شروع کر کے تلاوت فرماتے اور یہ دعا پڑھتے:۔

اللھم لك الحمد انت نور السموات والارض ومن فیھن ولك الحمد انت قیم السموات والارض ومن فیھن ولك الحمد انت الحق ووعدك ولقاؤك حق والجنۃ حق والنار حق والنبیون حق ومحمد حق والساعۃ حق اللھم لك اسلمت وبك آمنت وعلیك توکلت والیك انبت وبك خاصمت والیك حاکمت فاغفر لی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت أنت الٰھی لا الٰہ الا انت۔"

یعنی: "اے اللہ تیری ہی تعریف ہے، تو ہی آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا نور ہے اور تیری ہی تعریف ہے تو ہی آسمانوں، زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے سب کا تھامنے والا ہے اور تیری ہی تعریف ہے تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری ملاقات حق ہے، جنّت حق ہے، دوزخ حق ہے، تمام انبیاء حق ہیں، محمدؐ حق ہیں، قیامت حق ہے۔ اے اللہ میں تیرا فرمانبردار ہوں۔ تجھ پر ایمان لایا، تجھ پر بھروسہ کیا، تیری طرف ہی جھکا، تیری مدد ہی سے جھگڑا، تیری طرف ہی بلایا، بس مجھے بخش دے جو میں نے پہلے (گناہ) کیے اور بعد میں کیے، جو میں نے چھپ کر کیے اور جو میں نے علانیہ کیے۔ تو ہی میرا معبود ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں"۔

اور آپ رات کو پہلے پہر سو جاتے اور آخر پہر بیدار ہو جاتے۔ کبھی کبھی آپ مصالح مسلمین کے لیے ابتداء شب میں جاگتے رہتے۔ آپ کی آنکھیں سوتیں مگر دل بیدار رہتا اور جب آپ سوتے تو جب تک خود نہ جاگ اُٹھتے جگایا نہ جاتا اور جب آپ آغاز شب میں کسی جگہ اترتے تو دائیں پہلو پر لیٹ جاتے اور جب صبح کے قریب قیام فرماتے تو بازو کا سہارا لے کر سر مبارک ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ (امام ترمذیؒ نے اسی طرح بیان کیا ہے۔

ابو حاتم نے صحیح میں لکھا ہے کہ آپ رات کو کسی منزل پر اترتے تو دائیں پہلو پر آرام فرماتے اور جب صبح سے قبل اترتے تو بازو اونچا کر لیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط فہمی ہے۔ البتہ امام ترمذیؒ کی روایت درست ہے۔ ابو حاتم نے لکھا ہے کہ تعریس (اکڑوں بیٹھنا) صبح سے قبل ہوتی تھی۔ آپ کی نیند سب سے زیادہ معتدل ہوتی تھی اور یہی سب سے بہتر نیند ہے اور اطباء کا قول ہے کہ نیند کا بہترین وقت تہائی رات ہے اور دن آٹھ گھڑیوں میں منقسم ہے!

سواری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ

آپ نے گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے پر بھی سواری فرمائی۔ کبھی گھوڑے پر کاٹھی ڈال کر سواری کرتے۔ کبھی ننگی پیٹھ پر بھی سواری فرما لیتے۔ کبھی کبھی اُسے دوڑایا بھی کرتے تھے۔ زیادہ تر تنہا سوار ہوتے تھے۔ گاہے گاہے اُونٹ کے پیچھے بھی کسی کو سوار کر لیتے۔ کبھی خود پیچھے بیٹھتے اور دوسرے آدمی کو آگے بٹھا لیتے۔ ایک بار تین آدمیوں نے بھی سواری کی۔ مردوں کو بعض اوقات اپنی ازواجِ مطہرات کو بھی۔

آپ کے مراکب کا بڑا حصہ اونٹ اور گھوڑے پر مشتمل تھا، رہے خچر تو معروف روایت یہ ہے

کہ آپ کے پاس صرف ایک خچر تھا، کسی بادشاہ نے بطور ہدیہ نذر کیا تھا۔ ارض عرب میں خچروں کا چلن نہ تھا لیکن جب آپ کو ایک خچر ہدیہ پیش کیا گیا تو گھوڑے اور گدھی کے ملاپ کے بارے میں سوال کیا گیا آپ نے فرمایا کہ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو ناداں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بکریاں

آپ کے پاس ایک سو بکریاں تھیں، آپ کو یہ پسند نہ تھا کہ بکریوں کی تعداد سو سے بڑھ جائے، جب کوئی بڑھ جاتی تو اس کی جگہ کسی دوسری (بکری) کو ذبح کر دیتے۔

نیز آپ کے پاس لونڈیاں اور غلام بھی تھے آپ کے آزاد کردہ غلام لونڈیوں سے زیادہ تھے۔ امام ترمذیؒ نے اپنی جامع ترمذی میں ابوامامہ وغیرہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت نقل کی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا جس آدمی نے کسی مسلمان مرد کو آزاد کیا تو یہ اسے جہنم سے نجات دلانے کا سبب ہوگا۔ اس کا ہر عضو اس کے ہر عضو کے بدلہ میں آزاد ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ صحیح روایت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلام آزاد کرنا زیادہ باعثِ اجر ہے اور ایک غلام دو لونڈیوں کے برابر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر آزاد کردہ مرد غلام ہیں۔ یہ ان پانچ مقامات میں سے ایک ہے جہاں عورت کو نصف مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا مقام عقیقہ کرنے کا ہے کیونکہ جمہور علماء کے نزدیک عورت کا عقیقہ ایک بکری اور مرد دو بکریوں سے ہوتا ہے اور اس مسلک کی تائید کئی صحیح اور حسن احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ تیسرا مقام گواہی دینے کے سلسلہ میں ہے، جہاں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر شمار ہوتی ہے۔ چوتھا میراث اور پانچواں دیت میں ہے[1]۔

---

[1] ابن قیمؒ نے یہ بات جس پیرایہ میں بیان فرمائی ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کے مابین نصف کا فرق ہے۔

لیکن بات یوں نہیں ہے، قرآن کریم اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاں تک حقوق کا تعلق ہے دونوں میں کامل مساوات ہے۔ قرآن نے اکثر مقامات پر "مومنین" اور "مومنات" کو ایک ساتھ مخاطب کر کے اجر و عقاب، ثواب و عتاب اور جنت و جہنم کی بشارت یا وعید دی ہے، بنیادی حقوق میں مرد اور عورت بالکل یکساں ہیں، جس طرح مرد آزاد ہے کہ جس سے چاہے شادی کرے اسی طرح یہ حق عورت کو بھی ہے، جس طرح مرد تجارت لین دین آزادانہ طور پر کر سکتا ہے عورت بھی کر سکتی ہے جس طرح مرد اپنی جائداد اور املاک کا مستقل مالک ہے اسی طرح عورت بھی ہے جس طرح مرد اپنے مستقل نام سے اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے اسی طرح عورت بھی اپنے مستقل نام سے اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے وہ شادی سے پہلے

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خرید و فروخت

منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد خریداری میں اضافہ اور فروخت میں کمی واقع ہوئی۔ اس طرح ہجرت کے بعد بھی آپ سے صرف چند معاملات میں فروخت منقول ہے اور اکثر یہ فروخت خریدنے والے کے لیے زیادہ سود مند ہوا کرتی تھی، جیسے پیالے اور پالان کی فروخت۔ ایک مدبر غلام یعقوب کی فروخت نیز ایک غلام کی دو غلاموں کے عوض فروخت۔ رہی آپ کی خریداری تو یہ آپ نے کثرت سے فرمائی۔ دوسرے آپ نے اجرت پر کام کیا بھی ہے اور لیا بھی ہے۔ آپ نے اجرت پر کام کرنے کے مقابلہ میں اجرت دے کر زیادہ کام لیا ہے۔

منقول ہے کہ آپ نے نبوّت سے قبل بکریاں چرانے کے لیے اجرت پر کام کیا ہے۔ نیز حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر شام کا سفر بھی اسی نوعیت کا تھا اور جب تجارت مضاربت کی صورت میں ہو تو مضارب، امین، اجیر، وکیل اور شریک، ۴ چار حیثیتیں رکھتا ہے۔

جب مال پر قبضہ ہو تو امین شمار ہوگا۔

جب مال میں تصرف کرے گا تو وکیل ہوگا۔

جب خود بھی کام کرے گا تو اجیر کہلائے گا۔

اور جب اس تجارت میں نفع ہوگا تو اس میں شریک بھی ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸) ماں بن کر باپ کا، اور شادی کے بعد مسز بن کر شوہر کا ضمیمہ بن کر اپنی انفرادیت سے محروم نہیں ہوتی۔ چوری، زنا اور دوسرے جرائم کی سزا جو مرد کے لیے ہے وہی عورت کے لیے بھی ہے۔ اعمال صالحہ کا اجر و انعام مرد کے لیے ہے عورت کے لیے بھی ہے۔

لیکن خلقی کمزوری یا توانائی کی بنا پر مرد اور عورت میں فرق مراتب ضرور ہے، لیکن یہ فرق مراتب بھی یک طرفہ نہیں ہے۔ اگر کسی معاملہ میں مرد کو عورت پر تفوق حاصل ہے تو کسی معاملہ میں عورت مرد پر تفوق رکھتی ہے۔ مثلاً پاکدامن عورت پر بدچلنی کا اتہام لگانے کی سزا اسّی کوڑے ہے، لیکن پاکدامن مرد پر بدچلنی کی تہمت پر یہ سزا نہیں ہے۔

رہے وہ پانچ مقامات جن کا علامہ ابن قیم نے حوالہ دیا ہے کہ "عورت نصف مرد کے برابر ہے"۔ تو ان کی توجیہ یہ ہے:

(۱) ایک غلام دو باندیوں کے برابر کارکردگی کی بنا پر مانا گیا ہے۔

(۲) عقیقہ کا یہ فرق اس لیے ہے کہ گو اولاد ہونے کی حیثیت سے لڑکا اور لڑکی برابر ہیں، لیکن لڑکے سے چونکہ خاندان کا نام چلتا ہے لہٰذا اس کی خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۰ پر)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح حاکم میں حضرت ربیع بن بدر سے انہوں نے ابوزبیرہ اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مالِ تجارت کے سلسلہ میں جرش (شام) کی طرف دو مرتبہ اجرت پر سفر کیا اور بتایا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ نیز نہایہ میں ہے کہ جرش ہیں، جو شام میں ایک شہر کا نام ہے، میں کہتا ہوں یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ ربیع بن بدر ثقہ راوی نہیں ہے۔ اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام نسائی، دارقطنی اور ازدی نے اسے متروک لکھا ہے۔ حاکم کا خیال یہ ہے کہ ربیع بن بدر در اصل طلحہ بن عبید اللہ کا غلام ہے اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تجارت میں شرکت بھی کی ہے، جب یہ شریک آپ کے پاس حاضر ہوا، آپ نے فرمایا:۔

"کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟"

اس نے عرض کیا، آپ میرے شریک تھے اور آپ بہترین شریک تھے۔ آپ نے نہ کبھی دھوکا دیا اور نہ جھگڑا کیا۔ تداری کا صیغہ مدارأۃ ہے۔ اس کے معنی ہیں حق بات کا مقابلہ کرنا۔" اگر اس کے آخر سے ہمزہ اڑا دیا جائے تو فقط مداراۃ رہ جاتا ہے تو اس کے معنی ہوں گے "اچھے طریقہ سے مدافعت کرنا"

نیز آپ نے وکیل بنایا، خود وکالت فرمائی۔ زیادہ تر آپ نے وکیل بنایا، آپ نے ہدیہ دیا ہدیہ قبول بھی کیا، اس کا بدلہ بھی دیا۔ اسی طرح بخشش فرمائی اور قبول بھی فرمایا۔ سلمۃ بن اکوع بیان کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں ایک لونڈی آئی۔ سلمۃ نے عرض کیا کہ اسے مجھے عنایت فرمائیے چنانچہ آپ نے اُسے عطا فرما دی تو اس نے اس کے بدلے میں مکہ میں محبوس مسلمان قیدیوں کو رہا کرالیا۔

رہن اور بغیر رہن ہر طرح قرض بھی لیا، نقد اور ادھار خرید کی۔ نیز اچھے اعمال، جو جنت کی ضمانت ہیں ان پر لوگوں سے اپنے رب کے ہاں ضمانت بھی دی۔ فوت شدہ مسلمانوں کے قرض ادا کرنے کی ضمانت بھی دی، نیز آپ پر جو بھی قرض تھے آپ نے سب ادا کر دیے تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حکم آپ کے بعد ہر امام اور امیر کے لیے ہے۔ اس طرح مسلمانوں کا بادشاہ مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی کا ذمہ دار

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹) (۳) شہادت میں مرد اور عورت کا فرق نزاکت، احساس، جذباتیت اور رقت قلب کی بنا پر ہے۔

(۴) میراث میں لڑکی کو لڑکے سے کم حصہ اس لیے ملتا ہے کہ لڑکا مہر دیتا ہے اور بیوی کے جملہ مصارف کا کفیل ہوتا ہے لہٰذا اس کا خرچ لڑکی کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔

(۵) یہی صورت وہبت کی بھی ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

ہوتا ہے اگر وہ ادا نہ کر سکیں تو ان کا قرض بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔ اگر مسلمان کی موت واقع ہو جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی کا بیت المال ذمہ دار ہوتا ہے۔ نیز اسی طرح اگر ان کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو تو بیت المال (خزانہ) ہی ان پر خرچ کرے گا۔

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ زمین تھی۔ اُسے آپ نے اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دیا تھا۔ آپ نے سفارش کی بھی اور سفارش قبول بھی فرمائی۔ بریرہ[1] نے آپ کی سفارش "مراجعت" کے سلسلہ میں نہ مانی۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ناراضی فرمائی، نہ عتاب فرمایا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، شمع راہ اور اسوہ حسنہ ہے۔ اسّی سے زیادہ مواقع پر آپ نے حلف اٹھایا۔ تین مقامات پر اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ ——— جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ: یعنی: اور تجھ سے معلوم کرتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ کہہ دے ہاں پروردگار کی قسم یہ سچ ہے۔

اور فرمایا: وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ قُلْ بَلَى وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ۔ یعنی: اور ان لوگوں نے جو منکر ہیں کہا ہم پر قیامت نہ آئے گی۔ کہہ دو ہاں پروردگار کی قسم البتہ آئے گی۔

اور فرمایا: زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَى وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا

---

[1] بریرہ کا واقعہ یہ ہے کہ شوہر سے طلاق لے لی، لیکن فرطِ محبت کے باعث شوہر نے طلاق واپس لینا چاہی، یعنی رجعت کرنا چاہی مگر بریرہ نے تجدید نکاح سے انکار کر دیا، اب شوہر فریاد کناں دربار رسالت میں حاضر ہُوا، آپ کو ترس آیا اور بریرہ سے سفارش فرمائی، بریرہ نے کہا:

"یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ"؟

آپ نے فرمایا: مشورہ!"

بریرہ نے کہا، آپ کا مشورہ مجھے منظور نہیں!"

آپ نے اس پر جبر نہیں کیا خاموش ہو گئے، کیونکہ اسلام میں شادی رضامندی طرفین کا نام ہے اور اگر یہ نہ ہو تو حاکم یا امیر کسی فریق پر جبر نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آج سے ۱۴ سو برس پہلے اسلام نے عورت کو وہ آزادی اور حریت عطا فرمائی تھی جو آج بھی اُسے حاصل نہیں ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

عَمِلْتُمْ وَذَالِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْرٌ" یعنی: "دعویٰ کرتے ہیں کہ ہرگز وہ مر کر دوبارہ نہیں اٹھیں گے، تو کہہ دے کیوں نہیں قسم ہے میرے رب کی، تم کو بے شک، اٹھنا ہے، پھر تم کو جتانا ہے، جو تم نے کیا اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق اکثر ابوبکر محمد بن داؤد ظاہری سے مباحثہ کیا کرتے تھے اور انہیں فقیہ نہیں مانتے تھے۔ ایک دن یہ صاحب اور ان کے ایک مخالف مقدمہ لے کر آئے تو ابوبکر سے حلف کے لیے کہا گیا یہ حلف کے لیے تیار ہو گئے۔ قاضی اسماعیل نے فرمایا: کیا اے ابوبکر تم جیسا شخص بھی حلف لے گا؟ انہوں نے جواب دیا اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنی کتاب میں تین مواقع پر قسم کھانے کا حکم دیا ہے، انہوں نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ تو ابوبکر نے یہ آیات پڑھ دیں۔ قاضی اسماعیل نے ان کی خوب تعریف فرمائی اور اُس دن سے انہیں فقیہ کے نام سے یاد کرنے لگے۔

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی حلف میں استثناء کر دیتے، کبھی کفارہ ادا فرماتے اور کبھی اسے نبھاہتے۔ استثناء کا مطلب حلف کو روکنا ہے۔ کفارہ کا مطلب قسم کھا کر اس کا عوض ادا کرنا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے "تحلۃ الایمان" قرار دیا۔

آپ مذاق بھی فرمایا کرتے، البتہ مذاق میں حق بات ہی کہتے۔ آپ توریہ بھی کرتے لیکن توریہ میں بھی حق بات کہتے، مثلاً کسی سمت کا ارادہ کرتے تو کسی دوسرے سے دریافت فرماتے۔ اس کا راستہ اور پانی کیسا ہے؟ اس کے میدان کیسے ہیں؟ وغیرہ۔ آپ مشورہ کرتے اور مشورہ دیتے بھی تھے۔ آپ مریض کی تیمارداری کرتے، جنازہ میں شریک ہوتے، دعوت قبول فرماتے۔ بیوہ، مسکین اور کمزور لوگوں کی ضروریات کے سلسلہ میں ان کے ساتھ رہتے۔ آپ نے شعر سنا، اس پر انعام بخشا، لیکن اس میں جو آپ کی حمد بیان کی گئی وہ بہت ہی کم تھی۔ پھر آپ نے انعام دیا۔ آپ کے علاوہ باقی لوگوں کی تعریف اکثر جھوٹ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوڑ کے مقابلہ میں آگے بڑھ گئے۔ آپ نے کشتی بھی لڑی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے جوتے کی مرمت بھی کی، کپڑوں میں پیوند لگایا، ڈول میں ٹانکا لگایا، بکری کا دودھ دوہا، کپڑے سئے۔ اپنی اور اپنے اہل کی خدمت کی، مسجد کی تعمیر کے موقع پر اینٹیں اٹھائیں۔ کبھی آپ نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے اور کبھی سیر ہو کر تناول فرمایا، آپ مہمان بنے اور میزبان بھی بنے۔ نیز آپ نے سر کے درمیان اور پاؤں کی پشت پر سنگھیاں لگوائیں۔ اور آپ نے گدی اور گردن پر بھی سنگھیاں

لگوائیں، آپ نے علاج کرایا، داغ دیا، لیکن داغ لگوایا نہیں۔ دم کیا، لیکن آپ کو دم نہیں کیا گیا اور مریض کو مضرت رساں باتوں سے پرہیز کا حکم دیا۔

طب کے اصول یہی تین ہوتے ہیں۔ پرہیز حفظِ صحت، اور مضر مادہ سے پرہیز اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے اپنی کتاب میں یہ تینوں چیزیں جمع کر دیں۔ نقصان سے بچنے کے لیے مریض کو پانی کے استعمال سے پرہیز بتایا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا: یعنی: اور اگر تم مریض ہو، یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے واپس آئے، یا تم عورتوں کو مس کرو، تم پانی نہ پاؤ تو پاک صاف مٹی سے تیمم کرو۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے مریض کو بخار کی حالت میں تیمم کی اجازت دی، جس طرح پانی نہ ہونے کی صورت میں بھی اجازت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے حفظِ صحت کی خاطر فرمایا:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ یعنی: پس تم میں سے جو کوئی مریض ہو، یا سفر پر ہو تو بعد کے دنوں میں روزے رکھ لے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مسافر کو رمضان المبارک میں اپنی صحت کے تحفظ کی خاطر افطار کی اجازت دی تاکہ روزہ اور سفر کی تکلیفیں اس پر غالب نہ آجائیں اور اس کی صحت اور قوت پر برا اثر نہ پڑے۔ اور محرم کو استفراغ کے لیے سر منڈانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ فرمایا:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ: یعنی جو تم میں سے مریض ہو یا سر میں تکلیف ہو تو روزوں یا صدقہ یا قربانی کا فدیہ دے۔

یہاں مریض کو اجازت بخشی کہ جس کے سر میں کچھ تکلیف ہو اور اس نے احرام بھی باندھ رکھا ہو تو وہ سر منڈا کر گندے مواد اور خراب بخارات سے کچھ نجات حاصل کر لے، جن سے جوئیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہ کعب بن عجرہ کو تکلیف ہو گئی تھی یا کوئی اور تکلیف (پھوڑے وغیرہ) ہو جائے اور طب کے بھی یہی تین قواعد و اصول ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان میں سے ایک ایک بات کا ذکر فرما دیا تاکہ اس کے بندوں کو صحت کی حفاظت اور فاسد مادوں سے نجات پانے کے لیے ایک راستہ بلکہ نعمت مل جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نوازش اور رحمت و کرم کرنا چاہتا ہے اور وہی مہربان رحم کرنے والا ہے۔

آں حضرتؐ کے معاملات و معمولات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم معاملات میں سب سے بہتر اور برتر تھے!

جب آپ کسی سے قرض لیتے تو بہت عمدگی سے ادا فرماتے جب آپ کسی آدمی سے قرض لیتے تو ادا کرتے اور یہ دعا دیتے:

بَارَكَ اللّٰهُ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ۔ یعنی: "اللہ تعالیٰ تیرے گھر اور مال میں برکت دے۔ قرض کی جزا حمد اور ادائیگی ہے"۔

آپ نے ایک آدمی سے چالیس صاع قرض لیے۔ بعد میں انصاری خود محتاج ہو گیا اور آپ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا، ابھی تک ہمارے پاس کچھ نہیں آیا، اس صحابی نے کچھ عرض کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا: اچھی بات کرنا، کیونکہ میں سب سے بہتر ادا کرنے والا ہوں، پھر آپ نے اُسے چالیس پہلے اور چالیس مزید یعنی اسّی صاع عطا فرمائے۔ یہ روایت بزار کی ہے۔

آپ نے ایک اونٹ ادھار خریدا، اس کے بعد وہ بیچنے والا آیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سختی کے ساتھ تقاضا کرنے لگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اُسے پکڑنا چاہا۔ آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو، کیونکہ حق دار کو کہنے کا حق حاصل ہے۔

ایک بار کوئی چیز خریدی۔ آپ کے پاس کوئی قیمت نہ تھی، آپ نے اس میں نفع حاصل کیا۔ آپ نے اسے بیچنے کے بعد اس کا نفع بنی مطلب کی بیواؤں پر تقسیم فرما دیا اور فرمایا کہ آئندہ میں اسی وقت کوئی چیز خریدوں گا جب میرے پاس قیمت ہوگی۔ اس روایت کو ابوداود نے نقل کیا ہے۔ یہ روایت ایک مدتِ معینہ کی خریداری والی روایت کے خلاف نہیں کیونکہ اس کا مطلب اور ہے اور اس سے کچھ اور مراد ہے۔

ایک بار ایک قرض خواہ نے سختی کے ساتھ قرض کا تقاضا کیا۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے اسے

پکڑنا چاہا، آپ نے فرمایا: اے عمرؓ ٹھہرو، میں اس بات کا زیادہ محتاج تھا کہ مجھے قرض ادا کرنے کی تاکید کرتے اور وہ اس بات، کا زیادہ محتاج تھا کہ اُسے صبر کی تلقین کرتے۔

ایک یہودی سے آپ نے مدت مقررہ تک کے وعدہ پر کوئی چیز خریدی وہ وعدہ سے قبل ہی آگیا اور قیمت مانگنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی مدت پوری نہیں ہوئی، اس نے کہا اے بنی مطلب تم لوگ ٹال مٹول ہی کیا کرتے ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے پکڑنا چاہا، آپ نے اُن کو روک دیا۔ اور اس کی درشت باتوں کے مقابلہ میں آپ کا حلم بڑھتا ہی گیا۔ آخر یہودی کہنے لگا میں آپ کی نبوت کی تمام علامات دیکھ چکا تھا۔ ایک باقی تھی اور وہ یہ کہ وہ نبی ہر جاہلانہ بات کے مقابلہ میں حلیم اور بُردبار ہوگا۔ چنانچہ میں نے یہی معلوم کرنا چاہا تھا، وہ یہودی مسلمان ہوگیا۔

تنہا اور صحابہ کرام کے ساتھ چلنے کی سنت طیبہ

جب آپ چلتے تو خم کھا کر چلتے اور آپ سب لوگوں سے تیز، زیادہ اچھے انداز میں اور زیادہ سکون سے چلتے۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا۔ گویا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر سورج چمک رہا ہے اور میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز رفتار کسی کو نہیں دیکھا۔ گویا کہ زمین آپ کی خاطر لپٹی جارہی ہے اور ہم پوری کوشش کرتے لیکن آپ کو نہ پا سکتے۔

علی بن طالب نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو خم کھا کر چلتے گویا بلندی سے اتر رہے ہیں اور بتایا کہ جب چلتے تو "تقلع" سے چلتے۔ تقلع بلند زمین کو کہتے ہیں۔ بخلاف اونچی جگہ سے اترنے کے اور یہ رفتار وقار اور ہمت و شجاعت کی علامت ہوتی ہے۔ یہ رفتار تمام رفتاروں سے زیادہ مناسب جسم کے لیے زیادہ آرام دہ اور تھکا دینے والی چال سے بعید ہوتی ہے۔ کیونکہ چلنے والا یا ڈگ بھر بھر کے چلے گا، گویا کہ ایک لکڑی اٹھا رکھی ہے۔ یہ چال بے ہودہ اور مذموم ہے اور یا پریشانی و اضطراب کی چال چلے گا، جیسے احمق اونٹ چلتا ہے یہ چال بھی مذموم ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کم عقل آدمی ہے، خصوصاً اگر چلتے چلتے دائیں بائیں بھی دیکھتا جائے اور یا پھر آرام سے چلے گا۔ یہی خدائے رحمٰن کے بندوں کی چال ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا: یعنی خدائے رحمٰن کے بندے جو زمین پر سکون سے چلتے ہیں۔"

متقدمین میں سے ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ جو تکبر کیے بغیر سکون اور وقار سے

چلتے ہیں اور اکڑ کر نہیں چلتے۔ یہی پُر وقار چال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ تھی اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ اونچی جگہ سے اتر رہے ہیں اور زمین گویا آپ کے لیے لپٹی جا رہی ہے، یہاں تک کہ ایک پیدل چلنے والا پوری کوشش کرتا پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہ پہنچ سکتا۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چال متکبرانہ اور تکلیف دہ نہ تھی بلکہ از حد معتدل تھی۔ چال کی دس قسمیں ہوتی ہیں۔ تین قسموں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ چوتھی دوڑنا، پانچویں رمل یعنی جو دوڑنے سے قدرے تیز ہوتی ہے اسے خبب بھی کہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کرتے وقت تین چکر تیز دوڑ کر یعنی خبب، سے پورے کیے اور چار میں آہستہ چلے۔ چھٹی قسم کو نسلان کہتے ہیں، یہ ایک ایسی دوڑ ہے کہ جس سے چلنے والا نہ تھکتا ہے اور نہ یہ چال تکلیف دہ ہوتی ہے۔ حدیث کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حجۃ الوداع میں بعض چلنے والے لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلنے میں تکلیف، کی شکایت پیش کی۔ آپ نے فرمایا ذرا تیز دوڑ سے مدد لو، ساتویں قسم خوزلی کہلاتی ہے۔ یہ (عورتوں کی طرح) جھک جھک کر چلنے کا نام ہے۔ اس میں انکسار نہیں بلکہ زنانہ پن پایا جاتا ہے۔ آٹھویں قسم قہقری ہوتی ہے۔ یہ دوڑ سے قدرے کم ہوتی ہے۔ نویں جمزی ہے۔ اس میں چلنے والا کود کود کر چلتا ہے۔ دسویں متکبرانہ چال، یہ متکبرین اور غرور کرنے والوں کی چال ہے۔ اور یہ وہ چال ہے کہ اس کی بنا پر ایک (بہت بڑے متکبر کو) جب اس نے فخر و غرور کا مظاہرہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اُسے زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنستا ہی چلا جائے گا اور تمام چالوں سے زیادہ معتدل چال سکون کی ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کے ساتھ آپ اس طرح ہوتے کہ صحابہؓ آپ کے آگے آگے چلتے اور آپ پیچھے رہتے اور فرماتے کہ میری پشت فرشتوں کے چلنے کے لیے (خالی) چھوڑ دو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو اپنے آگے آگے لے کر چلتے تھے۔ کبھی آپ ننگے پاؤں اور کبھی جوتا پہن کر چل لیتے صحابہؓ تنہا اور مجتمعاً ہر طرح چلتے۔

ایک مرتبہ آپ کسی غزوہ میں شریک ہوئے، آپؐ کی انگشت مبارک کٹ گئی۔ اس سے خون بہنے لگا تو آپ نے فرمایا: ھل انت الا اصبع دمیت، یعنی تو ایک انگلی تھی، جو خون آلود ہو گئی۔ و فی سبیل اللہ لقیت: اللہ تعالیٰ کے راستہ میں تجھے تکلیف پہنچی۔

کمزور صحابہؓ کو نرمی سے چلاتے اور ان کو سواری پر ساتھ بٹھا لیتے اور ان کے لیے دعا فرماتے اس روایت کو ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔

آپ کی نشست اور سہارا لگانے کا طریقہ

آپ زمین چٹائی اور بستر پر (ہر جگہ) بیٹھ جایا کرتے قیلہ بنت مخرمہ نے بتایا کہ ایک بار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ اکڑوں تشریف فرما تھے۔ جب میں نے آپ کو اس طرح عاجزی سے بیٹھے دیکھا تو ڈر کر کانپ گئی۔ جب عدی بن حاتم حاضر ہوا تو آپ اسے گھر لے گئے تو ایک لونڈی نے آپ کی خدمت میں بچھونا پیش کیا جس پر آپ بیٹھا کرتے تھے۔ آپ نے اس کو اپنے اور عدی کے درمیان رکھ دیا اور زمین پر بیٹھ گئے۔ عدی بتلاتے ہیں کہ میں نے سمجھ لیا کہ یہ بادشاہ نہیں ہیں۔ بعض اوقات آپ چت لیٹ جایا کرتے تھے، گاہے گاہے آپ ایک پاؤں دوسرے پر رکھ دیتے اور لیٹ جاتے۔ کبھی آپ تکیہ سے ٹیک لگا لیتے۔ کبھی دائیں پہلو اور کبھی بائیں پہلو پر بھی ٹیک لگا لیا کرتے۔ جب آپ باہر تشریف لے جانے کی ضرورت محسوس فرماتے تو کمزوری کی وجہ سے کسی صحابی کا سہارا لے لیتے۔

قضائے حاجت کا طریقہ

جب آپ بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو یہ دُعا پڑھتے:۔ اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ: یعنی، اے اللہ میں خبث اور خبائث سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ خبائث کا مطلب شیطان مردود کی نجاست اور خباثت ہوتی ہے اور جب آپ وہاں سے فارغ ہو کر باہر تشریف لاتے تو پڑھتے غفرانک؛ یعنی "تیری بخشش چاہتا ہوں"۔ کبھی آپ پانی سے استنجا فرماتے اور کبھی پتھر (مٹی) سے، کبھی دونوں کو استعمال فرماتے۔ اور جب آپ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور کبھی آپ کسی چیز سے پردہ فرما لیتے، کبھی کھجور کی ٹہنیوں اور کبھی میدان کے کسی درخت کی اوٹ فرما لیتے۔ اسی طرح جب آپ سخت زمین پر پیشاب کرنے کا ارادہ فرماتے تو زمین کو ایک لکڑی لے کر اُس سے کریدتے۔ یہاں تک کہ وہ نرم ہو جاتی، پھر پیشاب فرماتے۔ اور آپ ہمیشہ پیشاب کرنے کے لیے نرم زمین ہی تلاش فرماتے، جو بالکل پوپلی قسم کی نرم زمین ہوتی اور عام طور پر آپ بیٹھ کر پیشاب فرماتے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جو یہ کہے کہ آپ کھڑے ہو کر بھی پیشاب کر لیتے تھے۔ اس کی تصدیق نہ کرنا بلکہ وہ تو ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب کرتے تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ کی روایت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر بھی پیشاب کیا۔ محدثین اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ آپ نے یہ اس وجہ سے کیا کہ آپ کو درد کی شکایت تھی۔ یعنی شرعی عذر کے باعث ایسا کیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ شفا چاہنے

کے لیے ایسا کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عربوں کے ہاں پیٹھ کے درد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا علاج ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ آپ نے یہ کام پیشاب سے بچنے اور دور رہنے کے لیے کیا۔ کیونکہ یہ فعل آپ سے اُس وقت صادر ہوا، جبکہ آپ ایک کوڑے کے ڈھیر کے پاس تشریف لائے۔ آپؐ مزبلہ نام کی ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ جگہ اونچی تھی کہ اگر یہاں بیٹھ کر پیشاب کیا جاتا تو لوٹ کر اوپر آتا۔ آپؐ نے اسے سترہ بنایا۔ اس طرح آپؐ اس کے اور دیوار کے درمیان ہو گئے۔ اب کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

امام ترمذیؒ نے حضرت عمرؓ بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھڑے کھڑے پیشاب کرتے دیکھا تو فرمایا: اے عمرؓ! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو۔ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔ امام ترمذیؒ نے لکھا ہے کہ یہ عبدالکریم بن ابو مخارق سے مرفوع روایت ہے اور یہ راوی محدثین کے ہاں ضعیف ہے۔ مسند بزاز وغیرہ حضرت عبداللہ بن بریدہؓ سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین زیادتی کی باتیں ہیں۔ کہ آدمی کھڑا ہو کر پیشاب کرے یا نماز سے فارغ ہونے سے قبل ہی پیشانی کو صاف کرے یا سجدہ کی جگہ پر پھونک مارے۔ ترمذیؒ نے بھی اسے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے۔ بزازؒ نے کہا ہے کہ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ سعید بن جلید اللہ کے علاوہ اور کسی راوی نے حضرت عبداللہ بن بریدہ سے اسے روایت کیا ہے اور انہوں نے کسی قسم کی جرح بھی نہیں کی۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ یہ راوی بصری ہے اور مشہور ثقہ راوی ہے۔ جب آپ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو قرآن پاک کی تلاوت فرمالیتے۔ آپ استنجاء پانی یا ڈھیلے سے، بائیں ہاتھ سے کرتے۔ اس سلسلے میں ایسا کوئی فعل نہ کرتے جو وہمی لوگوں کی عادت ہے۔ مثلاً ذکر کو کھینچنا، کھانسنا، کودنا، رسی کو پکڑنا، سیڑھی پر چڑھنا، احلیل کے آخر میں روئی ٹھونسنا، پانی ڈالنا اور بار بار ادھر اُدھر گھومنا، یہ تمام باتیں صرف وہمی لوگوں کی ایجاد ہیں۔

ابو جعفر عقیل کہتے ہیں کہ جب آپ پیشاب کر رہے ہوتے اور کوئی آدمی سلام کرتا تو آپ جواب نہ دیتے۔ یہ واقعہ صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ اور بزازؓ کی مسند میں مذکور ہے کہ آپ نے سلام کا جواب دیا۔ پھر بعد میں فرمایا۔ میں نے اس خیال سے جواب دیا کہ تم کہو گے کہ میں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ آئندہ اگر مجھے اس حالت میں دیکھو، تو سلام مت کرو، کیونکہ میں سلام کا جواب نہ دوں گا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ مسلم کی روایت

زیادہ درست ہے۔ کیونکہ وہ روایت ضحاک بن عثمان عن نافع عن ابن عمر سے مروی ہے اور بزاز کی روایت ابوبکر سے جو کہ عبداللہ بن عمر کی اولاد میں سے ایک شخص تھے، انہوں نے نافع سے روایت کی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ صاحب ابوبکر بن عمر بن عبدالرحمن بن عبداللہ بن عمر ہیں۔ امام مالک وغیرہ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، لیکن ضحاک کی روایت زیادہ افضل ہے اور جب آپ پانی سے استنجا فرماتے تو اس کے بعد زمین پر ہاتھ رگڑتے اور جب آپ رفع حاجت کے لیے بیٹھتے تو جب تک زمین کے بالکل قریب نہ ہو جاتے، تب تک کپڑا نہ اٹھاتے۔

چند امور میں آپ کی سنت جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضو کرنے، دینے اور لینے کے موقع پر دائیں طرف سے شروع کرنا اچھا سمجھتے تھے۔ آپ کھانا کھانے، پانی پینے اور پاک کرتے وقت دایاں ہاتھ استعمال فرماتے اور دوسری باتوں کے لیے بایاں ہاتھ استعمال فرماتے۔ مثلاً خراب چیزوں کو ہٹانے اور صاف کرنے کے لیے یہی بایاں ہاتھ استعمال فرماتے تھے۔

سر منڈانے میں آپ کی سنت یہ تھی: یا تو سارا سر منڈاتے یا سارا رہنے دیتے اور ایسا نہ کرتے کہ کچھ حصہ منڈا دیں اور کچھ حصہ رہنے دیں۔ حلقِ رأس (سر منڈانا) آپ سے صرف قربانی کے موقع پر منقول ہے آپ مسواک کو پسند فرماتے، روزے اور افطار ہر حالت میں مسواک کرتے۔ نیند سے بیدار ہوتے وقت وضو کے وقت نماز اور گھر میں تشریف لے جاتے وقت مسواک کرتے۔ آپ اراک کی مسواک کرتے۔ آپ کثرت سے خوشبو لگاتے اور خوشبو کو بہت پسند فرماتے۔ روایت ہے کہ آپ نورہ[1] بھی استعمال فرماتے۔ ابتدا میں آپ بالوں کو ایسے ہی چھوڑ دیتے۔ بعد میں آپ نے مانگ نکالنی شروع کر دی۔ اس طرح آپ نے بالوں کے دو حصے کر دیے۔

اور سدل کا مطلب پیچھے کی طرف بغیر مانگ نکالے لٹکا دینا ہے۔ اس صورت میں دو حصے نہ کرتے۔ آپ حمام میں کبھی نہیں گئے۔ غالباً آپ نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں، اور حمام والی روایت صحیح نہیں۔ آپ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی۔ آپ ہر رات سوتے وقت اس میں سے ہر آنکھ میں تین سلائیاں ڈالتے۔

خضاب کے متعلق صحابہؓ کا اختلاف ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے خضاب نہیں لگایا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ خضاب کیا۔ حماد بن سلمہ نے حمید سے اور انہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خضاب لگاتے ہوئے دیکھا۔ حماد کہتے ہیں کہ عبداللہ

---

[1] چونے اور ہڑتال کا مرکب۔

ن محمد بن عقیل نے مجھے بتایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو حضرت انسؓ کی موجودگی میں خضاب لگا دیکھا۔ ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوشبو استعمال فرماتے تھے کہ آپ کے بال سُرخ ہو گئے۔ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ (سرخ) خضاب لگا ہے، حالانکہ آپ خضاب نہ لگاتے۔ ابورِمثہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی تھا۔ آپ نے پوچھا: تمہارا بیٹا ہے؟ میں نے عرض کیا جی، ہاں! آپ گواہ رہیے۔ پھر آپ نے فرمایا: نہ تو اس کے لیے باعثِ اذیت ہو نہ وہ تجھے دکھ دے اور فرمایا میں نے بڑھاپے کو سُرخ دیکھا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یہ روایت زیادہ معتبر ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوڑھے نہیں تھے۔ حماد بن سلمہ سماک بن حرب سے روایت کرتے ہیں کہ جابر بن سمرةؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر بڑھاپے کے نشانات تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر مانگ کے قریب چند بالوں کے سوا بڑھاپے کی سفیدی نہ تھی۔ جب آپ تیل لگاتے تو اُس وقت وہ نظر آجاتے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر اور داڑھی میں کثرت سے تیل لگایا کرتے تھے اور آپ اکثر سر پر کپڑا رکھا کرتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے تیل کا کپڑا ہے۔ آپ کنگھی کرنا پسند کرتے۔ کبھی آپ خود ہی کنگھی کرتے اور کبھی حضرت عائشہؓ کرتیں۔ آپ کے بال نہ زیادہ تھے نہ کم۔ آپ کے بال کانوں کی لَو تک آجاتے، جب بڑھ جاتے تو آپ اُن کی چار لٹیں بنا لیتے۔

حضرت ام ہانیؓ بتاتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہمارے یہاں تشریف لائے اور آپ کی چار لٹیں تھیں۔ یہ روایت صحیح ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو رد نہ فرماتے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا، جس کو ریحان دیا جائے وہ رد نہ کرے، کیونکہ خوشبو مختصر اور ہلکی ہوتی ہے یہ الفاظ روایت میں ہیں بعض حضرات روایت کرتے ہیں کہ جسے خوشبو پیش کی جائے، وہ اُسے رد نہ کرے اس کا مطلب پہلی سے مختلف ہے، کیونکہ ریحان لینا زیادہ احسان مندی کی بات نہیں۔ اکثر لوگ ریحان ایک دوسرے کو دیتے ہی رہتے ہیں۔ بخلاف مشک عنبر اور دوسری بیش قیمت خوشبویات کے کہ انہیں عام طور پر دینے کا رواج نہیں، لیکن عروہ بن ثابت کی روایت جو حضرت ثمامہ سے ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو رد نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً حدیث ہے کہ وہ تین باتوں کے متعلق کہتے ہیں کہ تکیہ، تیل اور دودھ کو آپؐ رد نہیں فرماتے تھے، یہ معلول روایت ہے۔ امام ترمذیؒ نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی تعلیلات کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کی تعلیل مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کیا بتایا تھا۔ ہاں عبداللہ بن مسلم بن جندب کی اپنے والد سے اور ان کی ابن عمرؓ سے روایت نیز

ابو عثمان کے مراسیل سے بھی روایت ہے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو ریحان دیا جائے تو اسے رد نہ کرے، کیونکہ یہ جنت سے نکلا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خوشبو دانی تھی جس سے آپ خوشبو لگایا کرتے اور سب سے زیادہ آپ کو مشک کی خوشبو پسند تھی اور فاغیہ خوشبو آپ کو بہت ہی بھلی لگتی، کہتے ہیں کہ یہ حناء کی خوشبو ہوتی ہے۔

مونچھیں ترشوانے کا بیان

ابو عمر بن عبد البر نے بتایا کہ حسن بن صالح نے سماک سے اور انہوں نے عکرمہؓ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مونچھیں تراشتے تھے اور لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی مونچھیں تراشا کرتے تھے۔ محدثین کی ایک جماعت اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ پر موقوف سمجھتی ہے ترمذیؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو اپنی مونچھیں نہ کٹوائے وہ ہم میں سے نہیں[1] ترمذی اسے صحیح روایت قرار دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مونچھیں کاٹو اور داڑھی بڑھاؤ۔ اور مجوسیوں کے طریقے اختیار نہ کرو۔ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت مذکور ہے کہ "مشرکوں کی مخالفت کرو، ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں تراشو" صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ چالیس دن رات نہ گزرنے پائیں کہ تم مونچھیں کٹواؤ اور ناخن کٹواؤ۔

اسلاف کے مابین مونچھیں کٹوانے اور منڈوانے میں اختلاف رہا ہے کہ کونسا طریقہ بہتر ہے؟ امام مالک موطا میں لکھتے ہیں کہ اتنی مونچھیں کاٹی جائیں کہ لب کے کنارے ظاہر ہو جائیں یعنی جلد نظر آجائے۔ ابن عبدالحکیم مالکؒ سے روایت کرتے ہیں کہ مونچھیں "اعفاء" کی جائیں اور ڈاڑھی لٹکائی جائے اور اعفاء بالکل جلد سے مونڈنے کا نام نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ مونچھیں مناسب طریقہ سے بنائے ابن قاسم نے ان سے روایت کیا ہے کہ میرے نزدیک مونچھوں کا جڑ سے منڈوا دینا ایک قسم کا مثلہ ہے۔ مالکؒ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اعفاء الشارب کا مطلب احاطہ کرنا ہے اور امام مالکؒ اوپر سے بال لینے کو مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ مونچھوں کا بالکل جڑ سے مونڈ دینا بدعت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مرتکب کو جسمانی سزا دینی چاہیے اور امام

---

[1] یہ حدیث صحیح نہیں ہے (رئیس احمد جعفری)

مالک مزید بتاتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جب کوئی دکھ پہنچتا تو پھونکنے لگتے، پاؤں چادر میں لپیٹ کر دیتے اور مونچھوں کو بٹتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے کہ مونچھوں میں اعفاء (مونڈنا) سنت ہے۔ امام طحاوی بتاتے ہیں کہ ہمیں امام شافعیؒ سے اس کے متعلق کوئی قول نہیں پہنچا اور ابوحنیفہؒ، ابویوسفؒ، زفرؒ، اور امام محمدؒ کا مسلک سر اور مونچھوں کے متعلق یہ ہے کہ مونڈ دینا کترنے سے بہتر ہے۔ ابن خویز منداد مالکی، امام شافعیؒ کے متعلق نقل کرتے ہیں کہ ان کا مسلک بھی ابوحنیفہؒ کے مطابق تھا۔ ابوعمرؒ کا قول بھی یہی ہے۔ اثرمؒ نے امام احمدؒ کے متعلق کہا ہے کہ میں نے امام احمد کو دیکھا کہ وہ خوب جڑ سے مونچھوں کو منڈوا دیتے تھے۔ میں نے سنا کہ وہ اس بات کو سنت قرار دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ خوب مونڈ دینا چاہیے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مونچھیں مونڈ دو۔ امام حنبلؒ بتاتے ہیں کہ ابوعبداللہ سے پوچھا گیا کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ انسان کچھ مونچھیں کٹوا دے یا بالکل منڈوا دے یا کوئی اور طریقہ اختیار کرے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بالکل منڈوا دینے میں کوئی گناہ نہیں اور اگر کتروا دیا تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ ابومحمد نے مغنی میں لکھا ہے کہ اس بات کا اختیار ہے چاہے تو بالکل منڈوا دے اور چاہے تو صاف کتروا دے۔ طحاویؒ بتاتے ہیں کہ مغیرہؓ بن شعبہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک پر بال رکھ کر اپنی مونچھوں کو کاٹ دیا اور اس طرح بالکل "مونڈنا" نہیں ہو سکتا اور حضرت عائشہؓ و حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے دلیل پیش کی ہے جنہوں نے آپ کا "اعفاء" (بالکل مونڈ دینا) نہیں دیکھا۔ اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ دس باتیں فطرت کی ہیں ان میں قص الشارب (مونچھوں کو کترانا) روایت کیا ہے اور وہ روایت جو متفق علیہ ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ فطرت کی پانچ باتیں ہیں، ان میں سے مونچھوں کو کتروانا بھی ہے اور منکرینؒ نے اس حدیث سے دلیل پیش کی ہے کہ جس میں مونڈ دینے کا حکم ذکر ہے اور وہ روایت بھی صحیح ہے۔ نیز حضرت عباس کی روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مونچھوں کو مونڈ دیتے تھے امام طحاوی بتاتے ہیں کہ اس سے اچھی طرح مونڈ دینا مراد ہے اور حقیقتاً یہاں دونوں صورتوں کا احتمال ہے۔ مزید برآں ابوسعید، ابواسید، رافع بن خدیج، سہل بن سعد، عبداللہ بن عمر، جابر اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہم کے متعلق لکھا ہے کہ یہ سب حضرات مونچھیں منڈوایا کرتے تھے۔ ابراہیم بن محمد بن حاطب بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا کہ وہ اس طرح مونچھیں منڈواتے تھے کہ جیسے بال ہی اکھیڑ دیئے ہوں۔ بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ ان کی جلد کی سفیدی نظر آتی تھی طحاوی بتاتے ہیں کہ تمام حضرات کے خیال میں کترنا سنت ہے۔ ہاں حلق (مونڈ دینا) سر پر قیاس کرتے

ہوئے زیادہ افضل ہے۔ ایسے ہی مونچھوں کا مونڈ دینا افضل ہے۔

گفتگو، خاموشی، ہنسنے اور رونے میں آپ کی سنتِ طیبہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے زیادہ فصیح، شیریں بیان اور گفتگو میں حلاوت اور تسلسل لیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کا کلام دلوں میں کھب جاتا اور روح کو گرما دیتا۔ دشمن بھی آپ کے ان صفاتِ حمیدہ کے معترف تھے۔ جب آپ گفتگو فرماتے تو واضح اور جُدا جُدا الفاظ بولتے، کلام کو آپ دہراتے، اتنا تیز نہ بولتے کہ سامعین یاد نہ رکھ سکتے۔ اور جملوں میں اتنا سکوت نہ ہوتا کہ وہ گراں گزرتا۔ بلکہ آپ کا انداز کلام ہر لحاظ سے بہتر اور مکمل تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح مسلسل تیز گفتگو نہ فرماتے، بلکہ آپ جُدا جُدا اور واضح گفتگو کرتے کہ پاس بیٹھنے والا اُسے یاد کر لیتا۔ اکثر اوقات آپ ایک بات کو تین تین بار دہراتے تاکہ خوب یاد ہو جائے اور جب آپ سلام کرتے تو تین بار سلام فرماتے۔ اکثر اوقات آپ خاموش رہتے۔ ضرورت کے بغیر کلام نہ فرماتے۔ آپ کلام کا آغاز اور انجام جبڑوں کے دہانے سے کرتے (یعنی توجہ سے بات فرماتے) آپ جامع کلام فرماتے۔ بات نہ زیادہ طویل ہوتی اور نہ بے معنی حد تک مختصر ہوتی اور ضرورت کے بغیر آپ کلام نہ فرماتے۔ صرف اس معاملہ میں کلام فرماتے جہاں ثواب کی امید ہوتی۔ جب آپ کسی بات کو ناپسند فرماتے تو چہرے سے ظاہر ہو جاتا۔ آپ لغو کلام اور بے ہودہ گو نہ تھے اور نہ تیز کلام تھے۔ اور آپ کا ہنسنا اکثر تبسم کی حد تک رہتا بلکہ آپ محض تبسم ہی فرماتے۔ آپ کے ہنسنے کی آخری حد یہ تھی کہ فقط ڈاڑھیں نظر آجاتیں۔ کسی ہنسی کی بات پر آپ مسکرا دیتے۔ یعنی کوئی قابلِ تعجب بات ہو جاتی، جس کا وقوع نادر اور عجیب سمجھتے۔

ہنسی کے کئی اسباب ہیں جن میں سے ایک تو گزر چکا۔ دوسرا خوشی کے باعث ہنسنا یعنی کوئی ایسی بات یا واقعہ جو گدگدی پیدا کر دے۔ تیسرا غصے کے وقت ہنسنا یعنی زہرخند اور یہ اکثر غصہ میں ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ غصہ کرنے والا انسان، غصہ کا سبب دیکھ کر تعجب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مثلاً دشمن میرے قبضہ میں آچکا ہے اور اب میں اس پر قابض اور بااختیار ہوں، کبھی غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے ہنستا ہے، تاکہ غصہ سے توجہ ہٹ جائے اور اس کے نتائج ختم ہو جائیں۔

ہنسنے کی طرح آپ کا رونا بھی ایسا ہی تھا کہ اس میں چیخنا چلانا اور آواز نہ تھی جس طرح ہنسنے کے وقت قہقہہ نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح گریہ کے موقع پر اتنا ضرور ہوتا کہ آپ کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور

آنسو بہ جاتے اور سینہ سے رونے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی۔ کبھی تو میت پر رحمت کے باعث رو پڑتے۔ کبھی امت پر نرمی اور خطرات کے باعث، کبھی اللہ تعالیٰ کے ڈر سے اور کبھی قرآن مجید سنتے سنتے رو پڑتے۔ یہ آخری رونا محبت و اشتیاق اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے خوف سے ہوتا۔ جب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام فوت ہوئے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور نرم دلی کے باعث رو دیے اور فرمایا:

آنکھ روتی ہے، دل غم کھاتا ہے۔ البتہ ہم وہی کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اے ابراہیم تمہارے لیے ہمیں غم ضرور ہے۔

نیز جب آپ نے ایک نواسی کو حالتِ نزع میں دیکھا تو رو پڑے اور جب حضرت ابن مسعودؓ نے آپ کے سامنے سورۂ النساء کی تلاوت کی اور اس مقام پر پہنچے، جہاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ یعنی: پھر کیا حال ہو گا جب ہم بلائیں گے ہر امت میں سے احوال کہنے والا اور بلا دیں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا۔

جب عثمان بن مظعون فوت ہوئے تو بھی آپ رو دیے پھر جب سورج گرہن ہوا اور آپ نے نماز کسوف پڑھی تو آپ نماز میں رونے لگے اور کہا: اے (میرے) پروردگار کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہ کیا تھا کہ جب تک میں ان میں ہوں تو ان کو عذاب نہ دے گا اور وہ بخشش چاہتے رہیں گے اور ہم بخشش چاہتے ہیں"۔ اور جب آپ اپنی ایک بیٹی کی قبر پر تشریف فرما ہوئے تو رو پڑے اور کبھی آپ رات کی نماز (تہجد) میں روتے تھے۔

رونے کی کئی اقسام ہیں، ایک تو رحم کرتے ہوئے رونا اور نرم دلی سے رونا دوسرا ڈر اور خوف سے رونا، تیسرے محبت اور اشتیاق میں رونا، چوتھے خوشی و انبساط کا رونا۔ پانچواں تکالیف اور ناقابلِ برداشت مصائب پر رونا، چھٹا غم کا رونا۔ اس موخر اور خوف کے رونے میں فرق یہ ہے کہ غم کا رونا دہ ہوتا ہے، جو کسی گم شدہ محبوب چیز یا گزشتہ مصائب پر ہو اور خوف کا رونا آئندہ متوقع خطرات کے سبب سے ہوتا ہے۔ خوشی و انبساط اور غم کے رونے میں یہ فرق ہے کہ خوشی کا رونا ٹھنڈا ہوتا ہے اور دل بھی مسرور ہوتا ہے اور غم کا رونا گرم ہوتا ہے اور دل بھی غمگین ہوتا ہے۔ اس لیے خوشی کے موقع پر کہا جاتا ہے آنکھوں کی ٹھنڈک، اللہ تعالیٰ اس کی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور غم کے موقع پر بولا جاتا ہے آنکھوں کی حرارت۔ اللہ تعالیٰ اس کی آنکھیں گرم کرے۔ ساتواں ضعف و

ناتوانی کا رونا، آٹھواں منافقت سے رونا۔ اس میں آنکھ روتی ہے اور دل پتھر کی طرح سخت ہوتا ہے۔ ظاہری طور پر تو یہ آدمی بڑا نرم دل نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں بڑا سنگدل ہوتا ہے۔ نواں مستعار طور پر رونا اور مزدوری پر یعنی اجرت پر رونا، جیسے رونے والیاں اجرت لیکر روتی ہیں۔ بقول حضرت عمرؓ بن خطاب یہ عورتیں آنسوؤں کی تجارت کرتی ہیں، اور مردوں کے دکھ پر روتی ہیں۔ دسواں حمایت کرنے کے لیے رونا کہ جب لوگوں کو کسی مصیبت میں روتا دیکھے تو یہ بھی رو پڑے۔ اور یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کیوں رو رہے ہیں۔ صرف انہیں روتے دیکھا تو یہ بھی رونے لگا اور جس رونے میں محض آنسو ہوں اور آواز نہ نکلے وہ بند رونا ہوتا ہے اور جس رونے میں آواز بھی ہو تو اُسے لکائے ممدود (آواز والا رونا) کہتے ہیں جیساکہ شاعر نے کہا ہے ؂

بکت عینی وحق لها بکاها وما یغنی البکاء ولا العویل

یعنی "میری آنکھ رو پڑی اور اُسے رونے کا حق بھی تو ہے۔ رونے اور چیخنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں"۔
اور جو محض تکلف کرکے رویا جائے اسے "تباکی" (مصنوعی رونا) کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قابل تعریف اور دوسرا قابل مذمت ہوتا ہے، دکھاوے اور ریاکاری کے لیے نہیں بلکہ نرم دلی اور خوف خدا پیدا کرنے کے لیے رونے کی کوشش قابلِ تعریف ہے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے رونا قابلِ مذمت ہے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بدر کے قیدیوں کے متعلق روتے دیکھا تو دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتائیے کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اگر مجھے رونا آگیا تو رو پڑوں گا، ورنہ مصنوعی طور پر رونے کی حالت ضرور کرلوں گا اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بُرا نہیں کہا۔ سلف صالحین سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روؤ، اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنالو۔

خطباتِ نبویؐ

آں حضرتؐ کا انداز و اسلوبِ خطابت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر، منبر پر اور اونٹ بلکہ اونٹنی پر بھی خطبہ دیا ہے۔ جب آپ خطبہ فرماتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور جلال بڑھ جاتا، جیسے کہ کوئی کسی لشکر سے ڈرا رہا ہو کہ صبح یا شام کو آنے ہی والا ہے اور فرماتے تھے کہ مجھے اور قیامت کو اس طرح بھیجا گیا اور شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ذرا سے فرق سے دکھاتے اور فرماتے کہ اس کے بعد سب سے بہتر کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) ہے اور بہترین تحفہ (سنت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ سب سے بدترین کام بدعت (دین میں نئی ایجادات) ہیں اور ہر نئی ایجاد (بدعت) گمراہی ہے۔

آپ جو بھی خطبہ دیتے اللہ تعالیٰ کی تعریف سے اُس کا آغاز فرماتے۔ رہا اکثر فقہاء کا یہ کہنا کہ آپ بارش کی دعا کا خطبہ استغفار سے اور عید کا خطبہ تکبیر سے شروع کرتے تو اُن کے پاس اس مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہیں، حالانکہ آپ کی سنت اس سے جدا بات کی مقتضی ہے۔ یعنی تمام خطبات کے آغاز میں الحمد اللہ (اللہ کی تعریف) کہنا ثابت ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس مسلک کو اختیار کیا ہے اور ہمارے شیخ ابن تیمیہ نے بھی اس کو ترجیح دی۔ نیز آپ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ مراسیل عطاء وغیرہ میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر تشریف لاتے تو چہرۂ انور لوگوں کی طرف کر لیتے پھر السلام علیکم فرماتے۔ امام شعبیؒ بتاتے ہیں کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ رضی اللہ عنہما ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ آپ استغفار پر خطبہ ختم فرماتے۔ آپ زیادہ تر قرآن مجید سے ہی خطبہ دیتے۔

صحیح مسلم میں ام ہشام بنت حارثہ سے روایت ہے کہ میں نے ق والقرآن المجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن سن کر یاد کر لی تھی کیونکہ آپ ہر جمعہ مبارک کو منبر پر اسے پڑھا کرتے تھے جب آپ لوگوں کو خطاب فرماتے۔ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے تو پڑھتے:

الحمد اللہ نستعینهٗ ونستغفرهٗ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا من یهد اللہ فلا مضل لهٗ ومن یضلل فلا هادی لهٗ واشهد ان لا الٰه الا اللہ وان محمد عبدهٗ ورسوله ارسلهٗ بالحق بشیراً ونذیراً بین یدی الساعة من یطع اللہ ورسولهٗ فقد رشد

ومن یعصھما فانہ لا یضر الا نفسہ ولا یضر اللہ شیئاً۔

یعنی "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم اُسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے بخشش چاہتے ہیں اپنے آپ کی شرارتوں سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں جسے اللہ ہدایت دے اُسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں اور جسے گمراہ کرے اُسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ ان کو قیامت کے قریب ہی حق پر خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر مبعوث فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو بے شک وہ ہدایت پا گیا اور جو دونوں کی نافرمانی کرے۔ تو وہ صرف اپنا نقصان کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا"

ابوداؤد نے یونس سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابن شہابؒ سے جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف آوری کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بھی یہی الفاظ بتلائے۔ ہاں انہوں نے اتنا زیادہ بتایا، کہ آپ فرماتے:

"ومن یعصھما فقد غوی" یعنی "کہ جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا تو وہ گمراہ ہو گیا۔"

ابن شہاب بتلاتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو فرمایا کرتے: جو آنے والا ہے وہ قریب ہے اور جو آرہا ہے وہ دور نہیں۔ کسی کی جلد بازی پر اللہ تعالیٰ جلدی نہیں کرتا وہ لوگوں سے ڈرتا نہیں، جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، نہ کہ جو لوگ چاہتے ہیں، ایک بات اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور لوگ کوئی دوسری بات چاہتے ہیں تو ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اگرچہ لوگ ناپسند کریں، جسے اللہ قریب کرے اُسے کوئی دور نہیں کر سکتا اور جسے اللہ دور کرے اسے کوئی قریب نہیں کر سکتا۔ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی

آپؐ کے خطبے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کے انعامات و اوصافِ کمال، اسلام کے اصول کی وضاحت، جنت و دوزخ اور قیامت کے ذکر، اللہ سے ڈرنے کا حکم، اللہ تعالیٰ کی رضا و ناراضی کے مواقع بیان کرنے پر مشتمل ہوتے تھے اور آپ خطبہ دیتے وقت فرمایا کرتے تھے:

"اے لوگو! میں جس بات کا حکم کروں تم ہرگز اس کی طاقت نہیں رکھتے یا تم ہرگز وہ نہ کرو گے۔ ہاں سیدھے ہو جاؤ اور خوش ہو جاؤ۔"

اور جب خطاب کی ضرورت و مصلحت ہوتی آپ اُسی وقت خطاب فرمایا کرتے اور آپ جب بھی خطبہ دیتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے اور دونوں شہادتین دیتے (یعنی اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ) اور آپ اپنا نام اسم علم کے طور پر ذکر فرماتے۔

نیز آپ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس خطبہ میں شہادتین (دونوں شہادتیں مذکورہ) نہ ہوں تو وہ خطبہ گویا کہ ایک کٹا ہوا ہاتھ ہے اور آپ جب حجرہ سے باہر تشریف لاتے تو آپ کو کوئی اضطراب نہ ہوتا اور آج کل کے خطیبوں کا جیسے فیشن ہے مثلاً بڑے بڑے رومال سر پہ باندھنا اور پشت اور گردن پر لٹکا لینا آپ ایسا نہ کرتے۔

آپ کے منبر کی تین سیڑھیاں تھیں، جب آپ اس پر تشریف رکھتے اور لوگوں کی طرف چہرۂ انور کر لیتے تو مؤذن آذان کہتا اور آپ اذان سے پہلے کچھ نہ فرماتے اور نہ بعد میں کچھ بات کرتے۔ پھر جب آپ خطبہ پڑھتے تو مؤذن یا کوئی اور آدمی کوئی بات نہ کرتا جب آپ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ عصائے مبارک لے لیتے اور آپ منبر پر کھڑے کھڑے اس کا سہارا سا لگا لیتے۔

ابوداؤد نے ابن شہابؒ سے اس طرح روایت کیا ہے اور تینوں خلفاء بعد میں اس طرح خطبہ دیتے رہے ہیں اور کبھی آپ کمان پر سہارا لگا لیتے، یہ معلوم نہیں کہ آپ نے تلوار پر بھی ٹیک لگائی ہے یا نہیں۔ بعض جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ منبر پر بیٹھ کر تلوار ہاتھ میں لے لیتے اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ دین تلوار سے قائم کیا گیا۔ یہ واضح قسم کی جہالت ہے اور اس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ حدیث میں صاف آتا ہے کہ آپ عصا اور کمان پر ٹیک لگاتے اور دوسری بات یہ ہے کہ دین تو وحی کے ذریعہ قائم ہوا، ہاں تلوار مشرکین اور گمراہ لوگوں کو مٹانے والی ہے اور مدینہ منورہ تو صرف قرآن پاک ہی سے فتح ہو چکا تھا، یہاں تو تلوار کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوئی تھی۔ آپ کو جب خطبہ کے دوران میں کام پڑ جاتا تو اسے پورا کر دیتے اور پھر واپس آ کر خطبہ دیتے۔ ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حسنؓ و حسینؓ سرخ قمیص پہنے تشریف لائے، آپ نے خطبہ بند کر دیا۔ منبر سے اتر آئے اور ان دونوں کو گود میں اٹھا لیا، پھر منبر پر تشریف لے گئے۔ پھر اس کے بعد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ٹھیک فرمایا کہ:۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ: یعنی: تمہارے لیے اموال و اولاد آزمائش ہیں، میں نے ان دونوں کو قمیصوں میں لڑھکتے آتے دیکھا تو میں برداشت نہ کر سکا اور خطبہ ختم کیا اور انکو اٹھا لیا اور سلیک غطفانی حاضر ہوا۔ آپ اس وقت خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ اے سلیک اٹھ، دو رکعت نماز پڑھ۔ اور مختصر طور پر ادا کر۔ پھر آپ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: اور آپ منبر پر تشریف فرما تھے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی جمعہ کے دن مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور انہیں مختصر رکھے۔ کبھی آپ مختصر خطبہ ارشاد فرماتے اور کبھی حسبِ ضرورت طویل کر دیتے اور آپ کا ہنگامی خطبہ مرتب خطبہ سے زیادہ طویل ہوتا اور آپ عیدوں کے موقع پر عورتوں کو علیحدہ خطاب فرماتے اور انہیں صدقہ کی ترغیب دیتے۔

العِبَادَاتُ

آں حضرتؐ کا طریق طہارت

وضو، مسح، تیمم

کئی نمازیں ایک ہی وضو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازیں اکثر نیا وضو فرماتے اور کبھی کبھی کئی نمازیں ایک ہی وضو میں پڑھ لیتے۔ کبھی آپ ایک مد[1] پانی سے وضو فرماتے۔ مد کا وزن دمشق کے چار اوقیہ سے لے کر دو تین اوقیہ تک ہوتا ہے۔ وضو میں آپ پانی اچھی طرح استعمال فرماتے۔ لیکن پھر بھی امت کو پانی کے استعمال میں اسراف سے پرہیز کی تلقین فرماتے۔ آپ نے فرمایا: کہ میری امت میں وہ لوگ بھی ہوں گے، جو وضو میں اسراف کریں گے۔ نیز فرمایا کہ وضو کے وقت بھی ایک شیطان ہوتا ہے جس کو ولہان کہتے ہیں، اس لیے وضو کے وقت وسوسوں سے بچو۔

ایک مرتبہ حضرت سعدؓ کے پاس سے گزرے وہ وضو کر رہے تھے۔

آپ نے فرمایا: پانی میں اسراف نہ کرنا۔

انہوں نے عرض کیا، کیا پانی میں بھی اسراف ہوتا ہے؟

آپ نے فرمایا: "ہاں اگرچہ تم کسی بہتے ہوئے دریا کے کنارے کیوں نہ ہوں"

اور آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے ایک ایک بار، دو دو بار اور تین تین بار ہر عضو کو دھویا بعض روایات میں ایسا ہے کہ آپ نے ایک ہی وضو میں کسی عضو کو دو بار اور کسی کو تین بار دھویا۔ کبھی آپ ایک ہی چلو سے کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے اور کبھی دو یا تین چلوؤں سے بھی ایسا فرما لیتے۔ کبھی کلی کرتے اور ناک میں پانی لینے کا کام ایک ہی چلو سے کرتے، آدھے چلو سے کلی کرتے، باقی آدھے

---

[1] تقریباً ایک سیر وزن۔

سے ناک میں پانی ڈالتے، باقی دو یا تین چلوؤں کی صورت میں الگ الگ یہ کام کرتے۔ بخاری اور مسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ ایک چلو سے آپ نے یہ دونوں کام کیے۔ یہ حدیث عبداللہ بن زید کی ہے۔ کسی صحیح حدیث میں مضمضہ (کلی کرنا) اور استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) کے مابین فصل وارد نہیں ہے، لیکن طلحہ بن معرف نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے جد سے جو روایت کی اس سے فصل ثابت ہے لیکن آخری راوی کا صحابی ہونا ثابت نہیں۔

آں حضرتؐ کا طریقۂ مسح

آپ ناک میں سیدھے ہاتھ سے پانی ڈالتے اور جھکتے بائیں ہاتھ سے، مسح پورے سر کا کرتے، کبھی آگے پیچھے ہاتھ لگا لیتے، مسح کے ساتھ ساتھ کانوں کا بھی اندر باہر مسح کر لیتے، اس کے لیے الگ سے پانی نہ لیتے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ احادیث عثمان سے ثابت ہے کہ آپ سر کا مسح ایک مرتبہ کرتے۔ جب صرف پیشانی کا مسح کرتے تو عمامہ پر ہاتھ پھیر کر اس کی تکمیل کر لیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ سر کا مسح کرتے، کبھی عمامہ پر مسح کر لیتے، کبھی پیشانی اور عمامہ پر کر لیتے لیکن صرف پیشانی پر مسح کر لینا ثابت نہیں۔

اگر موزے[1] نہ پہنے ہوتے، یا پاتابے[1] استعمال میں نہ ہوتے تو پورے پاؤں کا مسح کرتے، لیکن اگر پہنے ہوتے تو صرف موزوں کا مسح کر لیتے، گردن کا مسح آپؐ سے ثابت نہیں۔

وضو کے وقت آپ فرماتے۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ

اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المستطھرین

سنن نسائی میں مروی ہے کہ وضو کے بعد آپ فرمایا کرتے:

سبحانک وبحمدک اشھد ان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک۔

وضو کے بعد آپ ڈاڑھی کا خلال کرتے، لیکن کبھی کبھی، ہمیشہ نہیں۔ لیکن اس بارے میں آئمہ حدیث مختلف الرائے ہیں۔ ترمذی وغیرہ کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے۔ احمد اور ابوزرعہ کے نزدیک تخلیل لحیہ (ڈاڑھی میں انگلیوں سے خلال کرنا) ازروئے حدیث ثابت نہیں، اس طرح آپؐ انگلیوں میں بھی خلال کرتے، لیکن پابندی سے نہیں، کبھی اور ٹخنے سے اوپر پانی ڈالنا ثابت نہیں۔ وضو کے بعد اعضاء کا خشک کرنا بھی مختلف فیہ ہے۔ کبھی خود وضو کر لیتے، کبھی کوئی دوسرا پانی ڈال دیتا، جیسا کہ صحیحین میں مغیرہ کی روایت

---

[1] چرمی موزے [1] سوتی موزے۔

ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ سفر میں آپ کو وضو کرایا۔ باقی رہا وضو کے وقت انگشتری کو ادھر ادھر گھمانا تو یہ حدیث ضعیف ہے، اسے معمر نے اپنے والد سے روایت کیا ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔ جیسا کہ دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔

مسح سفر اور حضر میں یکساں جائز ہے

سفر اور حضر، ہر حالت میں آپ نے مسح کیا ہے اور وفات تک یہ سلسلہ جاری رکھا، مسح کی مدت مقیم کے لیے، ایک شب و روز مسافر کے لیے، تین شب و روز مقرر فرمائی ہے، جو صحیح اور حسن احادیث سے ثابت ہے، آپ چرمی موزوں پر بھی مسح کرتے، جرابوں (اونی، سوتی) پر بھی، اور جوتوں پر بھی، اگر موزے نہ پہنے ہوتے پاؤں دھو لیتے، پہنے ہوتے تو مسح کر لیتے، مسح کرنے کے لیے موزے کبھی نہیں پہنے اور یہی بہتر طریقہ ہے۔

تیمم آپ کس طرح کرتے تھے؟

آپ کا دستور تھا کہ دو ایک مرتبہ ہاتھ مار کے چہرے اور ہتھیلیوں کا تیمم کر لیتے، یہی روایت صحیح ہے۔ دو مرتبہ ہاتھ مارنا یا کہنیوں تک تیمم کرنا ثابت نہیں ہے۔ امام احمد کا ارشاد ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ تیمم کہنیوں تک کرنا چاہیے، وہ یہ اضافہ اپنی طرف سے کرتا ہے۔ تیمم ہر اُس زمین پر کر لیتے جس پر نماز جائز ہے، خواہ وہ مٹی ہو یا ریت یا لونا۔ آپ فرماتے:

"میری امت کا آدمی جہاں کہیں نماز کا وقت پائے تو اس کے پاس اس کی مسجد اور سامانِ طہارت موجود ہے۔"

وضو کی طرح تیمم سے بھی کئی نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں

ہر نماز کے لیے جدا گانہ تیمم نہ فرماتے نہ آپ نے کبھی اس کا حکم دیا، بلکہ تیمم کو بالکل وضو کا قائم مقام فرمایا ہے اور یہی بات قرین صواب بھی ہے جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہو۔

نماز اور ارکان و آدابِ نماز

تکبیر، قرأت، سکتہ، رکوع، قیام، سجدہ، تشہد

سنّت اور بدعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر فرماتے اس سے پہلے کچھ نہ کہتے حتیٰ کہ زبان سے نیت بھی نہ کرتے، نہ یہ فرماتے کہ میں چار رکعت نماز کی نیت کعبہ کی طرف رخ کرکے امام یا مقتدی بن کر کرتا ہوں۔ نہ ادا اور قضا کا لفظ استعمال فرماتے، نہ وقت کا نام لیتے، یہ ساری باتیں بدعت ہیں۔ اس سلسلے میں آپ سے کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ نہ احادیث صحیحہ سے نہ ضعیف حدیثوں سے، نہ مسند سے، نہ مرسل سے، نہ کسی صحابی سے۔ تابعین میں سے بھی کسی نے ان باتوں کو پسند نہیں کیا ہے، نہ ائمہ اربعہ نے۔

بعض مورخین نے امام شافعی کے قول سے دھوکا کھایا ہے کہ نماز روزہ کی طرح نہیں ہے۔ کوئی شخص نماز نہیں پڑھ سکتا جب تک ذکر نہ کرے۔ ذکر سے مراد نمازی کا زبان سے نیت کرنا ہے۔ حالانکہ امام شافعی کا مقصد ذکر سے صرف تکبیر ہے۔ بھلا امام شافعی ایک ایسے فعل کو کس طرح لازمی قرار دے سکتے تھے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ کے خلفاء اصحاب نے کسی ایک نماز میں بھی روا نہ رکھا ہو، اگر ہمیں ایک حرف بھی ان سے مل جاتا تو ہم سرِ تسلیم خم کر دیتے کیونکہ نبی کی سنت اور صحابہ کے عمل سے زیادہ کوئی چیز بھی بہتر اور برتر نہیں ہے۔

تکبیر کے لیے آپ دونوں ہاتھ قبلہ رُخ ہو کر کاندھوں یا کانوں تک اس طرح اٹھایا کرتے تھے کہ انگلیاں پھیلی ہوئی ہوتیں۔

نماز کا آغاز کبھی آپ اس دعا سے کرتے:

اللھم باعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب۔

یعنی: اے اللہ میرے اور میری لغزشوں کے مابین اتنی ہی دوری کر دے جتنی مشرق

و مغرب کے درمیان ہے۔

کبھی فرماتے: اللھم اغسلنی من خطایای بالماء والثلج والبرد۔ اللھم نقنی من الذنوب والخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

"یعنی: اے اللہ میری لغزشوں سے مجھے پانی، اولے اور ٹھنڈ سے دھو ڈال۔ اے اللہ مجھے خطاؤں اور گناہوں سے اس طرح پاک صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل سے صاف ہو جاتا ہے۔"

کبھی فرماتے: وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفاً مسلماً وما انا من المشرکین۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اوّل المسلمین۔

یعنی: "میں صرف اس اللہ کی طرف اپنا رُخ کرتا ہوں جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور بلاشبہ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا فرمانبردار ہوں۔"

کبھی دس مرتبہ اللہ اکبر فرماتے پھر دس مرتبہ تسبیح کرتے پھر دس مرتبہ حمد کہتے پھر دس مرتبہ تہلیل کرتے، پھر دس مرتبہ استغفار کرتے، پھر دس مرتبہ فرماتے اللھم اغفرلی واھدنی وارزقنی:

یعنی: "اے اللہ میری مغفرت کر، مجھے سیدھا راستہ دکھا، مجھے رزق دے۔"

اس کے بعد دس مرتبہ فرماتے۔ اللھم اعوذ بک من ضیق مقام یوم القیامۃ۔ یعنی "اے اللہ قیامت کے دن میں ضیق مقام سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔" یہ تمام باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا آغاز ان الفاظ سے کرتے تھے: سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا الہ غیرک۔

یعنی: "اے اللہ تو ہر پاکی اور حمد کا سزاوار ہے، تیرا نام اونچا، تیرا مرتبہ بڑا، تیرے سوا کوئی نہیں جس کی پرستش کی جائے۔"

اسی طرح کی حدیث حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے اسی دعا کے ساتھ نماز کا آغاز کرتے تھے، تاکہ لوگ اچھی طرح جان لیں

امام احمد کا قول ہے کہ میں حضرت عمرؓ کے مسلک کا پابند ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص نماز کا آغاز دوسرے مذکورہ روایات کے مطابق کرے تو وہ بھی درست ہے۔ مذکورہ دعا کے بعد حضرت عمرؓ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۂ فاتحہ پڑھتے، کبھی زور سے، کبھی چپکے سے۔ لیکن زیادہ تر زور سے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دن رات کی پانچوں نمازوں میں زور سے نہ پڑھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بات خلفاء راشدین، جمہور صحابہ اور اہل مدینہ سے پوشیدہ نہ رہتی۔

تلاوت فاتحہ کے بعد آپ آمین کہتے۔ اگر فاتحہ باواز بلند پڑھتے تو آمین بھی آواز سے کہتے۔[1] اور اگر فاتحہ آہستہ سے پڑھتے تو آمین بھی چپکے سے کہتے۔ آپ کی قرأت اس طرح ہوتی کہ ہر آیت پر وقف کرتے اور آخری حرف کو کھینچ کر پڑھتے۔

فجر کی نماز زیادہ طویل ہوتی تھی

پہلی رکعت میں دو سکتے فرماتے تھے۔ ایک سکتہ پہلی تکبیر کے بعد، دوسرا سورۂ فاتحہ ختم کرکے پھر کوئی سورت شروع کر دیتے، جو کبھی طویل ہوتی، کبھی مختصر۔ لیکن نمازیں زیادہ تر ایسی سورتیں پڑھتے جو نہ طویل ہوتیں نہ مختصر۔ البتہ سفر اور معذوری کی حالت میں چھوٹی سورتیں پڑھتے۔ آپ نماز فجر میں ستر سے سو تک آیتیں پڑھتے۔ یہی نماز زیادہ طویل ہوتی تھی۔ جمعہ کے دن اکثر سورہ سجدہ، تنزیل اور ھل اتیٰ پڑھتے۔ یہ آخری دونوں سورتیں یعنی سورہ سجدہ اور ھل اتیٰ ایک ایک رکعت میں پوری پوری پڑھتے۔ آج کل کے بعض لوگوں کی طرح کچھ حصہ نہ پڑھتے اور نہ دو رکعتوں میں پوری سورۃ پڑھتے۔ یہ خلافِ سنت ہے۔ اکثر جاہلوں کا خیال ہے کہ یومِ جمعہ کی فضیلت سورہ سجدہ کی وجہ سے ہے۔ یہ جہل عظیم ہے۔ اسی وجہ سے بعض آئمہ اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ سورہ سجدہ اس نماز میں اس خیال کے ماتحت پڑھی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے ان سورتوں کو پڑھتے تھے کہ ان میں مبدا و معاد، خلق آدم، دخول جنت و جہنم کا ذکر ہے۔ اس لیے بڑے بڑے مجموں مثلاً عید اور جمعہ کے دن تذکیرات کے لیے ان سورتوں کا پڑھنا ہر طرح مناسب تھا۔ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر آپ سورۂ ق، اقتربت، سبح اور غاشیہ بھی پڑھتے تھے۔

---

[1] احناف کے ہاں آمین بالجہر یعنی زور سے کہنا افضل نہیں، لیکن اگر کوئی کہے تو نماز ہو جاتی ہے (رئیس احمد جعفری)

ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں

ظہر کی نماز میں آپ کبھی کبھی طویل قرأت کرتے، ابوسعید کہتے ہیں کہ نماز ظہر کی اقامت سن کر اس اثنا میں اگر کوئی چاہتا تو بہ آسانی بقیع تک جا کر وہاں قضائے حاجت سے فارغ ہو کر گھر آتا، وضو کرتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی رکعت میں پا لیتا، کبھی آپ ظہر کی نماز میں بہ قدر "الٓمّ تنزیل" یا "سبح اسم ربک الاعلیٰ" یا "واللیل اذا یغشیٰ" یا "والسماء ذات البروج" یا "والسماء والطارق" کے قرأت کرتے۔

البتہ عصر کی نماز بہ قدر ظہر کے نصف ہوتی، اگر اسے طول دیتے تو، ورنہ پھر ظہر کی مختصر نماز کے برابر ہوتی۔

مغرب میں آج کل کے لوگوں کے برخلاف کبھی سورۃ اعراف جیسی طویل سورۃ پڑھتے، کبھی سورۃ طور، کبھی سورۃ مرسلات، بلکہ معوذتین تک۔

عشاء میں "والتین والزیتون" پڑھتے، ایک مرتبہ جب معاذ بھی شریک تھے "والشمس وضحاہا" پڑھی عام طور پر "سبح اسم ربک الاعلیٰ" اور "واللیل اذا یغشیٰ" پڑھا کرتے۔

حضرت معاذ پر آپ کا عتاب

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ آپ معاذ پر خفا ہوئے، انہوں نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، پھر قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں گئے اور وہاں کے لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھائی اور سورۂ بقر (جیسی طویل ترین) سورت شروع کر دی، آپ کو جب یہ خبر پہنچی تو فرمایا؛

افتان انت یامعاذ؟ یعنی اے معاذ کیا تو فتنہ گر ہے[1]؟

جمعہ کی نماز میں آپ سورۂ جمعہ و منافقین پوری پڑھتے، علاوہ ازیں سورۃ سبح و غاشیہ بھی۔

عیدین میں بھی سورۂ "ق" اور "اقتربت" پوری کی پوری پڑھتے۔ کبھی سورۃ سبح و غاشیہ۔

یہ تھا آپ کا وہ معمول جس پر دنیا سے رخصت ہوتے وقت تک عامل رہے

خلفائے راشدین بھی آپ کی اس سنت پر پابندی سے عمل کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ

---

[1] اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات کو اس بات کا کتنا خیال رہتا تھا کہ دین کے معاملات میں لوگوں کو زحمت سے بچا سکیں، امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقتدیوں کی سہولت کا خیال رکھے، کیونکہ ان مقتدیوں میں مریض، بوڑھے، کمزور، حاجت مند سب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

(رئیس احمد جعفری)

فجر میں "سورہ بقرہ" اور حضرت عمر "سورہ یوسف" اور "نحل" اور "ہود" اور "بنی اسرائیل" جیسی (طویل) سورتیں عام طور پر پڑھا کرتے۔ اگر نماز فجر کی تطویل آپ نے منسوخ کر دی ہوتی تو خلفائے راشدین سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی تھی اور اگر رہ بھی جاتی تو دوسرے صحابہ فوراً ٹوکتے اور بتا دیتے۔

باقی رہی وہ حدیث جو مسلم نے اپنی "صحیح" میں جابر بن سمرہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر میں "ق" پڑھا کرتے تھے اور بعد میں چھوٹی سورتیں پڑھنے لگے تھے تو یہاں "بعد" سے مراد بعد فجر ہے۔ یعنی آپ فجر کی نماز تو طویل پڑھتے تھے اور بعد کی نمازیں مختصر۔

سورت معین کر کے نماز میں نہ پڑھنی چاہیے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ اور عیدین کے سوا دوسری تمام نمازوں میں سورت معین کر کے نہیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب کی روایت درج کی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

"فرض نمازوں میں چھوٹی بڑی سورتوں میں سے کوئی ایسی سورت نہیں ہے جو میں نے آپ سے (کبھی نہ کبھی) نہ سنی ہو۔"

آپ کا معمول یہ تھا کہ جو سورت پڑھتے پوری پڑھتے، کبھی کوئی سورت دو رکعتوں میں پوری کرتے، کبھی کسی سورت کا ابتدائی حصہ پڑھ کر رکوع میں چلے جاتے، لیکن یہ نہ ہوتا کسی سورت کے بیچ سے یا آخر سے قرأت کریں۔

ایک رکعت میں دو سورتیں بھی آپ پڑھ لیتے تھے لیکن نفل نمازوں میں، فرض میں نہیں۔

پہلی رکعت دوسری رکعت سے بڑی ہوتی تھی

معمولاً آپ کی پہلی رکعت دوسری سے بڑی ہوا کرتی تھی۔ قرأت ختم کرنے بعد ذرا دم لیتے، پھر تکبیر کہتے اور رکوع میں چلے جاتے۔

رکوع اس طرح کرتے کہ دونوں ہاتھوں کے پنجے گھٹنوں پر اس طرح رکھتے جیسے انہیں پکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں سے جدا رکھتے، پشت مبارک بالکل سیدھی رہتی، سر مبارک نہ بہت زیادہ اٹھا ہوا ہوتا نہ جھکا ہوا، بلکہ پشت کی سیدھ میں رہتا۔

آپ رکوع میں:

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ، یعنی "میرا پروردگار پاک ہے اور باعظمت ہے"۔ پڑھتے۔ کبھی اتنا اضافہ اور کر دیتے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ۔ یعنی: اے اللہ تو پاک ہے، تیری ہی ہم حمد وثنا کرتے ہیں، اے اللہ میری مغفرت فرما۔

آپ کا رکوع اتنا دراز ہوتا کہ آدمی بآسانی دس مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کہہ سکے یہی کیفیت سجدہ کی بھی ہوتی۔

اہل سنن نے حضرت انس رضی کی روایت درج کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے پیچھے آپ کی نماز سے اتنی ملتی جلتی نماز نہیں پڑھی جتنی اس نوجوان کی (مراد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں)!

راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے رکوع وسجود کا اندازہ کیا، تو اندازہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک دس تسبیحوں کے برابر ہے!

بعد ازاں آپ "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے ہوئے سر اٹھاتے، اور رفع یدین کرتے، قبل و بعد از رکوع رفع یدین کی روایت کم وبیش بتیس صحابہ نے کی ہے، جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں اس کے خلاف آپ سے کچھ ثابت نہیں ہے، اور اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت تک آپ کا یہی معمول رہا۔

رکوع سے فراغت کے بعد آپ بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے اور فراغت اَللّٰهُمَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اور کبھی ارشاد فرماتے اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔ یعنی "رَبَّنَا" اور "لَكَ" کے درمیان "واؤ" کا استعمال نہ کرتے، پہلی صورت صحیح نہیں ہے، دوسری صحیح ہے، آپ کا یہ رکن (قیام) بھی بہ قدر رکوع وسجود دراز ہوتا، قیام کے دوران میں آپ یہ دعا پڑھتے، جو آپ سے صحیح طور پر ثابت ہے۔

سمع اللہ لمن حمدہ، اللّٰھم ربنا لك الحمد۔ ملءُ السماوات وملءُ الارض وملءَ ماشئت من شیئٍ بعد اھل الثناء والمجد احق ماقال العبد وکلنا لك عبد، اللّٰھم لامانع لما اعطیت ولامعطی لما منعت، ولاینفع ذاالجد منك الجد۔

لہ حضرات اہل حدیث اور بعض دوسرے آئمہ کرام کا مسلک یہی ہے لیکن احناف کے ہاں "رفع یدین" یعنی رکوع کے بعد دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر کان تک لے جانا اگرچہ جائز ہے، لیکن ضروری نہیں۔ اختلاف استحباب میں ہے، واقعہ میں نہیں۔ ابن قیم اور دوسرے اکابر کا خیال ہے کہ آپ زندگی بھر اس پر عامل رہے لیکن ائمہ احناف کے نزدیک یہ دعویٰ ثابت نہیں۔ (رئیس احمد جعفری)

یعنی "اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس شخص کی حمد سن لی، جو اس نے بیان کی، اے خدا، تو سزاوارِ حمد ہے، آسمانوں کے برابر، زمین کے برابر اور اس چیز کے برابر، جو ارض و سما کی پہنائی کے بعد بھی تو پسند فرمائے۔ تیرے ہی لیے وہ تعریف و ثنا ہے جو بندہ کر سکے اور ہم سب تیرے بندے ہیں، اے اللہ جسے تو دینا چاہے اس کا کوئی مانع نہیں اور جسے تو کچھ نہ دینا چاہے اسے کوئی دے نہیں سکتا، اور نہ کوئی صاحبِ ثروت اپنی ثروت کے باعث تیرے عذاب سے بچ سکتا ہے"!

اس کے بعد آپ رفع یدین کیے بغیر سجدے سیدھے جاتے، بعض حفاظ حدیث کا خیال ہے کہ اس موقع پر بھی آپ رفع یدین کرتے تھے، مثلاً محمد بن حزم یہی کہتے ہیں، لیکن یہ ان کا وہم ہے، امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

سجدے کا طریقہ اور اسلوب اور دعائیں

سجدے کے وقت پہلے آپ گھٹنے زمین پر رکھتے پھر ہاتھ، اس کے بعد ماتھا اور ناک۔ احادیث صحیحہ سے یہی ثابت ہے، وائل بن حجر کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ سجدے میں پہلے آپ گھٹنے ٹیکتے، پھر ہاتھ رکھتے اور جب سجدے سے اُٹھنے لگتے تو پہلے ہاتھ اٹھاتے پھر گھٹنے۔ اس کے خلاف کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔

سجدے کی حالت میں آپ کا دستور یہ تھا کہ ماتھا اور ناک اچھی طرح زمین سے ٹکا دیتے، ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا رکھتے، پنجے کندھوں اور کانوں کی سیدھ میں ہوتے۔

صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب کی حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جب سجدے میں جاؤ تو ہتھیلیوں کو زمین پر رکھ لو، اور کہنیاں اٹھالو"!

آپ کا سجدہ معتدل تھا، پیٹھ سیدھی رہتی، دونوں پیروں کی انگلیوں کے سرے قبلہ رُخ ہوتے، ہتھیلیوں اور انگلیوں کو پھیلا دیتے۔ انگلیاں نہ باہم پیوست ہوتیں نہ جدا جدا۔ صحیح ابن حبان میں ہے کہ آپ رکوع میں جب جاتے تو یہ پڑھتے:

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی، یعنی میرا رب پاک ہے اور برتر ہے۔

نیز آپ یہ بھی پڑھتے:

سبحانك اللھم ربنا وبحمدك اللھم اغفرلی۔ یعنی: اے ہمارے رب تو پاک ہے، تو ہر حمد کا سزاوار ہے، میری مغفرت فرما۔

نیز آپ فرماتے:

اللھم انی اعوذ برضاك من سخطك وبمعافاتك من عقوبتك، واعوذ بك منك لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔

یعنی "اے اللہ بلاشبہ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے غصے سے تیری رضا کا واسطہ دے کر اور پناہ طلب کرتا ہوں تیرے عذاب سے، تیرے عفو کا واسطہ دے کر، تیری حمد کا شمار کرنا میرے بس سے باہر ہے، بے شک تو ویسا ہی ہے جیسا اپنے بارے میں تونے فرمایا ہے۔"

نیز آپ فرماتے:۔

اللھم اغفر لی خطیئتی وجھلی واسرافی فی امری وما انت اعلم بہ منی، اللھم اغفر لی جدی، وھزلی وخطائی وعمدی وکل ذالك عندی۔ اللھم اغفر لی ماقدمت وما اخرت، وما اسررت وما اعلنت انت الٰھی لا الٰہ الا انت۔

یعنی: اے میرے پروردگار، میری خطاکاری اور جہالت سے درگزر فرما، میری زیادتی معاف کر، میرا وہ گناہ بھی بخش دے، جس کا میرے مقابلہ میں تجھے زیادہ علم ہے۔ اے میرے پروردگار میری سعی و کوشش، میری ہنسی دل لگی، میری لغزش اور میرا ارادہ، ہر برائی جو میرے اندر ہے اسے بخش دے اے میرے پروردگار، میرے مقدم اور مؤخر گناہ بخش دے، وہ گناہ بھی جو میں نے علانیہ کیا اور چھپا کر کیا، تو ہی میرا معبود ہے، تیرے سوا کوئی پروردگار نہیں۔!"

دعائے سجدہ کے بارے میں آپ کا ارشاد تھا کہ خوب اچھی طرح گڑگڑا کر مانگا کرو۔

قیام اور سجود میں افضلیت کا سوال

اس باب میں اختلاف ہے کہ قیام اور سجود میں افضلیت کسے حاصل ہے؟

ایک جماعت کا خیال ہے کہ قیام کو متعدد وجوہ سے افضلیت حاصل ہے۔

۱۔ اس لیے کہ اس میں جو ذکر ہے وہ افضل الاذکار ہے اور یہ رکن بھی افضل الارکان ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قوموا للہ قانتین"۔

۳۔ ارشاد نبوی ہے۔ "افضل الصلاۃ طول القنوت"۔

ایک دوسری جماعت ہے جو سجدے کو قیام سے افضل مانتی ہے:۔

۱۔ اس جماعت کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

"جب کوئی بندہ سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بڑھا دیتا ہے اور اس کی خطائیں

گھٹا دیتا ہے۔

۲- ربیعہ بن کعب وسلمی نے جنت میں آپ کی مرافقت و مصاحبت کی استدعا کی، تو آپ نے فرمایا:۔

"خوب سجدے کرو!"

۳- آں حضرتؐ پر جو پہلی سورت نازل ہوئی، وہ "سورہ اقرأ" ہے، اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے۔ واسجد واقترب، یعنی: سجدہ کیجیے اور خدا کا قرب حاصل کیجیے:

۴- سجدہ کرنے والا اپنے رب کے سامنے سرفگندہ ہو کر حاضر ہوتا ہے اور ایک بندے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں۔ اس طرح وہ اپنے رب سے قریب ہو جاتا ہے۔

۵- سجدہ راز عبودیت ہے اور عبودیت نام ہے تذلل کا اور خضوع کا۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ رات میں طول قیام افضل ہے، اور دن میں کثرت رکوع و سجود افضل ہے۔

تشہد کے لیے بیٹھنے کا طریقہ

جب آپ کا قیام طویل ہوتا تو رکوع و سجود بھی طویل ہوتے اور جب قیام مختصر فرماتے تو رکوع و سجود بھی مختصر ہوتے، خواہ وہ نماز تہجد ہو یا فرض۔

تکبیر کہتے ہوئے آپ سجدے سے اُٹھتے، پھر بایاں پاؤں بچھا دیتے اور اس پر بیٹھ جاتے۔ داہنا پاؤں کھڑا رکھتے، رانوں پر ہاتھ یوں رکھتے کہ کہنیاں رانوں پر ٹکی رہتیں، پنجے گھٹنوں پر ہوتے۔

سجدے سے فارغ ہو کر جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو دو انگلیاں مٹھی میں لے لیتے اور دائرہ سا بنا کر انگشت شہادت اٹھا کر اسے حرکت دیتے اور دعا مانگتے۔ وائل بن حجر نے اس طرح روایت کیا ہے۔ آپ قعدہ اتنی دیر کرتے جتنی دیر سجدہ میں لگتی۔

ابوحاتم نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ آپ اس موقع پر یہ دعا پڑھا کرتے:

اللھم اغفرلی وارحمنی واجبرنی واھدنی وارزقنی: یعنی، اے میرے پروردگار میری مغفرت کر، مجھ پر رحم کر، میری مدد فرما، مجھے سیدھا راستہ دکھا، اور رزق عطا فرما۔

آپ تشہد میں کیا اور کس طرح پڑھتے؟

پھر جب آپ کھڑے ہوتے تو جیسا کہ وائل اور ابوہریرہ کی روایت ہے کہ قدموں اور گھٹنوں پر اس طرح اٹھتے کہ بوجھ رانوں پر رہتا، زمین پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھتے۔

جب آپ کھڑے ہوتے تو فوراً قرأت شروع کر دیتے اور اختتام صلوٰۃ کے وقت جس طرح ذراسا سکوت فرماتے اس موقع پر ایسا نہ کرتے، جب التحیات کے لیے بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور داہنا ہاتھ داہنی ران پر رکھتے، پھر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے، اسے خم کرتے اور حرکت دیتے، چھنگلی اور اس کے بعد کی انگلی مٹھی میں ہوتی، بیچ کی انگلی اور انگوٹھے سے دائرہ بنا لیتے۔ صرف انگشتِ شہادت باہر رہتی اس پر نظر جمی رہتی، اسے آہستہ آہستہ جنبش دیتے اور دعا کرتے، بایاں ہاتھ اور اس کی انگلیاں بدستور اپنی جگہ پر رہتیں، نشست بالکل ایسی ہی ہوتی جیسی سجدہ کے بعد ہوا کرتی۔

بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ جب دوسری رکعت میں آپ جلوس کرتے تو بایاں پاؤں بچھاتے اور داہنا کھڑا کرتے، لیکن جب آخری رکعت میں جلوس کرتے تو داہنا پاؤں پہلے کی طرح کھڑا کرتے اور بایاں پاؤں اس کے نیچے سے نکال لیتے اور جسم کو زمین پر رکھ کر بیٹھ جاتے۔ پھر تشہد پڑھتے۔

التحیات للہ والصلوٰۃ والطیبات السلام علیك ایھا النبیؐ ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ۔

یعنی: ساری عبادتیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، اے نبیؐ سلام ہو آپ پر اور اللہ کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوں آپ پر، ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر سلام ہو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے، اور رسول ہیں،،

پہلے تشہد میں، کسی حدیث سے بھی یہ ثابت نہیں کہ آپ نے اپنے اوپر یا اپنی آل پر درود بھیجا ہو، نہ عذابِ قبر، عذابِ دوزخ، فتنۂ حیات و ممات اور فتنۂ مسیحِ دجال سے پناہ مانگی۔ البتہ تشہد اخیر میں ان باتوں کا فرمانا، حدیث صحیح سے ثابت ہے۔

نماز کی دُعا اور نماز کے بعد سلام!

نماز کے دوران میں کون سے کام کیے جا سکتے ہیں؟

نماز میں دعا مانگنے کے سات مقامات

وہ مقامات جہاں آپ نماز میں دعا مانگتے سات تھے:

۱- ابتدائے (نماز) میں تکبیر تحریمہ کے بعد
۲- وتر میں قرأت سے فارغ ہونے کے بعد اور رکوع سے پہلے۔ اور صبح کی نماز میں رکوع سے قبل بصورت قنوتِ عارضہ کے بشرطیکہ یہ درست ہو کیونکہ روایت محل نظر ہے۔
۳- رکوع سے سیدھا کھڑا ہونے کے بعد جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو پڑھتے:-

سمع اللہ لمن حمدہ اللّٰھم ربنا لک الحمد ملء السمٰوات وملء الارض وملء ما شئت من شئ بعد اللّٰھم طھرنی بالثلج والبرد والماء البارد اَللّٰھُمَّ طھرنی من الذنوب والخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الوسخ۔

یعنی: جس نے اللہ کی تعریف کی اس نے سن لی۔ اے اللہ، اے ہمارے پروردگار تو سزاوار حمد ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پہنائی کے مطابق اور اس کے بعد جس چیز کو تو چاہے اس کی پہنائی کے مطابق۔ اے اللہ مجھے برف، ٹھنڈا اور ٹھنڈے پانی سے پاک کر دے۔ اے اللہ مجھے گناہوں اور خطاؤں سے اس طرح پاک فرما جیسے سفید کپڑے کو میل سے صاف کیا جاتا ہے۔

۴- رکوع میں آپ پڑھا کرتے: سبحانک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی۔
یعنی: "اے اللہ پاک ہے۔ ہمارے پروردگار تو سزاوار حمد ہے اے اللہ مجھے بخش دے"۔

۵- سجدہ میں (آپ دعا فرماتے) اور اس موقع پر آپ اکثر دعا کیا کرتے۔
۶- دو سجدوں کے درمیان۔
۷- تشہد کے بعد اور سلام سے پہلے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت فضالہ بن عبید کی روایت میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز آپ نے سجدہ میں دعا مانگنے کا بھی حکم دیا ہے۔ رہی وہ دعا جو نماز کے بعد سلام پھیر کر قبلہ رخ یا مقتدیوں کی طرف منہ کر کے کرتے ہیں۔ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے کچھ ثابت نہیں۔ اور نہ صحیح یا حسن سند سے روایت ہے۔ نیز فجر اور عصر کی نماز کے بعد اس کی تخصیص نہ آپؐ نے خود کی اور نہ آپ کے بعد خلفائے راشدین نے یہ تخصیص کی ہے اور نہ امت کو اس کا حکم فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ جس نے بھی اسے جائز سمجھا سنت نہیں بلکہ محض استحسان سمجھا۔

نماز کی دوسری عام دعائیں

نماز کے متعلق (دیگر) عام ادعیہ کا آپؐ نے اہتمام بھی کیا ہے اور حکم بھی فرمایا ہے۔ ان کا تعلق نمازی کے احوال سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہے، جب تک وہ نماز میں رہتا ہے وہ اسی سے سرگوشی کر رہا ہے۔ اور جب سلام پھیر دیتا ہے تو یہ سرگوشی منقطع ہو جاتی ہے اور اس کا قرب وحضور سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔ اس لیے قرب وسرگوشی کی حالت میں اور اس کی طرف توجہ کی صورت میں دعا کیسے ترک کر سکتا ہے ؟ نیز جب وہ سلام پھیرتا ہے تو پھر دست سوال (پھیلا) دیتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس حالت کا عکس نمازی کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ یاد رکھیئے یہاں ایک (لطیف نکتہ) بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب نمازی نماز سے فارغ ہو اور (اللہ کا ذکر کرے (لا الہ الا اللہ) تہلیل کرے۔ تسبیح پڑھے، حمد کرے اور نماز کے بعد مشروع اذکار سے اس کی بزرگی بیان کرے تو پھر نمازی کو چاہیے کہ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے اور (پھر) جو چاہے دعا کرے۔ بہتر یہ ہے کہ اس دوسری عبادت کے بعد ہی دعا مانگے، نہ کہ فقط نماز کے بعد، کیونکہ جب اس نے اللہ کا ذکر کیا، حمد کی اور اس کی ثنا بیان کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا تو اس کام کے بعد اس کی دعا قبول ہو گی جیسا کہ حضرت فضالہ بن عبیدؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی دعا کرے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث صحیح قرار دیا ہے۔

سلام پھیرنے کا طریقہ

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دائیں طرف سلام پھیرتے اور (کہتے)، : السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اسی طرح بائیں طرف بھی کرتے۔

اسے پندرہ صحابہؓ نے روایت کیا ہے، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔ عبداللہ بن مسعودؓ، سعد بن ابی وقاص، سہلؓ بن سعد ساعدی، وائلؓ بن حجر، ابو موسیٰؓ اشعریؓ، حذیفہؓ بن یمان، عمارؓ بن یاسر، عبداللہ بن عمرؓ، جابرؓ بن سمرۃ، براءؓ بن عازب، ابو مالکؓ اشعری، حسنؓ بن علی، اوسؓ بن اوس، ابو رمثہؓ، عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ سامنے کے رُخ پر ایک تسلیم سے سلام پھیرتے۔ لیکن یہ صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ اس بحث میں زیادہ صحیح روایت حضرت عائشہ کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی تسلیم سے سلام پھیرتے تھے، یعنی السلام علیکم فرماتے۔ آپؐ کی آواز اتنی بلند ہوتی کہ ہم جاگ جاتے یہ روایت معلول ہے۔ گو سنن میں ہے مگر یہ رات کی نماز (تہجد) کے بارے میں ہے، جن لوگوں نے دو تسلیمات ذکر کیے ہیں انہوں نے فرض و نفل میں جو مشاہدہ کیا اسے روایت کر دیا۔ دوسرے حضرت عائشہؓ کی روایت محض ایک سلام پر منحصر نہیں۔ بلکہ وہ فرماتی ہیں کہ آپ ایک سلام کرتے اور اس سے ہمیں جگا دیتے۔ دوسری تسلیم کا ذکر نہیں کیا بلکہ خاموش رہیں۔ اور ان کا سکوت اس راوی کی روایت پر مقدم نہیں ہو سکتا کہ جس نے روایت کو یاد کیا، ضبط کیا۔ ان رواۃ کی تعداد بھی کثیر ہے اور ان کی روایات بھی زیادہ درست ہیں۔ ان کے اکثر روایات صحیح اور باقی حسن ہیں۔

ابو عمر بن بن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سلام مروی ہے حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے، لیکن ان کی روایت معلول ہے اور محدثین اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ پھر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سعدؓ کے روایات کا ذکر کیا ہے کہ آپ نماز میں ایک ہی سلام کرتے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ وہم ہے اور غلط ہے بلکہ روایت یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں اور بائیں سلام پھیرتے۔ اس کے بعد ابن مبارک کے طریق پر حضرت مصعب بن ثابت سے اور انہوں نے اسماعیل بن محمد بن سعد سے اور انہوں نے عامر بن سعد سے اور انہوں نے اپنے والد سے حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں اور بائیں سلام پھیرتے ہوئے دیکھا۔ گویا کہ میں اب بھی آپ کے چہرے کا حصہ دیکھ رہا ہوں۔ (اس پر) امام زہریؒ نے فرمایا کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذخیرۂ احادیث میں اسے نہیں پایا۔

اسماعیل بن محمدؒ نے ان سے کہا کہ کیا رسول اللہ کی تمام احادیث آپ سُن چکے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں"۔ آپ نے فرمایا، "تو کیا نصف سن لیں"؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں" تو وہ کہنے لگے اسے

اس نصف میں سے سمجھ لیجیے، جو آپ نے نہیں سنی ہیں"۔

رہی حضرت عائشہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ روایت کہ آپ ایک ہی تسلیم سے سلام پھیرتے، تو اسے تنہا زہیر بن محمد نے ہشام بن عروۃ سے مرفوعاً بیان کیا ہے اور انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے عائشہ رضؓ سے روایت کیا ہے۔ پھر عمرو بن ابی سلمۃ وغیرہ نے روایت کیا۔ زہیر بن محمد تمام محدثین کے نزدیک ضعیف اور کثیر الخطاء ہیں، ان کی روایت سے حجت نہیں لائی جاتی۔ یحییٰ بن معین نے اس روایت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عمرو بن ابی سلمۃ اور زہیر کی روایات ضعیف ہیں، جو حجت نہیں ہو سکتیں۔ نیز بتایا ہے کہ حضرت انسؓ کی روایت صرف ایوب سختیانی کی سند سے مروی ہے حالانکہ ان کے خیال میں ایوب نے حضرت انسؓ سے کچھ بھی نہیں سنا۔ نیز کہا ہے کہ حضرت حسنؓ سے مرسل روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ایک ہی تسلیم سے سلام پھیرا کرتے تھے۔ حالانکہ ایک تسلیم کے قائلین کے پاس عمل اہلِ مدینہ کے سوا کوئی حجت نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ عمل انہیں اکابر سے متوارث طور پر پہنچا ہے۔ حالانکہ اس طرح کی بات کو دلیل بنانا صحیح نہیں، کیونکہ یہ مخفی نہیں کہ یہ فعل ہر روز کئی مرتبہ صادر ہوتا رہا، لیکن اس کے باوجود تمام فقہاء نے اس کی مخالفت کی ہے اور درست طریقہ ان ہی کا ہے۔

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنن اہل شہر کے عمل سے رد نہیں ہو سکتیں اور نہ ہٹائی جا سکتی ہیں۔ چاہے (اہل شہر) کوئی سے بھی ہوں۔ نیز حکامؓ نے مدینہ وغیرہ میں نماز کے اندر چند جدید امور چلا دیے تھے، جن پر عمل جاری رہا اور ان کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ اور اہلِ مدینہ کا جو عمل خلفائے راشدین کے عہد میں تھا (وہی قابلِ حجت ہے) لیکن وہ عمل جو خلفائے راشدین کے بعد یا زمانہ صحابہؓ کے ختم ہو جانے کے بعد کا ہے تو اُس میں اور (اہل مدینہ) کے علاوہ دوسروں کے عمل میں کچھ فرق نہیں اور لوگوں کو سنت پر عمل کا حکم دیا جاتا ہے نہ کہ اس عمل کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بعد کا ہے۔

آں حضرت کی نماز میں دُعا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دعا مانگتے:

اللھم انی اعوذ بك من عذاب القبر و اعوذ بك من فتنة المسيح الدجال واعوذ بك من فتنة المحياء الممات اللھم انی اعوذ بك من

لہ بنو امیہ مراد ہیں۔

المأثم والمغرم

یعنی: "اے اللہ میں عذابِ قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور مسیح دجال سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور مرگ وحیات کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ میں گناہ اور قرض سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

اور آپ نماز میں پڑھا کرتے: اللھم اغفر لی ذنبی ووسع لی فی داری وبارك لی فیما رزقتنی۔

یعنی: "اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور میرے لیے میرے گھر میں وسعت عطا فرما اور جو تو نے مجھے رزق دیا اس میں برکت دے۔"

نیز پڑھا کرتے تھے۔ اللھم انی اسئالك الثبات فی الامر والعزیمة علی الرشد و اسئالك شکر نعمتك وحسن عبادتك واسئالك قلبا سلیما ولسانا صادقا واسئالك من خیر ما تعلم واعوذ بك من شر ما تعلم واستغفرك لما تعلم

یعنی: "اے اللہ میں امور میں ثابت قدمی، نیکی پر عزم کی استدعا کرتا ہوں اور تیری نعمت کا شکر کرنے، تیری اچھی عبادت کرنے کی (توفیق) چاہتا ہوں اور تجھ سے قلب سلیم، زبانِ صادق چاہتا ہوں اور تجھ سے ہر اُس بھلائی کی درخواست کرتا ہوں جو تو جانتا ہے اور ہر اُس شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو تو جانتا ہے اور جو تو جانتا ہے۔ اس سے تیری بخشش چاہتا ہوں۔

اور سجدہ میں آپ پڑھا کرتے: رب اعط نفسی تقواھا وزکھا انت خیر من زکاھا انت ولیھا ومولاھا۔

یعنی: "اے میرے پروردگار مجھے پرہیزگاری عطا فرما اور پاک کر دے تو ہی بہتر ہے جو پاک کرے۔ تو ہی کارساز اور آقا ہے۔"

نیز رکوع، سجدہ، قعدہ اور اعتدالِ رکوع میں جو دعائیں پڑھتے ان کا کچھ ذکر ہو چکا ہے۔

دعا صرف اپنے لیے یا جماعت کے لیے؟

نماز میں آپ کی جس قدر منقول ادعیہ ہیں وہ مفرد صیغہ سے مذکور ہیں جیسے رب اغفرلی وارحمنی واھدنی۔

"یعنی: اے میرے پروردگار مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے ہدایت دے۔

اسی طرح تمام منقول ادعیہ کا معاملہ ہے، نماز کے افتتاح پر جو دعا ہے وہ بھی اسی طرح (مفرد صیغہ سے ہے) اللھم اغسلنی من خطایای بالثلج والبرد والماء البارد اللھم باعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب۔

امام احمد رحمۃ اللہ اور محدثین نے حضرت ثوبانؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ کوئی شخص اپنی جماعت کی اس طرح امامت نہ کرے کہ دعا میں اپنی ہی تخصیص کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو خیانت کی۔

ابن خزیمہؒ نے اپنی صحیح میں سند میں روایت کیا اور یہ حدیث اللھم باعد بینی وبین خطایای لکھ کر فرمایا کہ یہ روایت اس روایت کا رد کرتی ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم کی امامت اس طرح نہ کرے کہ دعا میں اپنی تخصیص کرے اگر اس نے ایسا کیا تو خیانت کی اور میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے سنا کہ وہ اس حدیث کے متعلق فرمایا کرتے۔ میرے نزدیک یہ حدیث اس دعا کے متعلق ہے کہ جب امام اپنے اور مقتدیوں کے لیے (اجتماعی) صورت میں دعا کر رہا ہو۔ جیسے دعائے قنوت وغیرہ۔

نماز کے دوران میں دوسروں کے آرام اور ضرورت کا خیال رکھا جا سکتا ہے

اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کھڑے ہوتے تو سر جھکا لیتے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو نقل کیا ہے اور تشہد میں آپؐ کی نگاہ انگلی کے اشارہ سے آگے نہ بڑھتی۔ اور یہ مضمون گزر چکا ہے (کہ جس میں آیا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، نعمت، خوشی اور روح نماز میں کر رکھی تھی اور فرمایا کرتے تھے اے بلالؓ ہمیں نماز سے شاد کام کر، اور فرمایا کرتے: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

اس کے باوجود نماز کی یہ کیفیات آپ کو مقتدیوں کے احوال سے غافل نہ ہونے دیتیں، اگرچہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام اور قرب خصوصی حاصل تھا۔ آپ نماز شروع کرتے تو طویل کر دیتے پھر کسی بچہ کے رونے کی آواز سنتے تو اس خیال سے مختصر کر دیتے کہ کہیں ماں پر بار نہ گزرے۔ آپ نے ایک سوار بھیجا جو (فوج کا) پیش رو تھا۔ پھر آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اور جس قبیلہ سے وہ سوار آ رہا تھا۔ اس کی طرف التفات بھی کرنے لگے۔ چنانچہ سوار کے احوال سے بے خبر نہ رہے۔ اس طرح آپ فرض نماز ادا کر رہے تھے اور آپ نے اپنی نواسی امامہ بنت ابی العاص بن ربیع کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ جب آپ رکوع و سجدہ کرتے تو اسے نیچے بٹھا دیتے۔ نیز آپ نماز میں ہوتے اور حسنؓ و حسینؓ

آتے تو وہ آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے اور آپ طویل سجدہ کرتے اس خیال سے کہ وہ پشت سے گر نہ پڑیں۔ آپ نماز میں مشغول ہوتے حضرت عائشہ رضؓ اپنے کام سے آتیں اور (مسجد) کا دروازہ بند ہوتا تو آپ اس طرف تشریف لے جاتے اور دروازہ کھول دیتے۔ پھر نماز میں لوٹ آتے۔ نیز جو آپ کو سلام عرض کرتا، آپ اشارے سے اس کا جواب دیتے، حالانکہ آپ نماز میں ہوتے۔

حضرت جابر بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک کام سے بھیجا۔ جب میں واپس حاضر ہوا تو آپ نماز میں تھے۔ میں نے سلام عرض کیا تو آپؐ نے اشارہ (سے جواب دیا) اس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح مسلم میں روایت کیا ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اشارہ کر لیتے تھے۔ اسے امام احمدؒ نے نقل فرمایا۔ حضرت صہیبؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا، آپ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے سلام کیا۔ آپ نے اشارہ سے جواب دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ بتایا کہ آپ نے انگلی سے اشارہ کیا، یہ روایت سنن اور مسند میں مذکور ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قباء کی طرف تشریف لے گئے وہاں آپ نماز پڑھ رہے تھے (راوی نے بتایا کہ آپ کے پاس انصار حاضر ہوئے اور انہوں نے سلام عرض کیا، آپؐ نماز میں مشغول تھے۔ میں نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تم نے کس طرح جواب دیتے دیکھا۔ جب لوگ حالتِ نماز میں ایسا سلام کرتے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ "یوں فرماتے" اور (اس پر) جعفر بن عون نے ہاتھ کھولا اور اندر کا حصہ نیچا کر دیا اور پشت ذرا اونچی کر دی۔ یہ سنن اور مسند میں منقول ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس کو صحیح بتایا اور الفاظ یہ ہیں "وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے" اور عبداللہ رضؓ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا: "جب میں حبشہ سے واپس آیا تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نماز پڑھ رہے تھے میں نے سلام عرض کیا تو آپؐ نے سر سے اشارہ فرمایا۔ اس روایت کو بیہقی نے نقل کیا ہے۔ رہی وہ روایت جو ابو غطفان نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس نے نماز میں ایسا اشارہ کیا کہ جس سے مطلب سمجھا جا سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ روایت باطل ہے اور دارقطنیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ابن ابی داؤد کے نزدیک ابو غطفان ایک مجہول آدمی ہے اور صحیح روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نماز میں اشارہ کر لیا کرتے تھے۔ اس کو حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ

وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (نیز) آپ نماز پڑھ رہے ہوتے اور حضرت عائشہؓ آپ کے اور قبلہ کے درمیان (لیٹی) ہوتیں۔ چنانچہ جب آپ سجدہ کرتے تو آپ انہیں ہاتھ سے اشارہ فرما دیتے۔ وہ اپنی ٹانگیں سکیڑ لیتیں اور جب آپ کھڑے ہو جاتے تو پھر پھیلا دیتیں۔ کبھی آپ منبر پر نماز پڑھتے، اسی پر رکوع فرما لیتے اور جب سجدہ کا موقع آتا تو اترتے۔ اور زمین پر سجدہ کر لیتے۔ پھر اس پر چڑھ جاتے۔ ایک مرتبہ آپ دیوار کے رُخ پر نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک چوپایہ آیا اور آپ کے سامنے سے گزرنے لگا۔ آپ اُسے ہٹاتے لگے۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ دیوار سے لگا دیا۔ آپ نماز میں مصروف تھے کہ بنی عبدالمطلب کی دو لڑکیاں آئیں، جو آپس میں لڑ رہی تھیں۔ آپ نے ان دونوں کو پکڑ لیا اور اُن کو ایک دوسرے سے چھڑایا، حالانکہ نماز میں تھے۔ امام احمدؒ نے یہ الفاظ مزید لکھے۔ "تو ان دونوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے پکڑ لیے۔ آپ نے ان دونوں کو علیحدہ کیا اور (نماز) نہ توڑی۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے سامنے سے ایک لڑکا گزرا تو آپؐ نے اپنے ہاتھ سے (اشارۃً) ادھر فرمایا تو وہ واپس ہو گیا (نیز) آپ کے سامنے سے ایک لڑکی گزرنے لگی، آپ نے اُسے (اشارۃً)، ہاتھ سے ادھر فرمایا تو وہ واپس چلی گئی۔[1]

کبھی آپ نماز میں رو دیتے، کبھی کھکھار لیتے۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت مقررہ پر مجھے حاضری کی اجازت دے رکھی تھی۔ میں حاضر ہو جایا کرتا۔ چنانچہ جب میں حاضر خدمت ہوتا تو اجازت چاہتا۔ اگر میں نماز کی حالت میں پاتا تو کھکھارتے اور میں اندر چلا جاتا اور اگر فارغ پاتا تو اجازت دے دیتے۔ نسائیؒ اور احمدؒ نے اس کو نقل کیا اور امام احمد کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دن رات میں حاضری کے دو موقع حاصل تھے اور جب میں حاضر ہوتا اور آپ نماز پڑھ رہے ہوتے تو کھکھار دیتے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے انہوں نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اس طرح کہ وہ نماز میں کھکھار لیا کرتے اور کھکھارنے (تنحنحہ) کو باطل نماز نہ سمجھتے۔

(نیز) آپ نے کبھی ننگے پاؤں نماز پڑھی اور کبھی جوتے پہن کر نماز پڑھی۔ عبداللہ بن عمروؓ نے اس

---

[1] دورانِ نماز میں اس طرح کے کام عام طور پر احناف کے ہاں "عمل کثیر" کے ذیل میں آتے ہیں لہٰذا ناجائز ہیں، جس کی احادیث سے تصدیق ہوتی ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

طرح روایت کیا ہے اور جوتے پہن کر نماز پڑھنے کا حکم[۱] دیا۔ تاکہ یہود کی مخالفت ہو جائے۔ کبھی آپ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور کبھی دو میں۔

---

[۱] جوتے پہن کر نماز جائز ہے اگر شبہہ ہو کہ صاف نہیں ہیں تو نماز شروع کرنے سے پہلے زمین پر رگڑ لیا جائے۔　(رئیس احمد جعفری)

دُعائے قنوت

ایک اہم اور معرکہ آرا اختلافی مسئلہ

آپؐ نے دعائے قنوت ہمیشہ پڑھی یا کبھی کبھی؟

قنوت: آپ نے صبح کی نماز میں ایک ماہ تک، رکوع کے بعد پڑھی، پھر ترک کر دی اور ہمیشہ دعائے قنوت پڑھنا آپ کی سنت سے ثابت نہیں اور یہ بات ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رکوع سے سیدھا کھڑے ہونے پر دعائے قنوت پڑھتے ہوں اور کہتے ہوں: اللہم اهدنی فیمن هدیت وتولنی فیمن تولیت اور آواز بلند کرتے ہوں اور صحابہؓ آمین کہتے ہوں۔ اور (یہ کام) ہمیشہ جاری رہا ہو۔ یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ مگر امت کو اس کا علم نہ ہوا ہو، بلکہ اکثر امت اور جمہور صحابہؓ سب ہی اسے بھول جائیں۔ حتیٰ کہ بعض ان میں یہاں تک کہ گزریں کہ یہ اختراع (محدث) ہے جیسا کہ سعید بن طارق الشجعی بتاتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا: آپ نے یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور کوفہ میں پانچ برس (نماز پڑھی)، تو کیا وہ سب صبح کی نماز میں قنوت پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا: اے بیٹے! یہ اختراع ہے۔ اہل سنن اور احمدؒ نے اسے روایت کیا۔ امام ترمذیؒ اسے صحیح حسن قرار دیتے ہیں۔ دارقطنیؒ نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ابن عباسؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ صبح کی نماز میں دعائے قنوت بدعت ہے۔

امام بیہقیؒ نے مجاز سے نقل کیا ہے، انہوں نے بتایا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی تو انہوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے عرض کیا: میں دیکھتا ہوں کہ آپ نے دعائے قنوت نہیں پڑھی؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے یاد نہیں کہ کوئی صحابی ایسا کرتا ہو! اور یہ بات تو لازمی طور پر معلوم ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر صبح کو قنوت پڑھتے۔ اور دعا فرماتے اور صحابہؓ بھی اس پر آمین کہا کرتے تو امت اسے اسی طرح نقل کرتی جیسے نماز میں بہ آواز بلند قرأت، رکعات

نماز کی تعداد اور اوقات نماز نقل کرتی آئی ہے۔

اور انصاف یہی ہے جیسا کہ ایک انصاف پسند عالم درست سمجھتا ہے کہ آپ نے جہر کیا۔ سراً بھی پڑھا، قنوت پڑھا، ترک بھی کیا اور جہر سے زیادہ سراً پڑھا۔ قنوت سے زیادہ ترک قنوت معمول تھا نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصائب میں ایک قوم پر بد دعا فرمائی اور ایک قوم کے متعلق بھی قنوت پڑھی۔ پھر جب وہ لوگ واپس آگئے اور قید سے رہا ہو گئے اور جن کے لیے یہ دعا کی تھی وہ مسلمان ہو گئے اور توبہ کرتے ہوئے حاضر خدمت ہو گئے تو آپ نے (قنوت پڑھنا) ترک کر دیا۔ تو گویا آپ کی دعائے قنوت ایک عارضی سبب سے تھی۔ جب وہ زائل ہو گیا تو آپ نے بند کر دی اور آپ نے اسے فجر سے مخصوص نہیں کیا۔ بلکہ آپ صبح اور مغرب کی نماز میں بھی قنوت پڑھتے تھے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے اسے روایت کیا ہے۔ مسلمؒ نے حضرت براءؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ امام احمدؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی ہر نماز کے بعد قنوت پڑھی۔ جب آپ آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو اس کے بعد بنی سلیم کے قبیلہ، رعل، ذکوان، عصیہ کے خلاف دعا فرماتے۔ اور جو آپ کے پیچھے ہوتے وہ آمین کہتے۔ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آفات میں خصوصاً قنوت پڑھنا اور ان کے دور ہو جانے پر چھوڑ دینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور آپ نے اسے نمازِ فجر سے مخصوص نہیں کیا، بلکہ زیادہ تر آپ اسی نماز میں قنوت پڑھتے کیونکہ طوالت، رات کی نماز سے متصل ہونے، سحری کے قریب ہونے، وقتِ اجابت، نزولِ (رحمت)، الٰہی کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مشہور نماز ہے جس کی شہادت اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے یا دن رات کے فرشتے دیتے ہیں جیسا کہ مروی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول ان قرآن الفجر کان مشھودا کی تفسیر ہے۔

آپؐ قنوت میں کیا پڑھتے تھے؟

رہی ابن ابی قدیک کی روایت اجو اعبداللہ بن سعید طبری نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے ہاتھ اونچے کرتے اور یہ دعا پڑھتے۔

اللھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولیت وبارک لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت انک تقضی ولا یقضی علیک انہ لا یذل من والیت تبارکت ربنا وتعالیت۔

یعنی: "اے اللہ مجھے ہدایت دے ان لوگوں میں کہ جنہیں تو نے ہدایت دی ہے اور مجھے عافیت دے ان لوگوں میں کہ جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے اور میری کارسازی کر ان لوگوں میں کہ جن کی تو نے کارسازی کی ہے اور جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا ہے اس میں برکت دے اور مجھے اس برائی سے بچالے کہ جو تو نے مقدر کی۔ بے شک تو حکم کرتا ہے اور تجھ پر حکم نہیں کیا جاتا۔ بے شک جو تیرا دوست ہوا وہ ذلیل نہ ہوا اور اے رب تو بابرکت اور بلند ہے"۔

اگر یہ حدیث صحیح یا حسن ہوتی تو کس قدر واضح طور پر قابلِ حجت تھی، لیکن عبداللہ کی روایت سے یہ دعا حجت نہیں۔ اگرچہ حاکم نے قنوت میں احمد بن عبداللہ مزنی کی روایت کو درست قرار دیا ہے۔

البتہ حضرت ابوہریرۃؓ سے صحیح روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا، خدا کی قسم! میں تم سے سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے زیادہ قریب ہوں اور حضرت ابوہریرۃؓ صبح کی نماز میں آخری رکوع کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے۔ آپ مسلمانوں کے لیے دعا کرتے اور کفار پر لعنت بھیجتے اور یہ امر قطعی ہے کہ نبی صلی اللہ نے یہ کیا اور پھر ترک کر دیا۔ حضرت ابوہریرۃؓ کی خواہش تھی کہ لوگوں کو بتا دیں کہ اس قسم کی قنوت سنت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے اور یہ اہلِ کوفہ کے رد میں ہے کہ وہ صبح کی نماز میں آفات وغیر آفات کسی بھی حالت میں قنوت کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے اور اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور محدثین اسے آفات وغیرہ میں مستحب سمجھتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں سے یہی لوگ حدیث سے زیادہ واقف ہیں۔ اور (محدثین) کہتے ہیں کہ اس کا کرنا بھی سنت اور اس کا ترک کرنا بھی سنت ہے۔ اس کے باوجود جو اس پر دوام کرے اس کے (اس عمل) کا انکار نہیں کرتے اور اس کے ترک کو بدعت نہیں سمجھتے اور نہ تارکِ (قنوت) کو سنت کا مخالف سمجھتے ہیں۔ بلکہ (ان کا خیال یہ ہے، کہ جس نے قنوت پڑھی اس نے اچھا کیا اور جس نے چھوڑی اس نے بھی اچھا کیا، لیکن اعتدال یہ ہے کہ دعا و ثنا کرے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع کیا اور دعائے قنوت عبارت ہے۔ دعا اور ثنا سے، اس لیے وہ اس مقام پر موزوں تر بھی ہے، لہٰذا جب امام بھی مقتدیوں کی آگاہی کے لیے جہر کرے، تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ حضرت عمرؓ نے شروع شروع میں مقتدیوں کو آگاہ کرنے کے لیے جہر سے پڑھی۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے نمازِ جنازہ میں

سورۂ فاتحہ جہر سے پڑھی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے نیز آمین بالجہر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اور یہ اختلاف مباح ہے۔ اس کے کرنے یا نہ کرنے پر کسی کو موردِ الزام نہیں بنایا جا سکتا۔ اس طرح نماز میں رفع یدین یا ترکِ رفع ہے، یا تشہداتِ مختلفہ کا اختلاف۔ اذان اور اقامت کی اقسام۔ افراد تمتع اور حج قران میں قربانی کی انواع کا معاملہ ہے اور ہمارا مقصد تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بیان کرنا ہے، جس پر وہ عمل پیرا تھے، کیونکہ آپ ہی اس کتاب میں مقاصد اور توجہات کا مرکز ہیں اور مدارِ تحقیق مطلب بھی آپ کی ذاتِ گرامی ہے۔

ہم نے اس کتاب میں جائز و ناجائز پر بحث نہیں کی بلکہ ہمارا مقصود صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بیان کرنا ہے جو وہ اپنے لیے انتخاب فرماتے تھے، کیونکہ آپ کامل اور افضل ہدایت ہیں۔ پس اگر ہم یہ کہیں کہ فجر میں آپ ہمیشہ قنوت نہیں پڑھتے تھے اور نہ جہراً (بسم اللہ) کا دوام تھا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے علاوہ دوسری سمت مکروہ یا بدعت ہے۔

ابو جعفر رازی کی روایت پر جرح

رہی ابو جعفر رازی کی روایت جو حضرت ربیع بن انس رضؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ یہ روایت مسند اور ترمذی وغیرہ میں ہے۔ امام احمدؒ وغیرہ نے ابو جعفر کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن مدینیؒ نے کہا ہے کہ وہ خلط ملط کرتا تھا۔ ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ اسے بکثرت وہم تھا۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ یہ بزرگان (دین) سے منکر (روایات) نقل کرنے میں منفرد ہے۔

قنوت، قیام، سکوت، مسلسل عبادت، دعا، تسبیح اور خشوع و خضوع (سب پر) بول جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ۔

یعنی: اور جو بھی آسمانوں اور زمین پر ہے سب اللہ کا ہے۔ ہر ایک اسی کا فرمانبردار ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا يَّحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهِ

یعنی: کیا وہ جو فرمانبردار ہے اور رات بھر سجدہ و قیام میں رہتا ہے، قیامت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے امید رکھتا ہے۔

نیز فرمایا: وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ۔

یعنی: اور اس نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے بہتر نماز وہ ہے کہ جس میں قنوت طویل ہو۔ اور زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ۔ یعنی: اور اللہ کے لیے فرمانبردار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔ تو ہمیں خاموشی کا حکم دیا گیا اور بات کرنے سے روک دیا گیا۔

حضرت انس کی روایت پر نقد و نظر

حضرت انسؓ نے باقی نمازوں کے علاوہ فجر میں قنوت کی تخصیص کی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ یہ کفار کے لیے بددعا تھی اور کمزور مومنین کے حق میں دعائے خیر نہ تھی، کیونکہ حضرت انس بتلاتے ہیں کہ آپ نے ایک ماہ تک دعائے قنوت پڑھی اور پھر چھوڑ دی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جس دعا کی آپ نے مداومت اختیار کی وہ معروف قنوت (حمد وغیرہ) تھی۔ نیز ابوبکر و عمر، عثمان، علی، براء بن عازب، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، ابوموسیٰ اشعری اور انس بن مالک وغیرہ رضی اللہ عنہم نے بھی قنوت پڑھی۔ اس کا جواب کئی طرح سے ہے۔

کیا قنوت صرف فجر کے ساتھ مخصوص ہے؟

ایک تو یہ کہ حضرت انسؓ نے بتایا ہے کہ آپ نے صبح اور مغرب کی نماز میں قنوت پڑھی، جیسا کہ بخاریؒ نے بھی ذکر کیا ہے تو اس میں فجر سے تخصیصِ قنوت نہیں ثابت۔ اس طرح حضرت براءؓ بن عازب نے نقل کیا ہے اور قنوت کے متعلق فجر کی تخصیص نہیں کی ہے۔ اب اگر تم یہ کہو کہ مغرب کی قنوت منسوخ ہو چکی ہے تو تمہارے مقابلہ میں کوفہ کے مباحثہ کرنے والے کہیں گے کہ فجر کی قنوت بھی منسوخ ہو چکی ہے اور مغرب کی قنوت کے منسوخ ہونے پر تم جو حجت پیش کرو گے اُسے فجر کی قنوت کی تنسیخ پر حجت بنا کر پیش کر دیا جائے گا۔ اور اس کا تو ابد تک بھی امکان نہیں کہ تم فجر کی نماز میں قنوت کے حکم اور مغرب کی تنسیخ قنوت کے متعلق کوئی دلیل حاصل کر سکو۔ اگر یہ کہو کہ مغرب کی قنوت تو دراصل قنوت نازلہ تھی۔ قنوت راتبہ نہ تھی تو تمہارے جواب میں محدثین یہ کہیں گے "ہاں! یہی صورت قنوتِ فجر کی بھی ہے تو دونوں ایک جیسی ہوئیں پھر فرق کیا رہا؟ اور انہوں نے (کوفیوں) نے کہا ہے کہ قنوتِ فجر، قنوت راتبہ نہ تھی بلکہ قنوتِ نازلہ تھی۔ اور حضرت انس نے خود اس کی خبر دی (نیز) قنوتِ راتبہ کے معاملہ میں حضرت انسؓ ہی بنیاد ہیں اور انسؓ نے بتایا کہ یہ قنوت نازلہ تھی، پھر اسے چھوڑ دیا اور صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک قنوت (نازلہ) پڑھی۔ آپ قبائل عرب میں سے ایک قبیلہ پر بددعا

کر رہے تھے، پھر آپ نے چھوڑ دی۔ دوسرے شبابہ نے قیس بن ربیع اور انہوں نے عاصم بن سلیمان سے روایت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے حضرت انس رضؓ بن مالک سے دریافت کیا کہ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھتے رہے۔ انہوں نے جواب دیا اس گروہ نے جھوٹ بولا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک دعائے قنوت پڑھی۔ آپ مشرکین کے قبائل میں سے ایک قبیلہ کے خلاف بد دعا کر رہے تھے۔ قیس بن ربیع کو اگرچہ یحییٰ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن بعض نے اس کی توثیق کی ہے۔

ابو جعفر اور قیس کی توثیق اور تضعیف

اور (دوسری روایت) ابو جعفر رازی پر منحصر ہے۔ ابو جعفر اپنے اس قول میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت فرما گئے" کیونکر حجت ہو سکتا ہے؟ حالانکہ (پہلا راوی) اس سے زیادہ ثقہ یا اس کے برابر ہے اور ابو جعفر کو ضعیف قرار دینے والوں کی تعداد قیس کو ضعیف سمجھنے والوں سے زیادہ ہے۔ اس بحث سے قیس کی یحییٰ سے روایت کا ضعف اور اس کا سبب معلوم ہوتا ہے۔

احمد بن سعید بن ابی مریم نے بتایا کہ میں نے یحییٰ سے اور انہوں نے قیس سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ ضعیف ہے، اس کی روایت لکھی نہیں جاتی۔ وہ عبیدہ سے روایت کرتا ہے۔ حالانکہ اس کے نزدیک وہ منصور سے روایت کرتا ہے (لیکن، اس قسم کی باتیں راوی کی روایت رد کرنے کا موجب نہیں تھیں، کیونکہ اس کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ غلط ہے اور اور منصور کے بجائے عبیدہ کا ذکر وہم میں داخل ہے۔

ایک ماہ تک مسلسل قنوت

(تیسرے) حضرت انس رضؓ نے بتایا کہ وہ قنوت پڑھتے تھے اور ابتدائے قنوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی جو انہوں نے رعل اور ذکوان کے خلاف پڑھی تھی۔ اسی طرح صحیحین میں حضرت عبدالعزیز بن صہیب سے اور انہوں نے حضرت انس رضؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر آدمیوں کو کسی کام سے بھیجا جنہیں قرار کہتے تھے۔ تو ایک کنوئیں کے پاس بنی سلیم کے قبائل رعل اور ذکوان ان کے مقابلہ پر اتر آئے اس کنوئیں کو بیر معونہ کہتے ہیں۔ ان صحابہ نے کہا کہ خدا کی قسم ہم تمہارے پاس نہیں آئے۔ بلکہ ہم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کام کے سلسلہ میں جا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے ان (صحابہ) کو شہید کر دیا۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک صبح کی نماز میں قنوت پڑھی۔ یہ قنوت کی ابتدا تھی اور ہم (بعد میں) قنوت نہ پڑھتے

تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ ہمیشہ دعائے قنوت پڑھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے اور حضرت انسؓ کا یہ قول کہ یہ "ابتدائے قنوت تھی"۔ اور پھر یہ فرمانا کہ آپ نے ایک ماہ تک قنوت پڑھی پھر چھوڑ دی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے انہوں نے وہ قنوت ثابت کی، جو قنوت نازلہ تھی۔ اور آپ نے ایک ماہ تک پڑھا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے آپؐ نے عشا کی نماز میں ایک ماہ قنوت پڑھی جسے صحیحین میں یحییٰ بن ابی کثیر سے اور انہوں نے ابوسلمہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں ایک ماہ تک قنوت پڑھی اور آپ قنوت میں یہ دعا مانگتے :۔

اللھم انج الولید بن ولید اللھم انج سلمہ بن ھشام اللھم انج عیاش بن ابی ربیعہ اللھم انج المستضعفین من المومنین اللھم اشدد وطاتک علی مضر اللھم اجعلھا علیھم سنین کسنی یوسف۔

"یعنی اے اللہ ولید بن ولید کو نجات دے اے اللہ سلمۃ بن ہشام کو نجات دے، اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے، اے اللہ کمزور مومنین کو نجات دے، اے اللہ مضر قبیلہ پر اپنی گرفت سخت کر دے اور ان پر (عہد یوسف) کی قحط سالی ڈال دے۔"

حضرت ابو ہریرہؓ بتاتے ہیں کہ وہ ایک دن صبح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا نہ کی آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ جو تم دیکھ رہے تھے وہ اسے پہنچ چکے۔ تو صبح کی نماز کا قنوت ایسے ہی تھا وہ نازلہ ہوتا یا کسی امر عارضی کے سبب سے ہوتا اس لیے حضرت انسؓ نے اسے ایک ماہ کے لیے بتایا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ان کے لیے صبح کی نماز میں ایک ماہ تک قنوت پڑھی یہ دونوں درست ہیں اور حضرت عکرمہؓ کی حضرت ابن عباسؓ سے روایت گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک مسلسل ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور صبح کی نماز میں قنوت پڑھی۔ اسے ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت صحیح ہے (نیز) طبرانیؒ نے اپنی معجم میں محمد بن انس سے روایت کیا، انہیں مطرف بن طریف نے انہیں ابی جہم نے بتایا اور انہیں حضرت براءؓ بن عازب سے روایت ملی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی نماز پڑھتے اس میں دعائے قنوت پڑھتے۔

امام طبرانیؒ فرماتے ہیں کہ مطرف سے صرف محمد بن انس نے روایت کیا ہے یہ اسناد اگرچہ

قابل حجت نہیں، لیکن پھر بھی معنی کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے، کیونکہ قنوت دعا کو کہتے ہیں اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز ایسی نہ پڑھی جس میں دعا نہ کی ہو جیسا کہ گزر چکا ہے اور ابو جعفر کی روایت اگر صحیح ہو تو حضرت انس رضہ کا مطلب بھی اس سے یہی ہے کہ آپ ہمیشہ قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ ہمیں اس میں کوئی شک و شبہ بھی نہیں کہ صبح کی نماز میں آپ ہمیشہ دعا پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔

انس رضہ اور عاصم کی روایت میں موازنہ

(وجہ چہارم) یہ ہے کہ حضرت انس رضہ کے طرق احادیث مطلب کو واضح کرتے ہیں اور ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے اور متناقض نہیں ہے اور صحیحین میں حضرت عاصم احول سے روایت ہے، انہوں نے بتایا کہ میں نے انس رضہ بن مالک سے صبح کی قنوت کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا "ہاں"۔ تو میں نے جواب دیا کہ "رکوع سے پہلے" پھر میں نے کہا کہ فلاں نے مجھے آپ کے متعلق اطلاع دی کہ آپ نے کہا ہے کہ آنحضرت نے (رکوع) کے بعد قنوت پڑھی۔ انہوں نے جواب دیا "اس نے جھوٹ بولا، بلکہ میں نے تو کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت پڑھی"۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ یہ روایت معلول ہے۔ عاصم نے اس میں تفرد کیا ہے۔ کیونکہ حضرت انس رضہ سے تمام روایت کرنے والوں نے اس کی مخالفت کی ہے، تو ان کا جواب یہ ہے کہ عاصم بالکل ثقہ ہے۔ ہاں اس نے صرف دو قنوتوں کے مقام پر اصحاب انس رضہ کے خلاف کیا ہے۔ حافظ نے اسے وہم بتایا ہے۔ اور جواد اسے ساقط کرتے ہیں۔ اور امام احمد رح سے اس کی تعلیل مروی ہے چنانچہ اثرم نے بتایا کہ میں نے ابو عبداللہ یعنی احمد بن حنبل رح سے دریافت کیا کہ عاصم احول کے سوا حضرت انس رضہ سے یہ روایت کس کی مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے قبل قنوت پڑھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ روایت کی ہو۔ پھر ابو عبداللہ نے بتایا کہ عاصم کی تمام رواۃ نے مخالفت کی ہے ہشام نے قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضہ سے اور تیمی نے ابو مجلز سے اور انہوں نے حضرت انس رضہ اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے رکوع کے بعد قنوت پڑھا۔ اور ایوب نے محمد سے روایت کیا کہ میں نے حضرت انس رضہ سے دریافت کیا اور حنظلہ سدوسی نے چار طرق سے حضرت انس رضہ سے روایت کیا۔ رہا عاصم! تو میں نے اس سے معلوم کیا تو اس نے جواب دیا کہ انہوں نے جھوٹ کہا۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے رکوع کے بعد (صرف) ایک ماہ تک قنوت پڑھی۔ دریافت کیا گیا کہ عاصم سے کس نے روایت کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا ابو معاویہ وغیرہ نے ابو عبداللہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا تمام روایات رکوع کے بعد والی نہیں ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا بلکہ یہ تمام خفان بن ایماء بن رخصہ اور ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں۔ میں نے ابو عبداللہ سے دریافت کیا تو پھر وہ رکوع سے قبل قنوت کی رخصت کیوں دیتے ہیں۔ جبکہ احادیث صحیحہ میں رکوع کے بعد (قنوت) ثابت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ فجر کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت ہے اور وتر میں رکوع کے بعد مختار ہے اور جو رکوع سے قبل کرے تو بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا فعل اور ان کا اختلاف (موجود) ہے۔ رہی صبح کی نماز میں رکوع کے بعد۔ تو کہا جائے گا کہ اس صحیح حدیث کی تعلیل تعجب انگیز ہے۔ جس کی صحت پر اتفاق ہے اور اسے ائمہ ثقہ نے اثباتِ حفاظ اور ابو جعفر رازی، قیس بن ربیع، عمرو بن ایوب، عمرو بن عبید، دینار اور جابر جعفی جیسی روایت کا قابلِ استدلال ہونا روایت کیا ہے۔

روایات انسؓ میں کسی طرح کا تناقض نہیں

حضرت انسؓ کی تمام روایات صحیح ہیں جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور ان میں تناقض نہیں ملتا اور رکوع سے قبل جو قنوت کا ذکر ہوا وہ (رکوع) کے بعد والے قنوت کے علاوہ ہے اور اس کا وقت بھی اس سے الگ ہے۔ تو جو رکوع سے قبل ہے (اس کا مطلب) قراۃ کے لیے طولِ قیام ہے، جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر نماز طویل قنوت (قیام) والی ہوتی ہے اور جو قنوت رکوع کے بعد مذکور ہے وہ دعا کے لیے طویل قیام ہے۔ آپؐ نے ایک ماہ تک ایک قوم کے خلاف اور ایک قوم کی حمایت میں پڑھا۔ پھر آپؐ اس رکن کو دعا و ثناء کے لیے طویل رکھتے گئے یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ثابتؒ اور انہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہیں اسی طرح نماز پڑھاتا رہا ہوں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھاتے رہے ہیں۔ اور راوی نے بتایا کہ حضرت انسؓ ایک ایسا کام بھی کرتے تھے، جسے میں دیکھتا ہوں کہ تم نہیں کرتے۔ جب آپ رکوع سے سر اٹھاتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ حتیٰ کہ کہنے والا کہتا کہ شاید بھول گئے ہیں۔ بس یہ ہی وہ قنوت ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عامل رہے یہاں تک کہ دنیا سے رحلت فرما گئے اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ آپ اس طویل وقفہ میں خاموش نہ رہتے۔ بلکہ اپنے پروردگار کی ثناء و

تجید کرتے اور دعا مانگتے اور یہ دعا اس ماہ کی معروف قنوت سے الگ تھی، کیونکہ وہ تو رعل، ذکوان، عصیہ اور بنی لحیان کے خلاف بددعا تھی اور جو کمزور مومنین مکہ میں تھے ان کے حق میں دعائے (رحمت تھی)

رہی صبح کی نماز سے اس کی تخصیص تو یہ سائل کے سوال کے مطابق (حال) بات تھی۔ کیونکہ اس نے قنوتِ فجر کے متعلق دریافت کیا تھا۔ تو انہوں نے اس سوال کا جواب دیا۔ نیز آپ باقی تمام نمازوں کے علاوہ صبح کی نماز (خصوصاً) طویل کرتے تھے۔ اور ساٹھ سے سو آیات تک پڑھتے تھے اور جیسا کہ حضرت براءؓ بن عازب نے بتایا ہے کہ آپؐ کا رکوع، اعتدال، سجود اور قیام قریب ہوتا۔ باقی تمام نمازوں کے علاوہ صبح کی نماز میں آپ کے طول قیام کا خوب اظہار ہوتا۔ یہی آپ کی قنوت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے ہمیں اس میں نہ شک ہوا اور نہ ہوگا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ دنیا سے رحلت فرما گئے اور جب عام لوگوں اور اکثر فقہاء کی زبان میں یہی معروف دعا قنوت بن کر رہ گئی: اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ فِیْمَنْ ھَدَیْتَ الخ اور انہوں نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھتے یہاں تک کہ آپؐ دنیا سے رحلت فرما گئے اور اسی طرح خلفائے راشدین اور ان کے علاوہ صحابہؓ میں سے (ایک گروہ) نے دعائے قنوت کو اپنی اصطلاح کے مطابق قنوتِ (مخصوصہ پر عمل کیا۔ اور اس مخصوص دعا) کے سوا باقی (معانی) غیر معروف بن گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ ہر صبح کی (نماز) میں اس پر مداومت کرتے رہے اور یہی وہ مسئلہ ہے کہ جس میں جمہور علماء نے نزاع کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آپؐ کا دائب فعل (مسلسل) نہ تھا، بلکہ یہ ثابت ہی نہیں کہ آپ نے کیا بھی ہو۔ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ روایت ہے کہ آپؐ نے حسنؓ بن علیؓ کو یہ دعا سکھائی۔ جیسے کہ مسند اور سنن اربعہ میں ہے۔

حضرت حسنؓ کی روایت

(حضرت حسنؓ) نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وتر میں پڑھنے کے لیے کلمات سکھائے (وہ یہ ہیں)

اللھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولیت وبارک لی فیما اعطیت ۔ وقنی شر ما قضیت فانک تقضی ولا یقضی علیک انہ لا یذل من والیت تبارکت ربنا وتعالیت (حسن ترمذی)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم قنوت کے متعلق اس سے زیادہ احسن (دعا) نہیں جانتے۔
امام بیہقیؒ نے اس پر یہ الفاظ زیادہ بتائے ہیں۔

ولا یذل من والیت ولا یعز من عادیت۔

یعنی: "تیرا دوست ذلیل نہ ہوگا۔ تیرا دشمن عزت نہ پائے گا"

جس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کی قنوت سے مراد رکوع کے بعد بھی تو وہ دعا و ثناء کے لیے قیام ہے۔ سلیمان بن حرب روایت کرتے ہیں کہ ہمیں ابو ہلال نے اور انہیں حضرت قتادۃؒ کی مسجد کے سامنے حضرت حنظلہ نے بتایا، میں کہتا ہوں کہ وہ صدوسی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں اور قتادۃؒ صبح کی نماز کے قنوت میں اختلاف کرنے لگے۔ قتادۃ نے کہا کہ رکوع سے پہلے! میں نے کہا کہ رکوع کے بعد!

آخر میں ہم حضرت انسؓ بن مالک کے پاس آئے ہم نے ان کے سامنے اس کا ذکر کیا۔
انہوں نے بتایا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (اقتدا) میں فجر کی نماز میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے تکبیر کہی اور رکوع کیا اور سر اٹھایا، پھر سجدہ کیا۔ پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے تو تکبیر کہی اور رکوع کیا، پھر سر اٹھایا، پھر کچھ دیر کھڑے ہوئے، پھر سجدہ میں چلے گئے۔

یہ روایت حضرت ثابتؒ کی روایت کے مطابق ہے اور وہ قنوت کے مسئلہ میں حضرت انسؓ کے مطلب کی وضاحت کرتی ہے۔ انہوں نے اس کے متعلق صاف بتا دیا کہ آنحضرتؐ نے رکوع کے بعد قنوت پڑھی۔ قیام طویل تھا اور حضرت انسؓ کا مطلب بھی یہی تھا۔ چنانچہ تمام احادیث متفق ہو گئیں۔

رہیں صحابہؓ سے روایات، تو وہ دو طرح سے ہیں، ایک مصائب کے وقت کی قنوت جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قنوت، مسیلمہ کذاب سے صحابہؓ کی جنگ کے موقع پر اور اہلِ کتاب کے ساتھ جہاد کے وقت یا قنوت عمرؓ یا حضرت علیؓ کی قنوت، معاویہؓ اور اہل شام سے جنگ کے وقت۔ دوسری قسم مطلق ہے، اس کا مطلب اس رکن میں تطویل دعا و ثنا ہے۔

سجدۂ سہو

آں حضرتؐ نے کن کن مواقع پر سجدۂ سہو کیا؟

سجدۂ سہو کی مصلحت اور حکمت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تم جیسا ایک آدمی ہوں، جس طرح تم بھول جاتے ہو، اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں۔ پس جب میں بھول جاؤں، مجھے یاد دلادو۔

نماز میں آپ کا سہو دراصل ان کی امت پر اللہ تعالیٰ کا اتمام نعمت اور اکمال دین کا باعث ہوتا تھا کہ سہو میں جو طریقہ مشروع ہو اس میں آپ کی اقتداء کریں۔ مؤطا میں منقطع روایت کا یہی مطلب ہے کہ میں بھول جاتا ہوں، یا بھلا دیا جاتا ہوں۔ تاکہ وضاحت کروں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھول جاتے تو آپ کے سہو پر احکام شریعت مرتب ہوئے، جو قیامت تک آپ کی امت کے سہو پر جاری رہیں گے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعت والی (نماز) میں دوسری رکعت کے بعد کھڑے ہو گئے اور دونوں کے درمیان قعدہ نہیں کیا، یعنی بیٹھے نہیں جب آپ نے نماز ختم کر لی، تو سلام سے پہلے دو سجدے کیے پھر سلام کیا۔ اس طرح اس سے ایک قاعدہ معلوم ہو گیا کہ جو آدمی ارکان کے ماسوا نماز کے باقی اجزاء میں سے کچھ حصہ سہواً چھوڑ دے تو وہ سلام سے قبل سجدہ سہو کرے۔

اور بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آپ نے ایک رکن سہواً چھوڑ دیا اور

لہ سجدۂ سہو، کی تعلیم عملی آپ کی طرف سے ضروری تھی، تاکہ امت اس پر عمل کر سکے اور اسوۂ نبیؐ کی روشنی میں تلافیٔ مافات کر سکے۔

(رئیس احمد جعفری)

اور دوسرا رکن شروع کیا تو متروک حصہ کی طرف نہیں پلٹے، کیونکہ جب آپ (دو رکعت کے بعد) کھڑے ہو گئے تو صحابہؓ نے سبحان اللہ کہا۔ آپ نے انہیں اشارہ کیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔[1]

اس محل سہو میں آپ سے اختلاف مروی ہے۔ صحیحین میں عبداللہ بن بحینہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں دو رکعت کے بعد کھڑے ہو گئے اور درمیان میں نہ بیٹھے۔ پھر جب آپ نے نماز مکمل کر لی تو دو سجدے کیے پھر اس کے بعد سلام پھیرا۔ ایک متفق علیہ روایت کے مطابق آپ نے سلام سے قبل بیٹھی ہوئی حالت میں ہر سجدہ پر تکبیر پڑھی اور مسند میں حضرت یزید بن ہارون سے اور انہوں نے مسعودی سے اور انہوں نے زیاد بن علاقہ سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے ہمیں نماز پڑھائی۔ جب آپ دو رکعت پڑھا چکے تو کھڑے ہو گئے اور نہ بیٹھے۔ پیچھے والوں نے تسبیح کہی۔ تو انہوں نے ان کو اشارہ کیا کہ کھڑے ہو جاؤ چنانچہ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام پھیرا، پھر دو سجدے کیے، پھر (دوبارہ) سلام پھیرا۔ اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا تھا۔ ترمذیؒ نے اسے صحیح بتایا۔

امام بیہقیؒ نے عبدالرحمٰن بن شماسہ مہری کی روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرت عقبہؓ بن عامر جہنی نے ہمیں نماز پڑھی۔ چنانچہ آپ کھڑے ہو گئے، حالانکہ آپ کو قعدہ کرنا چاہیے تھا۔ تو لوگ کہنے لگے سبحان اللہ، سبحان اللہ (حضرت عقبہؓ) نہ بیٹھے اور قیام میں ہی (نماز) پڑھتے چلے گئے۔ آخر نماز کے آخری حصہ میں پہنچے تو بیٹھے بیٹھے دو سجدے کیے اور جب سلام پھیرا تو فرمایا کہ میں نے شروع میں تمہیں سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے سنا تاکہ میں بیٹھ جاؤں، لیکن سنت وہی ہے جو میں نے کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن بحینہ کی روایت تین وجوہ سے اولیٰ ہے۔

ایک تو وہ روایت حضرت مغیرہؓ کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ دوسرے وہ اس سے زیادہ صریح ہے، کیونکہ قول مغیرہؓ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہو سکتا ہے کہ اس کی نسبت حضرت مغیرہؓ کے جملہ فعل کی طرف منسوب ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام سے قبل ایک سجدہ اور سلام کے بعد بھی ایک سجدہ کیا ہو۔ چنانچہ ابن بحینہؓ نے جو دیکھا اسے نقل کر دیا اور حضرت مغیرہؓ نے جو دیکھا اسے نقل کر دیا اس لیے دونوں باتیں جائز ہوئیں۔

---

[1] نماز میں کلام ممنوع ہے۔ امام کی غلطی یا سہو و نسیان کی صورت میں مقتدی اسے صرف سبحان اللہ وغیرہ کہہ کر ٹوک سکتا ہے جو امام کو متنبہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت مغیرہ رضؓ کا مطلب یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور مراجعت نہیں کی، پھر سجدہ سہو کیا۔

تیسرے مغیرہ رضؓ شاید سلام سے قبل سجدہ کرنا بھول گئے اور اس کے بعد سجدہ کیا، یہ سہو کا معاملہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ سجدہ سلام سے قبل سمجھا جائے۔

سجدہ سہو کی پانچ صورتیں

۱۔ ایک مرتبہ آپؐ نے عشاء یا ظہر، یا عصر کی نماز پڑھائی دو رکعتیں پڑھ کر کچھ کلام کیا، پھر نماز پوری کی، پھر سلام پھیرا، پھر (سہو کے) دو سجدے کیے، بہ آواز بلند سجدہ کرتے وقت اللہ اکبر کہا، پھر سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بہ آواز بلند اللہ اکبر کہا۔

(۲) ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی، پھر دو سجدے کیے، پھر تشہد پڑھا، پھر سلام پھیرا، ترمذیؒ کے نزدیک یہ حدیث حسن، غریب ہے۔

(۳) ایک مرتبہ آپؐ نے عصر کی تین رکعتیں پڑھائیں، پھر آپ گھر میں داخل ہو گئے۔ لوگوں نے یاد دلایا تو آپؐ باہر آئے اور مزید ایک رکعت پڑھا کر دو سجدے (سہو کے) کیے۔

۴۔ ایک مرتبہ آپؐ نے نماز پڑھائی، لیکن ایک رکعت کم، پھر نماز پڑھا کر آپ واپس چلے تو حضرت طلحہ رضؓ نے عرض کیا:

"آپؐ نے نماز میں ایک رکعت فراموش کر دی۔"

یہ سن کر آپ واپس لوٹے، مسجد میں داخل ہوئے اور بلال رضؓ کو حکم دیا کہ اقامت کہیں، پھر آپؐ نے (دوبارہ) نماز پڑھائی، یہ روایت امام احمد نے ذکر کی ہے۔

۵۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ظہر کی چار کے بجائے پانچ رکعتیں پڑھ لیں، زیدؓ نے ٹوکا تو آپؐ نے پوچھا کیا بات ہے؟"

لوگوں نے عرض کیا آپ نے پانچ رکعتیں پڑھائی ہیں۔"

"یہ سن کر سلام کے بعد آپؐ نے دو سجدے کیے، اس کے بعد پھر سلام پھیرا۔

یہ ہیں وہ پانچ روایات جو سجدۂ سہو کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مروی ہیں۔

سجدۂ سہو سلام سے پہلے یا بعد؟

آپؐ نے سجدہ سہو سلام پھیرنے سے پہلے بھی کیا اور سلام پھیرنے کے بعد بھی کیا۔ امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ

آپؐ نے تمام سجدے سلام سے پہلے کیے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے جتنے سہو کے سجدے کیے وہ سلام پھیرنے کے بعد کیے، امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ جب نماز میں سہو سے آپ نے کمی کی، یعنی کوئی رکعت کم پڑھی تو سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کیا اور جب زیادتی کی، یعنی کوئی رکعت زیادہ پڑھی تو سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کیا، اور اگر کسی نماز میں کمی اور زیادتی جمع ہو گئی تو سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ کیا۔

اثرم کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل سے سجدہ سہو کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آیا وہ سلام پھیرنے سے پہلے کیا جائے یا بعد میں؟ انہوں نے جواب دیا بعض مواقع پر سلام سے پہلے، اور بعض مقامات پر سلام کے بعد، جیسا کہ رسول اللہؐ کے عمل سے ثابت ہے۔ حدیث ابوہریرہؓ کے مطابق ذوالیدین کے واقعہ میں آپؐ نے سلام کے بعد سجدہ کیا اور حدیث عمران بن حصین کے مطابق سلام سے پہلے کیا۔

اثرم کہتے ہیں میں نے امام احمد سے پوچھا ان مواقع کے علاوہ کیا صورت اختیار کی جائے؟ امام احمدؒ نے جواب دیا، باقی تمام سہو کے سجدے سلام سے پہلے کیے جائیں، کیونکہ یہ سجدہ سہو نماز کی کمی کو پورا کر دیتا ہے، بلکہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد از سلام سجدہ مروی نہ ہوتا تو میں صرف قبل از سلام سجدہ سہو کا فتویٰ دیتا، کیونکہ نماز کی شان کا اقتضا یہی ہے کہ سلام سے پہلے سجدہ کیا جائے۔

داؤد کا قول ہے کہ ان مواقع کے سوا جو رسول اللہؐ سے ثابت ہیں سجدہ سہو جائز نہیں۔[1]

نماز میں آنکھیں بند رکھنا سنت رسولؐ نہیں

یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ تشہد کے اندر دعا پڑھتے ہوئے آپؐ انگلی کی طرف نگاہ سے اشارہ کرتے اور آپؐ کی نگاہ اشارہ سے تجاوز نہ کرتی جیسا کہ بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرت عائشہ کے پاس ایک پردہ تھا جسے وہ اپنے مکان کی ایک جانب ڈال لیتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے پردہ سے یہ ہٹا دو، کیونکہ اس کی تصاویر مسلسل میری نماز میں حائل ہو رہی ہیں اور اگر آپ نماز میں اپنی آنکھیں بند کرتے تو نماز میں یہ حائل نہ ہوتیں۔

---

[1] یعنی نماز دہرانی چاہیے۔ (رئیس احمد جعفری)

اس حدیث کا استدلال محل نظر ہے، کیونکہ جو چیز آپ کی نماز میں حائل تھی وہ وہی تصاویر تھیں جن کا ذکر کیا جاتا ہے یا محض دیکھنا ہی حارج تھا، یہ بھی احتمال ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی خوب وضاحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر میں نماز پڑھی، جس میں نقوش تھے تو آپؐ نے ان نقوش کو دیکھا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا میری اس چادر کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور ابوجہم کی چادر میرے پاس لے آؤ۔ کیونکہ شروع میں یہ میری نماز میں حارج ہوئی اور اس میں یہ بھی استدلال ہے کہ اس کا مقصود یہ تھا کہ اس میں ان کی طرف التفات پیدا ہو گیا اور اس التفات کی وجہ سے آپ کی نماز میں رکاوٹ ہو گئی اور شعب کی طرف التفات والی روایت سے یہ مراد نہیں کہ (یہ سبب تھا) کہ آپ نے ایک سوار کو پیش رو کے طور پر بھیجا بلکہ التفات امور لشکر کی ضرورت کے باعث تھا۔ اور اس سے نماز کسوف میں آپ کے ہاتھ بڑھانے پر بھی روشنی پڑتی ہے، تاکہ انگور کا خوشہ لے سکیں، جبکہ آپؐ نے جنت دیکھی اور آپؐ کا دوزخ کو اور بلی کے مالک کو اور صاحب محجن کو دیکھنا بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے) ایسے اس جانور سے مدافعت کی روایت کہ جس نے آپ کے سامنے سے گزرنا چاہا، ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو ہٹانا اور دو لڑکیوں کے درمیان آڑ بن جانا ایسے ہی جس نے سلام کیا اشارہ سے اس کے سلام کا جواب دینا حالانکہ آپؐ نماز میں تھے کیونکہ اسی کو اشارہ کر سکتے تھے، جس کو آپ دیکھ رہے ہوں۔

یہ احادیث ایسی ہیں کہ جن کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نماز میں آنکھیں بند نہ کرتے تھے اور فقہاء کا اس کی کراہت میں اختلاف ہے۔ امام احمدؒ وغیرہ نے اسے مکروہ سمجھا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ یہودی کا فعل ہے۔ ایک جماعت نے اسے مباح قرار دیا ہے، اور مکروہ نہیں سمجھا اور کہا ہے کہ یہ صورت گاہے گاہے خشوع کے زیادہ قریب ہوتی ہے، جو نماز کی روح، سر اور اس کا مقصود ہے۔ زیادہ صائب بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے اگر آنکھیں کھولنا خشوع نماز میں مخل نہیں۔ تو یہ صورت افضل ہے اور اگر یہ طریقہ خشوع اور اس کے قلب میں آڑ بن جاتا ہے کیونکہ اس کے قبلہ رُخ حسن و جمال وغیرہ نظر آتا ہے، جس کے دل کو پریشانی سی لاحق ہوتی ہے تو اس وقت آنکھیں بند کرنا قطعاً مکروہ نہ ہو گا اور اس حالت میں اسے مستحب کہا جائے گا (اور یہ) کراہت کے قول کی بجائے۔ اصول و مقاصدِ شرع کے زیادہ قریب ہو گا۔

اذکار و اشغال

نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعائیں اور اوراد

فراغت صلوٰۃ کے بعد آپؐ کے معمولات نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ کیا کیا کرتے،

کس طرح بیٹھتے تھے؟

کس سرعت سے جگہ چھوڑتے تھے؟

بعد از نماز امت کے لیے کون کون سے اوراد و اذکار شروع فرماتے؟

آپؐ کا عام معمول یہ تھا کہ جب سلام پھیرتے تو تین بار استغفار کرتے اور فرماتے اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذوالجلال والاکرام، یعنی اے اللہ تو سلام ہے اور تجھ سے ہی سلامتی ہے اے بزرگی و عزت والے تو برکت والا ہے۔"

صرف اتنے کہنے کی حد تک قبلہ رُخ رہتے اور مقتدیوں کی طرف تیزی سے منتقل ہو جاتے اور اپنے دائیں بائیں کی جانب سے (رُخ انور) پھیر لیتے اور ابن مسعودؓ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی بار بائیں رُخ ہو جاتے دیکھا اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت سے دائیں رُخ پر دیکھا۔

پہلی روایت صحیحین میں ہے اور دوسری روایت مسلمؒ میں ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ نماز میں دائیں بائیں سے اعراض کر لیتے۔ پھر آپ اپنا چہرہ انور مقتدیوں کی طرف پھیر لیتے اور ان کی سمت کے علاوہ کوئی دوسری سمت متعین نہ کرتے اور جب آپ صبح کی نماز پڑھ لیتے تو جائے نماز پر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ سورج نکل آتا اور ہر فرض نماز کے بعد یہ الفاظ پڑھتے:

لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک ولہٗ الحمد وھو علی کل شیئٍ قدیر، اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد۔

یعنی: "خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی مالکیت ہے۔ اور اسی کی حمد ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ جو تو نے عطا کیا ہے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو نے روک دیا اُسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی عزت دار کی عزت تیرے سامنے نفع نہیں دیتی۔"

اور کہا کرتے: لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیئٍ قدیر۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ لا الہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ لہ النعمۃ ولہٗ الفضل ولہ الثناء الحسن لا الہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون۔

یعنی: "خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی مالکیت ہے اور اسی کی حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا نہ ڈر ہے اور نہ قوت ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اسی کی نعمتیں ہیں اور اسی کا فضل ہے اور اسی کی اچھی ثنا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ خالص اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگرچہ کافر ناپسند کریں۔"

اور امام ابوداؤد نے علیؓ بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نماز سے سلام پھیر لیتے۔ تو یہ دعا پڑھتے:

اللھم اغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم بہ منی انت المقدم وانت المؤخر لا الہ الا انت۔

یعنی: "اے اللہ مجھے بخش دے، جو گزر چکے اور بعد کے ہیں اور جو میں نے پوشیدہ کیے اور جو علانیہ کیے اور جو اسراف کیا اور تو مجھ سے بہتر جانتا ہے، تو ہی اوّل ہے تو ہی آخر ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

یہ حضرت علیؓ کی طویل روایت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جسے امام مسلمؒ نے آغازِ (نماز) میں روایت

کیا ہے اور جو آپ رکوع اور سجود میں پڑھا کرتے تھے اور امام مسلمؒ کے اس میں دو الفاظ ہیں ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تشہد اور سلام کے درمیان پڑھا کرتے، یہ تو صائب خیال ہے۔ دوسرے آپ انہیں سلام کے بعد پڑھا کرتے اور ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں دو مقامات پر پڑھتے ہوں۔

امام احمدؒ نے زید بن ارقمؓ سے نقل کیا انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ پڑھا کرتے۔

اللھم ربنا ورب کل شیی وملیکہ انا شھید انك الرب وحدك لا شریك لك اللھم ربنا ورب کل شیی انا شھید ان محمداً عبدك ورسولك اللھم ربنا ورب کل شیٔ انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ اللھم ربنا ورب کل شیٔ اجعلنی مخلصا لك واھلی فی کل ساعۃ من الدنیا والاخرۃ یاذا الجلال والاکرام اسمع واستجب اللہ اکبر اللہ اکبر نور السموات والارض اللہ اکبر حسبی اللہ ونعم الوکیل اللہ اکبر الاکبر

یعنی: "اے ہمارے رب اور ہر چیز کے رب اور اس کے مالک میں گواہ ہوں کہ بیشک تو ہی رب ہے، تنہا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ اے اللہ ہمارے رب اور ہر چیز کے رب میں گواہ ہوں کہ محمدؐ تیرا بندہ اور تیرا رسول ہے۔ اے اللہ ہمارے رب اور ہر چیز کے رب میں گواہ ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں اے اللہ ہمارے رب اور ہر چیز کے رب مجھے اپنا مخلص بنا لے:........ اور میرے اہل کو بھی دنیا و آخرت کی ہر گھڑی میں۔ اے بزرگی اور عزت والے سن لے، قبول فرما لے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ مجھے اللہ ہی کافی ہے وہ بہتر کارساز ہے۔ اللہ سب سے بڑا سب سے بڑا ہے۔ (ابوداؤد)

افراد امت کے لیے مستحب ہے کہ ہر نماز کے بعد یہ کہا کریں: سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار اللہ اکبر (۳۴ بار) اور سو ان الفاظ کے ساتھ پورا کریں: لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریك لہ لہ الملك ولہ الحمد وھو علی کل شیٔ قدیر

یعنی: "خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی بادشاہی ہے اور اسی کی حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

دوسری روایت میں یوں ہے۔ اللہ اکبر ۳۴ بار اس طرح سو مکمل ہو جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں تسبیح ۲۵ بار اور اتنی ہی تحمید اور اتنی ہی تکبیر اور اتنی ہی لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔

ایک اور طریقہ پر آتا ہے: تسبیح دس بار اور تحمید دس بار اور تکبیر دس بار اور ایک اور طریقہ ۱۱ بار جیسے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرویات میں ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ بار یعنی گیارہ بار، گیارہ بار اور گیارہ بار تسبیح۔ تحمید اور تکبیر کہیں۔ تو یہ کل ۳۳ بار بن گئی۔ اس طریقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعض راویوں کے تصرف کا نتیجہ ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہو سکتی ہے کہ حدیث کے الفاظ تو یوں نہیں کہ "ہر نماز کے بعد ۳۳ بار تسبیح و تحمید و تکبیر کہیں"۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کلمات تسبیح و تحمید و تکبیر ہر ایک تینتیس تینتیس بار ہوگا۔ یعنی تسبیح و تحمید و تکبیر ہر ایک تینتیس تینتیس بار کہو، کیونکہ موسیٰ راوی حدیث نے ابو صالح سے روایت کیا ہے ابو صالح نے یہی تفسیر کی ہے کہا ہے کہ سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔ اللہ اکبر کہو اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک تینتیس بار ہو جائے۔

رہی گیارہ کی تخصیص تو اذکار کے معاملہ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بخلاف سو کے کہ اس کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں (نیز) دس کی نظیر بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ سنن میں حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے صبح کی نماز کے بعد اپنے دونوں پہلو پر بیٹھے بیٹھے کوئی بات کرنے سے پہلے کہا لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک یحیی ویمیت وھو علی کل شیئ قدیر

"یعنی خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اُسی کی حمد ہے، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے"۔

(یہ کلمات) دس بار کہے اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کی دس برائیاں مٹا دی جائیں گی اور اس کے دس درجے بلند کئے جائیں گے اور اس دن وہ ہر ناپسند چیز سے حفاظت میں ہوگا اور شیطان سے بچاؤ میں ہوگا اور اللہ کے ساتھ شرک کے سوا کوئی گناہ اسے پکڑ نہ سکے گا۔ ترمذیؒ نے اسے صحیح قرار دیا۔

مسند امام احمدؒ میں حضرت ام سلمہؓ سے ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو سکھائے۔ جب وہ ایک غلام کے لیے حاضر ہوئیں تو

آپ نے فرمایا:

سوتے وقت تم ۳۳ بار سبحان اللہ اور ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ اور جب تم صبح کی نماز پڑھ لو، تو کہو لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ دس بار اور نماز مغرب کے بعد دس بار۔

صحیح ابن حبان میں حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ سے مرفوع روایت ہے کہ جس نے صبح کے وقت یہ دعا پڑھی: لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ لہ الملک ولہٗ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ دس بار، تو اس کے لیے اس سے دس گنا نیکیاں لکھی جائیں گی اور دس برائیاں مٹا دی جائیں گی اور ان کلمات کے باعث دس درجے بلند کیے جائیں گے اور اسے چار غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب ملے گا اور یہ کلمات شیطان سے اس کا بچاؤ کریں گے اور جس نے نماز مغرب کے بعد دس بار یہ کلمات کہے تو اسے صبح تک اس قسم (کے فوائد) ملیں گے۔

شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول گزر چکا، اللہ اکبر دس بار، الحمد للہ دس بار اور سبحان اللہ دس بار اور لا الہ الا اللہ دس بار اور استغفر اللہ دس بار اور کہتے: اللھم اغفرلی واھدنی وارزقنی دس بار اور یوم قیامت کی تنگی سے دس بار پناہ مانگتے اور اذکار و دعوات میں دس کا عدد کثرت سے ملتا ہے، لیکن گیارہ کا تذکرہ ابو ہریرہ کی روایت کے سوا کہیں نہیں ملتا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

صحیح ابو حاتم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز ختم کرتے وقت پڑھا کرتے تھے۔

اللھُمَّ اصلح لی دینی الذی جعلتہٗ عصمۃ امری واصلح لی دنیای التی جعلت فیھا معاشی اللھم انی اعوذ برضاك من سخطك واعوذ بعفوك من نقمتك واعوذ بك منك لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منك الجد۔

یعنی: "اے اللہ میرے دین کی اصلاح کر دے جس میں تو نے میری امور کی حفاظت رکھی اور میری دنیا کی اصلاح کر دے جس طرح تو نے میری معاش (زندگی) رکھ دی۔ اے اللہ میں تیری خفگی سے تیری رضا کی پناہ چاہتا ہوں اور تیرے انتقام سے تیری معافی کی پناہ چاہتا ہوں اور میں تیری (سزا) سے تیری (رحمت) کی پناہ چاہتا ہوں اور جسے تو روک دے اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی عزت دار کی عزت تیرے سامنے نفع نہیں دیتی۔"

مستدرک حاکم میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو میں نے سنا کہ آپ نماز پڑھنے کے بعد یہ دعا پڑھاتے تھے۔

اللھم اغفر لی خطایای و ذنوبی کلھا اللھم انعشنی واحیینی وارزقنی، واھدنی لصالح الاعمال والاخلاق انہ لا یھدی لصالحھا ولا یصرف سیئھا الا انت۔

یعنی: اے اللہ میرے تمام گناہ اور میری سب خطائیں بخش دے، اے اللہ مجھے اٹھا اور مجھے رزق دے اور مجھے نیک اعمال و اخلاق کی ہدایت دے کیونکہ نیک (اعمال و اخلاق) کی صرف تو ہی ہدایت دے سکتا ہے۔ برائیوں سے صرف تو ہی ہٹا سکتا ہے۔

صحیح ابن حبان میں حضرت حارث بن مسلم تیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: جب تو صبح کی نماز پڑھے، تو بات کرنے سے پہلے یہ کلمات کہہ:

اللھم اجرنی من النار۔

یعنی: اے اللہ مجھے آگ سے بچالے (سات بار، کیونکہ تو اگر اسی دن فوت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ آگ سے تیری نجات لکھ دے گا اور جب تو مغرب کی نماز پڑھے تو بات کرنے سے پہلے سات بار یہ کلمات کہہ لے۔

اللھم اجرنی من النار۔

کیونکہ اگر تو اسی رات کو فوت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ آگ سے تیری نجات لکھ دے گا۔

امام نسائی رحمہ اللہ نے کبیر میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اسے جنت میں جانے سے موت کے سوا کوئی چیز نہ روکے گی۔

محمد بن حمیر نے اس روایت میں تفرد کیا ہے (اور) محمد بن زیاد الالھانی سے اور انہوں نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ نسائی رحمہ اللہ نے حسین بن بشر اور انہوں نے محمد بن حمیر سے روایت کیا ہے۔ بعض لوگ اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اور حسین بن بشر بتاتے ہیں کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق کہا کہ (لا باس بہ) اس میں کوئی حرج نہیں اور دوسرے مقام پر اسے ثقہ قرار دیا۔ البتہ

امام بخاریؒ نے (بھی) صحیح بخاری میں دونوں محمدوں کو قابلِ استدلال سمجھا ہے اور (محدثین) نے کہا ہے کہ حدیث اس (کی تحریر) پر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور ابو الفرج جوزی نے اپنی کتاب میں اسے موضوعات میں لکھا ہے اور محمد بن حمیر پر معلق بتایا ہے۔ ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ اس سے استدلال صحیح نہ ہوگا۔ یعقوب بن سفیان کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں۔ اور بعض حفاظِ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور محمد کو ثقہ کہا ہے اور کہا ہے کہ وہ اس بات سے بلند ہے کہ اس کی کوئی موضوع روایت ہو اور صحیح حدیث یعنی بخاری شریف میں اس قسم کی روایت کا پایا جانا زیادہ قابلِ استدلال بات ہے یحیٰی بن معین زیادہ شدت کے ساتھ اس کی توثیق کرتے ہیں اور معجم طبرانی میں حضرت عبداللہ بن حسن بن حسن نے اپنے والد ماجد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کہ جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو وہ دوسری نماز تک اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں (حفاظت میں) ہے۔

یہ روایت حضرت ابو امامہؓ، علی بنؓ ابی طالب، عبداللہ بن عمرؓ، مغیرہؓ بن شعبہؓ، جابرؓ بن عبداللہ اور انسؓ بن مالک سے مروی ہے اور ان تمام اسناد میں ضعف پایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ روایت کی اصل ضرور ہے اور موضوع نہیں ہے اور مجھے اپنے شیخ ابو العباس بن تیمیہؒ قدس اللہ روحہٗ سے پہنچی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اسے کبھی بھی کسی نماز کے بعد ترک نہیں کیا۔

مسند وسنن میں حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے، انہوں نے بتایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد معوذات پڑھوں۔ ابو حاتم، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم نے بتایا کہ یہ مسلم کی شرط پر صحیح روایت ہے۔ ترمذیؒ میں معوذتین کا لفظ آتا ہے۔ معجم طبرانی اور مسند ابو یعلیٰ موصلی میں عمر بن جتھان سے بھی روایت ہے اور حضرت جابر سے مرفوعاً روایت میں کلام کیا گیا ہے۔

"جو آدمی حالت ایمان میں ان پر عامل رہا اور جنت کے دروازوں میں جس دروازے سے چاہے اندر چلا جائے اور سحر چشم حوریں اُس کی ساتھی ہوں گی۔ یہ وہ شخص ہوگا جس نے:

۱۔ اپنے قاتل کو معاف کر دیا ہو۔

۲۔ اور قرضہ چھپ کر کے چکا دیا ہو۔ اور

۳۔ ہر فرض نماز کے بعد دس بار قُلْ هُوَ اللّٰه پڑھتا رہا ہو۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول چاہے ان میں سے ایک ہی کام کیا ہو؟

آپ نے جواب دیا ہاں اچھا ہے ایک ہی کیا ہو۔

(نیز) آپؐ نے حضرت معاذؓ کو وصیت فرمائی کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کریں۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ

یعنی: "اے اللہ مجھے اپنے ذکر کی اور شکر کی اور اچھی طرح عبادت کی توفیق اور مدد فرما"۔

نماز کے بعد سلام سے قبل کا بھی احتمال ہے اور اس کے بعد کا بھی احتمال ہے اور ہمارے شیخ (ابن تیمیہؒ) سلام سے قبل کو ترجیح دیتے تھے۔

سُترہ

کون کون سی سنتیں رسول اللہؐ سے ثابت ہیں؟

سترہ کس کس چیز کا بنایا جاسکتا ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تو اپنے اور اس کے درمیان بکری کی گزرگاہ کا سا فاصلہ چھوڑ دیتے اور اس سے دور نہ رہتے بلکہ سترہ کے قریب ہونے کا حکم فرماتے اور جب آپ لکڑی یا ستون یا درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو اسے دائیں بائیں جانب کر لیتے اور سفر خواہ خشکی میں کوئی چیز گاڑ لیتے اور اس کی طرف رُخِ انور کر کے نماز پڑھتے اس طرح وہ سترہ کا کام دے جاتا۔ کبھی آپ سواری کو آڑ بنا لیتے، اس طرح اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور اسے درست اور اس کے آخر میں نماز ادا کرتے اور نمازی کو سترہ کا حکم دیتے۔ اگرچہ ایک تیر یا لاٹھی سے ہو لیکن اگر نہ ملے تو زمین پر ایک لکیر ہی کھینچ لے۔

ابوداؤدؒ نے بتایا کہ میں نے احمد بن حنبلؒ سے سنا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ لکیر ہلال کی طرح عرض پر کھینچی جائے گی اور عبداللہ نے بتایا کہ لکیر لمبی کھینچی جائے گی۔ رہی لاٹھی تو وہ سیدھی گاڑ دی جائے گی اور اگر سترہ نہ ہو تو صحیح یہ ہے کہ عورت، گدھا اور سیاہ کتا نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

صحیح، غیر صریح اور صریح غیر صحیح

اور یہ (مسئلہ) ابوذرؓ، ابوہریرہؓ، ابن عباس اور عبداللہ بن مغفلؓ کی روایت سے ثابت ہے کے معارض روایات دو قسم کے ہیں:۔

۱۔ صحیح غیر صریح۔

۲۔ اور صریح غیر صحیح۔ پس جب معارض کی یہ حالت ہو تو اس کی وجہ سے (انہیں) ترک

نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں نماز پڑھتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے قبلہ کی جانب بیٹھی ہوتیں۔ یہ صورت سامنے سے گزرنے والے کے مشابہ نہیں، کیونکہ نمازی کے سامنے سے گزرنا حرام ہے اور (نمازی) کے سامنے ٹھہرنا مکروہ نہیں۔ اسی طرح عورت کا سامنے سے گزرنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے، لیکن ٹھہرنے میں (کوئی مضائقہ نہیں)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضر میں ہمیشہ دس رکعتوں کا اہتمام فرمایا کرتے اور وہ (رکعتیں) وہی ہیں جن کے متعلق حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں محفوظ کیں۔ دو رکعتیں ظہر کے پہلے اور دو اس کے بعد اور دو رکعتیں مغرب کے بعد آپ اپنے گھر میں (پڑھا کرتے) اور دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے۔ یہ وہ رکعتیں ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضر میں کبھی ترک نہ فرماتے اور جب کبھی ظہر کے بعد دو رکعتیں فوت ہو جاتیں تو آپ انہیں عصر کے بعد ادا کر لیتے یہ عمل دائمی تھا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی کام کرتے تو اُسے مسلسل جاری رکھتے اور اوقاتِ نہی میں سننِ رواتب کا ادا کرنا آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے عام ہے۔ رہی ان دو (مذکورہ) سنتوں کی مکروہ اوقات میں ادائیگی۔ یہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے[1]، جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی خصوصیات کے تذکرہ میں اس کی وضاحت آئے گی۔

کبھی کبھی آپ ظہر سے قبل چار رکعت پڑھتے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار رکعت کا ناغہ نہ کرتے اور صبح سے قبل دو رکعت (کا ناغہ نہ کرتے) اب اگر یہ کہا جائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر ہی نماز پڑھتے تو چار رکعت ادا کرتے اور جب مسجد میں پڑھتے تو دو رکعت ادا فرماتے، یہ واضح ہے اور یا یوں کہا جائے گا کہ کبھی آپ اِس طرح کرتے۔ اور کبھی اُسی طرح۔

اس طرح حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ ہر ایک نے جو کچھ دیکھا اسے روایت کر دیا اور دونوں

---

[1] یہ چیز خصوصیات نبوت میں سے تھی۔ جب آپؐ نے ایک مرتبہ کسی وقت نماز پڑھ لی تو یہ آپ کا دائمی معمول بن جاتا تھا۔ (رئیس احمد جعفری)

روایتیں صحیح ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی طعن نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ چار رکعتیں ظہر کی سنت نہ تھیں بلکہ یہ ایک مستقل نماز تھی، جو زوال کے بعد آپ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ امام احمدؒ نے حضرت عبداللہؓ بن سائب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور فرمایا یہ ایک ایسی ساعت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس وقت میرا ایک نیک عمل اوپر چڑھے۔

سنن میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ظہر سے پہلے چار رکعت ادا نہ کر سکتے تو نماز کے بعد ادا کرتے اور ابن ماجہؒ نے بتایا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہر سے قبل چار رکعت فوت ہو جائیں تو آپ عصر کے بعد انہیں ادا کر لیتے۔ اور ترمذی میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار رکعت ادا کرتے اور (فرض) کے بعد بھی دو رکعت ادا کرتے۔ نیز ابن ماجہؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار رکعت پڑھتے، جن میں طویل قیام کرتے اور ان میں رکوع اور سجود خوب اچھی طرح کرتے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت

اس طرح یہ وہ چار رکعت ہیں کہ جن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال ہے کہ آپ انہیں ترک نہیں کرتے تھے۔ رہیں ظہر کی دو سنتیں تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ تمام نمازوں کی سنتیں دو دو رکعت ہوتی ہیں اور فجر کی نماز بھی دو رکعت ہے (حالانکہ) لوگ اس وقت کافی فارغ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی سنتیں دو ہیں۔ دوسرے ظہر سے قبل کی چار رکعت زوالِ شمس اور نصف النہار (دوپہر) کی وجہ سے مستقل مذکور ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ زوال کے بعد آٹھ رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ قیام اللیل (رات کی عبادت) کے برابر درجہ رکھتی ہیں۔

اس کا راز یہ ہے کہ نصف النہار نصف اللیل کے مقابلہ میں ہے اور زوالِ شمس کے بعد آسمان کے دروازے کھلتے ہیں (اسی طرح) نصف رات کے بعد نزولِ الٰہی ہوتا ہے، تو یہ دونوں قرب اور رحمت کے اوقات ہیں۔ اس میں آسمانوں کے دروازے کھلتے ہیں اور اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں حضرت ام حبیبہؓ سے روایت کیا ہے انہوں نے بتایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ جس نے دن رات میں

بارہ رکعت (سنت) پڑھیں۔ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنایا گیا اور نسائیؒ و ترمذیؒ نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ ظہر سے قبل چار رکعت اور اس کے بعد دو رکعت اور مغرب کے بعد دو رکعت اور عشاء کے بعد دو رکعت اور صبح کی نماز سے قبل دو رکعت۔ نسائیؒ نے عشاء کے بعد کی دو رکعتوں کی بجائے لکھا ہے کہ عصر سے قبل دو رکعت۔ امام ترمذیؒ نے اسے صحیح بتایا ہے۔

ابن ماجہؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس نے بارہ رکعت سنن کی پابندی کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیا، چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت اس کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت فجر سے پہلے اور دو رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت اس کے بعد اور میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے بتایا تھا کہ دو رکعت عصر سے پہلے اور دو رکعت مغرب کے بعد اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے بتایا تھا کہ دو رکعت عشاء کے بعد ممکن ہے کہ یہ تفسیر حدیث میں بعض راویوں کے اپنے کلام کا اندراج ہو اور اس بات کا امکان بھی ہے کہ یہ (الفاظ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرفوع کلام ہی ہوں۔

رہیں عصر سے قبل چار رکعتیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عاصم بن حمزہ کی طویل روایت کے سوا کوئی عمل ثابت نہیں، جو حضرت علی سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سولہ رکعتیں (سنتیں) پڑھا کرتے تھے۔ چار رکعتیں اس وقت پڑھا کرتے جب سورج اس قدر بلند ہو جاتا جیسا کہ نماز ظہر کے لیے ہوتا ہے اور چار رکعت ظہر سے قبل اور دو رکعت ظہر کے بعد اور چار رکعت عصر سے قبل۔ ایک لفظ میں ہے کہ جب سورج ڈھل جاتا جتنا کہ عصر کے وقت ہوتا ہے تو دو رکعت پڑھتے اور عصر سے قبل چار رکعت پڑھتے اور ہر دو رکعتوں میں ملائکہ مقربین پر اور ان مومنین پر جو متبع ہیں۔ نیز مرسلین علیہم السلام پر سلام پڑھ کر فصل کرتے۔

امام ابن تیمیہؒ اس روایت کو غلط سمجھتے ہیں

میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے سنا کہ وہ اس روایت کا انکار کرتے تھے اور اس کی سخت تردید کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ موضوع ہے اور ابو اسحاق جوزجانی سے بھی اس کا انکار منقول ہے اور امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ، حضرت ابن عمرؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جو عصر سے قبل چار رکعت پڑھے۔ اس روایت میں اختلاف ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔ دوسروں نے اس کو معلول کہا ہے۔ ابن ابی حاتم نے بتایا کہ میں نے اپنے والد سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے ابو ولید

طیالسی سے محمد بن مسلم بن مثنی کی اپنے والد سے اور ان کی حضرت ابن عمرؓ سے اور ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کے متعلق دریافت کیا:

"اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جو عصر سے قبل چار رکعت پڑھے۔

تو انہوں نے جواب دیا "اسے رہنے دو"۔ میں نے عرض کیا کہ ابوداود نے اسے روایت کیا ہے تو ابو ولید کہنے لگے کہ حضرت ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دن رات میں دس رکعتوں (کی روایت) کو یاد کیا ہے" تو اگر یہ بھی ہوتی تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ اور بتایا کہ یہ والد کہا کرتے تھے کہ میں نے بارہ رکعتیں یاد رکھی ہیں اور یہ علت قطعاً نہیں، کیونکہ ابن عمرؓ نے وہی روایت کی، جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے یاد رکھا نہ کہ وہ جو دوسروں نے نہ بتایا، اس لیے دونوں روایتوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں۔

رہیں نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں کہ آپ انہیں پڑھا کرتے تھے اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا پابند کیا تھا اور آپ نگاہ رکھتے تھے کہ آیا یہ (سنتیں) پڑھتے ہیں؟ پھر بھی آپ نہ حکم کرتے اور نہ انہیں منع کرتے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ مزنی سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: مغرب سے قبل پڑھو، اور تیسری روایت میں آپ نے فرمایا: جو چاہو، اس بات کے پیشِ نظر کہ کہیں لوگ اسے سنت نہ قرار دے لیں یا پابندی نہ کرنے لگیں اور دو رکعتوں میں یہی صاحب رائے ہے کہ یہ مستحب اور مندوب ہیں۔

اور سنن روایت کی طرح سنت نہیں اور وہ عام سنن اور نوافل اپنے گھر میں پڑھتے جن کا کوئی خاص) سبب نہ ہوتا خصوصاً مغرب کی سنتیں، کیونکہ ان سنتوں کے متعلق آپ سے منقول نہیں کہ آپ نے انہیں ضرور مسجد میں پڑھا اور امام احمدؒ بن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سنت (طریقہ) یہ ہے کہ انسان مغرب کے بعد اپنے گھر میں دو رکعت پڑھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم سے یہی مروی ہے۔

سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ بن خطاب کے عہد میں لوگوں کو دیکھا کہ جب وہ مغرب سے فارغ ہوتے تو سب چلے جاتے حتیٰ کہ مسجد میں ایک آدمی بھی باقی نہ رہتا، گویا کہ وہ مغرب کے بعد کچھ نہ پڑھتے۔ آخر وہ اپنے گھروں میں پہنچ جاتے۔ ان کی روایت ختم ہوئی۔

"اگر کوئی مسجد میں دو رکعتیں پڑھے تو کیا جائز ہے اور اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟
تو اس کے متعلق) ان کا قول مختلف ہے۔ ان کے لڑکے عبداللہ نے ان سے روایت کیا
ہے، انہوں نے بتایا،" کہ مجھے ایک آدمی کے متعلق خبر ملی، جس کا اس نے نام لیا کہ اگر آدمی مغرب کے
بعد مسجد میں دو سنت پڑھے تو ادا نہ ہوں گی وہ کہنے لگے اس آدمی نے جو کچھ کہا خوب کہا اور
بہت خوب استنباط کیا!

نمازِ مغرب کے بعد کی دو رکعتیں

ابوحفصؒ نے بتایا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں نماز (نفل) ادا کرنے کے حکم سے یہ توجیہہ کی
ہے اور مروزیؒ فرماتے ہیں کہ جس نے مسجد میں نمازِ مغرب کے بعد دو رکعتیں (سنت) پڑھیں وہ
گناہ گار ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ ابوثورؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا وہ گناہ گار ہے۔" تو انہوں نے
جواب دیا شاید وہ اس مطلب پر اس وجہ سے پہنچے ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ یہ
سنتیں اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔"

ابوحفصؒ کہتے ہیں کہ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ اگر کسی نے گھر میں فرض ادا کر لیے اور مسجد ترک کی
تو بھی جائز ہوگا۔ اسی طرح سنتوں کا معاملہ ہے۔

اور امام احمدؒ کے نزدیک یہ توجیہہ ٹھیک نہیں، بلکہ ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ سنتوں
کے لیے کسی معین جگہ یا جماعت کی شرط نہیں ہے اس لیے انہیں گھر میں اور مسجد میں (ہر جگہ) پڑھنا
جائز ہے۔

اور مغرب کی سنن میں دو باتیں سنت ہیں، ایک تو یہ کہ ان کے اور مغرب (کے فرائض)
کے درمیان کلام کر کے فصل نہ کرے اور حسن بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے احمدؒ کو دیکھا کہ جب انہوں
نے مغرب کی نماز کے بعد سلام پھیرا تو کھڑے ہو گئے اور کوئی بات نہیں کی اور اپنے گھر میں
داخل ہونے سے پہلے مسجد میں کوئی نماز بھی نہیں پڑھی۔ ابوحفصؒ بتاتے ہیں۔ اس کا سبب قولِ
مکحولؒ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مغرب کے بعد دو رکعت (سنت)
کسی قسم کی بات کرنے سے قبل پڑھیں اس کی نماز علیین میں اٹھائی گئی اور (نیز) نوافل فرائض سے
متصل ادا ہو جاتے ہیں۔

دوسری سنت یہ ہے کہ گھر میں (سنتوں) کو ادا کرے۔ امام نسائیؒ، ابوداؤدؒ اور
ترمذیؒ نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبدالاشہل کی مسجد میں

تشریف لائے. مغرب کی نماز پڑھی. آخر جب سب نے نماز پڑھ لی تو ان کو دیکھا کہ وہ نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ گھر کی نماز ہے اسے ابن ماجہؒ نے رافع بن خدیج سے روایت کیا ہے۔ نیز فرمایا کہ یہ دو رکعتیں گھروں میں پڑھا کرو۔ الغرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ ہے کہ آپ نے تمام سنتیں اور نوافل گھر میں پڑھے جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ:

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں یاد رکھی ہیں۔ ظہر سے قبل دو رکعتیں اس کے بعد۔ اور دو رکعتیں مغرب کے بعد اپنے گھر میں اور دو رکعتیں عشاء کے بعد اپنے گھر میں اور دو رکعتیں صبح کی نماز سے قبل۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت میرے گھر میں پڑھا کرتے، پھر نکلتے تو لوگوں کو نماز پڑھاتے، پھر اندر تشریف لاتے، پھر دو رکعت پڑھتے۔ اور اس طرح فجر کی سنتوں کے متعلق آپ سے منقول ہے کہ آپ انہیں اپنے گھر میں پڑھتے جیسا کہ حضرت حفصہؓ سے منقول ہے اور صحیحین میں ہے کہ حضرت حفصہؓ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اور جمعہ کے بعد کی سنن اور اس سے پہلے کی نماز کے متعلق ان شاء اللہ جمعۃ المبارک کے مسنون طریقہ (ہدیۃ فی الجمعۃ) میں بحث کی جائے گی۔

سنتیں گھر میں پڑھنی چاہئیں

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مطابق ہے اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو۔ کیونکہ فرض کے علاوہ انسان کی سب سے بہتر نماز اپنے گھر میں ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ ہے کہ آپ سنن و نوافل گھر میں پڑھتے۔ ہاں اگر کوئی سبب ہو جاتا تو دوسری بات تھی، جیسے آپؐ کی سنت یہ ہے کہ آپ کے فرائض مسجد میں ادا ہوتے۔ ہاں کوئی سفر یا مرض یا اس کے علاوہ مسجد میں جانے سے روک دینے والی کوئی رکاوٹ پیش آ جاتی تو الگ بات تھی۔ فجر کی سنتوں کے متعلق آپ کی حفاظت اور تسلسل تمام نوافل سے زیادہ سخت تر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سفر و حضر میں انہیں اور وتروں کو ترک نہ کرتے اور سفر میں بھی آپ صبح کی سنت اور وتر پر باقی تمام سنن کی نسبت زیادہ تر سختی سے پابندی کرتے اور سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں کہ آپ نے ان دونوں کے علاوہ کوئی دوسری سنن راتبہ پڑھی ہوں اور یہی وجہ

ہے کہ حضرت ابن عمرؓ دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھتے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سفر کیا وہ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھتے۔ یہ (آپ کی سنت طیبہ تھی) اگرچہ اس بات کا احتمال بھی ہے کہ آپ تربع نہ فرماتے، لیکن بہرحال انہوں (ان کے علاوہ) سنتیں نہیں پڑھیں۔

ہاں حضرت ابن عمرؓ کے متعلق ثابت ہے کہ ان سے ظہر کی سنتوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا، اگر میں عبادت کر رہا ہوں گا تو انہیں (سنتوں کو) پورا کروں گا اور یہ حضرت ابن عمرؓ کے ورع (تقویٰ) کا معاملہ ہے، کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رباعیہ (چار رکعتوں والی) نماز میں سے بھی ایک حصہ کی تخفیف فرما دی تو اگر ان سے پہلے یا بعد دو رکعتیں شروع ہوں گی تو انہیں پوری کرنا زیادہ بہتر ہو گا۔

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ فجر کی سنتوں اور وتروں میں کونسی (نماز) زیادہ ضروری ہے (اس کے متعلق)، دو قول ہیں اور فقہاء کے اختلاف کے باعث وجوب وتر میں کسی سمت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ یہی معاملہ فجر کی سنتوں کے وجوب کے متعلق ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے سنا وہ فرماتے تھے، فجر کی سنن (دن بھر کے) کام کے آغاز کے قائم مقام ہیں اور وتر اس کا انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں اور وتروں میں سورۂ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور یہ سورتیں توحید اور اس کے علم و عمل، معرفت و ارادہ اور اعتقاد و قصد پر مشتمل ہیں۔

سورۂ اخلاص کے خصائص

اس طرح کہ سورۃ اخلاص اعتقاد و معرفت کے لحاظ سے توحید کے متضمن ہے اور پروردگار کی ایسی توحید پر مشتمل ہے جو ہر طرح سے شرک کے منافی ہے اور ایسی صمدیت (پر مشتمل ہے) جو تمام صفات کمال اسی طرف منسوب کرتی ہے جس میں کسی طرح بھی کوئی نقص نہیں پایا جاتا اور اب و ابنیت (باپ یا لڑکا) کی نفی کرتی ہے۔ یہی وہ صفات ہیں کہ جو صمدیت اور توحید کے لوازم میں سے ہیں اور کفو کی نفی کرتی ہیں، تاکہ تشبیہ، مماثلت اور نظیر کی نفی ہو جائے تو یہ سورۃ اس (مضمون) پر مشتمل ہے کہ ہر کمال اسی کے لیے ثابت ہے۔ ہر نقص سے وہ بری ہے۔ اس کے کمال میں تشبیہ و مماثلت ناممکن ہے اور اس کا شریک مطلقاً کوئی نہیں ہے۔

یہی وہ اصول ہیں جو توحید علمی و اعتقادی کا مجموعہ ہیں، کہ جن پر اعتقاد رکھنے والا تمام

گمراہ اور مشرک فرقوں سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن کے تیسرے حصہ کے برابر درجہ رکھتی ہے کیونکہ قرآن میں یا خبر ہے یا انشاء اور انشاء میں تین باتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) امر (۲) نہی اور (۳) اباحت۔

اور خبر کی دو قسمیں ہیں۔ خالق تعالیٰ کی اطلاع دینا، اس کے اسماء و صفات و احکام کی خبر دینا نیز اس کی مخلوق کی خبر دینا تو سورۂ اخلاص محض اس کی ذات اور اس کے اسماء و صفات کی خبر پر مشتمل ہے۔ اس وجہ سے یہ سورۂ ثلث قرآن کے برابر ہے اور اس کا پڑھنے والا جبکہ اس کا اس پر ایمان بھی ہو۔ علمی طور پر شرک سے بری ہو جاتا ہے۔ جس طرح سورہ کافرون شرک عملی و ارادی و مقصدی سے انسان کو الگ کر دیتی ہے، اور علم جبکہ عمل سے پہلے اور اس کا قائد و امام و رہنما اور اس کا حاکم (بلکہ) اس کو اس کے مقامات پر اتارنے والا ہو، تو گویا وہ سورہ (یعنی قل ھو اللہ احد) ثلث قرآن کے برابر ہو گئی۔

سورۂ کافرون کے خصائص

اور قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ ربع قرآن کے برابر ہوئی۔ حاکم نے اسے مستدرک میں روایت کیا اور بتایا کہ یہ صحیح السند ہے

اور جب شرک عملی و ارادی اپنی خواہشات کی اتباع کے باعث لوگوں پر غالب ہو جائے اور اکثر لوگ باوجود اس کی مضرت و بطلان سے واقف ہونے کے اس کے مرتکب ہو جائیں، کیونکہ اس میں ان کی ذاتی اغراض پائی جاتی ہیں تو پھر اس کو اکھاڑنا اور زائل کرنا شرک علمی کے زائل کرنے سے زیادہ مشکل اور دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ شرک علمی، تو علم استدلال سے دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مؤخر صورت کی حالت میں انسان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ (خواہ مخواہ) ہی ایک خلاف واقعہ بات کو صحیح سمجھتا رہے بخلاف شرک ارادی و مقصدی کے کہ محض غلبہ ہوتا، اور اپنے آپ پر غلبہ، شہوت و غضب، کے باعث اس کا مرتکب یہ کام کرتا ہے، حالانکہ اس کا علم اس کے بطلان و مضرت سے اسے آگاہی بھی کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ "الکافرون" میں شرک عملی کو دور کرنے کے سلسلہ میں تاکید و تکرار کے ساتھ احکامات آئے ہیں جو قل ھو اللہ احد میں نہیں ملتے۔

اب جبکہ قرآن کے دو حصے ہیں کہ ایک حصہ دنیا اس کے احکامات و متعلقات اور افعال مکلفین وغیرہ کے احوال واقعیہ پر مشتمل ہے اور دوسرے میں آخرت اور اس کے احوال واقعیہ

پائے جاتے ہیں۔

اور سورۃ اذا زلزلت ابتدا سے انتہا تک اسی (دوسرے) پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں آخرت کے سوا کچھ نہیں بتایا گیا اور اس میں احوالِ دنیا اس کے سکینوں کے متعلق کوئی بات نہیں ملتی۔ تو یہ نصف قرآن کے برابر ہے۔

اس روایت کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح حدیث ہے اور یہی باعث ہے کہ آپ ان دونوں سورتوں کو طواف کی دو رکعتوں میں پڑھا کرتے تھے اور چونکہ یہ دو سورتیں اخلاص و توحید کی ہیں اس لیے آپ دن کے کام کا آغاز بھی انہیں سے کرتے اور اختتام بھی انہی پر فرماتے اور صبح میں بھی انہیں پڑھتے جو کہ توحید کا (ایک عظیم) شعار ہے۔

تہجد اور وتر

وتر کب؟ کس طرح؟ کس تعداد میں؟ اور کیونکر؟

سنت فجر کے بعد استراحت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں کے بعد دائیں پہلو پر لیٹ جاتے، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہی ثابت ہے۔ ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

جب تم میں سے کوئی صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے تو اُسے چاہیے کہ اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جائے۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث، حسن صحیح غریب ہے۔ اور ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ باطل ہے اور صحیح نہیں ہے۔ صحیح طور پر آپ سے یہ فعل تو بے شک مروی ہے لیکن امر قطعاً مروی نہیں ہے۔

اور روایات امر میں عبد الواحد بن زیادہ منفرد ہے اور اس میں اس نے غلط بیانی کی ہے۔ رہے ابن حزمؒ اور ان کے متبعین تو وہ اس طرح لیٹنے کو واجب قرار دیتے ہیں اور ابن حزمؒ بتاتے ہیں کہ اس روایت کی بناء پر جو آدمی اضطجاع (لیٹنا) نہ کرے اس کی نماز باطل ہے اس مسئلہ میں وہ دیگر ائمہ سے منفرد ہیں اور میں نے ان کے ایک شاگرد کی کتاب دیکھی کہ جس میں انہوں نے ایوب سے اور انہوں نے ابن سیرینؒ سے روایت کیا کہ ابوموسیٰؓ، رافع بن خدیج اور انسؓ بن مالک صبح کی سنتوں کے بعد لیٹا کرتے تھے اور اس بات کا حکم بھی دیتے تھے اور معمر سے منقول ہے کہ انہوں نے ایوب سے اور انہوں نے نافع سے روایت کیا کہ حضرت ابن عمرؓ یہ فعل نہ کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بس سلام پھیر دینا ہی کافی ہے اور ابن جریج سے منقول ہے کہ مجھے اس نے اطلاع دی جس کی میں تصدیق کرتا ہوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی

نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سنت کی وجہ سے نہ لیٹتے تھے، بلکہ آپ رات میں بہت محنت کرتے اس لیے آرام فرماتے۔

ابن ابی شیبہ سے ابو صدیق نے ذکر کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک جماعت کو کہ وہ فجر کی دو رکعت (سنن) کے بعد لیٹ گئے۔ ان کی طرف بھیجا اور انہیں اس بات سے روک دیا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس طرح سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو حضرت (ابن عمرؓ) نے فرمایا۔ ان کی طرف جاؤ اور انہیں خبر کر دو کہ یہ بدعت ہے اور ابو مجلز کہتے ہیں۔

"میں نے حضرت ابن عمرؓ سے اس کے متعلق دریافت کیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے ساتھ شیطان کھیل رہا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ نے (مزید) فرمایا کیا بات ہے کہ ایک آدمی جب دو رکعتیں پڑھتا ہے تو حمار کی طرح لیٹ جاتا ہے۔ چنانچہ دو گروہوں نے اس اضطجاع میں غلو کیا ہے اور تیسرے گروہ نے اعتدال سے کام لیا ہے۔ اہلِ ظاہر کی ایک جماعت نے اس کو واجب قرار دیا ہے اور ابن حزم اور ان کے موافقین نے اس کے ترک کرنے پر نماز کو باطل قرار دیا ہے اور فقہا کی ایک جماعت نے اسے مکروہ سمجھا اور اسے بدعت قرار دیا ہے۔ امام مالکؒ وغیرہ نے اس میں اعتدال سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ جو استراحت کی خاطر ایسا کرے تو کوئی حرج نہیں اور جو سنت سمجھ کر کرے تو یہ مکروہ ہے۔

کیا سنت فجر کے بعد استراحت مستحب ہے؟

ایک جماعت نے اسے مطلقاً مستحب قرار دیا ہے۔ خواہ اس سے استراحت مطلوب ہو یا نہ ہو یہ لوگ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے حجت لیتے ہیں اور جنہوں نے اسے مکروہ کہا ہے۔ انہوں نے صحابہ کرام مثلاً حضرت ابن عمرؓ وغیرہ کے آثار سے استدلال کیا ہے۔ کیونکہ وہ اس شخص کو کنکر مارتے جو ایسا کرتا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل کیا بھی ہے۔ ان کے نزدیک صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اضطجاع وتر کے بعد اور فجر کی سنتوں سے قبل تھا جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ روایت میں صراحت سے ذکر ہے۔ رہی حضرت عائشہ کی روایت تو علی بن شہاب نے اس باب میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ امام مالکؒ نے اس سے روایت کیا کہ جب آپ فارغ ہو جاتے، یعنی رات کی نماز سے (فارغ ہو جاتے) تو دائیں کروٹ لیٹ جاتے، حتیٰ کہ موذن حاضر ہوتا تو آپ دو ہلکی سی رکعتیں ادا فرماتے۔ یہ اس بات کی صراحت ہے

کہ لیٹنا فجر کی سنتوں سے پہلے ہوتا۔ دوسروں نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ جب مؤذن فجر کی اذان دے چکتا اور آپ سفیدۂ سحر دیکھ لیتے اور مؤذن حاضر ہوتا تو آپ کھڑے ہو جاتے اور دو خفیف سی رکعتیں ادا فرماتے۔ پھر دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ انہوں نے بتایا کہ جب اصحاب ابن شہاب باہم مختلف ہیں تو قول وہی درست ہوگا جو مالکؒ کا ہے۔ کیونکہ وہی ان میں سے زیادہ یاد رکھنے والے اور بات کو محفوظ رکھ لینے والے تھے۔

دوسروں کا قول ہے کہ صحیح مسلک ان لوگوں کا ہے جو امام مالکؒ سے اختلاف کرتے ہیں۔

اور ابو بکر خطیب نے کہا ہے کہ مالکؒ نے زہریؒ سے اور انہوں نے عروہؓ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعت پڑھتے اور ایک رکعت ملا کر وتر ادا فرماتے، جب آپ فارغ ہو جاتے تو دائیں پہلو پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن حاضر ہوتا تو آپ دو خفیف سی رکعتیں ادا فرماتے اور عقیل، یونس، شعیب، ابن ذریب اور اوزاعیؒ وغیرہ نے امام مالکؒ سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے زہریؒ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعتیں (سنت) ادا فرماتے۔ پھر دائیں پہلو پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن حاضر ہوتا تو آپ کے ساتھ باہر تشریف لے آتے۔ چنانچہ مالکؒ نے بتایا ہے کہ اضطجاع فجر کی دو سنتوں سے پہلے ہوتا تھا۔ ایک اور جماعت کی روایت ہے کہ آپ نے دو رکعت کے بعد اضطجاع (استراحت فرمایا) اس لیے علماء نے فیصلہ فرما دیا کہ امام مالکؒ سے اس باب میں غلطی ہوئی اور دوسروں نے درست بتایا۔

آں حضرت کا معمول

اور ابو طالب کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے کہا کہ ابو صلت نے ابو کریب سے اور انہوں نے ابو سہیل سے اور انہوں نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ فجر کی دو (سنتوں) کے بعد لیٹ گئے۔ شعبہ کہتے ہیں کہ وہ اسے رفع نہیں کرتے میں نے عرض کیا کہ اگر نہ لیٹے ہوں تو اس پر کوئی ہرج ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ یہ روایت حضرت عائشہؓ کی نہیں ہے حضرت ابن عمرؓ بھی اس سے انکار کرتے ہیں۔

اور جلال نے بتایا کہ ہمیں مروزی نے خبر دی کہ ابو عبد اللہ نے کہا ہے کہ ابو ہریرہؓ کی روایت وہ نہیں ہے میں نے کہا کہ اعمش سے ابو صالح سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الواحد تنہا ہی اس کے راوی ہیں اور ابراہیم بن حارث کہتے ہیں کہ ابو عبد اللہ سے فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو وہ کہنے لگے کہ میں یہ نہیں کرتا۔ اور

اگر کوئی ایسا کرے تو ٹھیک ہے۔

اگر عبدالواحد بن زیاد کی روایت ان کے نزدیک صحیح ہوتی جو اس نے اعمش سے اور انہوں نے ابو صالح سے کی ہے تو ان کے نزدیک اس فعل کا مقام کم از کم مستحب تو ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح روایت کیا اور کبھی اس طرح روایت کیا۔ چنانچہ وہ کبھی اس طرح کر لیتے اور کبھی اس طرح کر لیتے، چنانچہ اس باب میں اختلاف نہیں بلکہ یہ مباحات میں سے ہے۔

آپ کے دائیں پہلو پر لیٹنے میں بھی ایک راز ہے، اور وہ یہ ہے کہ دل دائیں جانب معلق ہے پس جب آدمی بائیں کروٹ پر لیٹتا ہے تو اُس کو بھرپور نیند آجاتی ہے، کیونکہ آسائش و راحت میں ہوتا ہے اسی وجہ سے نیند خوب آجاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ دائیں کروٹ پر ہوتا ہے تو وہ پریشان سا ہو جاتا ہے اور دل کے قلق اور اپنے مقام کی طلب و میلان کے باعث اُسے بھرپور نیند نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے بائیں کروٹ پر سونے کو پسند کیا ہے۔ تاکہ راحت مکمل ہو اور نیند خوب آئے اور صاحبِ شرع نے دائیں کروٹ پر سونے کو پسند کیا ہے۔ تاکہ خوابِ خرگوش میں مبتلا نہ ہو جائے۔ کہ رات کی نماز سے بھی محروم رہے۔ چنانچہ دائیں کروٹ پر سونا دل کے لیے زیادہ مفید ہے۔ اور بائیں کروٹ سونا بدن کے لیے زیادہ مفید ہے۔

نمازِ تہجد اور آں حضرتؐ کے معمولات

سلف و خلف نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ کیا نمازِ تہجد آپ پر فرض تھی یا نہیں؟ دونوں گروہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے:۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ

"یعنی کچھ رات جاگتا رہ جو تیرے لیے مفید ہے۔"

ان کا خیال ہے کہ یہ (آیت) غیر واجب ہونے کی صراحت کرتی ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ اس سورۃ میں يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا۔ میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔ اور کوئی آیت اس کی ناسخ بھی نہیں رہا۔ (پہلی آیت میں) نافلة لك تو وہاں نافلة سے مراد "زیادہ" ہے اور مطلقاً زیادہ (عبادت) کرنا تطوعات (نوافل) پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"ووهبنا له اسحاق ويعقوب نافلة

یعنی ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے۔

لڑکا دینے کے مزید برآں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تہجد میں نافلۃ کا مطلب اجر اور درجات میں زیادہ معنی رکھتا ہے۔ اس لیے آپ کو اس سے مختص (فرض) فرمایا، کیونکہ دوسروں کے لیے قیام لیل مباح ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے۔ رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دیے ہیں۔ اس لیے آپ رفعتِ درجات اور زیادتی مراتب میں کوشش فرماتے ہیں اور دوسری لغزشوں کے کفارہ کے طور پر عمل کرتے ہیں۔

مجاہد رحمہ کہتے ہیں کہ یہ (عبادت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نافلۃ کا درجہ رکھتی ہے (چونکہ) آپ کے تمام گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دیے گئے ہیں تو گویا ان کی اطاعت نافلۃ یعنی ثواب میں زیادتی کا سبب بنتی ہے اور دوسروں کے لیے گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔ ابن منذر رحمہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ہمیں علی بن ابی عبیدہ نے بتایا اور انہیں حجاج نے ابن جریج سے اور انہوں نے ابن کثیر سے اور انہوں نے مجاہد سے سماعت کی کہ فرائض کے علاوہ باقی نافلۃ ہیں۔ کیونکہ (فرائض) گناہوں کا کفارہ نہیں بنتے اور زیادتی درجات کے لیے دوسرے لوگوں کے لیے نوافل نہیں ہیں بلکہ یہ خصوصیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور باقی تمام لوگ فرائض کے علاوہ گناہوں کے کفارہ کی خاطر نفلی عبادت کرتے ہیں۔

ہمیں محمد نے بتایا اور انہیں نصر نے اور انہیں عبداللہ نے اور انہیں عمرو نے اور ان کو سعید و قبیصہ نے انہیں سفیان نے، انہیں عثمان رضہ نے اور انہیں حضرت حسن رضہ نے کہ اس آیۃ کریمہ کے بارے میں روایت یہ ہے کہ فتہجد بہ نافلۃ لک: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے لیے نافلۃ (زیادتی درجات وغیرہ) نہیں بنتی اور ضحاک رحمہ سے منقول ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خصوصیت سے نافلۃ ہے۔ سلیمان بن حبان نے ذکر کیا کہ ہمیں ابو غالب نے بہ سند امامۃ بتایا کہ جب تو نے وضو کے اعضاء کو ان کے مقام پر رکھ دیا تو نجات یافتہ ہو کر اُٹھا، اب اگر تو کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا تو یہ تیرے لیے فضیلت و اجر کا سبب ہے، اس پر ایک آدمی کہنے لگا:

"اے ابو امامۃ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے تو یہ اس کے لیے نافلۃ (زیادتی درجات) کا باعث ہو گی؟"

جواب دیا، نہیں بلکہ نافلۃ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو گی۔ کسی اور کے لیے کیسے ہو سکتی ہے؟ جبکہ وہ گناہوں خطاؤں میں ڈوبا ہوا ہے (ہاں) اس کے لیے فضیلت اور اجر کا سبب ضرور ہو گی۔

میں نے کہا کہ مقصود تو یہ ہے کہ آیت میں لفظ نافلۃ سے مراد وہ نہیں جس کا فعل و ترک مباح ہو جیسے مستحب و مندوب بلکہ اس سے مراد زیادتی درجات ہے اور یہ صفت فرائض و مستحبات میں قدرِ مشترک ہے۔ اس طرح "نافلۃ" کا قول امر وجوب فی التہجد کے منافی نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر و حضر میں قیام لیل (تہجد) ترک نہ فرماتے اور جب کبھی آپ پر نیند کا غلبہ ہو جاتا یا تکلیف ہو جاتی تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے۔

کیا وتر کی قضاء کرنی چاہیے؟

میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو اس دلیل کے متعلق فرماتے سنا کہ وتر اپنے محل سے قضا (فوت) ہو جانے کے بعد قضا نہیں ہوتی۔ اور یہ تحیۃ المسجد، نمازِ کسوف اور نمازِ استسقاء وغیرہ کی طرح ہے، کیونکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ رات کی آخری نماز وتر ہو جیسے کہ دن کی آخری نماز مغرب ہوتی ہے اور جب رات ختم ہو جائے اور آدمی صبح کی نماز پڑھ لے تو وتر اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔

ابو داؤدؒ اور ابن ماجہؒ، حضرت ابو سعید خدریؓ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا، اگر کوئی وتر سے پہلے سو جائے یا بھول جائے تو جب صبح ہو یا یاد آجائے تو پڑھ لینا چاہیے۔

لیکن اس روایت میں کئی علل ہیں، ایک تو یہ کہ یہ عبدالرحمٰن بن زید اسلم کی روایت ہے۔ اور وہ ضعیف ہے۔ دوسرے صحیح بات یہ ہے کہ ان کی اپنے والد سے اور ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایت ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت سب سے زیادہ صحیح یعنی مرسل ہے تیسرے ابن ماجہؒ نے ابو سعیدؓ کی حدیث بیان کر کے محمد بن یحییٰ سے نقل کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح ہونے سے پہلے ہی وتر پڑھ لو۔"

روایت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز گیارہ یا تیرہ رکعت ہوتی تھی جیسا کہ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کیونکہ ان دونوں سے یہ ثابت ہے۔ نیز صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اور رمضان کے علاوہ بھی گیارہ سے زیادہ رکعتیں نہیں پڑھتے تھے۔ نیز صحیحین میں، انہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے اور ان میں پانچ کے ساتھ وتر کرتے اور صرف ان کے آخر میں بیٹھتے۔ حضرت عائشہ سے پہلی روایت صحیح ہے۔ اور گیارہ سے زائد دو رکعتیں (دراصل) یہ فجر کی سنتیں ہیں۔

اس حدیث میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے الفاظ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعتوں (سنتوں) کو ملا کر تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے۔ اسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے اس روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر جب فجر کی اذان سنتے تو دو خفیف رکعتیں پڑھتے۔

اور صحیحین میں قاسم بن محمد سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز دس رکعتیں ہوتیں اور ایک سجدہ (رکعت) سے وتر کرتے۔ پھر فجر کی دو رکعتیں پڑھتے تو یہ تیرہ رکعتیں بن گئیں۔ اس طرح یہ تفسیر واضح ہے۔

رہے حضرت ابن عباسؓ تو انہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو حمزہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز تیرہ رکعت تھی۔ لیکن اس کی وضاحت اس طرح منقول ہے کہ یہ تعداد فجر کی دو رکعتیں (سنن) ملا کہ بنتی ہے۔ شعبیؒ فرماتے ہیں۔ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ تیرہ رکعتیں، اس میں سے آٹھ (تہجد کے نوافل)، تین رکعتیں وتر اور دو رکعتیں فجر سے قبل کی سنتیں تھیں اور صحیحین میں کریب نے ان سے اپنی خالہ ام المومنین میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے گھر میں رات گزارنے کے قصہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ رکعت نماز پڑھی۔ پھر سو گئے یہاں تک کہ آپ کے خراٹے کی آواز آنے لگی۔ آخر جب آپ کو محسوس ہوا کہ فجر ہو گئی تو آپ نے دو خفیف سی رکعتیں پڑھیں۔ ایک لفظ یہ ہے کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر دو رکعتیں، پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پھر ایک (رکعت) ملا کر وتر پڑھے۔ پھر لیٹ گئے یہاں تک کہ مؤذن حاضر ہوا تو آپ اٹھے اور دو خفیف سی رکعتیں پڑھیں۔ پھر آپ صبح کی نماز پڑھنے کے لیے باہر تشریف لائے۔ اس طرح گیارہ رکعتوں پر (ائمہ) کا اتفاق ہو گیا اور آخری دو رکعتوں پر اختلاف رہا کہ آیا وہ فجر کی دو سنتیں تھیں یا ان کے علاوہ تھیں؟ اس طرح جب فرائض اور ان سنن راتبہ کو جمع کیا جائے۔ جن پر آپ مواظبت (دوام) کرتے تھے۔ تو جو مجموعہ رکعات بنتا ہے یہ دن رات میں چالیس رکعتیں ہوتی ہیں، جن پر آپ مواظبت کیا کرتے تھے۔ سترہ فرائض اور دس یا بارہ سنن راتبہ اور گیارہ یا تیرہ تہجد کی رکعتیں ہوتیں۔ اس طرح مجموعہ چالیس کا ہو گیا۔ اور جو ان سے زاید ہو تو غیر راتب (یعنی) عارضی (ہنگامی) ہوں گی، جیسے کہ نماز فتح آٹھ رکعتیں اور جب آپ سفر سے مراجعت فرما ہوتے تو نماز چاشت اور زیارت کے وقت

کی نماز اور تحیۃ المسجد وغیرہ پس انسان کو چاہیے کہ وہ موت تک اس ورد پر قائم رہے اس لیے کہ جو شخص دن رات میں چالیس بار دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو (ظاہر ہے) کہ وہ کس قدر سریع الاجابت ہوگا اور دروازہ (کس قدر) جلد کھل جائے گا اور اللہ سے ہی مدد کا سوال ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز شب، وتر اور ابتدائے تہجد کی نماز کا ذکر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی عشاء کی نماز پڑھی اور اندر تشریف لائے تو چار یا چھ رکعتیں پڑھیں پھر آپ بستر پر تشریف لاتے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب انہوں نے آپ کے پاس رات گزاری تو عشاء کی نماز پڑھی، پھر تشریف لائے اور نماز پڑھی اور سو گئے۔ ان دونوں کو ابوداؤد نے روایت کیا۔ اور جب آپ بیدار ہوتے تو مسواک سے آغاز فرماتے، پھر اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے اور بیدار ہوتے وقت جو کچھ آپ پڑھتے اس کے متعلق گزر چکا ہے۔ پھر آپ وضو فرماتے اور دو خفیف سی رکعتیں ادا کرتے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اُٹھتے تو دو خفیف سی رکعتوں سے ابتداء فرماتے تھے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق آپ نے اسی بات کا حکم بھی دیا، فرمایا:

جب تم میں سے کوئی رات کو اُٹھے تو اُسے چاہیے کہ دو خفیف رکعتوں سے ابتداء کرے (مسلم شریف)

اور جب رات آدھی گزر جاتی یا اس سے قبل یا اس کے بعد اُٹھتے اور اکثر اوقات آپ اس وقت اٹھتے جب آواز دینے والے یعنی مرغ کی آواز سنتے اور وہ اکثر نصف ثانی (رات کے آخری نصف حصہ) میں آواز لگاتا اور کبھی تو آپ اپنا ورد منقطع کر دیتے اور کبھی مسلسل جاری رکھتے اور یہی زیادہ تر ہوتا کہ آپ منقطع فرماتے جیسا کہ ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گزارنے کی روایت میں بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بیدار ہوئے تو مسواک کی اور وضو کیا۔ اور فرمایا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ

یعنی "بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں"۔

آپ نے یہ آیات پڑھیں یہاں تک کہ سورہ ختم کی پھر کھڑے ہو گئے اور دو رکعتیں پڑھیں

جن میں قیام ورکوع وسجود طویل کیا، پھر فارغ ہو گئے اور سو گئے یہاں تک کہ خراٹے کی آواز آنے لگی۔ پھر آپ نے تین مرتبہ چھ رکعتوں میں اسی طرح کیا، ہر بار مسواک کرتے، وضو فرماتے اور یہ آیات پڑھتے۔ پھر آپ نے تین وتر پڑھے، پھر مؤذن نے اذان دی اور آپ نماز کے لیے باہر تشریف لائے اور آپ دعا کر رہے تھے۔

اللھم فی قلبی نوراً وفی لسانی نوراً واجعل فی سمعی نوراً واجعل فی بصری نوراً واجعل من خلفی نوراً ومن امامی نوراً واجعل لی من فوقی نوراً ومن تحتی نوراً اللھم اعطنی نوراً۔

یعنی: "اے اللہ میرے دل میں نور ڈال دے اور میری زبان میں نور (ڈال دے) اور میرے کانوں میں نور ڈال دے اور میری آنکھوں میں نور ڈال دے اور میرے پیچھے نور کر دے اور میرے آگے نور (کر دے) اور میرے اوپر نور کر دے اور میرے نیچے نور (کر دے) اور اے اللہ مجھے نور عطا فرما: (مسلم)

عائشہ کی روایت کو ابن عباس کی روایت پر ترجیح

اور حضرت ابن عباسؓ نے دو خفیف رکعتوں کے ساتھ افتتاح کا تذکرہ نہیں کیا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تذکرہ کیا ہے اس لیے یا تو کبھی آپ اس طرح کرتے ہوں گے اور کبھی اُس طرح اور یا حضرت عائشہؓ نے وہ بات یاد رکھی جو حضرت ابن عباسؓ یاد نہ رکھ سکے اور یہی اظہر ہے کیونکہ وہی (ام المومنین رضی اللہ عنہا) ہمیشہ مواظبت سے (آپ کو دیکھتیں) اور (اہتمام سے) آپ (کی سنّت طیبہ) پر ملاحظہ کرتیں۔ نیز آپ ہی تمام مخلوقات کے مقابلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام لیل سے آگاہ تھیں اور ابن عباسؓ نے تو محض اپنی خالہؓ کے ہاں ٹھہرنے سے رات کو مشاہدہ کیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام لیل کے متعلق حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ میں اختلاف ہو تو حضرت عائشہؓ کا قول ہی معتبر تصور ہو گا۔

اور آپ کے قیام لیل اور وتر کئی انواع پر تھے۔ ایک تو یہ جو حضرت ابن عباسؓ نے ذکر کیا قسم ثانی جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا کہ آپ دو خفیف رکعتوں سے نماز کی ابتدا فرماتے پھر آپ اپنا ورد (نماز) گیارہ رکعتوں میں ختم کرتے۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور ایک رکعت کے ساتھ وتر کرتے۔

قسم سوم اسی طریقہ پر تیرہ رکعت تھیں۔

قسم چہارم، یہ تھی کہ آپ آٹھ رکعتیں پڑھتے، ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے، پھر مسلسل پانچ رکعت پڑھتے۔ وتر کرتے اور صرف آخر میں (تشہد) کے لیے بیٹھتے۔

قسم پنجم، نو رکعت تھیں کہ جو آٹھ مسلسل پڑھتے اور صرف آٹھویں رکعت کے آخر میں بیٹھتے اور اللہ کا ذکر فرماتے، حمد کرتے اور دعا مانگتے، پھر کھڑے ہو جاتے اور سلام نہ پھیرتے پھر نویں رکعت پڑھتے پھر بیٹھ جاتے اور تشہد پڑھتے اور سلام پھیر دیتے پھر سلام پھیرنے کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھتے۔

قسم ششم یہ تھی کہ نو مذکورہ کی طرح سات رکعتیں پڑھتے۔ پھر اس کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے۔

قسم ہفتم یہ تھی کہ آپ دو دو رکعت نماز پڑھتے اور (آخر میں) تین وتر ادا کرتے جن میں فصل نہ ہوتا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ تین وتر پڑھتے اور ان کے درمیان فصل نہ فرماتے اور نسائیؒ نے انہیں سے روایت کیا کہ آپ وتر کی نماز میں دو رکعت پر سلام نہ پھیرتے۔ یہ مشاہدہ پر مبنی سنت ہے۔

وتر کے متعلق بعض دوسرے روایات

ابو حاتمؒ اور ابن حبانؒ (ہر دو صاحبان) نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، تین وتر نہ پڑھو بلکہ پانچ یا سات (رکعتوں) سے وتر کرو اور نماز مغرب سے تشابہ نہ کرو۔ امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابو عبد اللہ سے دریافت کیا۔ وتر میں آپ کا مسلک تھا، کیا آپ دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے؟

انہوں نے جواب دیا ہاں!

میں نے پوچھا، کیوں؟

فرمایا، دو رکعتوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قوی اور کثرت سے ہیں۔ زہریؒ، حضرت عروہؓ سے اور وہ عائشہؓ سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے دو رکعتوں پر سلام پھیرا۔

اور حارث کہتے ہیں کہ امام احمدؒ سے وتر کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔ دو رکعتوں پر سلام پھیرا جائے گا اور اگر سلام نہ پھیرے تو مجھے امید ہے کہ کوئی حرج نہیں ہوگا لیکن

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سلام پھیرنا ثابت ہے اور ابو طالب کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ سے دریافت کیا۔

وتر میں آپ کس روایت کی طرف مائل ہیں؟

انہوں نے جواب دیا کہ میں سب کی طرف مائل ہوں، جس نے پانچ رکعت پڑھیں اور صرف آخری رکعت پر بیٹھا اور جس نے سات رکعتیں پڑھیں اور صرف ان کے آخری رکعت پر بیٹھا، دونوں صحیح ہیں، زرارہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت میں ہے کہ آپ نو سے وتر کرتے اور آٹھویں (رکعت) پر بیٹھا کرتے۔ انہوں نے بتایا لیکن زیادہ مضبوط اور قوی روایت ایک رکعت والی ہے۔ اسی لیے میں اس پر عامل ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں "کہ تین (رکعتیں)"

انہوں نے جواب دیا ہاں! (ابن مسعودؓ) نے حضرت سعدؓ پر ایک رکعت کی وجہ سے اعتراض کیا تھا تو انہوں نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا۔

قسم ہشتم: جو نسائیؒ نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں نماز پڑھی تو رکوع کیا اور رکوع میں سبحان ربی العظیم اس قدر (دیر تک) پڑھا جیسے کھڑے رہے پھر بیٹھ گئے آپ پڑھ رہے تھے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي رَبِّ اغْفِرْ لِي۔

یعنی: "اے پروردگار مجھے بخش دے اے پروردگار مجھے بخش دے۔"

جتنی دیر کھڑے رہے یہی پڑھتے رہے۔ ابھی چار رکعت ہی پڑھی تھیں کہ حضرت بلالؓ حاضر ہوئے اور صبح کی نماز کے لیے بلانے لگے۔

آپؐ نے شروع رات، درمیان میں اور آخر میں بھی وتر پڑھے ہیں اور بعض اوقات رات بھر کھڑے رہے اور ایک ہی آیت کی تلاوت صبح تک بار بار کرتے رہے اور وہ آیت یہ تھی۔

ان تعذبھم فانھم عبادتك۔

یعنی "اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں۔"

آپ کی رات کی نماز تین طرح ہوتی تھی ایک کھڑے ہو کر اور زیادہ تر یہی طریقہ تھا دوسرے بیٹھ کر نماز پڑھتے اور رکوع بھی بیٹھ کر کرتے۔ تیسرے یہ کہ آپ بیٹھ کر نماز پڑھتے اور جب قرأۃ میں سے تھوڑا سا باقی رہ جاتا تو کھڑے ہو جاتے اور کھڑے ہو کر رکوع فرماتے۔ یہ تینوں صورتیں صحیح طور پر

آپ سے منقول ہیں۔

ابوداؤد راوی کی تعدیل

رہا کھڑے ہونے کے موقع پر آپ کا بیٹھ جانا تو سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن شقیق سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا:

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تربع (پیتھی مار کر) نماز پڑھتے دیکھا۔ امام نسائی رح فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ابو داؤد کے سوا کسی نے اسے روایت کیا ہے اور ابوداؤد ثقہ راوی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ روایت غلط ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

قنوت کا مسئلہ

نماز میں قنوت کے وقت، طریقے اور دعا کا بیان

آٹھ رکعتیں پڑھنے کے بعد وتر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ وتر کے بعد کبھی بیٹھ کر دو رکعت پڑھتے اور کبھی دوران نماز میں تلاوت (قرآن) بیٹھ کر کرتے اور جب رکوع کرنا ہوتا تو کھڑے ہو جاتے اور جب رکوع کرتے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سلمہؒ سے روایت ہے، انہوں نے بتایا کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو (ام المومنینؓ) نے فرمایا آپ تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ اول آٹھ رکعتیں پڑھتے پھر وتر پڑھتے، پھر بیٹھ کر دو رکعتیں ادا کرتے۔ چنانچہ جب رکوع کرنا چاہتے تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کر لیتے پھر آپ اذان اور اقامت کے درمیان نماز صبح کی دو رکعت (سنن) پڑھتے۔

مسند میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتروں کے دو خفیف سی رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذیؒ نے بھی حضرت عائشہ اور ابو امامہؓ وغیرہ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہی روایت کی ہے۔

مسند میں حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر دو رکعت وتر پڑھا کرتے تھے جن میں آپ اذا زلزلت اور قل یا ایھا الکافرون پڑھا کرتے۔

تعارض روایت اور حل اشکال دار قطنیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اور اکثر لوگوں کو اس میں اشکال سا ہو گیا ہے اور انہوں نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول "رات کی آخری نماز وتر بناؤ" کا معارض سمجھا ہے۔ مالک رحمۃ اللہ علیہ نے تو ان دو رکعتوں کا انکار کیا ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ میں نہ یہ (رکعتیں) پڑھنا چاہتا ہوں اور نہ کسی کو پڑھنے سے منع کرتا ہوں اور بتایا ہے کہ

امام مالکؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ آپ نے یہ دو رکعتیں اس لیے پڑھیں تاکہ وتر کے بعد نماز کے جواز کا علم ہو جائے اور اگر یہ پڑھی گئی ہیں تو ان سے نفل پڑھنے کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ یہ آپ کے اس فرمان پر محمول ہے "رات کی آخری نماز وتر کو بناؤ" (یعنی) مستحب یہ ہے اور ان کے بعد دو رکعتیں محض مباح (جائز) ہیں۔ اور انسب یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ دونوں رکعتیں سنتوں کی قائم مقام ہیں اور وتر کی تکمیل کرتی ہیں کیونکہ وتر مستقل عبادت ہے خصوصاً جبکہ اسے واجب مانا جائے۔ پس وتر کے بعد دو رکعتیں مغرب کی سنتوں کے قائم مقام ہیں کیونکہ نماز مغرب دن کا وتر ہے اور یہ دو رکعتیں اس کی تکمیل کرتی ہیں۔ اسی طرح رات کے وتر کے بعد دو رکعتوں کا معاملہ ہے۔

وتر میں قنوت پڑھنا چاہیے یا نہیں؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں کہ آپ نے وتر میں قنوت پڑھا ہو ہاں صرف ایک روایت ہے جو ابن ماجہؒ نے علی بن میمون سے اور انہوں نے محمد بن یزید سے اور انہوں نے سفیان سے اور انہوں نے زبید یامی سے اور انہوں نے سعید بن عبدالرحمٰن بن ابزی سے اور انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے ابی بن کعبؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر پڑھتے تو رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے اور امام احمدؒ نے اپنے بیٹے عبداللہ کی روایت کے مطابق رکوع کے بعد قنوت کو اختیار کیا ہے (نیز) جو کچھ قنوت کے معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہی کچھ قنوت فجر سے متعلق بھی ہے۔ جب ایک رکوع سے سر اٹھاتے۔ آپ نے رکوع کے بعد وتر کے قنوت کو اختیار کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قنوت سے قبل یا بعد کچھ بھی منقول نہیں۔ اور جلال کہتے ہیں کہ مجھے محمد بن یحییٰ کحال نے بتایا کہ انہوں نے وتر میں (قنوت کے بعد یا قبل) اسے متعلق ابو عبداللہ سے دریافت کیا کہ انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ منقول نہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ ایک سال سے دوسرے سال تک قنوت پڑھا کرتے تھے۔

وتر میں پڑھنے والے دعائیہ کلمات

امام احمدؒ اور اہل سنن حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بتایا کہ مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمات سکھائے، جن کو میں وتر میں پڑھا کرتا ہوں۔

"اللھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولیت وبارك لی فیما اعطیت وقنی شرما قضیت انك تقضی ولا یقضی علیك انہٗ لا یذل من والیت تبارك ربنا وتعالیت"۔

اور امام بیہقیؒ اور نسائیؒ نے یہ الفاظ بھی زائد لکھے ہیں۔

ولا یعز من عادیت۔

اور نسائیؒ نے ایک روایت میں مزید یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

وصلی اللہ علی النبی۔

اور حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ انھوں نے بتایا کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا کہ جب میں سر اٹھالوں اور سجدہ کے سوا کچھ باقی نہ رہے (تو یہ دعا پڑھوں) ابن حبانؒ نے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ وہ دعا پڑھتے تھے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی یہ روایت حسن ہے اسے ہم صرف اسی (یعنی) ابو جوراء سعدی کی سند سے جانتے ہیں اور اس کا نام ربیعہ بن شیبان ہے اور قنوت کے متعلق ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سے زیادہ بہتر منقول دعا نہیں جانتے۔

اور وتر میں دعائے قنوت حضرت عمرو بن مسعودؓ سے منقول ہے اور ان سے فجر کی نماز میں قنوت زیادہ صحت سے منقول ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قنوت وتر کی روایت سے زیادہ فجر کی قنوت کی روایت زیادہ صحت کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت علیؓ کی روایت وتر کے بارے میں

ابو داؤدؒ و ترمذیؒ اور نسائیؒ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے آخر میں پڑھا کرتے تھے۔ اللھم انی اعوذ برضاك ابن سخطك وبمعافاتك من عقوبتك واعوذ بك منك لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔

یعنی "اے اللہ میں تیری خفگی سے تیری رضا کی اور تیری سزا سے تیرے عفو کی پناہ مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ میں تیری ثنا نہیں کر سکتا تو ایسا ہی ہے جیسی تو نے خود اپنی ثنا فرمائی"۔

اس کے متعلق یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس سے قبل ہو یا بعد میں ہر اور نسائی سے ایک روایت میں ثابت ہے کہ جب آپ نماز سے فارغ ہوتے اور بستر پر جاتے تو یہ مذکورہ دعا پڑھا کرتے اس روایت میں ہے لااحصی ثناء علیك ولوحرصت ۔

نبی صلی اللہ سے ثابت ہے کہ آپ نے یہ سجدہ میں کہا ہے، شاید آپ نے یہ نماز میں یا فارغ ہونے کے بعد پڑھا ہو۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اور وتر کے متعلق روایت کیا ہے پھر آپ نے وتر پڑھے۔ جب آپ نے نماز پڑھی تو میں نے سنا کہ آپ پڑھ رہے تھے:

اللھم اجعل فی قلبی نوراً وفی بصری نوراً وفی سمعی نوراً وعن یمنی نوراً و عن شمالی نوراً وفوقی نوراً وتحتی نوراً وامامی نوراً وخلفی نوراً واجعل لی یوم لقائك نوراً

یعنی: اے اللہ میرے دل میں نور ڈال دے اور میری آنکھوں میں نور ڈال دے اور میرے کانوں میں نور ڈال دے اور میرے دائیں طرف نور کر دے اور میرے بائیں جانب نور کر دے اور میرے اوپر نور کر دے اور میرے نیچے نور کر دے اور میرے سامنے نور کر دے اور میرے پیچھے نور کر دے اور میرے لیے اس دن نور کر دے جس دن تیری زیارت ہو۔

کریب اور سبیع نے قنوت کے متعلق کہا ہے کہ میں اولادِ عباس میں ایک آدمی سے ملا تو اس نے مجھے بتایا: آپ یہ بھی فرماتے تھے۔

"لحمی ودمی وعصبی وشعری وبشری ۔

یعنی: "میرے گوشت اور میرے خون اور میرے پٹھے اور میرے بالوں اور میری جلد (کو منور کر دے)

اور دو عادات ذکر کیں۔ نسائی کی ایک روایت میں ہے "اور وہ سجدہ میں پڑھا کرتے تھے۔" اور اس حدیث میں مسلم کی ایک روایت میں ہے "آپ نماز یعنی صبح کی نماز کے لیے باہر تشریف لائے اور آپ پڑھ رہے تھے۔" پھر یہ دعائے (مذکورہ) نقل کی اور ان کی ایک روایت میں ہے۔

دفی لسانی نوراً واجعل فی نفسی نوراً واعظم لی نوراً ۔

یعنی: "اور میری زبان نور سے بھر دے اور مجھ میں نور پیدا کر دے اور میرے لیے نور زیادہ کر دے۔

ان کی ایک روایت میں ہے وجعلنی نوراً۔
یعنی: "اور مجھے نور بنا دے۔"

اور ابوداؤدؒ و نسائیؒ نے ابی بن کعب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں سبح اسم ربك الاعلیٰ اور قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھا کرتے۔ جب سلام پھیرتے تو تین بار یہ دعا پڑھتے سبحان الملك القدوس تیسری مرتبہ آپ آواز کھینچ کر پڑھتے اور بلند کر لیتے۔ یہ نسائیؒ کے الفاظ ہیں۔ دارقطنیؒ نے مزید کہا ہے:۔ رب الملائکۃ والروح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت قطع کر لیتے اور ہر آیت پر ٹھہر جاتے۔ اس طرح آپ پڑھتے الحمد للہ رب العٰلمین اور ٹھہر جاتے پھر الرحمٰن الرحیم اور وقف کرتے پھر مالك یوم الدین ....

تلاوت قرآن کریم

کتاب اللہ کی تلاوت و قرأت کے آداب

امام زہری کی روایت زہری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت ایک ایک آیت (کے وقفہ) سے ہوتی تھی۔ اگرچہ (آیت)، کا تعلق مابعد سے کیوں نہ ہو (پھر بھی)، آیات، کے آخر میں وقف کرنا افضل ہے اور بعض قرا، کا یہ خیال ہے آیات، کے آخر میں وقوف کے موقع پر اغراض و مقاصد (آیات) اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و طریقہ کا لحاظ رکھنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ امام بیہقی اور دوسرے (محدثین) نے شعب الایمان میں لکھا ہے:۔

"آیت کے آخر میں وقف کو ترجیح ہے۔ اگرچہ آیت کا مابعد سے تعلق کیوں نہ ہو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ترتیل سے سورۃ پڑھاتے یہاں تک کہ وہ بڑی سے بڑی کیوں نہ ہو اور لگا ہے)، ایک ہی آیت کو صبح تک بار بار پڑھتے رہتے اور لوگوں نے ترتیل اور کم پڑھنا یا جلدی اور زیادہ پڑھنے میں اختلاف کیا ہے کہ دونوں میں کونسی صورت افضل ہے چنانچہ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ کا خیال ہے کہ ترتیل و تدبر کے ساتھ کم پڑھنا جلدی اور کثرتِ تلاوت سے بہتر ہے اور اس مسلک کے حضرات نے استدلال کیا ہے کہ تلاوت کا مقصود تو فہم و تدبر و تفقہ ہے اور اسی پر عمل کرنا، اس کی تلاوت کرنا اور اسے یاد کرنا مطالب کا ذریعہ ہے جیسا کہ سلف نے فرمایا ہے کہ قرآن عمل کے لیے نازل کیا گیا اس لیے اس کی تلاوت کو عمل سمجھو۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ قرآن اس کے عالم بھی تھے اور جو اس میں (احکامات) ہیں ان پر عامل بھی تھے۔ اگرچہ زبانی یاد نہ کیا ہو لیکن جس نے اُسے زبانی یاد کیا اور نہ اُسے سمجھا اور نہ اس پر عمل کیا تو وہ اہل (قرآن) میں سے نہیں۔ اگرچہ وہ کھٹا کھٹ (زبانی) پڑھ سکتا ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ:۔

ایمان سب سے افضل عمل ہے اور فہم قرآن اور تدبر قرآن ہی ایمان کا ثمر لورس ہے۔

بغیر سمجھے ہوئے تلاوت قرآن کی مثال

رہا یہ کہ فہم و تدبر کے بغیر صرف تلاوت کرنا تو اس کام کو تو نیک و بد اور مومن و منافق سب کر رہے ہیں جیساکہ نبی صلی اللہ نے فرمایا کہ منافق کی مثال جو قرآن پڑھ رہا ہو ایسی ہے کہ جیسے ریحان (پھول) کہ اس کی خوشبو اچھی ہے لیکن اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔

اس باب میں لوگوں کے چار طبقات ہیں۔

۱- اہل قرآن و ایمان یہ سب سے افضل طبقہ ہے۔

۲- جو قرآن و ایمان سے محروم ہے۔

۳- جسے قرآن تو ملا لیکن ایمان نہ ملا۔

۴- جسے ایمان ملا لیکن قرآن نہ ملا۔

ان کا کہنا ہے کہ جسے ایمان بغیر قرآن کے ملا وہ اس سے افضل ہے جسے قرآن ملا لیکن ایمان نہ ملا۔ ایسے ہی جسے تلاوت میں فہم و تدبر نصیب ہوا وہ اس سے افضل ہے جو بغیر تدبر کے کثرت اور تیزی سے تلاوت کرتا ہے ان کا فرمان ہے کہ:

"یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کیونکہ آپ ترتیل سے تلاوت فرماتے۔ یہاں تک کہ سورت طویل سے طویل ہو جاتی اور صبح تک ایک ایک آیت پر کھڑے رہتے۔

اصحاب شافعیؒ کی روایت تلاوت کے بارے میں

اور اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے کہ کثرت تلاوت افضل ہے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا السم ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (روایت ترمذیؒ)

اور صحیح مسئلہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ترتیل و تدبر سے تلاوت کرنا نہایت افضل اور بہتر ہے اور کثرتِ تلاوت کا ثواب مقدار میں زیادہ ہے۔ چنانچہ پہلے کی مثال یوں ہے کہ جیسے کسی نے ایک بڑی چیز کا صدقہ کیا یا کسی نے غلام آزاد کیا کہ جس کی قیمت بہت زیادہ تھی اور دوسرے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے بہت سے دراہم صدقہ کیے یا چند غلام آزاد کیے کہ جن کی (فرداً فرداً)

قیمت کم تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت انسؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔

تلاوت جسے کان سنیں اور دل محفوظ کرلے

شعبہؒ کہتے ہیں کہ ہمیں ابوجمرہؓ نے بتایا کہ میں نے ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ میں جلدی پڑھنے کا عادی ہوں اور بسا اوقات میں ایک رات میں ایک یا دو قرآن ختم کرتا ہوں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں ایک سورۃ پڑھوں بجائے اس کے کہ جو تم کرتے ہو، اس لیے اگر تم ضرور یہ کرنا چاہتے ہو تو ایسی "تلاوت کرو کہ جسے تمہارے کان سنیں اور دل محفوظ کرے۔

ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علقمہؓ نے حضرت ابن مسعودؓ کے سامنے تلاوت کی، ان کی آواز بہت اچھی تھی تو (ابن مسعودؓ) نے فرمایا، تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ ترتیل سے پڑھو، کیونکہ یہ قرآن مجید کی زینت ہے اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا قرآن کو شعر کی طرح نہ گاؤ اور نہ فضول نثر کی طرح پڑھو۔ اور عجائب (قرآن) پر وقف کرو۔ اس سے قلوب کو حرکت دو اور تمہارا مقصد محض سورۃ کے خاتمہ پر پہنچنا نہ بن جائے۔

قرآن سنو تو گوش ہوش سے

عبداللہ فرماتے ہیں کہ جب تم سنو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا یعنی، اے ایمان والو.... تو گوش ہوش سے سنو کیونکہ یا تمہیں نیکی کا حکم ہوگا اور یا برائی سے منع کیا جائے گا اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ میں ایک عورت کے پاس گیا، میں سورہ ہود پڑھ رہا تھا وہ کہنے لگی، اے عبدالرحمٰن تو اس طرح سورہ ہود پڑھ رہا ہے؟ خدا کی قسم میں تو چھ ماہ سے لگی ہوں لیکن ابھی تک اس کی تلاوت سے فارغ نہیں ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں کبھی تو آہستہ سے تلاوت فرماتے اور کبھی جہر سے تلاوت فرماتے، کبھی طویل قیام فرماتے اور کبھی قیام میں تخفیف فرماتے، زیادہ تر آپ رات

لہ دونوں طرح جائز ہے حسب سہولت و ضرورت آدمی جس طریقہ پر چاہے عمل کرے۔
(رئیس احمد جعفری)

کے آخری حصہ میں وتر پڑھتے اور کبھی کبھی پہلے یا درمیانی حصہ میں وتر ادا کر لیتے اور سفر میں آپ شب و روز سواری پر نفل پڑھتے۔ جدھر آپ کا رخ ہوتا اسی طرف پڑھتے۔ آپ اشارہ سے رکوع و سجود کرتے اور رکوع سے سجدہ زیادہ جھک کر کرتے۔

امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر نفل پڑھنے کا ارادہ کرتے تو قبلہ رخ ہو جاتے اور نماز کے لیے تکبیر کہتے۔ پھر اپنی سواری کو آزاد چھوڑ دیتے اس کے بعد سواری کا جس طرف بھی رُخ ہوتا نماز پڑھتے رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمدؒ سے روایت کا اختلاف ہے۔ دونوں روایتوں کی بناء پر سوال یہ ہے کہ آیا جب وہ قادر ہو تو ایسا کرے یا نہ کرے؟

نماز سواری کی حالت میں جب نماز کے اندر گھوم کر قبلہ رخ ہونا ممکن ہو، مثلاً وہ محمل میں یا کمرے میں یا اس جیسی کسی (جگہ) میں ہو تو اس کو قبلہ رُخ ضروری ہے کیونکہ اس کے لیے گھوم جانا ممکن ہے (بخلاف) سواری کے یا چارپائے کے کہ اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن ہے اور ابو طالب نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا محمل میں گھوم جانا بہت مشکل تر ہوتا ہے اس لیے جدھر رُخ ہو نماز پڑھ لے اور محمل میں سجدہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ان کے لڑکے حضرت عبداللہ نے ان سے روایت کیا ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر محمل ہو اور محمل میں سجدہ کرنا ممکن ہو تو سجدہ کرے۔ میمونؒ ان سے روایت کرتے ہیں کہ جب محمل میں نماز پڑھے تو میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ سجدہ کرے کیونکہ (محمل میں کرنا) ممکن ہے اور فضل بن زیاد نے ان سے روایت کیا کہ اگر محمل میں سجدہ ہو سکتا ہو تو کرے اور جعفر بن محمد نے ان سے نقل کیا کہ جب محمل میں ہو تو بلند جگہ پر سجدہ کرے اور بسا اوقات آپ نے اونٹ پر تکیہ لگایا لیکن اشارے سے ہی پڑھتے رہے اور سجدہ رکوع سے زیادہ جھک کر ادا کرتے رہے۔ اسے ابوداؤدؒ نے آپ سے نقل کیا ہے۔

ٹ اسے فقہی اصطلاح میں تحری کہتے ہیں، سواری کا رُخ کسی طرف بھی ہو قبلہ کے رُخ کی نیت کرے پھر نماز صحیح ہوگی۔ (رئیس احمد جعفری)

نماز چاشت

نماز چاشت مسنون ہے یا مستحب یا مباح یا کچھ نہیں؟

آں حضرت کا عمل صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز چاشت پڑھتے کبھی نہیں دیکھا، ! لیکن میں پڑھتی ہوں اور مواق عجلی کی روایت میں منقول ہے کہ میں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ نماز چاشت پڑھتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں! میں نے کہا اور ابو بکرؓ؟ فرمایا: نہیں وہ بھی نہیں، میں نے عرض کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ فرمایا، نہیں، وہ بھی نہیں۔ ان کا کوئی بھائی (مساوی) نہیں۔

ابن ابی لیلی سے منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز چاشت پڑھتے دیکھا ہو۔ سوائے ام ہانیؓ کے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن ان کے گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعتیں پڑھیں میں نے کوئی نماز اس سے ہلکی نہیں دیکھی۔ ہاں آپ صرف رکوع اور سجود مکمل کر رہے تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن شفیق سے منقول ہے انہوں نے بتایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت پڑھا کرتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں! ہاں اگر آپ سفر سے تشریف لاتے (تو پڑھتے) میں نے عرض کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورتوں کے درمیان اقتران فرماتے تھے؟ فرمایا ہاں، مفصل میں ایسا کرتے۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت کی چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا بڑھا دیتے۔

فتح مکہ کے دن آپ نے چاشت پڑھی؟

صحیحین میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن آٹھ رکعت نماز پڑھی اور یہ نماز چاشت تھی اور حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں بتایا کہ ہمیں اصم رحمہ اللہ نے اور انہیں صنعانی رحمہ اللہ نے اور انہیں ابن ابی مریم نے اور انہیں بکر بن مضر نے اور انہیں عمر بن حرث نے بتایا اور انہوں نے بکر بن الشج سے اور انہیں ضحاک رحمہ اللہ سے اور انہوں نے عبداللہ رحمہ اللہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی انہوں نے بتایا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سفر میں آٹھ رکعت نماز چاشت پڑھتے دیکھا جب آپ فارغ ہو گئے تو فرمایا: میں نے امید وخوف کی نماز پڑھی اور میں نے اپنے پروردگار سے تین چیزوں کا سوال کیا اس نے مجھے دو عطا فرمائیں اور ایک روک دی، میں نے عرض کیا کہ میری امت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کیجیو، تو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور میں نے سوال کیا کہ ان پر کوئی دشمن مسلط نہ ہو تو یہ بھی قبول فرمالیا اور میں نے سوال کیا کہ ان میں تفرقہ پیدا نہ ہو تو یہ قبول نہ ہوا۔

نماز چاشت میں آپ کیا پڑھتے تھے؟

حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ضحاک رحمہ اللہ بن عبداللہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ کون ہے؟ اور اس کی حالت (اعتماد) کیسی ہے؟ حاکم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب فضل الضحیٰ میں لکھا ہے کہ ہمیں ابوبکر فقیہ نے اور انہیں بشر بن یحیٰ نے انہیں محمد بن صالح دولانی نے انہیں خالد بن عبداللہ بن حصین نے بتایا اور انہیں ہلال بن یساف سے اور انہیں زاذان سے اور انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت پہنچی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ الضحیٰ پڑھی پھر پڑھا۔

اللھم اغفرلی وارحمنی وتب علی انک انت التواب الرحیم الغفور۔

یعنی "اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور میری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا بخشنے والا ہے۔"

یہاں تک کہ آپ نے ایک سو مرتبہ یہی دعا پڑھی۔

ہمیں ابو عباس اصم انہیں اسد بن عاصم نے انہیں حصین بن حفص نے بتایا انہیں سفیان سے انہیں عمر بن ذر سے اور انہیں حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت دو رکعت اور چار رکعت اور چھ اور آٹھ پڑھی۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ ہمیں ابو سعید مولیٰ بن ہاشم نے انہیں عثمان بن عبدالملک عمری نے انہیں عائشہ بنت سعد نے بتایا

انہیں حضرت ام درة نے بتایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نماز چاشت پڑھتے دیکھا وہ فرماتی تھیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف چار رکعت پڑھتے ہوئے دیکھا۔ نیز حاکم فرماتے ہیں ہمیں ابو احمد بکر بن محمد مروزی نے انہیں ابو قلابہ نے انہیں ابو ولید نے انہیں ابو عوانہ نے بتایا کہ انہیں حصین بن عبد الرحمٰن سے انہیں عمرو بن مرة سے انہیں عمارة بن عمیر سے انہیں ابن جبیر بن مطعم سے انہیں اپنے والد بزرگوار سے روایت پہنچی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ چاشت پڑھتے دیکھا نیز حاکم فرماتے ہیں کہ ہمیں اسماعیل بن محمد نے انہیں محمد بن عدی بن کامل نے انہیں وہب بن بقیہ واسطی نے انہیں خالد بن عبد اللہ نے بتایا کہ انہیں محمد قیس سے انہیں حضرت جابر بنؓ عبد اللہ سے روایت پہنچی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ رکعت نماز پڑھی۔ پھر حاکمؒ نے اسحٰق بن بشب محاملی سے روایت کی ہے کہ انہیں عیسٰی بن موسیٰ نے بتایا کہ انہیں جابر سے، انہیں عمر بن صبیح سے انہیں مقاتل بن حبان سے، انہیں مسلم بن صبیح سے انہیں مسروق سے انہیں حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمة رضی اللہ عنہا سے روایت پہنچی، ان دونوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ چاشت میں بارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اور طویل روایت ذکر کی ہے حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں ابو احمد بکر بن محمد مراف نے بتایا کہ انہیں ابو قلابہ رقاشی نے انہیں ابو ولید نے انہیں شعبہ نے بتایا۔ انہیں ابو اسحاق سے انہیں عاصم بن حمزة سے انہیں حضرت ن رضی اللہ عنہ سے روایت پہنچی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت پڑھتے تھے۔ یہی خیال ابو ولید کا ہے انہیں ابو عوانہ نے بتایا کہ انہیں حصین بن عبد الرحمٰن سے انہیں عمرو بن مرة سے انہیں عمارة عمیر عبدی سے انہیں ابن جبیر بن مطعم سے انہیں اپنے والد سے روایت پہنچی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز چاشت پڑھتے دیکھا۔

نماز چاشت کے بارے میں صحابہ کی شہادت

حاکمؒ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مردوں میں سے حضرت ابو سعید خدریؓ، ابو ذر غفاریؓ، زید بن ارقمؓ، ابو ہریرہؓ، بریدة اسلمیؓ، ابو الدرداءؓ، عبد اللہ بن ابی اوفیٰؓ، عتبان بنؓ مالک، انسؓ بن مالک، عتبہ بن عبد اللہ سلمی، نعیم بن ہمار غطفانی اور ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم ہیں اور عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ بنت ابی بکرؓ، ام ہانی اور ام سلمہؓ رضی اللہ عنہن ہیں ان سب نے گواہی دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت کی نماز چھ رکعت پڑھا کرتے تھے

ان روایات میں اسناد پر لوگوں میں اختلاف ہو گیا (چنانچہ فعل کی روایت کو ترک (صلوٰۃ) پر ترجیح دی گئی، کیونکہ اثبات کرنے والی روایات میں معلومات کثرت سے ہیں جو نفی کرنے والے پر مخفی رہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ اکثریت کے پاس موجود نہ رہے اور قلیل جماعت کے پاس پایا جائے، کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ، انسؓ، جابرؓ، ام ہانیؓ اور علی بن ابی طالبؓ نے خبر دی ہے کہ آپ نے یہ (نمازِ چاشت) پڑھی ہے اور مندرجہ ذیل احادیث اس کی تائید کرتی ہیں، جن میں اس کی وصیت اور اس نماز کے تحفظ نیز اس پر عامل کی مدح و ثناء ملتی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بتایا کہ میرے خلیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ ہر ماہ تین دن کے روزے رکھوں اور دو رکعت نماز چاشت (پڑھوں) اور سونے سے قبل وتر ادا کروں۔ صحیح مسلم میں اسی طرح حضرت ابو الدرداءؓ سے منقول ہے اور صحیح مسلم میں حضرت ابوذرؓ سے مرفوعاً منقول ہے۔ آنحضرت نے فرمایا۔

تم میں سے ہر آدمی پر صدقہ واجب ہے۔ چنانچہ ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر حمد صدقہ ہے، ہر تہلیل (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) صدقہ ہے۔ ہر تکبیر صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے اور نہی عن المنکر صدقہ ہے۔ اور نماز چاشت کی دو رکعت ان سب کی طرف سے کافی ہیں۔

نمازِ چاشت کی برکت و فضیلت و اجر

اور مسند امام احمدؒ میں حضرت معاذ بن انس جہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنی جائے نماز پر ٹھہرا رہے، یہاں تک کہ نماز چاشت کی دو رکعتیں پڑھے اور صرف اچھی بات منہ سے نکالے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ بخش دے گا چاہے وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔

ترمذیؒ، سنن ابن ماجہؒ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے نمازِ چاشت کی حفاظت کی اس کے تمام گناہ بخشے جائیں گے۔ چاہے وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں اور مسند اور سنن میں نعیمؓ بن حماد سے مروی ہے انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: اے اولادِ آدم دن کے آغاز میں چار رکعتوں سے عاجز نہ آنا۔ میں (دن کے) آخر تک تجھے کافی ہوں گا اور ترمذیؒ نے حضرت ابو الدرداءؓ اور ابوذرؓ سے اور جامع ترمذیؒ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ:

"جس نے نمازِ چاشت کی بارہ رکعتیں ادا کیں، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں سونے کا ایک محل بنا دے گا۔"

مسجد قبا میں نماز چاشت

اور صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد قباء میں ایک جماعت کو نماز چاشت ادا کرتے دیکھا تو فرمایا کیا انہیں معلوم نہیں کہ اس گھڑی کے علاوہ دوسرے وقت میں نماز زیادہ افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نمازِ اوابین اس وقت ہے جبکہ حرارت تیز ہو جائے اور "ترمض الفصال" کا مطلب ہے کہ دن کی حرارت سخت تر ہو جائے۔ یہاں تک کہ جسم میں دوپہر کی گرمی محسوس ہونے لگے اور صحیح (روایت) میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبانؓ بن مالک کے گھر میں دو رکعت نماز چاشت پڑھی اور مستدرک حاکم میں خالد بن عبداللہ واسطی سے اور انہیں محمد بن عمر سے اور انہیں ابو سلمہ سے اور انہیں ابو ہریرہؓ سے روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نماز چاشت کی حفاظت صرف اوّاب (اللہ کی طرف رجوع کرنے والے) ہی کیا کرتے ہیں۔"

اور بتایا کہ مسلم بن حجاج کی طرح یہ سند بھی قابلِ استدلال ہے اور انہوں نے اپنے شیوخ سے اور انہیں محمد بن عمر سے انہیں ابو سلمہ سے انہیں حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ سے روایت پہنچی اور انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوا اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کا اتنا (تاکیدی) حکم نہیں فرمایا جتنا ایک نبی کو قرآن مجید اچھے انداز سے تلاوت کا حکم فرمایا اور بتایا کہ شاید کہنے والے نے کہا کہ یہ حماد بن سلمہ اور عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے اور انہیں محمد بن عمر سے مرسل روایت پہنچی۔ چنانچہ خالد بن عبداللہ ثقہ راوی ہے اور ثقہ کی زائد (صفت، قبولیت (کا سبب) ہوتی ہے پھر حاکمؒ نے روایت کیا، انہیں عبدان بن یزید نے انہیں محمد بن مغیرہ سکری نے، انہیں قاسم بن حکم عرنی نے، انہیں سلیمان بن داؤد یمامی نے انہیں یحییٰ بن ابی کثیر نے بتایا اور انہیں ابو سلمہ سے اور انہیں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت پہنچی، انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جنت میں ایک دروازہ ہے، جسے باب الضحیٰ کہتے ہیں۔ چنانچہ جب قیامت قائم ہوگی۔ تو ندا دینے والا آواز دے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو نمازِ چاشت پڑھا کرتے تھے۔ یہ تمہارا دروازہ ہے اللہ کی رحمت سے اس میں داخل ہو جاؤ۔"

جامع ترمذیؒ میں ہے کہ ہمیں ابوکریب محمد بن علاء نے اور انہیں یونس بن بکیر نے بتایا اور انہیں محمد بن اسحاق سے روایت پہنچی کہ مجھے موسیٰ بن خلال نے بتایا کہ اسے اپنے چچا ثمامہ بن انس بن مالک سے انہیں انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے نماز چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھیں تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے سونے کا ایک گھر بنا دے گا۔

کیا آپؐ نماز چاشت مسلسل پڑھا کرتے تھے؟

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں اور امام احمدؒ اس مسئلہ میں حضرت ام ہانیؓ کی روایت کو صحیح تر سمجھتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ موسیٰ بن خلال دراصل موسیٰ بن عبداللہ بن مثنیٰ بن انس بن مالک ہی ہے۔ نیز ان کی جامع میں حضرت عطیہ عوفی سے روایت ہے۔ انہیں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت پہنچی۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اس طرح مسلسل) نماز چاشت پڑھا کرتے کہ ہم سمجھتے کہ آپ اب ترک نہ کریں گے اور پھر اس طرح ترک کر دیتے کہ ہم سمجھتے کہ اب نہ پڑھیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں بتایا ہے کہ ہمیں ابوالیمان نے انہیں اسماعیل بن عیاش نے خبر دی، انہیں یحییٰ بن حارث ذماری سے انہیں قاسم سے انہیں ابوامامہ سے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت پہنچی کہ:

جو فرض نماز (ادا) کرنے کے لیے چلا اور اس کا وضو ہے تو اس کے لیے اجر ہے جیسے احرام باندھ کر حج کے لیے چلنے والے کا اجر ہوتا ہے یا عمرہ کرنے والے کا ہوتا ہے اس کا حج اور عمرہ مکمل ہو جائے۔ ابن ابی شیبہ نے کہا ہے کہ مجھے حاتم بن اسماعیل نے بتایا انہیں حمید بن صخر سے انہیں مقبری سے انہیں اعرج سے انہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ملی۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا چنانچہ کافی مال غنیمت حاصل ہوا اور یہ لوگ جلدی لوٹ آئے تو ایک آدمی کہنے لگا یا رسول اللہ ہم نے کبھی اس سے جلدی لوٹنے والا لشکر نہیں دیکھا اور نہ اس لشکر سے زیادہ مال غنیمت لانے والا لشکر دیکھا، تو آپ نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں ایک ایسے آدمی کی خبر نہ دوں؟ کہ جو سب سے جلدی لوٹ آئے اور سب سے زیادہ غنیمت لے کر آئے۔ ایک آدمی اپنے گھر میں وضو کرے اور بہترین وضو کرے پھر مسجد کی طرف رخ کرے وہاں صبح کی نماز ادا کرے پھر اس کے بعد نماز چاشت ادا کرے تو یقیناً وہ جلد لوٹ

آنے والا اور سب سے زیادہ غنیمت لانے والا ہے۔

اور اس کے علاوہ بھی اس باب میں کئی روایات ہیں۔

نماز چاشت میں چار رکعتیں پڑھنا زیادہ صحیح ہے

حاکم فرماتے ہیں کہ میں نے حفاظ حدیث کی ایک جماعت کے ساتھ مصاحبت کی تو یہی تعداد (یعنی چار رکعت) کو پسند کرتے دیکھا (اور دیکھا) کہ وہ اس مسئلہ میں اخبارِ متواترہ صحیحہ کی بناء پر چار ہی رکعتیں پڑھا کرتے۔ میرا بھی یہی مسلک ہے اور اخبارِ ماثورہ اور مشائخ حدیث کی اقتداء میں اسی کو دعوت دیتا ہوں۔

ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ نماز چاشت اور اختلاف مناجات کے متعلق روایات مرفوعہ ملتی ہیں اور ان میں کوئی ایسی حدیث نہیں جو اس کے ماننے والے کا دفاع کرتی ہو اور یہ معاملہ یوں ہے کہ جو منقول ہے کہ آپ نے نماز چاشت میں چار رکعتیں پڑھیں۔ ہو سکتا ہے کہ (راوی) نے آپ کو اس طرح کرتے دیکھا ہو۔ دوسرے راوی نے آپ کو چھ رکعتوں کی ترغیب دیتے دیکھا ہو ایک اور نے دو رکعتیں پڑھنے کی ایک اور نے دس کی اور ایک اور نے بارہ رکعتوں کی ترغیب دیتے سنا تو ہر ایک نے جو سنا اور جو دیکھا وہی روایت کر دیا۔ انہوں نے بتایا ہمارے اس قول کی دلیل صحت حضرت زید بن اسلم کی روایت ہے انہوں نے بتایا کہ میں نے عبداللہ بن عمر کو سنا کہ وہ ابوذرؓ سے کہہ رہے تھے۔

"اے چچا مجھے وصیت کیجیے!

انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا جیسا کہ تم نے مجھ سے سوال کیا ہے تو آپ نے فرمایا جس نے نماز چاشت دو رکعت پڑھی وہ غافلوں میں نہیں لکھا جائے گا اور جس نے چار رکعتیں پڑھیں وہ عابد لوگوں میں سے لکھا جائے گا اور جس نے چھ رکعتیں پڑھیں اور اس دن کوئی گناہ نہیں کیا اور جس نے آٹھ رکعتیں پڑھیں وہ قانتین میں سے لکھا جائے گا اور جس نے دس رکعتیں پڑھیں تو اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔

نماز چاشت میں تعداد رکعات کے روایات

مجاہد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز چاشت میں دو رکعتیں پڑھیں پھر ایک پھر چار پھر ایک دن چھ پھر ایک دن آٹھ پڑھیں پھر چھوڑ دیا تو اس روایت نے ہمارے قول کی صحت کو ظاہر کر دیا کہ حسب سابق ہر مخبر کی خبر سے احتمال یہ ہے کہ اس

کی اطلاع اس کے اپنی ذاتی مشاہدے و معائنے پر مبنی ہو اور جب مسئلہ یوں ہو تو صحیح تر مسلک یہ ہے کہ پڑھنے والا جس تعداد میں چاہے پڑھ لے۔

سلف کی ایک جماعت سے یہی منقول ہے۔ ہمیں ابن حمید نے انہیں جریر نے بتایا انہیں ابراہیم سے روایت پہنچی کہ ایک آدمی نے حضرت اسودؓ سے دریافت کیا کہ میں نمازِ چاشت کتنی رکعتیں پڑھوں؟ انہوں نے فرمایا جتنی چاہو۔

نمازِ چاشت نہ پڑھنے کے رواۃ اور روایات

اور دوسرا گروہ ترکِ چاشت کی روایات کی طرف گیا ہے اور صحت اسناد کے باعث اور ان پر عملِ صحابہؓ کے باعث ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نہ وہ خود پڑھا کرتے اور نہ ابو بکرؓ و عمرؓ (پڑھا کرتے تھے) میں نے دریافت کیا کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا نہیں ان کا کوئی بھائی (مساوی) نہیں۔

وکیعؒ بتاتے ہیں کہ ہمیں سفیان ثوریؒ نے بتایا انہیں عاصم بن کلیب سے انہیں اپنے والد سے انہیں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت پہنچی۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک ہی دن نمازِ چاشت پڑھتے دیکھا اور علی بن مدینی بتاتے ہیں کہ ہمیں معاذ بن معاذ نے انہیں شعبہ نے انہیں فضیل بن فضالہ نے بتایا انہیں عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ سے روایت پہنچی کہ حضرت ابو بکرؓ نے کچھ لوگوں کو نمازِ چاشت پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگ وہ نماز پڑھ رہے ہو جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی اور نہ آپ کے عام صحابہ رضی اللہ عنہم نے پڑھی۔

موطا میں حضرت مالکؒ سے ابن شہاب سے وہ عروۃ سے وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی نمازِ چاشت نہیں پڑھی، حالانکہ میں پڑھتی ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کام چھوڑ دیتے تھے حالانکہ آپ عمل کرنا پسند کرتے تھے (اس کی وجہ یہ تھی)، کہ آپ کا خطرہ کہ آپ اگر (مسلسل) عمل شروع کریں گے تو امت پر فرض ہو جائے گا۔

کیا نمازِ چاشت بدعت ہے؟

ابو الحسن علی بن بطال نے بتایا: سلف کی ایک جماعت نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اخذ کرتے ہوئے

نماز چاشت کو تسلیم نہیں کیا۔ ایک جماعت نے کہا کہ یہ بدعت ہے۔ شعبی نے قیس بن عبید سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی طرف سنت میں اختلاف پایا جاتا تھا تو میں نے انہیں نماز چاشت پڑھتے نہیں دیکھا اور شعبہؒ نے سعد بن ابراہیم سے اور انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے روایت کیا کہ وہ نماز چاشت نہیں پڑھتے تھے۔

مجاہدؒ سے منقول ہے انہوں نے بتایا کہ میں اور حضرت عروہؓ بن زبیر مسجد میں گئے تو دیکھا کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پاس تشریف فرما ہیں اور لوگوں کو دیکھا کہ وہ مسجد میں نماز چاشت پڑھ رہے ہیں تو ہم نے ان سے (لوگوں) کی اس نماز کے متعلق دریافت کیا انہوں نے فرمایا یہ بدعت ہے۔ اور ایک بار فرمایا کہ یہ اچھی بدعت ہے۔

امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو کہتے ہوئے سنا:

مسلمانوں نے نماز چاشت سے زیادہ افضل بدعت ایجاد نہیں کی۔

اور حضرت انسؓ بن مالک سے نماز چاشت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ نمازیں پانچ ہیں۔

کیا نماز چاشت مستحب ہے؟ تیسرا گروہ گاہے گاہے اس کو مستحب سمجھتا ہے اس لیے کسی کسی دن پڑھنی چاہیے۔ امام احمدؒ سے مروی دو روایتوں میں سے یہ ایک ہے اور امام طبریؒ نے اسے ایک جماعت سے روایت کیا ہے اور جریریؒ نے حضرت عبداللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا:

کیا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، نہیں، ہاں، اگر آپ سفر سے تشریف لاتے تو پڑھتے۔ پھر انہوں نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت ذکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت پڑھتے۔ یہاں تک کہ ہم سمجھتے کہ اب ترک نہ کریں گے اور کبھی آپ چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم سمجھتے کہ اب نہ پڑھیں گے اور یہ گزر چکا ہے پھر بتایا کہ اسی طرح سلف میں جس نے اس پر عمل کیا اس نے ذکر کیا ہے۔

شعبہ نے حبیب بن شہید سے انہوں نے حضرت عکرمہؓ سے روایت کیا، انہوں نے بتایا کہ حضرت ابن عباسؓ اس کو یعنی نماز چاشت کو ایک دن پڑھتے اور دس دن ترک کر دیتے اور شعبہ نے حضرت عبداللہ بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ (ابن عمرؓ) نماز چاشت

نہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ مسجد قباء میں تشریف لاتے تو نماز پڑھتے اور آپ ہر ہفتہ کو تشریف لاتے اور حضرت سفیانؒ نے منصورؒ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ (بزرگانِ دین) دیگر فرض نمازوں کی طرح اس کی پابندی نہ کرتے۔ کبھی پڑھتے اور کبھی نمازِ چاشت چھوڑ دیتے۔

حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ میں نماز چاشت چھوڑ دیتا ہوں حالانکہ میں چاہتا ہوں (کہ پڑھوں) اس ڈر سے کہ اسے اپنے آپ پر لازم نہ فرض کرلوں۔

مسروقؒ فرماتے ہیں ہم مسجد میں پڑھتے تھے چنانچہ ہم حضرت ابن مسعودؓ کے جانے کے بعد بھی ٹھہرے رہتے، پھر اُٹھتے اور نمازِ چاشت پڑھتے۔ آخر حضرت ابن مسعودؓ کو اس کی اطلاع ہو گئی تو انہوں نے فرمایا کہ تم اللہ کے بندوں پر وہ بوجھ کیوں ڈالتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے نہیں ڈالا اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو گھروں میں پڑھو۔

نمازِ چاشت مسجد کے بجائے گھر میں پڑھنی چاہیے

ابو مجلزؒ اپنے گھر میں نمازِ چاشت پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا ہے یہی بہتر صورت ہے تاکہ کسی کو اس کی پابندی دیکھ کر وجوب یا سنتِ راتبہ ہونے کا شک نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں والدین بھی زندہ کر دیے جائیں تو بھی اس نماز کو ترک نہ کروں گی، کیونکہ وہ اسے اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھیں جہاں لوگ انہیں نہ دیکھ سکتے۔

فتح مکہ کے دن چاشت کی آٹھ رکعتیں

چوتھا گروہ اس طرف گیا ہے کہ (حضرت عائشہؓ) کا اس پر ایک سبب سے عمل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر ایک خاص سبب سے عمل تھا۔

اور ان کا کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مکہ کے دن چاشت کے وقت کی آٹھ رکعتیں فتح مکہ کی خوشی کے باعث تھیں اور فتح کے موقع پر سنت یہ ہے کہ آٹھ رکعتیں ادا کی جائیں اور احکام اہلِ اسلام اسے نماز فتح کا نام دیتے تھے۔ طبری نے اپنی تاریخ میں شعبی سے نقل کیا ہے کہ جب خالد بن ولیدؓ نے حیرۃ فتح کیا تو نمازِ فتح آٹھ رکعت پڑھی، جن کے درمیان سلام نہ پھیرا پھر فارغ ہوئے۔

(محدثین) کا کہنا ہے کہ حضرت ام ہانیؓ کا قول یہ ہے کہ یہ نمازِ چاشت تھی۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ چاشت کا وقت تھا نہ کہ یہ صورت ہوئی کہ چاشت کی نماز کا نام دے دیا گیا۔

عتبانؓ کے ہاں آپ نے نماز کیوں پڑھی؟

(محدثین) فرماتے ہیں کہ عتبان بن مالکؓ کے ہاں آپ کی نماز ایک سبب سے تھی کیونکہ عتبانؓ نے عرض کیا تھا کہ میری نظر کمزور ہو چکی ہے۔ میرے اور میری قوم کی مسجد کے درمیان سیلاب آڑے آجاتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے گھر میں تشریف لائیں اور میرے ہاں نماز پڑھیں تاکہ میں اس جگہ کو مسجد قرار دے لوں، آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ میں ایسا کردوں گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت ان کے ہاں تشریف لے گئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ اس وقت دن (کی حرارت) تیز ہو چکی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت دی، پھر آپ نہیں بیٹھے بلکہ فرمایا اپنے گھر میں تم کہاں پسند کرتے ہو کہ میں نماز پڑھوں؟ میں نے اُس جگہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں میں چاہتا تھا کہ آپ نماز پڑھیں پھر آپ کھڑے ہو گئے اور ہم نے آپ کے پیچھے صف بنائی، آپ نے نماز پڑھی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو ہم نے بھی سلام پھیر دیا (متفق علیہ)

اس نماز کی یہ اصل اور واقعہ ہے اور بخاریؒ کے الفاظ اس میں یہ ہیں کہ حضرت عتبانؓ سے بعض راویوں نے اختصار سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں نماز چاشت پڑھی اور وہ (صحابہؓ) آپ کی اقتدا میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے نماز پڑھی۔

سفر سے واپسی پر نماز چاشت

رہا حضرت عائشہؓ کا وہ قول کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم صرف سفر سے واپسی پر نماز چاشت پڑھا کرتے تھے تو یہ واضح تر امر ہے کہ آپ کی یہ نماز ایک خاص سبب سے تھی کیونکہ آپ جب سفر کا آغاز فرماتے تو مسجد میں تشریف لے جاتے اور وہاں دو رکعت نماز ادا فرماتے۔ یہ آپ کی سنت طیبہ ہے اور حضرت عائشہؓ نے اس کی خبر دی ہے اور یہ جو آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی نماز چاشت نہیں پڑھی تو جس کا انہوں نے اثبات فرمایا ہے تو وہ سفر سے واپسی فتح اور کسی قوم سے ملاقات وغیرہ جیسا کوئی سبب ہے۔ جس طرح مسجد قبا میں نماز پڑھنے کے لیے وہاں تشریف لانا۔ اسی طرح جیسے یوسف بن یعقوب نے روایت کیا ہے انہیں محمد بن ابی بکر انہیں سلمۃ بن رجاء انہیں شعثاء نے بتایا کہ میں نے ابن ابی اوفی کو اس دن دیکھا جس دن اسے ابوجہل کے سر کٹ جانے) کی خوشخبری دی گئی کہ انہوں نے نماز چاشت کی دو رکعتیں پڑھیں۔

اگرچہ واقعہ درست ہے تو یہ نماز شکر ہوگی، جو اتفاقاً چاشت کے وقت وقوع پذیر ہوئی۔ جیسے شکرانہ فتح اور جسے مسترد کیا ہے وہ وہی نماز ہے جسے لوگوں نے بغیر کسی سبب کے قائم کر رکھا تھا اور انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ مکروہ یا خلافِ سنت ہے ہاں، اتنی بات ہے کہ یہ آپ کی سنتِ حبیبہ نہیں۔ حالانکہ آپ نے اس کی وصیت فرمائی اور اسے مندوب قرار دے کر اس کی ترغیب دی آپ اس کے بدل میں قیام اللیل کر لیتے تھے کیونکہ اس سے اس کا بدل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا۔

یعنی اور وہی ذات ہے جس نے رات اور دن بنائے۔ پے درپے اس کے لیے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گزار بننا چاہے۔"

اور ابن عباسؓ، حسنؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے عوض و بدل بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی کا کوئی عمل کسی وقت فوت ہو جائے تو اسے چاہیے کہ دوسرے وقت ادا کر لے۔

قتادہؒ فرماتے ہیں کہ شب و روز میں اللہ تعالیٰ کے لیے اچھے اعمال کرو کیونکہ یہ (دن رات) پیٹھے جا رہے ہیں۔ لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ ہر دور نزدیک ہو رہا ہے ہر نئی چیز بوسیدہ ہو رہی ہے اور قیامت تک کا ہر امر موعود آ رہا ہے۔

بعض صحابہ نماز چاشت پڑھتے تھے بعض نہیں

شفیق فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے رات کی نماز فوت کر دی۔ آپ نے فرمایا جو عمل تو نے رات کو فوت کر دیا سے دن میں پورا کر لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا۔

(محدثین) فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کا فعل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ ایک دن پڑھتے اور دس دن چھوڑ دیتے۔ اور حضرت ابن عمرؓ پڑھتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ آپ مسجد قباء میں آتے تو پڑھتے اور آپ ہر سنیچر کو مسجد قباء میں تشریف لایا کرتے۔

اور سفیانؒ نے حضرت منصورؒ سے روایت کیا ہے کہ (صحابہؓ) فرض نمازوں کی طرح اس کی پابندی مکروہ سمجھتے تھے، کبھی پڑھتے، کبھی چھوڑ دیتے۔

(محدثین) نے فرمایا ہے کہ اس باب میں صحیح حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ انصار میں سے ایک فربہ آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا میں آپ کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ طعام کی اور آپ کو اپنے گھر میں بلایا اور چٹائی کے ایک حصہ پر آپ کی خاطر پانی چھڑکا۔ چنانچہ آپ نے اس پر دو رکعت نماز پڑھی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن کے سوا کبھی نماز چاشت پڑھتے نہیں دیکھا (رواہ البخاری)

جو بھی احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ میں تدبر سے کام لے تو اُسے معلوم ہو گا کہ یہ سب اسی قول کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ ہاں! ترغیب و تحریص کی روایات تو صحیح روایات حضرت ابو ہریرہؓ اور ابو ذرؓ کی ہیں (لیکن) ان سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ سنت راتبہ ہے، ویسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس کی وصیت فرمائی۔ کیونکہ مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ رات کی نماز کے عوض درس حدیث کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ان کو قیام لیل کے عوض نماز چاشت کا حکم دیا یہی وجہ ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ وتر پڑھنے سے قبل نہ سونا۔ حالانکہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ دیگر صحابہؓ کو اس بات کا حکم نہیں دیا۔

مرفوع، منقطع اور موضوع حدیثیں

اس سلسلہ میں عام احادیث کی اسناد محل نظر ہیں۔ بعض منقطع اور بعض موضوع ہیں، جن سے استدلال جائز نہیں۔ جیسے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت کہ جس نے نماز چاشت پر مواظبت (مداومت) کی اور کسی عذر کے بغیر اسے منقطع نہ کیا تو وہ اور میں نور کے سمندر میں نور کی ایک کشتی میں ہوں گے اسے زکریا بن درید کندی نے حمید سے روایت بنا کر وضع کیا۔

رہی یعلی بن اشدق کی روایت (جو وہ) عبداللہ بن جراد سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ:

تم میں سے جو نماز چاشت پڑھے تو اُسے چاہیے کہ عبادت گزاری کرتے ہوئے پڑھے کیونکہ ایک آدمی سنت کو ایک زمانہ میں ادا کرتا ہے پھر اسے فراموش کر دیتا اور چھوڑ دیتا ہے۔ تو ہم اس کی طرف ایسے دیکھتے، ہوتے ہیں جیسے اونٹنی اپنے بچے کی طرف کھنچی آجاتی ہے جبکہ وہ گم ہو جائے۔!

احادیث مرفوعہ کا ایک مجموعہ

حاکمؒ پر تعجب ہے کہ ان جیسی روایات سے کس طرح استدلال کر ڈالتے ہیں کیونکہ وہ اس روایت کو اس کتاب میں تحریر

کرتے ہیں، جس میں منفرد طور پر نمازِ چاشت کو ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ نسخہ یعنی یعلی بن اشدق کا نسخہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موضوع روایات پر مشتمل ہے۔

ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ یعلی بن اشدق نے اپنے چچا عبداللہ بن جراد سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت کے ساتھ منکر احادیث روایت کی ہیں۔ یہ اور اُن کے چچا دونوں غیر معروف (مجہول) راوی ہیں۔

مجھے ابومسہر سے معلوم ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے یعلی بن اشدق سے کہا۔
تیرے چچا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث نہیں سنی۔
وہ کہنے لگا کہ اس نے سفیان، موطا مالک اور کچھ (دیگر) فوائد سے استفادہ کیا۔

ابوحاتم بن حبان کہتے ہیں کہ یعلی کی عبداللہ بن جراد سے ملاقات ہوئی۔ چنانچہ جب وہ بڑا ہو گیا تو اس سے مصاحبت کی چنانچہ انہوں نے حدیث سے ملتی جلتی باتیں اختراع کیں اور یہ انہیں روایت کرنے لگا حالانکہ یہ (ان کے متعلق) کچھ بھی نہ جانتا تھا اور یہی سبب ہے کہ ہمارے اصحاب کے مشائخ نے فرمایا۔

تو نے عبداللہ بن جراد سے کیا سُنا ہے؟

کہنے لگا یہ نسخہ، حالانکہ جامع سفیان سے کسی حال میں بھی روایت جائز نہیں۔ اسی طرح عمر بن صبیح کی روایت جو انہیں مقاتل بن حیان سے حضرت عائشہؓ کی پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت میں بارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ طویل حدیث ہے جسے حاکمؒ نے نمازِ چاشت کے بیان میں ذکر کیا ہے حالانکہ یہ روایت موضوع ہے اور عمر بن صبیح متہم بالکذب ہے۔

ایک راوی پر علمائے اسماء الرجال کی جرح

بخاریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یحییٰ بن علی بن جبیر نے بتایا کہ میں نے عمر بن صبیح کو یہ کہتے سنا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ وضع کیا ہے۔ ابن عدیؒ نے اس کو منکر احادیث بتایا ہے ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ ثقات کے نام پر روایات وضع کرتا تھا اور محض تعجب کی بنا پر اس کی طرف سے کتب احادیث جائز ہو سکتی ہیں۔ دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ یہ متروک ہے۔ ازدیؒ اسے کذاب بتاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عبدالعزیز بن ابان کی روایت جو امام ثوریؒ سے انہیں حجاج بن فرافصہ سے انہیں مکحول سے، انہیں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً پہنچی کہ جو نماز چاشت کی پابندی کرے۔ اس کے تمام گناہ بخشے جائیں گے۔ چاہے وہ کتنی ہی تعداد میں ہوں اور سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔

نیز حاکمؒ نے بھی نقل کیا ہے اور عبدالعزیز کے لیے۔ ابن نمیر کہتے ہیں کہ یہ کذاب ہے۔ اور یحییٰ کہتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں۔ کذاب ہے خبیث حدیثیں وضع کرتا ہے۔ امام بخاریؒ، نسائی اور دارقطنی اسے متروک الحدیث بتاتے ہیں۔

یہی صورت نہاس بن قہم کی روایت کی ہے جو اسے (بزعم خویش) شداد سے انہیں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً پہنچی کہ جس نے نماز چاشت کی پابندی کی، اس کے تمام گناہ بخشے جائیں گے چاہے وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں اور نہاس کے متعلق یحییٰ فرماتے ہیں کچھ بھی نہیں ضعیف ہے۔ یہ حضرت عطاء سے اور حضرت ابن عباسؓ سے منکر روایات بیان کیا کرتا تھا۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں۔ ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ یہ مشاہیر (ائمہ) سے منکرات روایت کرتا ہے اور ثقات کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کی روایت سے استدلال جائز نہیں اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں یہ مضطرب الحدیث ہے۔ یحییٰ قطان نے ترک کر دیا ہے۔

ایک راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف

رہی حمید بن صخر کی روایت جو مقبری سے انہیں حضرت ابوہریرہؓ سے پہنچی۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا (الحدیث)، یہ گزر چکا ہے تو یہ جو حمید ہے نسائیؒ اور یحییٰ بن معینؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسروں نے اسے ثقہ بتایا ہے اور اس کی بعض روایات کا انکار کیا ہے اور جب یہ منفرد ہو تو اس کی روایت سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

نماز چاشت پڑھنے والے کے لیے بشارت

رہی محمد بن اسحاق کی روایت جو انہیں موسیٰ سے انہیں عبداللہ بن مثنیٰ سے انہیں انس سے انہیں اپنے چچا ثمامہ سے انہیں انسؓ سے مرفوعاً پہنچی، جس نے نماز چاشت پڑھی اللہ اس کے لیے جنت میں سونے کا ایک گھر بنائے گا" یہ غریب روایات میں سے ہے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ غریب ہے۔ ہم اسے صرف اس سند سے جانتے ہیں۔ رہی نعیم بن ہمار کی روایت کہ:۔

"اے ابن آدم دن کے آغاز میں چار رکعتوں سے عاجز نہ رہ میں تجھے اس کے آخری حصہ تک کافی رہوں گا۔ اسی طرح ابوالدرداءؓ اور ابوذرؓ کی روایت کا معاملہ ہے چنانچہ میں نے شیخ الاسلام

ابن تیمیہؒ کو کہتے سنا کہ ان چار رکعتوں سے میرے نزدیک فجر کی نماز اور اس کی سنتیں مراد ہیں۔[1]

---

[1] بہر حال یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نماز چاشت اگرچہ فرض یا واجب نہیں لیکن اپنے پڑھنے والے کے لیے گوناگوں برکتیں اور نعمتیں رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صوفیا کے ہاں خواہ وہ کسی سلسلہ سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں۔ دوسرے اہم اور مسلسل اور غیر منقطع معمولات میں نماز چاشت بھی داخل ہے۔ گویا روحانی سربلندی کے حصول میں اس سے غیر معمولی مدد ملتی ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

سجدۂ شکر

مصیبت کے ٹلنے یا خوش خبری پر سر بہ سجود ہونا

آں حضرتؐ کی سنت طیبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت طیبہ تھی جیسا کہ مسند میں حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی طرح کی مسرت انگیز اطلاع ملتی تو سجدۂ شکر میں گر پڑتے اور ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات کی خوش خبری دی گئی تو آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ امام بیہقیؒ نے بخاری کی شرط سند کے اصول پر ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قبیلہ ہمدان کے قبول اسلام کی اطلاع بھیجی تو آپ نے سجدۂ شکر کیا، پھر سر اٹھایا، اور فرمایا:

السلام علی ہمدان۔ السلام علی ہمدان۔

مسند میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اپنے پروردگار کی طرف سے بشارت ملی کہ جس نے آپؐ پر درود بھیجا میں اس پر رحم کروں گا اور جس نے آپؐ پر سلام بھیجا میں اس پر سلام بھیجوں گا تو آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ سنن ابوداؤد میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اللہ سے دیر تک دعا کرتے رہے۔ پھر تین بار سجدہ کیا پھر فرمایا:۔

میں نے اپنے پروردگار سے سوال کیا اور اپنی امت کی شفاعت کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی امت کا تیسرا حصہ دیا پھر میں نے سجدۂ شکر کیا۔ پھر میں نے سر اٹھایا اور اپنے پروردگار سے اپنی امت کے لیے درخواست کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسرا ثلث بھی عطا

فرمایا۔ میں نے سجدۂ شکر کیا۔ پھر میں نے سر اٹھایا اور اپنے پروردگار سے اپنی امت کے لیے التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرا ثلث عطا فرمایا۔ میں اپنے پروردگار کے سامنے سجدۂ شکر میں گر گیا۔

چند تاریخی اور اہم مثالیں

اور کعبؓ بن مالک کو جب خوشخبری دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے تو انہوں نے سجدۂ شکر کیا اور امام احمدؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ذکر کیا ہے کہ جب انہوں نے خوارج کے مقتولوں میں ذوالثدیہ کو دیکھا تو سجدۂ شکر ادا کیا اور سعید بن منصورؒ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب مسیلمہ کذاب کے قتل کی اطلاع ملی تو سجدۂ شکر کیا۔

قرآن مجید کے سجدوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت طیبہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم (تلاوت قرآن کے دوران) جب کسی سجدہ سے گزرتے تو تکبیر کہتے اور سجدہ کرتے اور بسا اوقات سجدہ میں یہ دعا پڑھتے۔

سجد وجھی للذی خلقہٗ وصورہٗ وشق سمعہٗ وبصرہٗ بحولہ وقوتہٗ

یعنی: "میرے چہرے نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کی تصویر بنائی ہے اور اسے سماعت و بصارت اپنی قوّت و قدرت، سے عطا فرمائی"۔

کبھی کبھی آپؐ یہ دعا پڑھتے:

اللھم احطط عنی بھا وزرا واکتب لی بھا اجرا واجعلھا لی عندک ذخرا وتقبلھا منی کما تقبلتھا من عبدک داؤد۔

یعنی: "اے اللہ اس سجدہ کی برکت سے میرا بوجھ ہٹا دے اور اسے میرے لیے اجر بنا دے اور اسے اپنے پاس میرا ذخیرہ کرلے اور میرا سجدہ اسی طرح قبول فرما جس طرح تو نے اپنے بندے داؤد علیہ السلام کا قبول کیا تھا"۔

اہل سنن نے ان دونوں کو ذکر کیا ہے اور یہ نقل نہیں کیا کہ آپؐ اس سجدہ سے اٹھتے وقت تکبیر کہتے تھے اس لیے خرقی اور متقدمین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ امام شافعیؒ سے منصوص ہے کہ اس میں کوئی تشہد و سلام بھی نہیں۔

صحیح روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے مندرجہ ذیل سورتوں میں سجدہ کیا: الم تنزیل، ص، النجم، اذا السماء انشقت، اقرأ باسم ربک الذی خلق۔

اور ابو داؤدؒ نے حضرت عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے سجدہ کے پندرہ مقامات بتائے ہیں ان میں سے تین سورۂ مفصل ہیں۔ دو سجدے سورۃ حج میں ہیں۔
حضرت ابوالدرداء کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گیارہ سجدے
گئے اور مفصل میں کوئی سجدہ نہیں۔ الاعراف، الرعد، النحل، بنی اسرائیل، مریم، الحج، سجدہ الفرقان،
النمل، السجدہ، حوامیم (میں ہیں)
اور حضرت ابوہریرہ رضی سے بہ روایت صحیحہ ثابت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے
ساتھ اقرأ باسم ربك الذی خلق اور اذا السماء انشقت میں سجدہ کیا۔

جمعہ اور خصائصِ جمعہ

جمعہ ہر قوم کا افضل دن تھا مگر اس نے بعد میں چھوڑ دیا

مسلمانوں کا امتیازِ خاص صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا، قیامت کے دن اگلوں، پچھلوں اور سبقت کرنے والوں میں ہمارا ہی شمار ہوگا، بس فرق جو ہے وہ اتنا کہ انھیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر یہ (جمعہ کا دن)، جو ان پر اللہ نے فرض کیا پھر انھوں نے اس میں اختلاف کیا۔ چنانچہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی، اور لوگ اس میں ہمارے متبع ہیں (باقی) یہودی کل (ہفتہ)، اور عیسائی پرسوں (اتوار) (پر بھٹک گئے)۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو ہم سے پہلے تھے، اللہ نے انھیں جمعہ سے بھٹکا دیا۔ اب یہودیوں کا ہفتہ اور عیسائیوں کا اتوار رہ گیا۔ پھر اللہ ہمیں لایا، اور ہمیں جمعہ کی ہدایت دی، اسی طرح اس نے جمعہ ہفتہ اور اتوار بنا دیا (پے در پے) اسی طرح وہ قیامت کے دن ہمارے پیچھے رہ جائیں گے۔ ہم دنیا کے لحاظ سے بعد میں ہیں لیکن قیامت کے دن آگے آگے ہوں گے۔

سب سے افضل دن جمعہ کا ہے مسند وسنن میں اوس بن اوسؓ کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے: تمہارا سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے اسی دن اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اسی دن ان کی روح قبض کی، اسی دن صور پھونکا جائے گا، اسی دن (قیامت کی) کڑک ہوگی، پس اس دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

بعض حاضرین نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول جب آپ مٹی میں مل جائیں گے تو ہمارا

درود کیسے پیش کیا جائے گا؟
آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے اجسام کھائے۔
اس حدیث کو حاکم و ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔
جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:
سب سے بہتر دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، اسی دن جنت میں داخل کیئے گئے۔ اسی دن وہاں سے انھیں نکالا گیا، اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔
امام مالکؒ نے موطا میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، سب سے بہتر دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی دن (انھیں زمین پر) اتارا گیا۔ اسی دن (ان کی) توبہ قبول کی گئی، اسی دن وہ فوت ہوئے، اسی دن قیامت قائم ہوگی، جن اور انسان کے سوا کوئی جاندار ایسا نہیں جو جمعہ کے دن قیامت سے ڈر سے خائف و ترساں نہ ہو، اور اس میں ایک ایسی ساعت بھی آتی ہے کہ جب کوئی مسلمان نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو (اللہ) اسے ضرور ہی عطا فرماتا ہے۔
کعبؓ[1] نے دریافت کیا، کہ کیا یہ ہر سال ہوتا ہے؟ تو میں نے جواب دیا، نہیں! بلکہ ہر جمعہ کو۔ پھر انھوں نے توراۃ پڑھی، اور کہنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درست فرمایا۔
حضرت ابوہریرہؓ بتاتے ہیں، پھر میں حضرت عبداللہ بن سلام سے ملا، تو میں نے ان کے سامنے کعبؓ کے واقعہ کا تذکرہ کیا، انھوں نے جواب دیا، میں جانتا ہوں کہ وہ کونسی گھڑی ہے؟
میں نے عرض کیا، پھر مجھے بھی بتا دیجئے۔
انھوں نے فرمایا، یہ جمعہ کے دن کی آخری ساعت ہے۔
میں نے عرض کیا، وہ کس طرح؟ جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس ساعت میں کوئی مسلمان نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا تو (اللہ) اس کی دعا ضرور قبول کرے گا، اور یہ آخری گھڑی جو آپ نے بتائی ہے ایسی ہے جس میں کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی۔
حضرت ابن سلامؓ نے فرمایا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جو کسی جگہ بیٹھے اور نماز کا انتظار کر رہا ہو تو نماز پڑھنے تک گویا وہ نماز ہی میں مشغول رہا؟

---

[1] بہت بڑے یہودی عالم تھے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے۔ اس اعتبار سے انھیں "کعب احبار" کہتے ہیں۔ (رئیس احمد جعفری)

مسند امام شافعی رضی اللہ عنہ میں حضرت انس بن مالک سے منقول ہے کہ حضرت جبریلؑ ایک سفید آئینہ لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، جس میں ایک نقطہ تھا، آپ نے دریافت کیا، یہ کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا، یہ جمعہ کا دن ہے۔ آپ اور آپ کی امت کو اس سے شرفِ فضیلت عطا کیا گیا ہے، اور یہود و نصاریٰ اس میں آپ کے تابع ہیں، اور اس میں آپ کے لیے خیر ہے، اور اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ ایک مومن بندہ جب بھی اس میں کوئی اچھی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول کرتا ہے، اور وہ ہمارے یہاں یوم المزید ہے۔

"یوم المزید" سے کیا مراد ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا، یوم المزید کیا ہے؛ انھوں نے جواب دیا، آپ کے پروردگار نے فردوس میں ایک وادی بنائی ہے جس میں مشک کے تودے ہیں۔ جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ جتنے ملائکہ چاہتا ہے نازل فرماتا ہے اور اس کے اردگرد نور کے منبر ہوتے ہیں جن پر انبیاء علیہم السلام کے بیٹھنے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں اور یہ منبر سونے کے بنے ہوئے، یاقوت و زبرجد سے مرصع ہوئے منبروں سے گھرے ہوئے ہیں، ان پر شہداء اور صدیقین ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ ان کے پیچھے ان ٹیلوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، میں تمہارا پروردگار ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ کیے گئے وعدوں کو پورا کر دیا اس لیے مجھ سے (مزید) مانگو، میں دوں گا، تو وہ عرض کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار ہم تیری رضا چاہتے ہیں؛ تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے، میں تم سے راضی ہوگیا اور جو تمہاری خواہش ہو، وہی ملے گا، اور میرے پاس تمہارے لیے یہ مزید (انعام) ہے تو وہ یوم جمعہ سے محبت رکھتے ہیں کیونکہ اس دن ان کا پروردگار خیر عطا فرماتا ہے۔ اور یہ وہی دن ہے کہ جس دن میرا پروردگار عرش پر بیٹھا، اسی دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔

اس حدیث کی سند

اس حدیث کو امام شافعیؒ نے ابراہیم بن محمد سے روایت کیا ہے، انھوں نے موسیٰ بن عبیدہ سے انھوں نے ابوالازہر معاویہ بن اسحٰق بن طلحہ سے، انھوں نے عبداللہ بن عبید سے، انھوں نے عمیر بن انس سے، کہ ہمیں ابراہیم نے خبر دی، کہ مجھے ابوعمران ابراہیم بن جعد نے انھیں انس نے بتایا۔

اس سند پر جرح

امام شافعیؒ ان کے شیخ ابراہیم کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔

لیکن امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ معتزلی جہمی قدری ہے۔ اور اس میں ہر عیب پایا جاتا ہے،
اور مسند امام احمدؒ میں حضرت علی بن ابی طلحہ سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا
کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ جمعہ کا کیوں یہ نام رکھا گیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا کیونکہ
اسی دن تمہارے باپ آدم کا خمیر تیار کیا گیا اسی میں صعقہ (کڑک) اور بعثہ (دوبارہ جی اٹھنا) ہے
اور اسی میں بطشہ (پکڑ) ہے۔ اور اس کے آخر میں تین ساعتیں ہیں۔ ان میں ایک ساعت ایسی
ہے کہ اس میں دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

حضرت حسن بن سفیان نسوی نے اپنی مسند میں لکھا ہے کہ مجھے ابومروان ہشام بن خالد ازرق
نے انھیں حسن بن یحییٰ خشنی نے انھیں عمر بن عبداللہ مولیٰ عفرہ نے انھیں انسؓ بن مالک نے بتایا
کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا، کہ میرے پاس حضرت جبریل
علیہ السلام آئے، ان کے ہاتھ میں سفید آئینے کی طرح (کوئی چیز تھی) جس میں ایک سیاہ نقطہ تھا
میں نے پوچھا، کہ اے جبریل، یہ کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا، یہ جمعہ ہے، اور مجھے یہ دے کر آپ کی طرف بھیجا گیا ہے۔ یہ
آپکے لیے اور آپ کے بعد آپ کی امت کے لیے عید کا دن ہے۔

میں نے پوچھا، اے جبریل، اس میں ہمارے لیے کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا، اس میں آپ کے لیے کثرت سے خیر و برکت ہے۔ آپ آخری (امتی)
ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے ہیں۔ اس میں ایک ایسی ساعت ہوتی ہے کہ کوئی مسلمان حالتِ نماز
میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرماتا ہے۔

میں نے کہا اے جبریل، یہ سیاہ نقطہ کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ یہ وہ گھڑی ہے جو جمعہ کے دن ہوتی ہے اور یہ تمام ایام کا سردار ہے
اور ہم اپنے ہاں (فرشتوں کے ہاں) اسے یوم المزید (زیادہ انعامات کا دن) کہا کرتے ہیں۔

میں نے کہا اے جبریل، یہ یوم المزید کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا، یہ اس طرح ہے کہ آپؐ کے پروردگار نے جنت میں ایک وادی بنائی
جس میں سفید مشک کی خوشبو پھیلا دی، چنانچہ جب آخری دنوں میں جمعہ کا دن آتا ہے تو پروردگار کریم
اپنے عرش سے اتر کر کرسی پر آجاتا ہے اور نور کے منبر کرسی کو گھیرے میں لے لیتے ہیں ان پر انبیاءؑ
تشریف فرما ہوجاتے ہیں اور منبروں کو سونے کی کرسیاں گھیرے میں لے لیتی ہیں، ان پر صدیقین

اور شہداء بیٹھ جاتے ہیں اور بالا خانوں کے مکین وہاں سے اتر کر مشک کے ٹیلوں پر بیٹھ جاتے اور مجلس میں اولیاء منبر و کرسی کی افضلیت نہیں دیکھتے۔ اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے سامنے اپنے آپ کو منکشف فرماتا ہے اور کہتا ہے، مجھ سے سوال کرو۔

وہ سب کہتے ہیں، اے پروردگار ہم تیری رضا مانگتے ہیں، تو وہ اپنی رضا کی گواہی دیتا ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگ لو۔ پھر وہ مانگتے ہیں۔

یہاں تک کہ ان میں ہر بندے کی آخری تمنا بھی پوری ہو جاتی ہے، اور بتایا، پھر وہ ان پر ایسے انعامات کرتا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے اور نہ کان نے سنے اور نہ کسی آدمی کے دل میں گزرے

پھر جبار سبحانہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اپنے عرش کی طرف تشریف لے جاتا ہے اور بالا خانے کے مکین اپنے بالا خانوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سفید موتیوں یا سرخ یاقوت یا سبز زمرد کے بالا خانے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی دراڑ یا بوسیدگی نہیں ہوتی، روشن ہیں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں

فرمایا کہ فرحت ہوتے ہیں، جن میں پھل لٹک رہے ہوتے ہیں ان میں ان کی بیبیاں ان کے خادم اور مکانات ہوتے ہیں۔

اور بتایا، کہ اہل جنت جمعہ کے روز جنت میں ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے ہیں جیسے اہل دنیا بارش کے متعلق دنیا میں ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے ہیں

حضرتِ جبرئیل بارگاہ نبوت میں

ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب صفۃ الجنۃ میں لکھا ہے کہ مجھے ازہر بن مروان رقاشی نے انھیں عبداللہ بن عرادہ شیبانی نے انھیں قاسم بن طیب نے بتایا انھیں اعمش بن ابی وائل سے انھیں حضرت حذیفہؓ سے روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور ان کے ہاتھ میں ایک نہایت خوبصورت اور روشن شیشہ تھا اور اس کے درمیان ایک سیاہ چمکدار نشان تھا، میں نے پوچھا کہ یہ چمک دار داغ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ کیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا یہ جمعہ ہے۔

میں نے پوچھا جمعہ کیا ہوتا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ خدائے بزرگ و برتر کے ایام میں سے ایک دن ہے، اور ابھی میں آپ کے سامنے دنیا میں اس کے شرف و فضیلت کے متعلق عرض کرتا ہوں اور اس کے متعلق جو اہل جمعہ اس کی امید رکھتے ہیں، نیز آخرت میں اس کے نام کے بارہ میں بتاتا ہوں۔"

دنیا میں اس کا شرف و فضل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن اپنی مخلوق کا معاملہ کیا ہے، اور رہا یہ کہ جو اس دن اہلِ دنیا امید رکھتے ہیں، تو وہ یہ ہے کہ اس دن ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ اس وقت کوئی مسلمان مرد یا عورت اللہ تعالےٰ سے بھلائی کی درخواست کرے تو اسے ضرور عطا فرماتا ہے۔

اور آخرت میں اس کا فضل و شرف یہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اہلِ جنت کو جنت کی طرف اور اہلِ جہنم کو دوزخ کی طرف بھیجا، ان پر دن گذرنے لگے، اور یہ راتیں نہ وہ ان راتوں جیسی راتیں تھیں نہ ان دنوں جیسے دن پھر اللہ تعالےٰ نے انھیں اس کی مقدار اور اس کی ساعتیں بتائیں۔

اس طرح جب جمعہ کا دن ہوا، جب جمعہ پڑھنے والے نمازِ جمعہ کے لیے جاتے ہیں تو اہلِ جنت کو ایک مناد (آواز دینے والا) آواز دیتا ہے۔

اے اہلِ جنت وادی مزید کی طرف چلو۔

اور وادی مزید کے طول و عرض کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا، اس میں اتنے اونچے مشک کے ٹیلے ہیں جن کے سر آسمان میں ہیں۔

انھوں نے بتایا پھر غلمان انبیاء نور کے منبروں پر نکلتے ہیں اور غلمان مومنین یاقوت کی کرسیوں پر نکلتے ہیں، چنانچہ جب ان کے لیے یہ رکھ دی جاتی ہیں اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں تو اللہ تعالےٰ ان پر مثیرہ نام کی ہوا چلاتا ہے جو اس مشک کو سب پر پھیلا دیتی ہے، اور ان کے کپڑوں کی تہہ میں داخل کردیتی ہے اور ان کے چہروں اور بالوں میں سے نکال دیتی ہے، معلوم ہونا چاہیے اگر دنیا کی کوئی عورت وہ مشک لگالے تو ساری زمین خوشبو سے بھر جائے

انھوں نے بتایا کہ پھر اللہ تبارک و تعالےٰ حاملینِ عرش سے کہتا ہے، اسے اپنی پشت پر رکھ لو، تو پہلی آواز یہ سنی جاتی ہے کہ:

اے وہ لوگو! جنھوں نے غائبانہ میری اطاعت کی اور مجھے دیکھا نہیں، اور میرے رسولوں کی تصدیق کی اور میرے احکام کی اتباع کی، مجھ سے مانگ لو، یہی یوم مزید ہے، پھر وہ سب ایک کلمہ پر متفق ہوجاتے ہیں، کہ "ہم تجھ سے راضی ہوئے (اے پروردگار) تو ہم سے راضی ہوجا۔

پھر اللہ تعالےٰ ان کی طرف توجہ فرماتا ہے کہ "اے اہلِ جنت اگر میں تم سے راضی نہ ہوتا تو تمھیں اپنے گھر میں نہ ٹھہراتا، اس لیے مجھ سے مانگ لو، کیونکہ یہ یوم المزید ہے، پھر وہ سب ایک ہی جواب پر

مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم تیرے چہرہ انور کا (سوال کرتے ہیں) تاکہ ہم اس کی زیارت کرلیں، تو اللہ تعالیٰ ان حجابوں کو اتار دیتا ہے، اور ان کے سامنے منکشف ہو جاتا ہے۔ تو وہ ذرا سی جھلک دیکھتے ہی غش کھا جاتے ہیں۔ جب ان کو غش آتا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ نہ جلیں تو ضرور جل جاتے۔ پھر انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ اب اپنے منازل میں واپس چلے جاؤ پھر وہ لوگ اپنے منازل میں واپس آجاتے ہیں، اسی واقعہ کے باعث ان پر ضعف طاری ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنی بیویوں کے پاس واپس پہنچتے ہیں تو اس نور کی وجہ سے وہ اپنی بیویوں سے اور ان کی بیویاں ان سے اوجھل ہو جاتی ہیں، پھر جب دوبارہ ان کو بصارت دی جاتی ہے، تو اپنی اپنی شکلوں کو دیکھتے ہیں تو ان کی بیویاں کہتی ہیں کہ تم ہمارے یہاں سے اور شکل میں گئے تھے اور اب نئی شکل میں آئے ہو۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر تجلی فرمائی ہے اور ہم نے اس کا جلوہ دیکھا ہے۔"

اور بتایا "چنانچہ وہ ہر ہفتہ میں جنت کی نعمتوں اور مشک (خوشبو) سے مستفید ہوتے ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کہ:

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاءً بما کانوا یعملون ؛

یعنی پس کوئی نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیا کیا آنکھوں کی ٹھنڈک (نعمتیں) چھپا رکھی ہیں، اس وجہ سے کہ وہ عمل (صالح) کرتے تھے۔

قبل از ہجرت مدینہ کا پہلا جمعہ کس نے قائم کیا؟

ابن اسحاقؒ نے بتایا کہ مجھے محمد بن ابی امامہ بن سہل سے، انھیں اپنے والد سے انھیں عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے روایت پہنچی کہ انھوں نے کہا: جب میرے والد کی بینائی جاتی رہی تو (نماز جمعہ) کے لیے میں اپنے والد کی رہنمائی کرتا تھا، جب میں ان کے ہمراہ جمعہ کے لیے نکلتا، اور وہ جمعہ کی اذان سنتے، تو ابو امامہ اسعد بن زرارہ کے لیے بخشش کی دعا کرتے۔ چنانچہ جب میں یہ سنتا رہا تو میں نے (دل میں) کہا۔ یہ بڑی نکمی سی بات ہے کہ میں اس بارے میں کچھ دریافت نہ کروں۔ پھر میں حسب عادت ان کے ہمراہ (جمعہ کے لیے) نکلا، تو جب انھوں نے جمعہ کی اذان سنی تو حسب معمول اس کے لیے استغفار کیا۔ میں نے عرض کیا آپ جب کبھی جمعہ کی اذان سنتے ہیں تو اسعد بن زرارہ کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں، آخر اس کا سبب؟

انھوں نے فرمایا، اے میرے بیٹے، اسعد پہلا آدمی تھا جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

تشریف آوری سے قبل مدینہ کے (علاقہ) میں حرۃ بنی بیاضۃ کے ویرانے میں جمعہ پڑھایا، جو ایک بقیع (قبرستان) میں واقع تھا اور جسے بقیع خضمات کہتے تھے۔

میں نے پوچھا۔ آپ لوگ ان دنوں کتنے تھے؟

انھوں نے فرمایا، کل چالیس آدمی، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے بنی عمرو بن عوف کے ہاں قباء میں ٹھہرے، جیسا ابن اسحاق نے بتایا ہے کہ پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو ان کی مسجد کی بنیاد رکھی، پھر وہاں سے جمعہ کے روز چل پڑے، اور بنی سالم بن عوف کے علاقہ میں نماز جمعہ کا وقت آیا تو آپ نے وادی کے اندر واقع مسجد میں نماز ادا فرمائی، اور مدینہ میں پڑھا جانے والا یہ پہلا جمعہ تھا، اور یہ جمعہ آپ کی مسجد (نبوی) کی تاسیس سے قبل پڑھا گیا۔

ابن اسحٰق رح فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پہلا خطبہ دیا، جو مجھے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کے واسطہ سے پہنچا، اور ہم اللہ تعالےٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلط بات روایت کریں، جو آپ نے نہ فرمائی ہو۔ آپ نے خطبہ دیتے ہوئے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جس کا وہ اہل ہے پھر فرمایا:

اما بعد اے لوگو، اپنے لیے (نیکی) آگے بھیجو، یاد رکھو خدا کی قسم جب تم پر اچانک موت آئے گی، پھر وہ اپنی بکریوں کو بلائے گا تو ان کا کوئی چرواہا نہ ہوگا۔ پھر اس سے اس کا پروردگار فرمائے گا جس کا نہ کوئی ترجمان ہے اور نہ اس کے سامنے کوئی حاجب ہے، کیا تیرے پاس میرا رسول نہ آیا تھا؟ جس نے تجھے تبلیغ کی؟ اور کیا میں نے مال نہ دیا تھا اور تجھ پر اپنا فضل نہ کیا تھا؟ تو پھر تو نے اپنے لیے آگے کیا بھیجا؟ پھر وہ یقیناً.. دائیں بائیں دیکھے گا، تو اسے کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھر وہ اپنے سامنے دیکھے گا، تو دوزخ کے سوا اسے کچھ نظر نہ آئے گا، تو جو بھی آگ سے اپنا چہرہ بچا سکے اگرچہ ایک کھجور دے کر بچا سکے تو اسے چاہیے ایسا کرے، جسے یہ بھی میسر نہ ہو تو اچھی بات ہی سہی کیونکہ وہ نیکی کی قائم مقام ہوگی۔ (جس کا اجر) دس سے سات سو گنا تک ہوگا، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابن اسحاق رح فرماتے ہیں پھر حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خطبہ دیا، تو فرمایا:

ان الحمد للہ احمدہ واستعینہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھد اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ان احسن الحدیث کتاب اللہ قد افلح من زینہ اللہ فی قلبہ

وادخلہ فی الاسلام بعد الکفر فاختارہٗ علیٰ ما سواہ من احادیث الناس انہٗ احسن الحدیث وابلغہٗ احبوا ما احب اللہ احبوا اللہ من کل قلوبکم ولا تملوا کلام اللہ وذکرہٗ ولا تقس عنہ قلوبکم فانہٗ قد سماہ خیرتہٗ من الاعمال والصالح من الحدیث ومن کل ما اوتی الناس الحلال والحرام فاعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہٖ شیئاً واتقوہٗ حق تقاتہٖ واصدقوا اللہ صالح ما تقولون بافواھکم وتحابوا بروح اللہ بینکم ان اللہ یغضب ان ینکث عھدہٗ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یعنی "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اس کی تعریف کرتا ہوں، اور اس سے مدد چاہتا ہوں اور ہم اپنی جانوں کے شر سے اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بے شک سب سے بہتر بات اللہ کی کتاب ہے، اللہ نے جس کے دل کو اس سے زینت بخشی اور کفر کے بعد اسے اسلام میں داخل کیا تو وہ یقیناً کامیاب رہا، اور دوسروں کی باتوں کے مقابلہ میں اسے منتخب کر لیا کیونکہ یہ بہترین کلام ہے اور سب سے زیادہ بلیغ ہے جس سے اللہ محبت رکھے تم بھی اس سے محبت کرو، اپنے دل کی ساری محبت اللہ کے لیے (وقف) کردو، اور اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ اور تمہارے قلوب اس کے متعلق کھوٹے نہ ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہترین عمل اور صالح ترین کلام کا نام عطا کیا ہے۔ (اور اس میں) تمام حلال و حرام جو انسانوں کو بتائے گئے (موجود ہیں) پس اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ کرو، اور اسی سے ڈرو جتنا ڈرنے کا حق ہے اور جو بولی تم اپنے منہ سے نکالتے ہو، ان کے بہتر الفاظ سے اللہ کی تصدیق کرو، اور اللہ کی رحمت سے آپس میں محبت کرو بے شک اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے کہ اس کا وعدہ توڑا جائے والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"

یوم جمعہ

اور اس کی تشریف، تخصیص، اور تعظیم

ایامِ عید پر جمعہ کی فضیلت

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دن کے شرف، اس کی عظمت، اور اس کی خصوصیت کو، ایامِ عید پر امتیاز دیتے تھے۔

اس باب میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا جمعہ کا دن افضل ہے یا یوم عرفہ؟

اس سلسلہ میں دو قول، اور امام شافعی کے خیال میں دو سبب یہ ہیں:

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (جمعہ کے دن) فجر کی نماز میں الم تنزیل السجدۃ اور ھل اتیٰ علی الانسان پڑھا کرتے تھے اور اکثر لوگ جو علوم سے آشنا نہیں ہوتے یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نماز ایک زاید سجدہ کی وجہ سے مخصوص ہے چنانچہ اسے سجدۂ جمعہ کا نام دیا کرتے۔ اور اگر کوئی اس نماز میں یہ سورتیں نہ پڑھے تو مستحب یہ ہے کہ وہ سورت پڑھے کہ جس میں سجدہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ کرامؒ نے جمعہ کے دن نمازِ فجر میں ان سورتوں کی مداومت کو مکروہ قرار دیا ہے تاکہ جہلاء کا مذکورہ وہم ختم ہو جائے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو فرماتے ہوئے سنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی صبح کو یہ سورتیں اس لیے تلاوت فرمایا کرتے کہ یہ سورتیں ایسے معاملات پر مشتمل ہیں، جو اس دن ہوئے یا ہوں گے کیونکہ ان میں خلقِ آدم، ذکر معاد اور حشر و نشر کا ذکر ہے۔ اور یہ سب امور یوم جمعہ کو ہوں گے، نیز اس دن (صبح کو) ان کی تلاوت امت کے لیے گویا پیش آنے والے واقعات اور حالات کی یاد دہانی ہے، ورنہ درحقیقت سجدہ'' مقصود نہ تھا بلکہ یہ تو تبعاً آگیا (کیونکہ) نمازی کی تلاوت میں یہ تو بغیر قصد کے اتفاقاً آگیا، تو یہ جمعہ کے خواص میں سے ایک خاصہ ہے۔

۲۔ دوسرا خاصہ یہ ہے کہ اسی دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت مستحب ہے، کیونکہ آپؐ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کو مجھ پر کثرت سے درود بھیجو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہانوں کے سردار ہیں اور یوم جمعہ بھی تمام دنوں کا سردار ہے، اس لیے درود شریف کا اس دن سے ایک خصوصی تعلق بھی ہے جو باقی ایام سے نہیں ہو سکتا (مزید برآں) اس میں ایک حکمت ہے، وہ یہ کہ اس امت نے دنیا و آخرت

ہیں جس قدر بھی بھلائی حاصل کی سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی تمام خیر و برکات اس امت کو عطا فرمائیں۔ یہ بہت بڑا شرف ہے، جو اسے حاصل ہے، اور یہ (شرف) جمعہ کے دن عطا ہوتا ہے، کیونکہ اسی دن جنت میں اسی امت کو اس کے محلات و منازل کی طرف بھیجا جائے گا اور جب یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، تو یہ دن ان کے لیے یوم المزید ہوگا۔ یہ دنیا میں بھی ان کے لیے عید کا دن تھا، اور اسی دن اللہ تعالیٰ ان کی ضروریات و خواہشات پوری فرمائے گا۔ اور کسی سائل کو رد نہ کرے گا، اور یہ تمام (انعامات) اس امت کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے) انہیں کے صدقہ میں حاصل ہوئے، تو ان کا شکر و حمد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی قلیل سی ادائیگی یہ ہے کہ اس شب و روز میں آپ پر کثرت سے درود شریف پڑھا جائے۔

فرائض اسلام میں اہم ترین فریضہ

۳۔ نمازِ جمعہ فرائض اسلام میں سے سب سے زیادہ اہم اور اجتماعاتِ اسلامیہ میں ایک پر عظمت اجتماع ہوتا ہے، اور عرفہ کے اجتماع کے بعد اس کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے جو محض سستی سے اسے چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے، اور جمعہ کے دن لوگ جس قدر امام کے قریب اور نماز میں جلد حاضر ہونے والے ہیں، وہ قیامت کے دن اتنے ہی اہل جنت کے قریب اور یوم المزید کے موقع زیارتِ (خدائے تعالیٰ) پر اولیت حاصل کر سکیں گے۔

وجوب غسل کا حکم

۴۔ اس دن وجوب غسل کا حکم ہے۔ یہ امر ازحد موکد ہے، نیز وجوب وتر، نماز میں بسم اللہ پڑھنے، عورت کے لمس پر وجوبِ وضو، نماز میں قہقہہ، نکسیر سینگیاں لگوانا، اور قے کرنے پر وجوبِ وضو سے زیادہ قوی ہے (نیز) آخری تشہد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وجوبِ صلوٰۃ اور مقتدی پر وجوبِ قراۃ سے زیادہ (موکد) ہے۔

اور لوگوں کے متعلق اس کے وجوب میں دو قول ہیں، ایک نفی دوسرا اثبات، تفصیل اس کی یہ ہے، کہ جس کے بدن پر بدبو ہو، اور اس کو زائل کرنے کی ضرورت ہو تو اس پر واجب ہے اور جو اس سے مستغنی ہو، اس پر مستحب ہے۔

خوشبو لگانا

۵۔ اس دن خوشبو لگانا چاہیے، اور یہ خوشبو بھی ہفتہ کے باقی ایام سے کہیں زیادہ عمدہ ہونی چاہیے۔

مسواک کرنا

۶۔ اس دن مسواک کرنا اور باقی ایام کی نسبت اس میں مسواک کی ایک خاص عظمت ہے لہٰذا مسواک ضرور کرنی چاہیے۔

۷۔ نماز کے لیے تکبیر (تحریمہ)

۸۔ امام کے تشریف لانے تک نماز، تلاوتِ قرآن اور ذکر میں مشغول رہے۔

خطبہ کے موقع پر سکوت

۹۔ خطبہ کے موقع پر خاموش رہنا، جب خطبہ ہونے لگے تو خاموش رہنا اصح قول کے مطابق واجب ہے، اگر اس نے اس کی پروانہ کی تو لغویت کا مرتکب ہوگا، اور جس نے لغویت کا مظاہرہ کیا، تو اس کا جمعہ رائگاں گیا اور مسند میں مرفوعاً آتا ہے، کہ جو اپنے ساتھی سے کہے کہ چپ ہو جا۔ تو اس کا (بھی) جمعہ ضائع گیا۔

۱۰۔ اس دن سورہ کہف کی تلاوت کرنا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو آدمی جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرے گا، تو اس کے پاؤں سے لے کر آسمان تک ایک نور بچھا دیا جائے گا۔ قیامت کے دن اس سے روشنی ہوگی، اور دو جمعوں کے درمیان کے گناہ بخشے جائیں گے۔ اسے سعید بن منصور نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے قول سے ذکر کیا۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مسلک

۱۱۔ گیارھواں یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے حامیوں کے نزدیک اس دن زوال کے وقت بھی نماز مکروہ نہیں۔ ہمارے شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس مسلک کو اختیار کیا ہے حالانکہ ان کا اس سلسلہ میں لیث کی روایت پر انحصار نہیں، کہ جو انھیں مجاہد سے اور انھیں ابوخلیل سے انھیں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے اور انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا، کہ جمعہ کے سوا نصف النہار (دوپہر) کے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور فرمایا کہ جمعہ کے علاوہ (اس وقت) جہنم دہکایا جاتا ہے، بلکہ ان کے مسلک کا انحصار اس روایت پر ہے کہ جو جمعہ کی نماز میں حاضر ہو، مستحب یہ ہے کہ وہ امام کے باہر آنے تک نماز پڑھ لے، اور صحیح حدیث میں منقول ہے جو آدمی بھی بروزِ جمعہ غسل کرے اور امکان بھر پاکیزگی حاصل کرے اور کوئی تیل لگائے یا اپنے گھر سے خوشبو لگا لے، پھر وہ (جمعہ پڑھنے کے لیے) نکلے، اور دو آدمیوں میں تفریق نہ کرے، پھر وہ نماز پڑھے جتنی کہ اس کے مقدر میں لکھی ہے، اور جب امام خطبہ دے تو وہ خاموش رہے (اس پر) اس کے تمام گناہ جو اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے ہوں گے سب بخش دیئے جائیں گے (بخاری)، اس لیے جو بھی اس کے مقدر میں ہو مستحب یہ ہے کہ وہ نماز پڑھے اور امام کے نمودار ہونے تک کے علاوہ کوئی چیز نماز کے لیے امر مانع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی حضراتِ سلف نے فرمایا۔ جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب بھی ہیں اور امام احمد بن حنبل نے بھی ان کا ہی اتباع کیا ہے کہ خروجِ امام نماز کا مانع ہے، اور خطبۂ امام مانعِ کلام ہے۔ تو انھوں نے خروجِ امام کو مانعِ نماز قرار دیا، نہ کہ دوپہر ہونا (مانعِ نماز ہے)، نیز "لوگ اس وقت چھتوں کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں اور زوال کے وقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے، اور جو آدمی نماز میں

مشغول ہو گا، اسے زوالِ شمس کا علم نہ ہو سکے گا، اور اس کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ لوگوں کی گردنیں پھاندتا ہوا باہر آئے، اور سورج کو دیکھ کر پھر لوٹ جائے۔ اور یہ حرکت بھی اس کے لیے مشروع نہیں۔ نیز بعض دیگر شواہد بھی ملتے ہیں، جنھیں امام شافعیؒ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

مثلاً انھوں نے فرمایا۔ اسحٰق بن عبداللہ سے مروی ہے، انھیں سعید بن ابی سعید سے انھیں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت پہنچی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے علاوہ دوپہر (زوالِ شمس) کے وقت نماز سے منع فرمایا، جب تک کہ سورج نہ ڈھل جائے۔ اسی طرح انھوں نے کتاب اختلاف الحدیث میں روایت کیا ہے اور کتاب الجمعہ میں لکھا ہے کہ ہمیں ابراہیم بن محمد سے انھیں اسحٰق سے اور انھیں ابوخالد احمد سے اہل مدینہ کے ایک شخص سے روایت ملی جسے عبداللہ بن سعید مقبری کہتے ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

جمعہ کی ایک اور خصوصیت

اور امام بیہقی نے "المعرفۃ" میں عطا بن عجلان سے انھوں نے ابونضرہ سے انھوں نے ابوسعید سے اور انھوں نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا، ان دونوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے علاوہ نصف النہار (دوپہر) کو نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے لیکن اس کی اسناد قابلِ استدلال نہیں ہیں۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں" لیکن جب ان روایات کو ابوقتادہؓ کی روایت کے ساتھ جمع کیا جائے، تو ایک گونہ قوت ہو جاتی ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں، لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جمعہ میں جلدی کرتے ہیں اور خروجِ امام تک نماز پڑھتے ہیں۔

امام بیہقیؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ نے جس طرف اشارہ کیا ہے وہ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی طرف جلدی جانے اور بغیر کسی انتشار کے خروجِ امام تک نماز پڑھنے کی ترغیب دی ہے، اور یہ روایت ان روایات کے مطابق ہے جن میں جمعہ کے علاوہ دوپہر کے وقت نماز کی اجازت ملتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے حضرت عطاءؒ، حسنؒ اور مکحول کے خیال میں رخصت کا ذکر کر دیا ہے۔" میں کہتا ہوں کہ دوپہر کو نماز پڑھنے کی کراہت کے معاملہ میں لوگوں میں اختلاف ہے، اور اس میں تین اقوال ملتے ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ یہ وقت کسی طرح بھی کراہت کا وقت نہیں، امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ جمعہ و غیر جمعہ ہر روز یہ کراہت کا وقت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ایک مشہور روایت کے مطابق امام احمدؒ بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ جمعہ کے علاوہ یہ کراہت کا وقت ہے، اب (جمعہ کے روز) یہ وقتِ کراہت نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ کا یہ مذہب ہے۔

۱۲۔ بارھواں یہ کہ نماز جمعہ میں سورہ جمعہ، منافقین یا سبّح باسم اور غاشیہ پڑھی جائیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں یہی سورتیں پڑھا کرتے تھے (مسلم)، نیز یہ بھی مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ میں ھل اتاك حديث الغاشيه بھی پڑھتے تھے۔ یہ سب آپ سے ثابت ہے، اور یہ مستحب نہیں کہ ہر سورہ میں سے کچھ حصہ یا ایک سورہ دو رکعتوں میں پڑھی جائے کیونکہ یہ خلافِ سنت ہے اور صرف جاہل امام اس پر مداومت کرتے ہیں۔

جمعہ عید مکرر ہے

۱۳۔ تیرھواں یہ کہ ہر ہفتہ بار بار آنے والی عید ہے اور ابو عبداللہ بن ماجہؒ نے اپنی سنن میں حضرت ابو لبابہ بن عبدالمنذر کی روایت سے نقل کیا ہے، انھوں نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جمعہ کا دن تمام ایام کا سردار ہے اور اللہ کے ہاں سب سے بڑی عظمت والا ہے اور یومِ اضحیٰ اور یوم فطر سے بھی زیادہ ذی شان ہے۔ اس میں پانچ خاص باتیں ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اسی دن آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔

۲۔ اسی دن آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا۔

۳۔ اسی دن آدم علیہ السلام کو وفات دی گئی۔

۴۔ اور اسی دن ایک ایسی ساعت ہے کہ اس میں کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اسے وہی چیز عطا فرمائے گا، بشرطیکہ وہ حرام چیز کا سائل نہ ہو۔ اور

۵۔ اسی دن قیامت قائم ہوگی، کوئی مقرب فرشتہ، آسمان، زمین، ہوائیں، پہاڑ اور درخت ایسے نہیں جو کہ اس روز جمعہ سے خوفزدہ نہ ہوں۔

جمعہ کو اچھا لباس پہننا چاہیئے

۱۴۔ مستحب یہ ہے کہ اس دن سب سے بہتر لباس جو میسر ہو پہنے، کیونکہ امام احمدؒ اپنی مسند میں حضرت ابو ایوبؓ سے نقل کرتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو، اسے لگایا، اور بہترین لباس پہنا پھر وہ نکلا، اور مسجد میں پہنچنے تک اس پر متانت طاری رہی، پھر اگر (وقت ہوا) تو اس نے رکوع کیا (نماز پڑھی) اور کسی کو ایذا نہ دی، اور جب امام نکلا تو خاموش ہو گیا یہاں تک کہ اس نے نماز ادا کی تو یہ ان دونوں (جمعوں) کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔

اور سنن ابو داؤدؒ میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر جمعہ کے دن فرماتے سنا " تمھارا کیا بگڑتا ہے اگر تم عام لباس کے علاوہ جمعہ کے دن کے لیے ایک لباس خرید لو؟"

اور سنن ابن ماجہؒ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن لوگوں کے بدن پر سوف کے موٹے کپڑے دیکھے، تو فرمایا:

اگر تم کچھ وسعت رکھتے ہو تو کیا ہرج ہے کہ عام کام کاج کے کپڑوں کے علاوہ جمعہ کے لیے ایک اور لباس تیار کر لو۔

جمعہ کے دن سفر

۱۵- جمعہ کا وقت داخل ہو جانے کے بعد اس دن میں سفر کرنا جائز نہیں جب پر جمعہ واجب ہو۔

رہا وقت سے قبل، تو اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں، جو احمدؒ سے منقول اور منصوص ہیں' ایک تو عدم جواز کا ہے، دوسرا جواز کا اور تیسرا خصوصیت جہاد کے لیے جواز کا۔

امام شافعیؒ کے نزدیک جمعہ کے دن زوال کے بعد سفر کا آغاز کرنا حرام ہے۔ سفرِ اطاعت میں دو قول ہیں۔

ایک تحریم کا ہے، امام نوویؒ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

دوسرا جواز کا ہے، امام شافعیؒ نے اس کی (حمایت) کی ہے۔

رہا زوال سے قبل سفر کرنا! تو امام شافعیؒ کے اس کے متعلق دو قول ہیں۔ قدیم قول، جائز ہونے کا ہے' اور جدید قول، زوال کے بعد کے مطابق ہے (یعنی حرام ہے)

صاحب التفریع فرماتے ہیں۔ امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے بعد جمعہ کی نماز ادا کرنے تک سفر نہ کرے۔ اور اگر زوال سے قبل سفر شروع کر لے، تو کوئی مضائقہ نہیں، اور بہتر یہ ہے کہ طلوعِ فجر (جمعہ) کو اگر مقیم ہو تو ادائیگی نماز جمعہ تک سفر نہ کرے۔

امام ابو حنیفہؒ مطلقاً سفر کو جائز قرار دیتے ہیں۔

دار قطنیؒ نے " افراد " میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" جو جمعہ کے روز جائے اقامت سے سفر شروع کرے۔ فرشتے اس کے لیے بد دعا کرتے ہیں، کہ (خدا کرے) سفر میں تیرا کوئی دوست نہ ہو۔ یہ ابن لہیعہ کی روایت ہے۔

مسند امام احمدؒ میں حکمؒ کی روایت سے ثابت ہے جو انھیں مقسم سے انھیں ابن عباسؓ سے پہنچی کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن رواحہ کو ایک سریہ (چھوٹی سی فوج) میں بھیجا تو انھیں جمعہ کا معاملہ آن پڑا، تو ساتھی صبح کو چلے گئے اور وہ کہنے لگے کہ میں پیچھے رہتا ہوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ کر ان سے جا ملوں گا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا، تو دریافت فرمایا، تم کیوں رک گئے۔ پھر کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ (جہاد کے سفر) پر صبح نہ کی؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے چاہا کہ آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کروں، پھر ان سے جا ملوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو وہ تمام کچھ خرچ کر دے (اللہ کے راستہ میں) تو بھی ان کے اس سفرِ جہاد کے برابر ثواب حاصل نہ کر سکے گا۔

یہ روایت علیل ہے، اس لیے کہ حکم کا مقسم سے سماع ثابت نہیں، لیکن یہ وہ صورت ہے، جب مسافر کو اپنے رفقاء کے نہ مل سکنے کا خطرہ نہ ہو لیکن جب اسے اس بات کا خطرہ ہو کہ رفقائے (سفر) کو پا نہ سکے گا تو اس کے لیے سفر کرنا قطعاً جائز ہے کیونکہ یہ ایک ایسا عذر ہے کہ جو جمعہ اور جماعت کو ساقط کر دیتا ہے۔

اور شاید اسی پر یہ روایت بھی محمول ہے کہ اوزاعیؒ سے منقول ہے کہ ان سے اس مسافر کے متعلق پوچھا گیا جس نے نماز جمعہ کی اذان سنی، اور وہ سواری پر کجاوہ ڈال چکا تھا کہ اسے سفر پر ضرور جانا چاہیے اسی طرح حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ جمعہ اسے سفر سے نہیں روکتا اور ان کا مطلب مطلقاً جوازِ سفر کا ہو، تو مختلف فیہ معاملہ ہے۔

اس سلسلہ میں فیصلہ کن دلیل وہ ہے جو عبدالرزاقؒ نے نقل کی ہے، انھوں نے اپنی مصنف میں لکھا ہے، انھیں معمر سے انھیں خالد حذاء سے انھیں ابن سیرینؒ یا کسی دوسرے سے روایت پہنچی کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے جمعہ کی نماز ختم ہونے کے بعد ایک آدمی پر لباسِ سفر دیکھا تو دریافت فرمایا، کہ تمہارا کیا معاملہ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میں نے سفر کا ارادہ کیا تھا، پھر میں نے ناپسند سمجھا کہ نماز پڑھنے سے قبل ہی چلا جاؤں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا جب تک جمعہ کا وقت نہ آ جائے۔ جمعہ سفر سے نہیں روکتا، تو یہ قول زوال کے بعد منع کا ہے اور زوال سے قبل کوئی ممانعت نہیں۔

نیز ثوریؒ سے انھیں ابن ذویب سے انھیں صالح بن دینار سے انھیں امام زہریؒ سے معلوم ہوا انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نماز سے قبل چاشت کے وقت سفر کے لیے

تشریف لے گئے اور ابن مبارکؒ نے حسان بن ابی عطیہ سے نقل کیا ہے، فرمایا: جب انسان جمعہ کے دن سفر کرتا ہے تو یہ دن اس پر بددعا کرتا ہے کہ خدا کرے اس کی ضرورت میں اسے مدد نہ ملے، اور نہ اسے سفر میں کوئی دوست ملے۔

امام اوزاعیؒ نے حضرت ابن حبیب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، انھوں نے فرمایا، جمعہ کے دن نماز کے بعد سفر ہونا چاہیے۔ ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عطا سے دریافت کیا، کہ کیا آپ کو خبر ملی کہ کہا جاتا ہے، جب جمعہ کی رات کو کسی جمعہ پڑھے جانے والے قصبہ میں ٹھہرنے کا موقع ملے تو جمعہ کی نماز پڑھنے سے قبل وہاں سے نہ جائے، انھوں نے فرمایا، کہ یہ مکروہ ہے، تو میں نے عرض کیا "تو جمعرات کے دن (چلا جائے)"؟ فرمایا، نہیں، یہ تو ایسا دن ہے جس میں کوئی مضرت نہیں۔

اجر فراواں کی بشارت

۱۶۔ یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کو جانے والے کے لیے ہر قدم پر ایک سال کے روزوں اور قیام (اللیل) کا اجر ہے۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ انھیں معمر سے انھیں یحییٰ بن ابی کثیر سے انھیں ابوقلابہ سے انھیں ابواشعث صنعانی سے انھیں اوس بن اوس سے روایت پہنچی۔ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے جمعہ کے دن (کپڑوں وغیرہ) کو دھویا اور غسل کیا، اور جلدی اٹھا اور اس طرف جلدی چلا، اور امام کے قریب بیٹھا، اور خاموش رہا، تو وہ جس قدر قدم اٹھائے گا، ہر قدم پر اس کے لئے ایک سال کے روزوں اور قیام (اللیل) کا اجر ہے۔ اور یہ (ثواب عظیم کی عطا) اللہ پر آسان ہے۔ اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

جمعہ کفارۂ سیئات کا دن ہے

۱۷۔ سترھویں کہ یہ دن گناہوں کے کفارے کا دن ہے مسند امام احمدؒ میں حضرت عطا خراسانی سے منقول ہے، انھیں نبیشہ ہذلی سے معلوم ہوا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے تھے کہ جب مسلمان نے جمعہ کے دن غسل کیا، پھر مسجد میں حاضر ہوا، اس طرح کہ وہ کسی کو ایذا نہیں دیتا، اگر ابھی تک امام نہیں آیا ہے اور اس نے حسب استطاعت نماز ادا کی اور اگر دیکھا کہ امام آچکا ہے تو بیٹھ گیا اور (امام کا خطبہ) سنا اور خاموش رہا یہاں تک کہ امام نے نماز جمعہ پڑھا دی، اس کی بخشش ہو جائے گی اگر اس کے تمام گناہ اس جمعہ میں نہ بخشے جائیں گے تو اتنا ضرور ہوگا کہ دوسرے جمعہ تک کے گناہ بخشے جائیں گے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت سلمانؓ سے منقول ہے انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

۱؎ علمائے اصول حدیث کا یہ تقریباً متفقہ اصول ہے کہ جن حدیثوں میں عمل قلیل پر اجر کثیر کی بشارت اور معصیت قلیل پر عذاب عظیم کی خبر ہو، وہ ضعیف ہیں، چنانچہ بخاری و مسلم میں اس طرح کی حدیثیں شاذ و نادر ہی ملیں گی (رئیس احمد جعفری)

فرمایا، جمعہ کے دن جس نے غسل کیا، اور حسبِ استطاعت طہارت حاصل کی، اور کوئی سا تیل لگایا یا کوئی عطر لگایا، پھر وہ (نمازِ جمعہ کے لیے) نکلے اور دو آدمیوں میں تفریق نہ کرے، پھر حسبِ مقدر نماز پڑھے، اور جب امام خطبہ پڑھے، تو خاموش رہے، تو اس جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

اور مسند امام احمدؒ میں حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے بتایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، پھر لباس پہنا اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو تو وہ بھی لگائی، پھر متانت کے ساتھ نمازِ جمعہ کے لیے چل پڑا، نہ کسی کو پھاند کر گزرے، نہ اسے تکلیف دے اور جو اس کے مقدر میں ہو نماز پڑھے، پھر امام کے فارغ ہونے تک انتظار کرے تو اس کے دو جمعوں کے درمیان کے گناہ بخشے جائیں گے۔

۱۸۔ اٹھارواں یہ کہ جمعہ کے علاوہ ہر روز جہنم دہکایا جاتا ہے (اور ابن ابی قتادہؓ کی روایت اسی کے متعلق گذر چکی ہے) کیونکہ اللہ کے ہاں یہ سب سے افضل دن ہے اور اس دن میں طاعات وعبادات دعائیں اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سامنے عاجزی وزاری کی جاتی ہے، اور یہ چیزیں جہنم کے دہکنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دن اہلِ ایمان کے گناہ بھی دوسرے ایام کی نسبت بہت کم واقع ہوتے ہیں، یہاں تک کہ فساق وفجار بھی ہفتے کے باقی دنوں سے اس دن گناہوں سے زیادہ تر رکے رہتے ہیں۔ اس روایت کا مطلب دنیا میں دوزخ کا دہکنا ہے۔ اور جمعہ کے علاوہ ہر روز اس کو گرم کیا جاتا ہے۔ رہا، یوم قیامت، تو اس کا عذاب کم نہ ہوگا اور نہ اہلِ دوزخ سے کسی دن بھی اس کی تخفیف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ جہنم کے فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اپنے پروردگار سے درخواست کرنا کہ کسی دن ہماری سزا میں کمی کریں تو وہ ان کی (چیخ پکار) کا جواب نہیں دیتے۔

قبولیت دعا کی ساعت

۱۹۔ انیسواں، اس میں قبولیت دعا کی ایک ساعت ہے، اور یہ وہی گھڑی ہے کہ جس میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، تو وہ اسے ضرور قبول کرتا ہے۔

چنانچہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے روز ایک ایسی گھڑی آتی ہے کہ کوئی مسلمان بھی جو نماز پڑھ رہا ہو، اسی وقت اللہ تعالیٰ سے جو مانگے گا، اللہ تعالیٰ اُسے وہی چیز عنایت فرمائے گا، اور ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا کہ یہ تھوڑا سا وقت ہے۔

اور مسند میں حضرت ابولبابہ منذری کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت منقول ہے کہ آپ نے فرمایا، جمعہ کا دن اللہ کے نزدیک تمام ایام کا سردار اور سب سے زیادہ عظمت والا ہوتا ہے، اور اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ یوم فطر اور یوم اضحیٰ سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور اس میں پانچ خاص باتیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔

دوسرے اسی دن ہبوط آدم ہوا، یعنی وہ زمین پر اتارے گئے۔

تیسرے اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو وفات دی۔

چوتھے اسی دن کے اندر ایک ایسی گھڑی آتی ہے کہ جب کوئی بندہ اس وقت اللہ سے کچھ مانگتا ہے تو وہ اسے عطا فرماتا ہے بشرطیکہ وہ حرام نہ ہو۔

پانچویں، اسی دن قیامت آئے گی کوئی مقرب فرشتہ زمین، ہوا، سمندر، پہاڑ، درخت ایسا نہیں جو اس دن کے پیش آنے والے حوادث سے خائف و ترساں نہ ہو۔

جمعہ کی ساعت قبولیت

قائم ہے یا اٹھالی گئی ؟

اقوال متعددہ و مختلفہ اس ساعت کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ آیا وہ باقی ہے ؟ یا اٹھالی گئی ؟

اس سلسلے میں دو قول ہیں، جنھیں ابن عبدالبر وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

جو اس کے باقی ہونے کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ اٹھائی نہیں گئی۔ ان کا اختلاف اس میں ہے کہ جمعہ کے دن یہ ایک معین وقت پر آتی ہے یا غیر معین وقت پر ؟

اس سلسلے میں بھی دو قول ہیں۔

جو غیر معین ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے بھی دو قول ہیں۔

مزید برآں جو غیر معین ہونے کے قائل ہیں، ان کے مابین اس باب میں اختلاف ہے کہ کیا یہ دن کی مختلف ساعتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے، یا نہیں ؟ اور اس میں بھی دو قول ہیں۔

اور جو اس کے معین ہونے کے قائل ہیں، ان کا اختلاف بڑھ کر گیارہ اقوال تک پہنچ چکا ہے۔

۱۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ملی کہ انھوں نے فرمایا کہ یہ ساعت طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک اور نماز عصر سے لے کر نماز مغرب تک رہتی ہے۔

دوسرے قول کے مطابق یہ زوال کے قریب ہوتی ہے جیسے ابن منذر نے حضرت حسن بصریؒ اور ابوعالیہؒ سے نقل کیا ہے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جب موذن جمعہ کی اذان دے، ابن منذر کہتے ہیں کہ یہ قول ہمیں حضرت عائشہؓ سے پہنچا ہے۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ جب امام خطبہ دینے کے لیے منبر پر بیٹھتا ہے اس کے فارغ ہونے تک کے درمیان

عرصہ میں یہ ساعت آتی ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں، ہمیں یہ روایت حضرت حسن بصریؒ سے پہنچی ہے۔

۵۔ پانچواں ابو بردہؓ کا قول ہے کہ یہ وہ ساعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے منتخب کر لیا۔

۶۔ چھٹا ابو سوار عدوی کا قول ہے، انھوں نے بتایا کہ سلف کا خیال ہے زوالِ شمس سے لے کر نماز کے وقت تک دعا قبول ہوتی ہے۔

۷۔ ساتواں قول حضرت ابو ذرؓ کا ہے کہ یہ ساعت ایک بالشت طلوعِ شمس سے لے کر بقدر ایک گز طلوع تک ہوتی ہے۔

۸۔ آٹھواں قول یہ ہے کہ یہ عصر اور مغرب کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کے قائل حضرت ابو ہریرہؓ، عطاءؒ، عبداللہ بن سلام اور طاؤسؒ ہیں۔ یہ تمام اقوال ابن منذرؒ نے نقل کیے ہیں۔

۹۔ نواں قول یہ ہے کہ یہ ساعت عصر کے بعد آخری وقت میں ہوتی ہے۔ امام احمدؒ جمہور صحابہؓ اور تابعین کا یہی مذہب ہے۔

۱۰۔ دسواں قول ہے یہ ساعت خروجِ امام سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک کے درمیانی عرصہ میں ہوتی ہے۔ اسے امام نوویؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

۱۱۔ گیارھواں، صاحب "مغنی" نے لکھا ہے کہ یہ دن کی تیسری ساعت میں آتی ہے۔ اور حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اگر انسان جمعہ کا دن (تین) برابر حصوں میں تقسیم کرلے تو یہ ساعت مل سکتی ہے

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، صرف ایک دن کو طلب حاجت کے لیے خاص کرلینا بہت آسان ہے۔

دو قابل ترجیح قول

ان تمام اقوال میں زیادہ قابل ترجیح دو قول ہیں جو صحیح احادیث پر مشتمل ہیں، اور ان دونوں میں سے ایک زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

پہلا تو یہ کہ یہ ساعت امام کے (منبر) پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک کے درمیان میں ہوتی ہے۔ اس قول کی دلیل صحیح مسلم کی وہ روایت ہے جو ابو بردہؓ بن ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے کبھی اپنے والد بزرگوار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جمعہ کے متعلق بھی سنی ہے؟ انھوں نے فرمایا، ہاں، میں نے سنا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا "کہ یہ (ساعت) امام کے (منبر) پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک کے درمیان میں ہوتی ہے، اور ابن ماجہؒ و ترمذیؒ نے بھی حضرت عمرو بن عوف مزنی سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا، بے شک جمعہ کے دن ایک ساعت ایسی ہوتی ہے کہ اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے اس وقت کچھ بھی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرماتا ہے۔ عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسول، وہ

کونسی ساعت ہے؟ آپ نے فرمایا، جب نماز قائم ہو اس وقت سے لے کر نماز سے فارغ ہو جانے تک۔

دوسرا قول ہے کہ یہ ساعت نمازِ عصر کے بعد ہوتی ہے۔ یہ دونوں متاخر اقوال میں سے زیادہ ترجیحی قول ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن سلام۔ ابوہریرہؓ، امام احمد اور ایک جماعت کا قول ہے اس قول کی حجت وہ روایت ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ اس وقت ایک مسلمان بندہ جو بھی اللہ سے مانگتا ہے اللہ تعالیٰ وہی چیز عطا فرماتا ہے، اور یہ ساعت عصر کے بعد ہوتی ہے، اور ابوداؤدؓ۔ نسائیؒ نے حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا، جمعہ کے دن بارہ ساعتیں ہوتی ہیں ان میں ایک ساعت ایسی ہوتی ہے کہ اس وقت ایک مسلمان اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے وہی چیز عطا فرماتا ہے۔ اسی لیے اس (ساعت) کو عصر کے بعد آخری گھڑی میں تلاش کرو، اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ جمع ہوئے اور جمعہ کے دن میں واقع اُس ساعت کے متعلق تبادلہ خیال کیا تو ان کا اختلاف ہو گیا، لیکن جمعہ کی آخری ساعت میں ہونے کے متعلق کوئی اختلاف نہ کیا، اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن سلام سے مروی ہے انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم اللہ کی کتاب یعنی توراۃ میں جمعہ کے دن ایک ساعت پاتے ہیں کہ اس وقت کوئی مومن بندہ اللہ تعالیٰ سے جو بھی مانگے، اللہ اس کی حاجت پوری فرما دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ یا ساعت کا کچھ حصہ، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ نے درست فرمایا، یا ساعت کا کچھ حصہ، پھر میں نے عرض کیا، وہ کونسی ساعت ہے؟ آپ نے فرمایا، کہ وہ دن کی گھڑیوں میں سے آخری ساعت (گھڑی) ہے۔ میں نے عرض کیا (لیکن) یہ تو نماز کی ساعت نہیں۔ آپ نے فرمایا، ہاں! جب ایک مومن بندہ نماز پڑھتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے اور (آئندہ وقت) کی نماز ہی نے اسے بٹھا رکھا ہوتا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں ہوتا ہے۔"

اور جس نے یہ کہا ہے کہ یہ ساعت اس وقت ہوتی ہے جب امام خطبہ شروع کرے اس وقت سے فراغت نماز تک، تو اس نے صحیح مسلم کی روایت سے استدلال کیا ہے جو ابوبردہؓ سے انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے نقل کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے اپنے والد سے جمعہ کی ساعت کے متعلق کچھ سنا؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں میں نے ان سے سنا، وہ کہتے تھے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "یہ (ساعت) امام کے (منبر) پر بیٹھنے سے لے کر نماز ختم ہو جانے

کے درمیان میں ہوتی ہے۔"

اور عبدالرحمٰن بن حجاب نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ ان کی بیوی نے جمعہ کے دن کی اسی ساعت کے متعلق پوچھا جس میں ایک مومن بندہ کی دعا قبول کی جاتی ہے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ (ساعت) سورج کے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد تک کی ہے اور اگر اب تو نے پوچھا تو تجھے طلاق ہے۔ ان لوگوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ "وہ کھڑا نماز پڑھ رہا ہو" اور عصر کے بعد اس وقت کوئی نماز نہیں ہوتی۔ اور ظاہر حدیث سے استدلال زیادہ اولیٰ ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کی روایت سے استدلال

ابوعمرؓ فرماتے ہیں کہ اس خیال کے لوگوں نے حضرت علیؓ کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: جب سورج ڈھل جائے اور سائے لوٹ جائیں اور ارواح جانے لگیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات کا سوال کرو، کیونکہ یہ اوابین کی ساعت ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی، "اِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا"

سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے بتایا، جمعہ کے دن جس ساعت کا ذکر کیا جاتا ہے وہ نمازِ عصر سے غروبِ شمس تک ہے اور حضرت سعید بن جبیر جب نمازِ عصر پڑھ لیتے تو غروبِ آفتاب تک کسی سے بات نہ کرتے۔ اکثر سلفؒ کا یہی قول ہے۔ اسی کی حمایت میں اکثر احادیث ہیں اور اسی سے وہ قول ملتا ہے کہ یہ ساعتِ نماز ہے۔ باقی اقوال کی کوئی دلیل نہیں۔

میرے نزدیک یہ ہے کہ نماز میں بھی ایک ایسی ساعت ہے کہ جس میں دعا قبول ہوتی ہے، تو اس طرح قبولیت کی دو ساعتیں ہوتی ہیں۔

اگر وہ مخصوص ساعت نمازِ عصر کے بعد کی آخری ساعت ہو تو وہ اس دن سے مقررہ ساعت ہے جو مقدم و موخر نہیں ہوتی۔ رہی ساعتِ صلوٰۃ تو یہ نماز کے تابع ہے، جو مقدم یا موخر ہو سکتی ہے، کیونکہ مسلمانوں کے اجتماع و نماز و تضرع اور اللہ کے سامنے عاجزی کرنے میں قبولیتِ دعا کے لیے ایک عجیب اثر ہوتا ہے، تو ان کے اجتماع کی ساعت ایسی گھڑی ہے جس میں اجابت کی امید کی جا سکتی ہے۔ اور اسی پر تمام احادیث متفق ہیں، اور ان دو ساعتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں دعاء اور زاری کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس کی مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان ہے، کہ ایک مرتبہ جب آپؐ سے اس مسجد کے متعلق دریافت کیا گیا کہ جو تقویٰ کی بنا پر بنائی گئی تو آپ نے فرمایا "یہ ہے وہ تمہاری مسجد" اور مسجد مدینہ (مسجد نبوی) کی طرف اشارہ کیا۔ یہ فرمان مسجد قباء کی نفی نہیں کرتا جس کے متعلق یہ آیت "تقویٰ کی بنا پر" نازل ہوئی، بلکہ یہ دونوں مسجدیں تقویٰ ہی پر قائم ہیں۔

اس طرح جمعہ کی ساعت کے متعلق آپ کا فرمان، کہ "یہ ساعت امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے ختم ہونے کے درمیان ہے" بھی دوسری روایت کی نفی نہیں کرتا، کہ " اسے نماز عصر کے بعد تلاش کرو" اور اسماء میں اس سے مشابہ امثلہ آتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ما تعدون الرقوب فیکم یعنی تم اپنے اندر کس کو رقوب سمجھتے ہو؟ (صحابہؓ) نے عرض کیا، جس کا کوئی لڑکا نہ ہو، آپ نے فرمایا، رقوب وہ ہے کہ جسے اپنے بچے سے کچھ حاصل نہ ہو، اور آپ نے فرمایا کہ یہ بھی رقوب ہے جب اس کو اپنے لڑکے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ "جس کا بچہ نہ ہو اسے رقوب کہا جائے"۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان، کہ تم میں مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، کہ جس کے پاس کچھ زر و مال یا سامان و اسباب نہ ہو، آپ نے فرمایا، مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن پہاڑوں کی طرح بہت سی نیکیاں لے کر آئے اور ساتھ ساتھ یہ بوجھ بھی ہو کہ اس نے کسی کو چانٹا مارا ہو، کسی کو زدوکوب کیا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، چنانچہ اس کی کچھ نیکیاں یہ لے جائے۔ اور کچھ اس کی نیکیاں وہ لے جائے... (الحدیث)

اسی طرح آپ کا فرمانا، کہ "مسکین یہ نہیں جو پھر رہا ہے، اور اسے ایک لقمہ یا دو لقمے ایک کھجور یا دو کھجوریں ملتی ہیں، بلکہ مسکین تو وہ ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا۔ اور وہ اسے سمجھتے ہی نہیں کہ اس پر صدقہ کریں"۔

ساعت اجابت

یہ ساعت عصر کے بعد کی آخری ساعت ہے، تمام اہل ادیان نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اور اہل کتاب کے خیال میں یہ ساعتِ اجابت ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس میں انہیں تبدیلی یا تحریف کی ضرورت نہ تھی اور ان کے اہل ایمان نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ساعت جمعہ اور لیلۃ القدر

باقی جنھوں نے اس کے منتقل ہوتے رہنے کا دعویٰ کیا ہے تو انھوں نے دراصل (اس دعویٰ) کے ذریعہ احادیث کو جمع کرنے کا قصد کیا ہے جیسا لیلۃ القدر کے متعلق منقول ہے اور یہ قوی نہیں، کیونکہ لیلۃ القدر کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسے پچیس چھبیس ستائیس اور انتیس (شب) میں تلاش کرو، اور جمعہ کی ساعت کے متعلق ایسا کوئی قول منقول نہیں۔ دوسرے لیلۃ القدر کے متعلق کوئی صریح روایت نہیں ملتی کہ وہ ٹھیک ٹھیک اس وقت ہوگی۔ بخلاف جمعہ کی ساعت کے، اس طرح دونوں میں امتیاز ہوگیا۔

ساعت جمعہ اٹھائی نہیں گئی

رہا ان لوگوں کا قول جو اس ساعت کے اٹھا لیے جانے کے قائل ہیں، تو ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے بعض کا خیال ہے کہ لیلۃ القدر اٹھالی گئی ہے، اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ یہ ساعت پہلے معلوم تھی اور بعد میں امت سے اس کا علم چھین

لیا گیا تو ان سے پوچھا جائے گا کہ "ساری امت سے اس کا علم رفع نہیں کیا گیا، اگرچہ بعضوں سے رفع ہو چکا ہو، اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس ساعت کی حقیقت اور ساعتِ اجابت ہونا مرفوع ہو چکا ہے تو یہ مطلب باطل اور احادیث صحیحہ صریحہ کے خلاف ہے۔ اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

جمعہ کے خصائص میں سے اکیسواں خاصہ یہ ہے کہ اس میں نماز جمعہ ہوتی ہے، جو تمام فرض نمازوں میں اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہے، جو اجتماع، عدد مخصوص، اشتراط اقامت، استیطان، اور قرأتِ جہری کے لحاظ سے صرف اسی میں پائی جاتی ہیں۔ اور نماز عصر کے علاوہ اس کی اس قدر تاکید آئی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی، چنانچہ سنن اربعہ میں ابو جعد ضمری سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "جس نے استخفاف کے باعث تین جمعے چھوڑ دیے، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔"

راویان حدیث پر جرح

ترمذیؒ فرماتے ہیں، کہ یہ روایت حسن ہے، اور میں نے محمدؒ سے حضرت ابو جعد ضمری رضؓ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس کا نام معروف نہیں اور بتایا کہ میں نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس کی اس کے سوا کوئی روایت نہیں جانتا، اور سنن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تارک جمعہ کے لیے حکم مذکور ہے کہ جو اسے چھوڑ دے وہ ایک دینار کا صدقہ کرے۔ اگر نہ مل سکے تو نصف دینار۔ ابو داؤدؒ، نسائیؒ نے اسے قدامہ بن وبرہ اور انھوں نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے۔ لیکن امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قدامہ بن وبرہ معروف نہیں۔ اور یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہے۔ امام بخاریؒ سے منقول ہے کہ وہ سمرہؓ سے اس کا سماع صحیح نہیں مانتے۔

جمعہ کے چند اور خصائص

تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جمعہ فرض عین ہے۔ ہاں امام شافعیؒ سے ایک قول منقول ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔

جمعہ کا بائیسواں خاصہ یہ ہے کہ اس میں خطبہ ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ثنا و تمجید بیان کی جاتی ہے اس کی وحدانیت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دی جاتی ہے اور بندوں کو اس کے متعین کردہ ایام سے تذکیر اور اس کے انتقام و زجر سے تحذیر کی جاتی ہے اور ان اعمال کی وصیت کی جاتی ہے جو انھیں اس کی طرف اور جنت کی طرف لے جائیں، اور ان باتوں سے روکا جاتا ہے کہ جو اس کی ناراضگی اور دوزخ کا سبب بنیں۔ خطبہ اور اجتماع کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے۔

جمعہ کا تئیسواں خاصہ یہ ہے کہ یہ وہ دن ہے کہ جس دن عبادت کے لیے فارغ ہو جانا مستحب ہے مستحب اور واجب عبادات کے باعث باقی ایام پر اس دن کو ایک خاص فوقیت حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر ملت کے لیے ایک دن ایسا بنا دیا کہ وہ اس دن دنیا کے کاموں سے الگ ہو کر یکسوئی سے

عبادت کر سکیں۔ تو (اہل اسلام) کے ہاں بھی جمعہ کا دن عبادت کا دن ہے، اس طرح دنوں میں اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے مہینوں میں رمضان شریف کی ہے۔ اور اس میں ساعت اجابت کی مثال ایسی ہے جیسی کہ رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کی حیثیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کا جمعہ کا دن درست اور گناہوں سے سلامت رہا اس کے تمام دن سلامت رہے اور جس کا رمضان کا مہینہ سلامت اور درست رہا تو اس کا سارا سال پرامن (سلامت) رہا، اور جس کا حج درست اور سلامت رہا اس کی تمام عمر سلامت رہی۔

جمعہ ہفتہ کی میزان ہے

پس جمعہ ہفتے کی میزان ہے، رمضان سال کی میزان ہے اور حج عمر کی میزان ہے۔ اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

جمعہ کا چوبیسواں خاصہ یہ ہے کہ جب جمعہ کی حیثیت ہفتہ میں اس طرح ہے جیسے سال میں عید کی اور عید نماز اور قربانی سے عبادت ہے۔ اور جمعہ کا دن یوم الصلوٰۃ قرار پایا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف جلدی سے چل کر جانے کو قربانی کا قائم مقام کر دیا، تو جو مسجد میں جلدی تیاری کر کے جا رہا ہے، گویا وہ نماز اور قربانی دونوں کو جمع کر رہا ہے، جیسا کہ صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، کہ آپ نے فرمایا جو اوّل ساعت میں داخل مسجد ہوا، گویا اس نے ایک اونٹ قربانی کے لیے پیش کیا۔ اور جو دوسری ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک گائے قربانی کے لیے پیش کی اور جو تیسری ساعت میں حاضر ہوا تو گویا اس نے ایک بھیڑ قربانی کے لیے پیش کی۔

ساعت جمعہ سے متعلق فقہا کا اختلاف

اور اس ساعت کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے یہاں ان کے دو قول ملتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ ساعت شروع دن میں ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ اور احمد وغیرہ کا یہی مذہب مشہور ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ (ساعت) زوال کے بعد چھٹی ساعت میں ہوتی ہے یہ امام مالکؒ کا مشہور قول ہے اور بعض شوافع نے بھی اسے اختیار کیا ہے، اور اس پر دو استدلال کیے ہیں۔

ایک یہ کہ (مساجد) میں زوال کے بعد ہی جانا ہوتا ہے اور یہ صبح کے جانے کے مقابل ہے، جو زوال سے قبل ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ : یعنی اُن کا صبح کا (سفر) ایک ماہ کا اور شام کا (سفر) ایک ماہ (کے برابر) ہوتا ہے۔ اور جوہریؒ فرماتے ہیں کہ یہ زوال کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ سلفؒ بھلائیوں کے زیادہ شیدا تھے، اس کے باوجود وہ طلوع شمس کے وقت یعنی صبح صبح جمعہ کی نماز کے لیے حاضر نہ ہوتے تھے۔ اور امام مالکؒ نے تو (جمعہ کی نماز) کے لیے

شروع دن میں صبح صبح آنے کا انکار کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اہل مدینہ اس پر دعامل رہے ہوں) پہلے قول کے اصحاب نے حضرت جابرؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو انھوں نے نبیؐ سے روایت کی ہے۔ یعنی یہ کہ جمعہ کے دن بارہ ساعتیں ہوتی ہیں، اور منقول ہے کہ معہود ساعتیں بارہ ساعتیں ہوتی ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ معتدل اور زمانی ساعتیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ساعتیں قرار دی ہیں اور اس سے زیادہ نہیں کیں۔ اور اگر ساعتیں گھڑیوں کے چھوٹے چھوٹے اجزاء شمار کیے جائیں تو یہ چھ حصوں میں منقسم نہ ہوں گی بخلاف اس کے ان سے معہود ساعتیں مراد ہوں گی کیونکہ چھٹی ساعت جب نکل جائے اور ساتویں داخل ہو جائے تو امام نکل جاتا ہے صحیفے لپیٹ لیے جاتے ہیں اور اس کے بعد کسی کی قربانی (ہدیہ) قبول نہیں کیا جاتا، جیسا کہ سنن ابوداؤد میں صراحت سے مذکور ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ جب جمعہ کا دن ہوتا ہے، تو شیاطین اپنے جھنڈے لے کر بازاروں میں جاتے ہیں اور لوگوں کو مکر و فریب میں پھنساتے ہیں اور انھیں جمعہ سے روکتے ہیں۔ اور فرشتے بھی صبح ہی آتے ہیں اور مساجد کے دروازوں پر بیٹھ جاتے ہیں، تو لوگوں کو ایک ساعت میں، دوسرے کو دو ساعتوں کے بعد لکھتے ہیں، یہاں تک کہ امام آجاتا ہے۔

عمر بن عبدالبر نے بتایا ہے کہ ان ساعات کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے، بعض کا خیال یہ ہے ساعات کا مطلب طلوع شمس اور اس کا کھل جانا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں جمعہ کے لیے جلد جانا افضل ہے۔ ثوریؒ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور اکثر علماء جلد حاضر ہونے کو مستحب سمجھتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر فجر کے بعد اور طلوعِ شمس سے قبل (نماز جمعہ کے لیے گیا)، تو یہ بہتر ہے۔

جمعہ یوم اجتماع ہے

جمعہ کے چند مزید خصوصیات

وہ آثار جن سے مالک استدلال کرتے ہیں: اثرم بتاتے ہیں۔ کہ احمد بن حنبلؒ سے کہا گیا کہ انس بن مالک۔ کا قول ہے کہ جمعہ کے دن صبح صبح ہی مسجد میں جانا مناسب نہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے خلاف ہے۔ اور پھر فرمایا۔

سبحان اللہ اس مسئلہ میں وہ کس طرف چلے گئے!؟

ہم نے اس پر کتاب واضح السنن میں کافی بحث کی ہے اور یہ تمام مبحث عبدالملک بن مروان ہی کے متعلق ہے۔ پھر ابو عمرؒ نے اس کا رد کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ امام ملک رحمۃ اللہ علیہ پر محض بہتان ہے۔ اور یہی ہے کہ جس نے ایک منکر اور محرف بات کی ہے، بلکہ امام مالکؒ کی رائے کی تو ائمہ کے روایات اور احادیث صحیحہ سے تائید ہوتی ہے اور اہل مدینہ کا عمل بھی ان کا شاہد ہے۔ اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ کہ جس میں (اہل مدینہ) کا عمل قابل استدلال ہے۔ کیونکہ جمعہ کی نماز بار بار آتی ہے۔ اور عوام و علماء سے مخفی نہیں رہ سکتی۔

جن آثار سے امام مالکؒ استدلال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک زہریؒ نے حضرت سعید بن مسیب سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جمعہ کا دن آتا ہے تو مسجد کے دروازوں میں سے ہر دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو لوگوں کے متعلق لکھتے رہتے ہیں کہ پہلے (آنے والا کون ہے) اور پھر بعد میں (کون ہے)؟ تو جمعہ کی طرف صبح جلدی سے آنے والا ایسا ہے جیسے ایک اونٹ کا ہدیہ دے پھر جو اس کے بعد آئے وہ ایسا ہے جیسے ایک گائے دے۔ پھر اس کے بعد میں آنے والا ایسا ہے کہ جیسے ایک بھیڑ دے، حتیٰ کہ انہوں نے مرغی اور انڈے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ آخر جب امام (منبر پر) بیٹھ جائے

تو صحیفے لپیٹ لیتے جاتے ہیں۔ اور لوگ خطبہ سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تم اس روایت کا مطلب نہیں سمجھتے۔ کہ انہوں نے فرمایا ہے۔ کہ (فرشتے) پہلے آنے والوں اور پھر ان کے بعد آنے والوں کے نام لکھتے ہیں اس طرح جمعہ کی طرف (ہجیر) صبح صبح جانے والا ایسا ہے جیسے اونٹ پیش کرنے والا۔ اور پھر جو اس کے بعد آتا ہے۔ ۔۔ ۔ اسی طرح سب سے پہلے آنے والے کو انہوں نے ہجر قرار دیا۔ یہ لفظ ہاجرۃ اور تہجیر سے ماخوذ ہے۔ اور یہ جمعہ کی طرف جانے کے وقت کو کہتے ہیں اس کا طلوع آفتاب کے وقت پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہاجرۃ یا تہجیر کا یہ وقت نہیں، اور روایت میں ہے۔ پھر جو اس کے بعد آتے پھر جو اس کے بعد آئے۔ اور کسی ساعت کا ذکر نہیں کیا گیا انہوں نے بتایا۔ ان الفاظ کے ساتھ ابتداء میں کمی طرح ذکر کر دئے گئے ہیں۔ رہے اہل مدینہ: کہ وہ دن کے آغاز میں مسجد نہیں جایا کرتے تھے۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ تک ان کا یہ عمل رہا اور یہ حجت نہیں، اور نہ ان کے ہاں جو یہ کہتے ہیں۔ کہ اجماع اہل مدینہ حجت ہے۔ کیونکہ یہ تو صرف اتنی بات ہوئی۔ کہ ابتدائے روز میں انہوں نے جمعہ کے لئے جانا ترک کیا تھا۔ اور یہ کام ضرورت کے پیش نظر جائز ہوتا ہے۔ اور گاہے گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتدائے دن میں جمعہ کی طرف جانے کی بجائے اپنے ذاتی یا گھر والوں کے مصالح و معاش یا اس کے علاوہ بعض دینی و دنیاوی امور زیادہ توجہ طلب اور افضل ہوتے ہیں۔

"رباط" سے کیا مراد ہے؟

اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ نماز ادا کرنے کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا اور دوسری نماز پڑھنے تک جائے نماز پر بیٹھا رہنا واپس لوٹ کر گھر جانے سے افضل ہے۔ جیسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو آدمی نماز کا انتظار کرے۔ پھر امام کے ساتھ نماز پڑھے۔ یہ اس سے افضل ہے۔ جو نماز پڑھے اور پھر اپنے گھر میں چلا جائے اور بتایا۔ کہ جب تک وہ اپنی جائے نماز میں رہے تب تک فرشتے اس پر دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔ اور فرمایا کہ نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ایسے (اعمال) میں ہے کہ جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ اور درجات کو بلند کرتا ہے۔ اور یہی چیز رباط (جم کر عبادت کرنا) ہے۔ (مزید) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے سامنے ایسے بندے پر فخر کرتا ہے جو فریضہ ادا کرے۔ اور دوسرے فریضہ کے انتظار میں بیٹھ جائے۔ یہ اس بات پر شاہد ہے کہ جو صبح کی نماز پڑھے اور پھر جمعہ کی انتظار میں بیٹھ جائے وہ اس سے افضل ہے۔ جو چلا جائے اور وقت پر پھر حاضر ہو جائے اور اہل مدینہ وغیرہ کا اس

پر عامل نہ ہونا یہ مطلب نہیں رکھتا کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔

اسی طرح جمعہ کے لئے صبح کرنا اور جلدی سے حاضر ہونے کا مسئلہ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے۔

ایک اور خاصہ جمعہ کا یہ ہے کہ اسی دن صدقہ کرنا باقی ایام کی نسبت زیادہ باعث اجر ہے ہفتے کے باقی دنوں کی نسبت اس دن صدقہ دینا ایسا ہے، جیسے تمام مہینوں سے رمضان کے مہینہ کا صدقہ (افضل) ہوتا ہے۔

میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو دیکھا۔ کہ وہ جب جمعہ کے لئے حاضر ہوتے۔ تو گھر میں سے روٹی وغیرہ جو میسر آتا لے لیتے۔ اور راستہ میں خفیہ طریق پر صدقہ کرتے اور میں نے ان کو فرماتے ہوئے سنا کہ "جب اللہ تعالےٰ نے ہمیں مناجات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل صدقہ کا حکم دیا ہے، تو پھر اللہ تعالےٰ کی مناجات سے قبل صدقہ کرنا تو زیادہ افضل اور اولیٰ ہے۔ احمد بن زہیر بن حرب بتاتے ہیں کہ ہمیں والد بزرگوار نے انہیں جریرؒ نے بتایا انہیں منصورؒ سے انہیں مجاہدؒ سے انہیں حضرت ابن عباسؓ سے معلوم ہوا۔ انہوں نے فرمایا:

ابو ہریرہؓ اور کعبؓ اکٹھے ہوئے تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا بے شک جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت آتی ہے۔ کہ اس وقت کوئی مسلمان جو کچھ بھی اللہ تعالےٰ سے مانگے وہ اُسے وہی کچھ عطا فرماتا ہے۔

حضرت کعبؓ نے فرمایا: کہ میں تمہیں جمعہ کے متعلق دکچھ، بتاؤں (پھر فرمایا) کہ جب جمعہ کا دن آتا ہے۔ تو ابن آدم اور شیاطین کے سوا آسمان وزمین، خشکی، تری، پہاڑ۔ درخت اور تمام مخلوقات اس سے ترسان اور خوفزدہ ہو جاتی ہے اور فرشتے مسجد کے دروازوں کو گھیر لیتے ہیں اور جو پہلے اور پھر پہلے پہلے آتا ہے۔ اس کا نام درج کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ امام نکل آتا ہے۔ اس طرح جب امام نکل آتا ہے تو وہ صحیفے لپیٹ دیتے ہیں۔ اور جو (امام) کے آنے کے بعد آتا ہے۔ تو وہ اللہ سے یوں ملتا ہے۔ کہ اس کا کچھ عمل نہیں ہوتا۔

اور ہر بالغ کو چاہیئے کہ اس دن غسل کرے۔ جس طرح جنابت کا غسل کیا جاتا ہے۔ اور تمام ایام کی نسبت اس دن صدقہ کرنا زیادہ افضل ہے۔ اور جمعہ کے دن ایسا ہے کہ جیسے اس دن سورج نہ طلوع ہوا اور نہ غروب ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت کعبؓ کا مکالمہ تھا۔ اور میں کہتا

ہوں کہ اگر اس کے پاس خوشبو ہو تو وہ بھی لگائے۔

جمعہ اور دیدار جلوۂ الٰہی ایک مزید خاصہ جمعہ کا یہ ہے کہ اس دن اللہ تعالےٰ اپنے اولیاء و مومنین کو جنت میں اپنا جلوہ دکھانے کے لیے تجلی فرماتا ہے۔ تو جو بھی امام سے زیادہ قریب ہوگا۔ وہ اُس (اللہ) سے زیادہ قریب ہوگا۔ اور جو جمعہ کی طرف زیادہ جلدی سے جائے گا وہ دیدار الٰہی بھی سب سے پہلے کرے گا۔

اور یحیٰ بن یمان نے شریکؒ سے انہوں نے ابوالیقظانؒ سے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق ولدینا مزید: روایت کیا: فرمایا:
(اللہ) تعالےٰ ہر جمعہ کو اپنی تجلی سے سرفراز فرمائے گا۔

معجم طبرانی میں ابونعیم مسعودی کی روایت ہے کہ انہوں نے منہال بن عمرو سے انہوں ابوعبیدہ سے نقل کیا انہوں نے بتایا کہ عبداللہ نے فرمایا: جمعہ کی طرف جلدی کرو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ ہر جمعہ کو اہل جنت کے سامنے کافور کے ایک ٹیلے پر تجلی فرماتا ہے۔ اس دن اللہ کا یہ قرب جمعہ کی طرف جلدی کرنے کے مطابق ہوتا ہے۔ پس اس دن اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کو اس قدر اعزاز و اکرام عطا فرماتا ہے کہ جو انہوں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر یہ لوگ اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ آتے ہیں اور جو اللہ تعالےٰ نے ان سے کلام فرمایا ہوتا ہے۔ وہ (گھر آکر) بتاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پھر حضرت عبداللہ مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو وہاں دو آدمی اور بھی تھے۔ تو عبداللہ فرمانے فرمایا کہ میں تیسرا ہوں۔ اگر اللہ تعالےٰ نے چاہا۔ تو تیسرے میں بھی برکت فرمائے گا۔

بیہقی رح نے مشعب میں حضرت علقمہ بن قیس سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں حضرت عبداللہ بنؓ مسعود کے ساتھ جمعہ کی طرف چلا۔ تو انہوں نے وہاں تین آدمی دیکھے جو ان سے سبقت لے گئے۔ تو فرمایا: چار کا چوتھا۔ اور چار کا چوتھا بھی دور نہیں۔ پھر فرمایا: کہ میں نے جناب رسول اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: کہ لوگ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کے اس قدر (قریب اور دور) بیٹھے ہوں گے جس قدر وہ جمعہ کی نماز کے لئے جانے میں (جلدی یا سستی) سے کام لیا کرتے تھے، پہلا پھر دوسرا پھر تیسرا پھر چوتھا۔ اور فرمایا کہ چار کا چوتھا کوئی دور نہیں۔

دارقطنیؒ نے بتایا کہ ہمیں احمد بن سلیمان بن حسن نے انہیں محمد بن عثمان بن محمد نے انہیں مروان بن جعفر نے انہیں نافع ابوالحسن مولی بنی ہاشم نے انہیں عطاء بن ابی میمون نے بتایا۔ انہیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت پہنچی۔ انہوں نے بتایا۔ کہ جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو مومن اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے۔ پس جمعہ کی طرف جو سب سے زیادہ سبقت لے گیا ہوگا۔ وہ سب سے پہلے دیدار کر سکے گا۔ اور مومن عورتیں یوم فطر اور یوم نحر (قربانی) کو زیارت کریں گی۔

جمعہ کا دن برکتوں اور رحمتوں کا دن ہے

ہمیں محمد بن نوح نے انہیں محمد بن موسیٰ بن سفیان سکری نے انہیں عبداللہ بن جہم رازی نے انہیں عمرو بن ابی قیس نے بتایا۔ انہیں ابو طیبہ سے انہیں عاصم سے انہیں عثمان بن عمیر ابو الیقظان سے انہیں حضرت انسؓ بن مالک سے انہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت پہنچی آپ نے فرمایا:

میرے پاس جبریل آیا۔ اور اس کے ہاتھ میں گویا کہ ایک سفید آئینہ ہے۔ جس میں ایک سیاہ نشان ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ اے جبریل یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ جمعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے آپ پر پیش فرماتا ہے۔ تاکہ آپ کے لئے اور آپ کے بعد آپ کی امت کے لئے یہ عید کا دن ہو۔ میں نے پوچھا۔ "اور اس دن میں ہمارے لئے کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ کہ آپ کے لئے اس میں بھلائی ہے۔ آپ پہلے ہیں اور یہود و نصاریٰ بعد میں ہیں[1] اور اس میں آپ کے لئے ایک ساعت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ سے اس وقت کوئی بندہ جو کچھ بھی مانگتا ہے۔ اگر وہ اس کے مقسوم میں ہے عطا فرماتا ہے۔ (اگر) اس کے مقسوم میں نہ ہو۔ تو اس سے بہتر عطا فرماتا ہے۔ اور جو اس کے خلاف لکھا ہوتا ہے۔ اس کے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ (سزا) اس سے ہٹا دیتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: میں نے پوچھا، کہ یہ سیاہ نقطہ کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا یہ قیامت ہے۔ جو جمعہ کے دن قائم ہوگی۔ اور یہ دن ہمارے ہاں تمام ایام کا سردار کہلاتا ہے اور آخرت کے لوگ اسے یوم المزید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

انہوں نے فرمایا: یہ اس طرح کہ آپ کے پروردگار جل شانہٗ نے جنت میں ایک وادی منتخب کی ہے جس میں سفید مشک کی خوشبوئیں پھیلا دی ہیں۔ تو جب جمعہ کا دن آتا ہے تو (اللہ) اپنی

---

[1] یعنی ہفتہ اتوار جمعہ کے بعد آتے ہیں۔

کرسی پر نزول فرماتا ہے، پھر کرسی کے ارد گرد نور کے منبر بچھا دیئے جاتے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام حاضر ہوتے ہیں اور ان پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سونے کے منبر ارد گرد بچھا دیئے جاتے ہیں۔ اور صدیقین و شہداء حاضر ہو کر وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اہل غرف حاضر ہوتے ہیں۔ تو وہ ٹیلوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور فرمایا کہ پھر ان کا پروردگار جل وعز ان کے سامنے تجلی فرماتا ہے۔ تو وہ اس کی زیارت کرتے ہیں۔ پھر (اللہ) تعالیٰ فرماتا ہے۔

"میں وہ ہوں کہ جس نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اور تم پر اپنی تمام نعمتیں مکمل کر دیں، یہ میری تکریم کی جگہ ہے، اب مجھ سے مانگو۔ تو وہ اس کی رضا مانگتے ہیں۔ (اللہ) فرماتا ہے: کہ میری رضا تھی کہ میں تمہیں اپنے گھر میں اتارتا ہوں اور شرف سے نوازتا ہوں۔ اس لئے مجھ سے مانگو۔ تو وہ (پھر بھی) اس کی رضا مانگتے ہیں۔ تو (اللہ) اپنی رضا کی گواہی دیتا ہے پھر وہ مانگتے ہیں یہاں تک کہ ان کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جمعہ کے دن ان کے لئے وہ وہ نعمتیں کھولتا ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں۔ اور نہ کسی کان نے سنیں۔ اور نہ کسی بشر کے دل میں کھٹکیں۔

فرمایا، کہ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اٹھ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انبیاء، و شہداء اٹھ جاتے ہیں اور اہل غرف اپنے اپنے بالاخانوں میں چلے جاتے ہیں۔

فرمایا: کہ ہر بالاخانہ موتیوں کا بنا ہوتا ہے۔ جس میں کوئی دراڑ وغیرہ نہیں ہوتی۔ سرخ یاقوت کا بنا ہوتا ہے۔ اور سبز زبرجد کے دروازے چھت اور پرنالے ہوتے ہیں۔ ان میں نہریں بہتی ہیں جن میں پھل متعلق ہوتے ہیں۔ جن میں بیویاں اور خدام ہوتے ہیں۔

فرمایا، تو جمعہ تک وہ کسی بات کے محتاج نہیں ہوتے، تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار کرنے اور اس کے انعامات کی شرف بخشی سے خوب متمتع ہوں۔ پس یہ یوم المزید ہوتا ہے۔

اور اس حدیث میں کئی طرق ہیں۔ جنہیں ابو حسن دارقطنی نے کتاب الرؤیہ میں ذکر کیا ہے۔

جمعہ کا دن "یوم شاہد" ہے

ایک خاصہ جمعہ کا یہ ہے: کہ دارقطنی نے کتاب یوم الجمعہ میں شاہد کی تفسیر میں بیان کیا ہے حمید بن زنجویہ نے بتایا۔ کہ ہمیں عبداللہ بن موسیٰ نے انہیں موسیٰ بن عبیدہ نے بتایا۔ انہیں ایوب بن خالد سے انہیں عبداللہ بن رافع سے انہیں ابو ہریرۃ رضؓ سے روایت پہنچی۔ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یوم موعود قیامت کے دن کو کہتے ہیں۔ اور یوم مشہود ہی یوم عرفہ ہے۔ اور جمعہ کا دن

شاہد ہے جمعہ کے دن سے افضل کوئی ایسا دن نہیں کہ جس پر سورج طلوع یا غروب ہوا ہو۔ اسی دن ایک ساعت ایسی آتی ہے۔ کہ اگر اس وقت مومن بندہ اللہ تعالےٰ سے کسی بھلائی کی دعا کرے۔ تو وہ ضرور قبول کرتا ہے۔ یا کسی شر سے پناہ چاہے تو ضرور پناہ دیتا ہے۔

اور حارث بن ابی مسلمۃ نے اپنی مسند میں روح سے اور انہوں نے موسیٰ سے روایت کیا اور موسیٰ بن عبیدہ سے اس کے کئی طرق (مذکور) ہیں۔ معجم طبرانی میں اسماعیل بن عیاش سے روایت ہے۔ کہ مجھے والد بزرگوار نے بتایا۔ انہیں ضمضم بن زرعۃ نے بتایا انہیں زرعۃ سے انہیں شریح بن عبید سے انہیں ابو مالک اشعری سے روایت پہنچی۔ انہوں نے بتایا کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یوم موعود، یوم قیامت ہے۔ اور جمعہ کا دن شاہد ہے اور یوم عرفہ مشہود ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے ہمارے لئے (جمع کا دن) جمعہ کا قرار دیا ہے۔ اور نمازِ عصر نمازِ وسطیٰ ہے۔

جبیر بن مطعم سے روایت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہری (مطلب) یہ ہے اور اللہ تعالےٰ ہی خوب جانتا ہے۔ کہ حضرت ابو ہریرۃ رضؓ کی تفسیر ہے۔ چنانچہ امام احمد رحؒ نے فرمایا: کہ ہمیں محمد بن جعفر نے انہیں شعبہ نے بتایا۔ انہیں یونس سے روایت ملی۔ (وہ فرماتے ہیں) کہ میں نے عمار مولیٰ بن ہاشم سے سنا۔ وہ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے اس آیت وشاہد ومشہود کی شرح کرتے ہوئے فرمایا جمعہ کا دن شاہد ہے۔ اور یوم عرفہ یوم مشہود ہے اور قیامت کا دن یوم موعود ہے۔

جمعہ کا دِن یوم اجتماع ہے

ایک اور خاصہ جمعہ کا یہ ہے کہ یہ وہ دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے یوم اجماع بنا دیا۔ اور اس دا امتام سے پہلے اہل کتاب کو گمراہ کر دیا۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ابو ہریرۃ رضؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا:

جمعہ سے زیادہ بہتر دن پر سورج طلوع وغروب نہیں ہوا۔ جس کی اللہ نے ہمیں ہدایت دی۔ اور لوگ اس سے گمراہ ہو گئے۔ اسی طرح یہ لوگ ہمارے بعد ہیں، کیونکہ جمعہ ہمارے لئے ہے اور یہود کے لئے ہفتہ کا دن اور نصاریٰ کے لئے اتوار کا دن ہے۔

دوسری روایت میں ہے۔ کہ آپ نے فرمایا جمعہ کا دن اللہ تعالےٰ نے ہمارے لئے جمع کر دیا ہے۔

اور امام احمدؒ نے فرمایا: ہمیں علی بن عاصم نے خبر دی انہیں حصین بن عبدالرحمان سے انہیں عمرو بن قیس سے انہیں محمد بن اشعث سے انہیں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت پہنچی۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی۔ کہ ایک یہودی نے حاضر ہونے کی اجازت چاہی آپ نے اجازت دی۔ تو وہ کہنے لگا۔

السام علیکم: (یعنی تم پر ہلاکت ہو)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وعلیک (تجھ پر)

(حضرت عائشہ) فرماتی ہیں۔ میں نے مداخلت کرنی چاہی کہ دوسرا یہودی داخل ہوا۔ اس نے بھی اسی طرح کہا۔

نبی صلی اللہ نے جواب دیا: وعلیک:

عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ میں نے بولنے کا ارادہ کیا۔ پھر تیسرا یہودی داخل ہوا تو اس نے بھی کہا۔

السام علیکم (تم پر موت آئے)

عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ میں نے کہا: بلکہ تم پر موت آئے، اور اللہ کا غضب ہو۔ (تم) بندروں اور سوروں کے بھائی ہو۔ کیا تم رسول اللہ کو اس انداز سے سلام کرتے ہو؛ جس انداز سے اللہ عزوجل نے نہیں کیا؟

عائشہ فرماتی ہیں آپ نے میری طرف دیکھا۔ اور فرمایا:

ٹھہرو۔ بے شک اللہ تعالےٰ فحش اور تفحش کو پسند نہیں کرتا۔ انہوں نے ایک بات کی تو ہم نے ان پر لوٹا دی۔ لہٰذا ہمیں ان کی بات کا کچھ ضرر نہیں اور ان پر قیامت تک پڑ گئی۔ وہ ہم پر کئی (باتوں کے) بارے میں دوسروں سے بہت زیادہ حسد کرتے ہیں۔ مثلاً جمعہ کے متعلق کہ اللہ تعالےٰ نے ہم کو ہدایت دی اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے۔ اور قبلہ پر حسد کرتے ہیں جس کی طرف اللہ نے ہمیں دعوت دی اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے۔ اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر حسد کرتے ہیں۔

جمعہ کا انتخاب، انتخاب حسنہ ہے

مزید خاصہ جمعہ کا یہ ہے۔ کہ یہ دن ہفتے کے ایام میں سے اللہ کا انتخاب (حسنہ) ہے۔ جیسے عام مہینوں میں ماہ رمضان کا انتخاب اور راتوں میں سے لیلۃ القدر کا انتخاب اور زمین میں سے مکہ کا انتخاب اور اپنی مخلوقات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ کا انتخاب فرمایا۔

آدم بن ابی ایاس فرماتے ہیں۔ کہ ہمیں شیبان ابو معاویہ نے بتایا انہیں عاصم بن ابو النجود سے

انہیں ابوصالح سے انہیں کعب احبارؓ سے روایت ملی۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مہینوں کا انتخاب فرمایا۔ اور ماہِ رمضان کو چن لیا۔ ایام کا انتخاب فرمایا۔ اور جمعہ کا دن چن لیا، راتوں کا انتخاب فرمایا اور لیلۃ القدر کو چن لیا۔ ساعتوں کا انتخاب فرمایا اور نماز کی ساعت کو چن لیا۔ اور جمعہ دوسرے دوسرے تک کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ اور تین (گنا) مزید انعام کا (سبب ہے) اور رمضان دوسرے رمضان تک کا کفارہ ہے۔ اور حج دوسرے حج تک کے درمیان کے حصّہ کا کفارہ بنتا ہے۔ اور عمرہ دوسرے عمرہ تک کے درمیان کی مدت کا کفارہ ہوتا ہے اور آدمی دو نیکیوں کے درمیان فوت ہوتا ہے ایک نیکی اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دوسری نیکی نماز ہے جس کا وہ منتظر ہوتا ہے اور رمضان میں شیاطین کو باندھ دیا جاتا ہے۔ دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور آواز دی جاتی ہے۔

"اے خیر (بھلائی) کے چاہنے والے رمضان آگیا کچھ جمع کرلے۔

اور آخری دس راتوں سے زیادہ اللہ کو ایسی کوئی رات زیادہ محبوب نہیں۔ جس میں عمل کیا جائے۔"

جمعہ کے دن مُردوں اور زندوں کی ملاقات | جمعہ کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ جمعہ کے دن ارواح اپنی قبور کے قریب ہو جاتے ہیں اور اس دن انہیں اجر ملتے ہیں، اس طرح وہ اپنے زائرین کو اور اپنے پاس سے گزرنے والوں سلام کرنے والوں کو پہچان لیتے ہیں۔ اور دوسرے ایام کی نسبت اسی دن وہ اپنی جان پہچان والوں سے زیادہ حاصل کر لیتے ہیں۔ پس یہ دن ایسا ہے۔ کہ اس میں زندہ اور مردہ آپس میں ملتے ہیں۔ چنانچہ جب اس دن قیامت قائم ہوگی۔ تو پہلے اور آخر (زمانہ) کے لوگ۔ اہل زمین۔ اہل آسمان۔ آقا۔ غلام عامل اور اس کا عمل، ظالم مظلوم، سورج اور چاند سب اکٹھے ہوں گے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ کبھی جمع نہ ہوئے۔

گویا یہ اجتماع اور ملاقات کا دن ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ دوسرے ایام کی بہ نسبت دنیا میں بھی زیادہ ملاقاتیں کرتے ہیں گویا یہ "یوم التلاق" (ملاقات کا دن) ہے"!

ابوتیاح لاحق بن حمید نے بتایا۔ کہ مطرف بن عبداللہ بدیہ میں تھے۔ وہ ہر جمعہ کو (سفر کرکے) آیا کرتے، ایک روز جب وہ جمعہ کے دن قبرستان کے قریب تھے تو کہنے لگے:

"میں نے ہر قبر والے کو اپنی قبر پہ بیٹھے دیکھا ہے، اس پر لوگ کہنے لگے۔ یہ تو مطرف ہے جو

ہر جمعہ کو تو آیا کرتا ہے۔ (مطرف) فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا۔
کیا تم بھی جمعہ سے واقف ہو؟
وہ کہنے لگے۔ ہاں! اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس دن پرند کیا کہتے ہیں۔؟
میں نے پوچھا۔ کہ اس دن پرندے کیا کہتے ہیں؟
وہ کہنے لگے: کہ (پرند) کہتے ہیں۔ اے پروردگار سلامتی۔ اچھا دن!
ابن ابی دنیا نے کتاب المنامات میں عاصم حجدری سے نقل کیا ہے کہ: کہ میں نے عاصم جحدری کو، ان کی وفات کے دو سال بعد خواب میں دیکھا۔ میں نے پوچھا۔
کیا تم دنیا سے چلے نہیں گئے تھے؟
انہوں نے جواب میں فرمایا: ہاں! دنیا میں تو نہیں ہوں،
میں نے پوچھا۔ تو اب آپ کہاں ہو؟
انہوں نے جواب دیا خدا کی قسم جنت کے باغات میں سے ایک باغ میں ہوں۔ میں اور میرے دوستوں میں سے ایک جماعت ہر جمعہ کی رات کو اکٹھے ہوتے ہیں۔
اور پھر صبح کو ہم ابو بکر بن عبداللہ مزنی کے ہاں جاتے ہیں۔ تو ہمیں تمہاری خبریں ملتی ہیں۔
میں نے پوچھا اب تمہاری کیا کیفیت ہے؟ اجسام ہو یا ارواح؟
انہوں نے فرمایا: ہیہات، اجسام تو بوسیدہ ہو گئے، صرف ارواح ہیں جو ملتی جلتی ہیں۔
راوی کا بیان ہے پھر میں نے کہا تم لوگ ہماری آمد سے آگاہ ہو جاتے ہو؟
انہوں نے بتایا۔ کہ ہم جمعہ کی رات اور جمعہ کا سارا دن اور ہفتہ کی رات میں طلوع آفتاب تک آگاہ ہو جاتے ہیں۔ (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا۔ کہ باقی ایام کے سوا (ان دنوں) میں کیسے (آگاہ) ہو جاتے ہو؟
انہوں نے جواب دیا کہ جمعہ کی فضیلت دعظمت کے باعث۔
نیز ابن ابی دنیا نے محمد بن واسع سے نقل کیا۔ کہ وہ ہر ہفتے کی صبح کو جبانہ تک پہنچ جاتے پھر قبروں پر کھڑے ہو کر سلام کرتے، ان کے لئے دعا کرتے، پھر واپس ہو جاتے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر آپ یہی کام دو شنبہ کو کر لیا کریں تو؟
انہوں نے جواب دیا۔ مجھے خبر ملی ہے۔ کہ جمعہ سے ایک دن قبل اور ایک دن بعد تک اہل قبور اپنے زائرین کو معلوم کر لیتے ہیں۔

اور حضرت سفیان ثوریؒ کہتے ہیں مجھے ضحاکؒ سے معلوم ہوا، انہوں نے فرمایا: کہ جس نے ہفتہ کے دن طلوع آفتاب سے پہلے قبر کی زیارت کی تو مردے کو اس کی آمد کا علم ہو جاتا ہے۔

ان سے پوچھا گیا۔ کہ یہ کیسے؟

انہوں نے جواب دیا جمعہ کے مرتبہ کے باعث!

جمعہ کے دِن روزہ رکھنا مکروہ ہے یا مستحسن!

جمعہ کا ایک خاصہ یہ ہے کہ محض جمعہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ یہ امام احمدؒ کی نص ہے، اثرم فرماتے ہیں۔ ابو عبداللہ سے جمعہ کے روزے کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو انہوں نے افراد سے کراہت کا اظہار کیا، ارشاد فرمایا،

اگر روزے رکھنے کے دوران میں جمعہ کا دن آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن خاص کر جمعہ کے دن رکھے تو یہ روا نہیں۔

میں نے پوچھا ایک آدمی ایک دن روزہ رکھتا ہے۔ اور ایک دن افطار کرتا ہے۔ اتفاقاً جمعرات کو افطار کا دن آگیا۔ اور جمعہ روزہ کا دن بن گیا۔ اور پھر ہفتے کا دن افطار کا ہوگیا۔ اس طرح جمعہ کا دن مفرد روزے کا دن ہو گیا پھر؟

انہوں نے فرمایا: یہ جائز ہے، ہاں اگر وہ مخصوص طور پر اسی دن کا روزہ رکھے تو غلط ہے، اصل میں عمداً محض جمعہ کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

امام مالکؒ اور ابو حنیفہؒ نے باقی ایام کی طرح اسے مباح بتایا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ میں نے کسی اہل علم و فقہ سے یا ان کے اتباع میں کسی سے نہیں سنا۔ کہ وہ جمعہ کے روزے کو منع کرتا ہو۔ حالانکہ اس دن روزہ رکھنا بہتر ہے۔ اور میں نے بعض اہل علم کو دیکھا کہ وہ اس دن برابر روزہ رکھا کرتے تھے۔ بلکہ وہ خاص طور پر اس دن کے روزے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

ابن عبداللہ فرماتے ہیں۔ جمعہ کے روزہ سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مختلف ہیں چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ آپؐ ہر ماہ میں تین دن روزے رکھا کرتے۔ اور بتایا۔ کہ میں نے آپ کو جمعہ کے دن بہت ہی کم حالت افطار میں دیکھا۔ یہ صحیح حدیث ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن کبھی بھی روزہ کے بغیر نہیں دیکھا۔ ابن ابی

شیبہ نے اسے حفص بن غیاث سے انہوں نے لیث بن ابی سلیم سے انہوں نے عمیر بن ابی عمیر سے اور انہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے۔ کہ آپ اس دن روزہ رکھتے اور اس پر مداومت فرماتے تھے۔ اور جو امام مالکؒ نے ذکر کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ تو محمد بن منکدر ہے ایک قول ہے کہ یہ صفوان بن سلیم ہے۔ اور دراوردی نے صفوان بن سلیم سے انہوں نے بنی خثیم کے ایک آدمی سے روایت کیا کہ اس نے حضرت ابو ہریرۃؓ کو فرماتے سنا۔ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! جس نے جمعہ کا روزہ رکھا۔ تو اس کے لئے آخرت کے دس سفید ایام کے برابر اجر لکھا گیا۔ کہ دنیا کے ایام ان کے مشابہ نہیں ہو سکتے۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ جمعہ کا روزہ ایک نیکی ہے۔ جسے ایک معارض دلیل کے بغیر روکا نہیں جا سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ درست طور پر معارض ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی طعن بھی نہیں۔ چنانچہ صحیحین میں محمد بن عباد سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے جابرؓ سے پوچھا کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روزہ سے منع فرمایا؟ انہوں نے فرمایا ہاں! منع فرمایا ہے، اور صحیح مسلم میں محمد بن عباد سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حضرت جابر بن عبداللہ سے پوچھا کہ کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روزہ سے منع فرمایا؟ انہوں نے فرمایا: ہاں! اس عمارت کے پروردگار کی قسم! اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ تم میں سے کوئی محض جمعہ کا روزہ نہ رکھے، ہاں جب تک وہ اس سے قبل یا بعد میں (متصل) روزہ نہ رکھ رہا ہو (پھر کوئی ہرج نہیں)، یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔

جمعرات شب بیداری کے لئے اور جمعہ روزے کیلئے مخصوص نہ کرو

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے آپؐ نے فرمایا راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام کے لئے مخصوص نہ کرو۔ اور باقی ایام میں جمعہ کے دن کو روزے کے لئے مخصوص نہ کرو، ہاں اگر تم میں سے کوئی روزے رکھ رہا ہو۔ اور یہ (اتفاقاً) درمیان میں واقع ہو جائے، تو خیر، اور بخاری میں حضرت جویریہؓ بنت حارث سے مروی ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن ان کے پاس تشریف لائے۔ اور یہ روزے سے تھیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے کل روزہ رکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا۔ جی نہیں! پھر آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا کل کے لئے روزہ رکھنے کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ جی نہیں! آپؐ نے فرمایا: پھر افطار کر لو۔

اور مسند امام احمدؒ حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تنہا جمعے کے دن روزہ نہ رکھو۔ نیز مسند میں حضرت جنادہ ازدی سے مروی ہے، انہوں نے بتایا۔ کہ میں بنی ازدی کے آدمیوں کے ہمراہ جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں۔ اور آپ صبح کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: آؤ کھانا کھالو!۔

ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ ہم روزے سے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے کل روزے رکھے تھے؟ ہم نے کہا جی نہیں!

آپ نے فرمایا: تو کیا کل روزے رکھو گے؟

ہم نے عرض کیا جی نہیں!

آپ نے فرمایا: تو افطار کرلو۔

پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا۔ راوی کا بیان ہے۔ کہ جب آپ باہر تشریف لائے۔ اور منبر پر بیٹھے۔ تو پانی کا ایک برتن منگایا۔ اور منبر پر بیٹھے بیٹھے پانی پیا۔ لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور آپ اپنا یہ فعل گویا انہیں دکھا رہے تھے۔ کہ جمعہ کے دن روزہ آپ نہیں رکھا کرتے۔ ... نیز مسند میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے عید کے دن کو روزے کا دن نہ بنایا کرو۔ سوا اس کے کہ اس سے پہلے یا بعد بھی روزے رکھ رہے ہو۔ اور ابن ابی شیبہ نے سفیان بن عیینہ سے انہوں نے عمران بن ظبیان سے انہوں نے حکیم بن سعید سے انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا۔

انہوں نے فرمایا: تم میں سے اگر کوئی مہینے میں کچھ روزے رکھنا چاہے۔ تو اسے چاہئے کہ جمعرات کا روزہ رکھ لیا کرے۔ اور جمعہ کو روزہ نہ رکھے۔ کیونکہ یہ کھانے پینے کا دن ہے۔ اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے دو دن جمع کر دے گا۔ ایک روزے کا دن (اجر) اور دوسرے عام مسلمانوں کے ساتھ قربانی کا دن"!

اور ابن جریر نے مغیرہ سے، انہوں نے ابراہیم سے ذکر کیا ہے کہ وہ جمعہ کے روزے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ تاکہ نماز کے لئے قوت حاصل ہو سکے۔

ہم کہتے ہیں۔ کہ جمعہ کے دن روزہ رکھنے میں کراہت کے تین وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ جو مذکور ہوا، لیکن ایک دن قبل یا بعد میں منضل کرنے سے یہ کراہت زائل ہو جاتی ہے۔ دوسرے

جمعہ کا دن دراصل یوم عید ہے۔ اور اسی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

اشکالات اور ان کا جواب

اس تعلیل پر دو اشکالات ہیں۔ ایک یہ کہ جمعہ کا روزہ حرام نہیں اور عید کے دن کا روزہ حرام ہے۔ دوسرے عدم افراد سے اس کی کراہت زائل ہو جاتی ہے۔

ان دو اشکالات کا جواب اس طرح دیا گیا کہ یہ سال کی عید نہیں بلکہ ہفتے کی عید ہے۔ اور تحریم سالانہ عید کے روزے کی ہے۔ اور جب ایک دن قبل یا بعد میں روزہ رکھا۔ تو کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ اب اس نے جمعہ اور عید کے باعث روزہ نہیں رکھا ہے۔ لہٰذا اس کی تخصیص سے پیدا ہونے والا اعتراض ختم ہو گیا۔ بلکہ (جمعہ کا روزہ) اس کے مسلسل روزوں کے ضمن میں آگیا۔ اسی پر امام احمد کی روایت محمول ہے جو انہوں نے مسند میں ذکر کی اور نسائی و ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے بشرطیکہ وہ صحیح بھی ہو۔ فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن افطار سے بہت ہی کم دیکھا۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اسے جواز پر محمول کیا جائے گا۔ جیسے اہل صحیح میں سے کسی نے روایت نہیں کیا۔ امام ترمذیؒ نے اسے غریب بتایا ہے۔ اس طرح یہ روایت صحیحہ کے معارض یا مقدم کیسے ہو سکتی ہے؟

تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ ایسا ذریعہ مسدود ہو جائے جس سے غیر دین کی باتیں دین میں شامل کر دی جاتی ہیں اور دینوی اعمال سے فارغ ہو کر بعض ایام کو محض عبادت کے لئے مخصوص کرنے کے معاملہ میں اہل کتاب سے تشبہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ جب باقی ایام کے مقابلہ میں اس کو افضیلت حاصل ہو گی۔ تو اس کے روزے پر ایک قوی استدلال بن جائے گا۔ اس طرح اس دن لوگوں کے مسلسل روزہ رکھنے اور دوسرے ایام کی نسبت اس دن مخصوص طور پر تہوار منانے سے ایک گمان (کہ یہ ایک مخصوص تہوار ہے) سا پیدا ہو جائے گا۔ یہ تصور شرح کے ساتھ ایک ایسا الحاق ہے۔ جو قبل ازیں اس میں نہ تھا یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام لیل کے لئے مختص کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کہ یہ تمام راتوں سے افضل ہے بلکہ بعضوں نے تو اسے لیلۃ القدر سے افضل قرار دیا ہے۔ اور امام احمدؒ سے مروی ہے کہ ایسا کرنے سے اس کا تخصص بالعبادۃ محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے شارع علیہ السلام نے اس رات کو قیام کیلئے مختص کرنے کو ممنوع قرار دیکر اس ذریعہ ہی کو مسدود کر دیا۔

. . . .

جمعہ کے دن آپ کون سی سورتیں معمولاً پڑھا کرتے تھے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں دو سورتیں الم تنزیل السجدۃ اور ھل اتی علی الانسان پڑھا کرتے تھے، کیونکہ یہ دونوں سورتیں گذشتہ اور آئندہ کے متعلق مبدا و معاد، حشر مخلوقات۔ قبروں سے اٹھنے اور جنت و دوزخ کی طرف جانے پر مشتمل ہیں۔ نہ کہ سجدہ کے باعث (پڑھا کرتے) جیسے کہ بعض جہلاء اور ناقص العلم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ کبھی اور سجدہ والی سورت کو بھی پڑھ لیا کرتے ہیں، اور ان کا اعتقاد بن چکا ہے۔ کہ جمعہ کی فجر کو ایک نماز سجدہ کے باعث افضلیت عطا کی گئی۔ اور جو ایسا نہ کرے۔ اس کا انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح بڑے بڑے اجتماعات مثلاً عیدوں وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی سورتوں کی تلاوت فرماتے۔ کہ جو توحید و مبدأ و معاد قصص انبیاء اور ان کی امتوں۔ ان کے اعمال کی تکذیب (و تصدیق) ان کے کفر اور انکی ہلاکت و شقاوت ان پر ایمان لانے والوں ان کی تصدیق اور ان کی نجات و عافیت پر مشتمل ہوں۔ جس طرح آپ عیدین میں سورت ق اور قرآن المجید۔ اقتربت الساعۃ وانشق القمر اور کبھی سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک حدیث الغاشیہ پڑھا کرتے تھے۔ اور جمعہ کے دن کبھی کبھی سورۂ جمعہ کی تلاوت فرماتے۔ کیونکہ اس سورۃ میں نماز جمعہ کے متعلق آیات اس کے لئے کوشش و سعی کرنے اور اعمال مانعہ کو ترک کرنا۔ اور (اللہ) کے ذکر کی کثرت کا بیان ہے، تاکہ دارین میں فلاح و کامرانی حاصل ہو۔ کیونکہ (اللہ) کا ذکر بھول جانا۔ دارین میں ہلاکت و تباہی کا موجب ہے دوسری رکعت میں آپ اذا جاءک المنافقون پڑھتے تاکہ امت کو نفاق جیسی برائی سے ڈرایا جائے اور انہیں آگاہ کیا جائے کہ ان کے اموال و اولاد انہیں نماز جمعہ سے اور اس کی یاد سے نہ روک دیں۔ اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ خسارے میں رہیں گے۔

خطبات کا موضوع کیا ہونا چاہیئے؟ نیز آپ لوگوں کو (اللہ کے راستہ) میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے۔ کہ جو ان کی سعادت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اور موت (کی کیفیات) سے ڈراتے۔ حالانکہ وہ (دنیا) کا دوام چاہتے تھے۔ رجعت چاہتے اور اس موت کو قبول نہ کرتے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی وفد کی آمد پر (تبلیغ) فرماتے: خیال یہ ہوتا۔ کہ انہیں قرآن مجید سنایا جائے۔ اور جہری نمازوں میں

قرأت طویل فرماتے ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ آپ مغرب کی نماز میں سورۃ اعراف سورۃ الطور سورۃ ق کی تلاوت فرماتے ، اور نماز فجر میں ایک سو آیت پڑھتے ۔

اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبات میں اصول اللہ ۔ اس کے فرشتوں ۔ کتب ۔ رسل اللہ کی ملاقات اور ۔ جنت و دوزخ کے ذکر کی وضاحت فرماتے ۔ اور (ان باتوں پر خطاب فرماتے) جو اللہ نے اولیاء کرام اور اہل طاعت کے لئے تیار کر رکھے ہیں ۔ اور جو اپنے اعداء اور نافرمانوں کے لئے مہیا کر رکھے ہیں ۔

اس طرح ایمان ۔ توحید اللہ تعالیٰ اور اس کی نشانیوں سے لوگوں کے قلوب بھر جاتے ۔ اور یوں نہ ہوتا جیسے دوسروں کے خطبات ہوا کرتے ہیں ۔ کہ مخلوقات کے مشترکہ امور مشتمل ہوتے ہیں ۔ جیسے زندگی دکھ آلام پر نوحہ خوانی ۔ موت کا خوف دلانا ۔ حالانکہ یہ ایسے امور ہیں ۔ جن سے قلب میں کچھ بھی ایمان باللہ توحید اور معرفت وغیرہ حاصل نہیں ہوتی ۔ نہ تذکیر بایام اللہ حاصل ہوتی ہے ۔ نہ دیدار الٰہی کی تڑپ پیدا ہوتی ۔ اس طرح سامعین سن کر واپس چلے جاتے ہیں ۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں حاصل کرتے ، جب وقت آتا ہے مرجاتے ہیں ۔ زر و مال تقسیم ہو جاتا ہے ۔ اور مٹی ان کے اجسام کو بوسیدہ کر دیتی ہے ۔ افسوس صد افسوس اس طرح کے خطبوں سے کونسا ایمان کون سی توحید ، معرفت اور علم نافع حاصل ہوا ۔ جو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے خطبات کو پڑھے گا ۔ تو محسوس کرے گا ۔ (کہ ان کے خطبات) ہدایت و توحید پروردگار جل وعز کی صفات کے تذکرہ اور دعوت الی اللہ اور کلیات ایمان کے اصول ۔ اور انعامات الٰہیہ کہ جن سے وہ اپنی مخلوق کو محبوب رکھتا ہے ۔ اور تذکرہ بایام اللہ کہ جن سے وہ اپنی قہاریت سے ڈراتا ہے ۔ نیز اس کے ذکر و شکر پر مشتمل ہیں ۔ تاکہ وہ اللہ کی عظمت وصفات اور اس کے اسمائے مبارکہ کا ذکر کریں ۔ (الغرض) (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ) انہیں اللہ کی طاعت و شکر و ذکر کا حکم فرماتے ۔ اس طرح سامعین (وعظ سن کر) واپس ہوتے ۔ تو وہ اللہ کے محب ہوتے اور خدا تعالےٰ ان سے محبت رکھتا ۔

خطباتِ نبوی

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ اور اس کی نوعیت و کیفیت

زمانہ گزرتا رہا اور نورِ نبوت نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ شرائع و اوامر نے رسموں کی صورت اختیار کر لی۔ ان کے اصل مقاصد و حقائق سے یکسر بے پروا ہو کر انہیں ادا کیا جانے لگا۔ لوگوں نے حسبِ دل خواہ صورتیں گھڑ لیں اور ان کی زیب و زینت میں لگ گئے۔ انہوں نے رسوم و اوضاع کو سنت قرار دے لیا، جو اس شرف کے سزاوار نہ تھے، وہ لایعنی مقاصد کے پیچھے چل پڑے۔ انہوں نے اپنے خطبوں کو مسجع اور علم بدیع سے مرصع کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا تعلقِ خاطر اور اصل مقصد کم بلکہ معدوم ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خطبات محفوظ ہیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ زیادہ تر قرآن مجید اور خصوصاً سورہ ق سے خطبہ دیا کرتے تھے۔ حضرت ام ہشام بنت حرث بن نعمان فرماتی ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات سے ہی سورہ ق حفظ کر لی ہے۔

آپ کی طرف ایک منسوب خطبہ

نیز حضرت علی بن زید بن جدعان کی ایک ضعیف روایت ہے کہ آپ کا جو خطبہ محفوظ ہے وہ یہ ہے:۔

اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آؤ، توبہ کرو، اس سے قبل کہ تمہیں موت آئے اور نیک کاموں میں عجلت کرو اور کثرتِ ذکر خفیہ اور علانیہ صدقات کے ساتھ اپنے اور اپنے پروردگار کے درمیان تعلق (محبت) پیدا کرو تمہیں اس کا اجر ملے گا، تم قابلِ ستائش قرار دیے جاؤ گے، تمہیں رزق ملے گا اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر جمعہ فرض کیا ہے۔ اس جگہ اس مہینے میں، اس سال میں یہ قیامت تک فرض (عین) رہے گا جو اس فرض کو ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو یا جس نے

میری زندگی میں یا میری وفات کے بعد اس سے انکار کیا یا از راہ استخفاف (معمولی بات سمجھ کر) اسے چھوڑ دیا اور اس کا کوئی عادل یا ظالم امام بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے پراگندہ کر دے گا اور اس کے کاموں میں برکت نہ دے گا۔ خبردار (یاد رکھو) کہ اس کی کوئی نماز نہیں۔ خبردار اس کا کوئی وضو نہیں، خبردار اس کا کوئی روزہ نہیں، خبردار اس کی کوئی زکوٰۃ نہیں خبردار اس کا کوئی حج نہیں۔ خبردار اس کے کاموں میں) کوئی برکت نہیں، جب تک وہ توبہ نہ کرے اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ نیز آپ کا مخصوص خطبہ یہ بھی منقول ہے۔

آپ کی طرف منسوب ایک اور خطبہ

الحمد للہ استعینہٗ واستغفرہٗ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا من یھدا اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضلل فلا ھادی لہٗ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ ارسلہٗ بالحق بشیراً ونذیراً بین یدی الساعۃ من یطع اللہ ورسولہٗ فقد رشد ومن یعصھما فانہٗ لا یضر الا نفسہٗ ولا یضر اللہ شیئاً (ابوداؤد)

یعنی: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں میں اس سے مدد چاہتا ہوں۔ اسی سے بخشش چاہتا ہوں، ہم اپنے نفس کی شرارتوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں (اللہ) نے انہیں حق کے ساتھ قیامت سے قبل بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر مبعوث فرمایا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ خوش بخت ہوا اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا اور اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

خطبات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ

جب آپ خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور آپ پر جلال کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ جیسے کوئی حملہ سے ڈرا رہا ہو۔ آپ فرمایا

کرتے تمہاری صبح یا شام (اور لیں)! (نیز) فرمایا کرتے کہ مجھے اور قیامت کو اس طرح ایک ساتھ بھیجا گیا جیسے یہ دو (انگلیاں ہیں) پھر درمیانی اور شہادت کی انگلی کو جوڑتے اور فرماتے:۔
اما بعد: بے شک سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہتر طریقہ سنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور تمام امور میں سے بد ترین بدعات ہیں اور بدعت گمراہی ہے۔"
پھر فرماتے کہ میں ہر مومن کا اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ (خیر خواہ) ہوں جس نے مال چھوڑا وہ اس کے اہل کا ہے اور جس نے قرضہ چھوڑا ہو تو وہ میری طرف اور میرے ذمے ہے۔" (مسلم)

آپ مختصر سا خطبہ دیتے اور نماز طویل کرتے، ذکر الٰہی کثرت سے کرتے اور جامع کلام فرماتے اور آپ فرمایا کرتے آدمی کی طویل نماز اور مختصر خطبہ اس کی فقاہت (سمجھ) کی علامت ہے اور آپ اپنے خطبات میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو قواعدِ اسلام اور شریعت سکھاتے۔
جب کبھی کسی کام کے حکم یا ممانعت کی ضرورت ہوتی تو آپ خطبہ میں بتا دیتے یا منع کر دیتے جیسا کہ خطبہ دیتے وقت ایک صحابی مسجد میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: دو رکعتیں پڑھ لو۔"

اسی طرح لوگوں کی گردنیں پھاندنے والے کو منع فرمایا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ کبھی کبھی آپ کسی ضرورت یا کسی صحابی کے سوال پر خطبہ منقطع کر دیتے اور وہ ضرورت یا حاجت پوری فرماتے پھر آپ خطبہ کی طرف لوٹ کر اسے مکمل فرماتے۔
بسا اوقات آپ کسی ضرورت سے منبر سے بھی اتر گئے۔ پھر واپس آ کر اسے مکمل فرمایا جیسا کہ حضرت حسن رضؓ و حسین رضؓ کو گود میں اٹھانے کے لیے آپ منبر سے اترے، انہیں گود میں لیا، پھر اسی طرح لیے لیے منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ مکمل فرمایا۔
کبھی آپ خطبہ میں کسی کو بلاتے اور فرماتے: اے فلاں بیٹھ جا، اے فلاں نماز پڑھ وغیرہ۔
خطبہ میں تقاضائے وقت وضرورت کے مطابق تقریر فرماتے۔ جب کسی کو آپ ضرورت مند یا بھوکا دیکھتے تو صحابہ رضؓ کو صدقے کا حکم دیتے اور ترغیب دیتے۔
خطبہ میں آپ دعا یا ذکر اللہ کے موقع پر شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے۔
جب بارش کم ہوتی تو خطبہ میں آپ بارش کے لیے دعا کرتے۔
جمعہ کے خطبہ میں آپ تاخیر کرتے، یہاں تک کہ لوگ جمع ہو جاتے، جب جمع ہو جاتے تو آپ

تنہا بغیر کسی طرح کے اظہار نخوت کے تشریف لاتے، نہ آپ کے آگے آگے کوئی ندا دے رہا ہوتا اور نہ آپ طیلسان (سبز چادر، خاص قسم کی) زیب تن کیے ہوتے۔ جب آپ مسجد میں تشریف لاتے تو پیش قدمی کر کے خود صحابہؓ کو سلام کرتے، جب منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی طرف چہرہ کر لیتے، انہیں سلام کرتے، پھر بیٹھ جاتے اور حضرت بلالؓ اذان شروع کر دیتے۔

جب (حضرت بلالؓ) اذان سے فارغ ہوتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے۔ اذان و خطبہ کے درمیان بغیر وقفہ کے کسی اور کام کی طرف متوجہ ہوئے بغیر خطبہ شروع کر دیتے۔

آپ تلوار یا کوئی چیز ہاتھ میں نہ لیتے بلکہ منبر بننے سے قبل تیر اور کمان پر ٹیک لگاتے لڑائی میں آپ کمان پر ٹیک لگایا کرتے تھے اور جمعہ کے موقع پر آپ عصا پر ٹیک لگاتے۔ آپ سے یہ مروی نہیں کہ آپ نے تلوار پر ٹیک لگائی ہو اور بعض جہلاء جو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ہمیشہ تلوار پر ٹیک لگایا کرتے تھے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دین تلوار سے قائم ہوا" یہ محض جہالت ہے۔ منبر کے بن جانے کے بعد آپ سے مروی نہیں کہ آپ نے تلوار یا تیر و کمان کے ذریعہ منبر پر قدم رنجہ فرمایا ہو اور نہ منبر بن جانے سے قبل آپ نے تلوار پر ٹیک لگائی۔ بلکہ (اس وقت) معمولاً آپ تیر و کمان پر ٹیک لگایا کرتے۔

آپ کے منبر میں تین سیڑھیاں تھیں اور آپ منبر بننے سے قبل ایک کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگایا کرتے اور جب آپ منبر کی طرف منتقل ہو گئے تو وہ کھجور کا تنا رو پڑا اور اہل مسجد نے اس کا گریہ سنا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے اور اسے چمٹا لیا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب کھجور کے تنے نے دیکھا کہ وہ جو وحی سن رہا تھا اب اس سے محروم ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب مفقود ہو گیا تو اس پر گریہ طاری ہو گیا۔

منبر کو مسجد کے درمیان نہیں بلکہ مغربی سمت میں دیوار کے قریب رکھا گیا اور منبر اور دیوار کے مابین ایک بکری کے گزر سکنے کا فاصلہ تھا اور جب آپ جمعہ کے علاوہ اس پر بیٹھتے یا جمعہ میں کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تو (صحابہؓ) کی طرف اپنا چہرۂ انور گھما لیا کرتے۔

خطبہ میں آپ کا معمول

جب آپ خطبہ دیتے تو کھڑے ہو جاتے۔ ذرا دیر خطبہ دینے کے بعد کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتے، پھر کھڑے ہو جاتے اور دوبارہ خطبہ دیتے۔

جب آپ خطبہ سے فارغ ہو جاتے تو حضرت بلالؓ اقامت کہتے اور آپؐ لوگوں کو قریب ہو جانے اور خاموش رہنے کا حکم دیتے اور فرماتے۔

"کہ اگر ایک آدمی اپنے ساتھی سے یہ کہے کہ "خاموش ہو جاؤ" تو اس نے بھی لغو (حرکت) کی۔ اس کا جمعہ غارت گیا۔

اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔

اور ابی بن کعبؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن تبارک پڑھی اور ہمیں ایام اللہ یاد دلائے۔ حضرت ابو الدرداءؓ یا حضرت ابوذرؓ نے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا، یہ سورۃ کب اتری ہے؟ کیونکہ میں نے اسے آج تک نہیں سنا تو انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا جب فارغ ہوئے تو کہنے لگے۔

میں نے تم سے پوچھا تھا کہ یہ سورۃ کب اتری تھی؟ تو تم نے مجھے بتایا نہیں!

انہوں نے فرمایا: آج تمہاری بالکل نماز نہیں ہوئی بلکہ محض لغویات کے مرتکب ہوئے۔

وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور یہ تمام ماجرا بیان کیا۔ نیز جو ابی بن کعبؓ نے کہا وہ بھی بتا دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابیؓ نے سچ کہا۔"

اسے ابن ماجہؒ اور سعید بن منصور نے ذکر کیا ہے اور اصل روایت مسند امام احمدؒ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ میں تین آدمی حاضر ہوتے ہیں۔ ایک تو لغو کام کرتا ہے۔ وہی اس کا حصہ ہے اور ایک اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے قبول کر لیتا ہے اور چاہے روک لیتا ہے اور ایک آدمی خاموشی اور سکوت کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ لوگوں کی گردنیں نہیں پھاندتا، نہ کسی کو ایذا دیتا ہے۔ تو اس کی (نماز جمعہ) دوسرے جمعہ تک کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اور تین دن کا مزید (اجر) ملتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا۔

یعنی "جس نے ایک نیکی کی اسے دس گنا اجر ملے گا۔"

(مسند امام احمدؒ، ابوداؤدؒ)

نمازِ جمعہ سے پیشتر

سنتیں پڑھنی چاہئیں یا نہیں؟

حضرت بلالؓ اذان سے فارغ ہو جاتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ شروع کر دیتے اور کوئی آدمی اس وقت نماز نہ پڑھتا۔ صرف ایک ہی اذان ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ جمعہ نمازِ عید کی طرح ہے جس سے پہلے کوئی سنت نہیں۔ علمائے کرام کے اقوال میں سے یہی زیادہ صحیح قول ہے اور سنت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے تشریف لاتے اور جب منبر پر چڑھتے تو حضرت بلالؓ جمعہ کی اذان دیتے اور جب اذان ختم ہوتی تو کسی وقفہ کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینا شروع کر دیتے۔ یہ وہ واقعات ہیں جنہیں آنکھوں نے دیکھا۔ پھر سنتیں پڑھنے کا کب موقع لوگوں کو ملتا تھا؟

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت بلالؓ کے اذان سے فارغ ہوتے ہی سب لوگ کھڑے ہو جاتے اور دو رکعت سنت ادا کرتے تو ایسا خیال کرنے والا سنت سے بالکل جاہل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بتا چکے کہ جمعہ سے قبل کوئی سنت نہیں۔ امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے اور مشہور قول کے مطابق امام احمدؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال

امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ کرام، جن کا خیال یہ ہے کہ جمعہ کی سنتیں ہیں، ان کی ایک دلیل تو یہ ہے۔ یہ (جمعہ) ظہر مقصورہ (قصر شدہ) ہے۔ اس لیے اس پر احکامِ ظہر نافذ ہوں گے۔ یہ بہت ہی ضعیف دلیل ہے کیونکہ جمعہ ایک مستقل نماز ہے جو نمازِ ظہر سے جہر قرأت، تعداد رکعات، خطبہ، وقت اور شروطِ معتبرہ کے لحاظ سے یکسر مختلف ہے اور بعض نے صحیح بخاری کی روایت سے استدلال کیا ہے جو انہوں نے باب الصلوٰة

قبل الجمعہ و بعدہا" میں روایت کی ہے کہ ہمیں عبداللہ بن یوسف سے، انہیں مالک سے، انہیں نافع سے، انہیں حضرت ابن عمرؓ سے روایت پہنچی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں ظہر سے قبل اور بعد میں دو رکعت پڑھا کرتے اور مغرب کے بعد دو رکعت پڑھتے اور عشاء سے قبل دو رکعت پڑھتے اور جمعہ کے بعد کچھ نہ پڑھتے پھر گھر آکر آپ دو رکعتیں پڑھتے۔ یہ دلیل نہیں بن سکتی۔ اور بخاریؒ نے اس میں جمعہ سے قبل سنن کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ اُن کا مطلب تو یہ ہے کہ کیا جمعہ سے قبل یا بعد میں کوئی نماز پڑھنا مکروہ ہے؟ پھر یہ روایت بیان کی۔ اور اس میں بھی صرف جمعہ کے بعد سنن کا تذکرہ کیا۔ اور اس سے قبل کچھ بیان نہیں کیا۔

کیا جمعہ ظہر کا بدل ہے؟

بعض کا خیال یہ ہے کہ چونکہ جمعہ ظہر کا بدل ہے اور ظہر سے قبل اور بعد میں سنتیں ازروئے حدیث مروی نہیں اس لیے جمعہ میں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے اور جو یہ فرمایا کہ آپ جمعہ کے بعد گھر جانے کے بعد سنتیں پڑھا کرتے تو اس سے صرف جمعہ کے بعد سنتوں کا وقت بتانا مقصود ہے یہ غلط خیال ہے۔ کیونکہ امام بخاریؒ نے باب التطوع بعد المکتوبۃ" میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ ظہر سے قبل دو رکعتیں، ظہر کے بعد دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں عشاء کے بعد دو رکعتیں اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں۔ اس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ صحابہؓ کے نزدیک جمعہ کی نماز ظہر کی نماز سے علیحدہ ایک مستقل نماز ہے ورنہ اسے ظہر کے تحت سمجھتے ہوئے اس کو علیحدہ طور پر پیش نہ کرتے اور جب اس کی سنن کا ذکر بعد میں ہوا تو معلوم ہوا کہ جمعہ سے پہلے کوئی سنت نہیں۔ اور بعض نے ابوداؤدؒ کی روایت سے استدلال کیا ہے، فرمایا: ہمیں مسدد نے انہیں اسماعیل نے انہیں ایوب نے بتایا انہیں حضرت نافعؒ سے روایت پہنچی کہ حضرت ابن عمرؓ جمعہ سے پہلے طویل نماز پڑھا کرتے اور بعد ازاں اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے اور مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جمعہ سے پہلے بھی سنتیں ہیں بلکہ ان کے اس قول "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، مسجد میں نہیں پڑھتے تھے اور یہ افضل ہے جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

سنن میں حضرت ابن عمرؓ کے متعلق منقول ہے کہ جب وہ مکہ میں تھے تو انہوں نے جمعہ کی

نماز پڑھی، گھر میں تشریف لائے اور دو رکعت (سنن) پڑھیں مگر مسجد میں نہ پڑھیں۔ ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کیا کرتے تھے۔ رہا جمعہ سے قبل حضرت ابن عمرؓ کی طوالت نماز تو مطلقاً نوافل تھے اور جو آدمی بھی جمعہ کے لیے حاضر ہو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ امام کے آنے تک نماز میں مشغول رہے۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت نبیشہ ہذلی کی روایت گزر چکی جو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بتایا کہ جو جمعہ کے دن غسل کرے اور مسجد میں حاضر ہو پھر جس قدر اس کے مقدر میں ہے نماز پڑھے، پھر خاموش رہے۔ یہاں تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہو جائے، پھر اس کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اس کے اور دوسرے جمعہ کے درمیان تک جتنے اس کے (گناہ) ہوں گے وہ بخشے جائیں گے اور تین دن کا مزید (اجر) ملے گا اور نبیشہ ہذلیؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان جمعہ کے دن غسل کرے، پھر مسجد کی طرف اس طرح حاضر ہو کہ (راستہ میں) کسی کو ایذا نہ دے۔ اب اگر امام کو مسجد میں حاضر نہ دیکھے تو حسبِ استطاعت نماز پڑھے اور اگر امام آچکا ہو تو سنے اور خاموش رہے۔ یہاں تک کہ امام جمعہ اور تقریر ختم کرے اگر اس جمعہ کو اس کے تمام سابقہ گناہ نہ بھی بخشے گئے تو بھی اس جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ کے گناہوں کا کفارہ ضرور ہو گا، یہی صحابہؓ کا طریق مسنونہ تھا۔

ابن عمرؓ کے طرزِ عمل سے استدلال

ابن منذر فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ملی ہے کہ وہ جمعہ سے قبل بارہ رکعتیں پڑھا کرتے اور ابن عباسؓ آٹھ پڑھا کرتے۔

یہ تمام مباحث اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ مطلقاً نوافل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مروی تعدادِ رکعات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ترمذیؒ نے جامع میں اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ وہ جمعہ کے دن نمازِ جمعہ سے قبل چار رکعت اور اس کے بعد چار رکعتیں پڑھا کرتے۔ ابن مبارکؒ اور ثوریؒ کا یہی مذہب ہے۔ اور اسحٰقؒ بن ابراہیمؒ بن ہانی ہشاپوری فرماتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ کو دیکھا کہ جب جمعہ کا دن ہوتا تو وہ نماز پڑھتے رہتے یہاں تک کہ سورج ڈھلنے کے قریب ہو جاتا۔ جب زوال قریب ہو جاتا تو وہ رک جاتے یہاں تک کہ مؤذن اذان دیتا جب اذان ہو جاتی تو اُٹھتے تو دو یا چار رکعتیں پڑھتے اور دو رکعتوں پر سلام سے فصل کرتے۔ چنانچہ جب فرض نماز پڑھ لیتے تو مسجد میں ٹھہرتے پھر بعد میں مسجد سے نکلتے اور کسی چھوٹی سی قریب کی مسجد میں جاتے اور دو رکعتیں مزید پڑھتے۔

اس طرح حضرت علی کی روایت کے مطابق یہ چھ رکعتیں بن گئیں۔ بسا اوقات آپ ان چھ کے بعد یا کم و بیش مزید پڑھتے۔

بعض لوگوں نے حدیث سے اس کے مسنون ہونے پر استدلال کیا ہے کہ سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ہمیں محمد بن یحییٰ سے انہیں یزید بن عبداللہ سے انہیں بقیہ سے انہیں مبشر بن عبید سے انہیں حجاج بن ارطاۃ سے انہیں عطیہ عوفی سے انہیں ابن عباس سے روایت پہنچی۔ انہوں نے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے قبل چار رکعتیں پڑھتے جن میں کوئی فصل نہ ہوتا۔ ابن ماجہؒ نے "باب الصلوٰۃ قبل الجمعہ" میں ذکر کیا ہے۔

اس روایت میں کئی انصرام ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ بقیہ بن ولید مدلسین کا امام ہے، اس کا سماع صراحت سے مذکور نہیں اور وہ معنعن بھی ہے۔

۲۔ دوسرے مبشر بن عبید منکر راوی ہے۔

۳۔ تیسرے حجاج بن ارطاۃ ضعیف مدلس ہے۔

۴۔ چوتھے عطیہ عوفی کے متعلق امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہشیمؒ اس میں کلام فرماتے تھے اور امام احمدؒ نے اسے ضعیف قرار دیا۔ اور عبداللہ بن احمدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابیؓ کو فرماتے سنا کہ ایک شیخ جسے مبشر بن عبید کہتے تھے حمص میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کوفی ہے اور اس سے بقیہ اور ابو مغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی تمام احادیث موضوع اور جھوٹ (کا پلندہ) ہیں۔ امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ مبشر بن عبید متروک راوی ہے اس کی روایات کا اتباع نہیں کیا جاتا۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ عطیہ عوفی قابل استدلال نہیں اور مبشر بن عبید حمص وضع روایات سے منسوب ہے اور حجاج بن ارطاۃ بھی قابلِ حجت نہیں ہے۔

اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب جمعہ کی نماز پڑھ لیتے تو اپنے گھر تشریف لے جاتے اور دو رکعت سنت پڑھتے اور حکم دیتے کہ جو پڑھ لے وہ اس کے بعد چار پڑھے۔

ہمارے شیخ ابو عباس ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسجد میں پڑھتے تو چار رکعتیں پڑھے اور اگر اپنے گھر میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھے میں کہتا ہوں کہ احادیث کا یہی مفہوم ہے اور ابو داؤدؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب وہ مسجد میں پڑھتے تو چار رکعتیں ادا کرتے۔ اور جب گھر میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جب تم میں سے کوئی جمعہ (کی نماز) پڑھے تو اُسے چاہیے کہ اس کے بعد چار رکعتیں پڑھ لے۔ واللہ اعلم![1]

---

[1] یہ اور اس طرح کے دوسرے مباحث دراصل فقہی مسائل ہیں، علمی طور پر بحث و گفتگو دوسری چیز ہے، لیکن اگر فقہی آپ یہ مسئلہ درکار ہو تو پھر کتب فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، ورنہ غلط روی اور غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

نماز عیدین

نماز عید کے لیے آپؐ ایک راستے سے جاتے دوسرے سے آتے تھے۔

عید کی نماز ہمیشہ عید گاہ میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ میں نماز (عید) پڑھا کرتے۔ یہ عید گاہ (جائے نماز) مدینہ کے شرقی دروازہ کے پاس تھی۔ یہ وہی عید گاہ ہے جہاں حاجیوں کا محمل رکھاجاتا ہے۔

مسجد (نبوی) میں آپ نے صرف ایک مرتبہ جب بارش ہوگئی تھی نماز عید پڑھی چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو وہیں نماز پڑھائی۔ بشرطیکہ یہ روایت، — جو سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں وارد ہوئی ہے، — ثابت بھی ہو۔

آپ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ نے ہمیشہ دونوں عیدوں کی نماز یہیں پڑھی۔ (عید گاہ) جاتے وقت آپ سب سے بہترین لباس زیب تن فرماتے۔ آپ کے پاس ایک لباس تھا جسے عیدین اور جمعہ کے موقع پر زیب تن فرماتے۔ ایک بار آپ نے دو سبز چادروں اور ایک بار سرخ چادر کا استعمال فرمایا۔ لیکن یہ چادر بالکل سرخ نہ ہوگی جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے چادر (برد) کا لفظ نہ استعمال ہوتا۔ واقعہ یہ ہے اس میں فقط سرخ دھاریاں تھیں۔ جیسے عام طور پر یمنی چادریں ہوا کرتی ہیں۔ اس وجہ سے اسے سُرخ چادر سے تعبیر کر دیا گیا۔ ورنہ یہ کیسی تعارض کے آپ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے زرد اور سُرخ لباس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بدن پر جب دو سُرخ کپڑے دیکھے تو آپؐ نے انہیں جلادینے کا حکم دیا۔ پس یہ ناممکن تھا کہ اس رنگ میں اس قدر سخت ترین کراہت بھی پائی جائے اور پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے استعمال کریں اور یہی چیز اس بات کی شاہد ہے کہ سرخ لباس حرام یا شدید تر مکروہ ہے۔

آپ نماز عیدالفطر کے لیے جانے سے قبل چند کھجوریں تناول فرمالیتے۔ آپ انہیں وتر

(طاق عدد) میں کھاتے۔ البتہ عید الضحیٰ کے موقع پر عید گاہ سے واپس آجانے تک کچھ نہ کھاتے۔ (واپس آنے کے بعد) آپ اپنی قربانی کے گوشت میں سے کچھ تناول فرماتے۔

آداب نمازِ عیدین دونوں عیدوں کی نماز (سے قبل) آپ غسل فرماتے (صحیح حدیث) آپ پیدل تشریف لے جاتے، نیزہ آپ کے آگے آگے لے جایا جاتا جب عید گاہ میں پہنچتے تو آپ کے سامنے نصب کر دیا جاتا تاکہ اس کی آڑ بنا کر نماز پڑھ سکیں۔ کیونکہ ان دنوں عید گاہ ایک کھلا میدان ہوتا تھا، جس میں کوئی عمارت یا دیوار موجود نہ تھی اور آپ کا حربہ (نیزہ) ہی آپ کے لیے سُترہ کا کام دیتا تھا۔

آپ عید الفطر کی نماز میں تاخیر فرماتے اور عید الضحیٰ کی نماز میں تعجیل فرماتے حضرت ابن عمرؓ اتباعِ سنت کی شدت کے باعث طلوعِ شمس سے قبل گھر سے نہ نکلتے اور گھر سے نکلتے ہی عید گاہ تک تکبیر کہتے رہتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں پہنچتے تو اذان، اقامت یا الصلوٰۃ جامعۃ جیسے کلمات کہے بغیر ہی نماز شروع فرما دیتے۔ اور سنت یہی ہے کہ ان میں سے کوئی فعل نہ کیا جائے آپ اور آپ کے صحابہؓ جب عید گاہ میں پہنچتے تو عید گاہ سے قبل کوئی (نفل وغیرہ) نہ پڑھتے اور نہ بعد میں پڑھتے اور خطبہ سے پہلے نماز شروع کرتے۔ اس طرح آپ دو رکعتیں ادا کرتے۔ پہلی رکعت میں تکبیر اولیٰ سمیت سات مسلسل تکبیریں کہتے اور ہر دو تکبیروں کے درمیان ایک ہلکا سا وقفہ ہوتا۔ تکبیرات کے درمیان آپ سے کوئی مخصوص ذکر مروی نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ اتباعِ سنت کی شدت کی وجہ سے ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے تھے۔ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیریں ختم فرماتے تو قرأت شروع کرتے۔ یعنی سورۃ فاتحہ پھر اس کے بعد سورۃ ق والقرآن المجید ایک رکعت میں پڑھتے اور دوسری رکعت میں اقتربت الساعۃ وانشق القمر پڑھتے بسا اوقات آپ دو رکعتوں میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک حدیث الغاشیۃ پڑھتے۔ یہ آپ سے صحیح طور پر مروی ہے، اس کے علاوہ صحیح روایت میں کچھ اور مروی نہیں، جب قرأت سے فارغ ہو جاتے تو تکبیر کہتے اور رکوع میں چلے جاتے۔ پھر ایک رکعت مکمل کرتے اور سجدہ سے اُٹھتے (پھر) پانچ بار مسلسل تکبیریں کہتے جب تکبیریں مکمل کر لیتے تو قرأت شروع کر دیتے۔ اس طرح ہر رکعت کے آغاز میں تکبیریں کہتے اور بعد میں قرأت کرتے۔

امام ترمذیؒ سے حضرت کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف کی روایت سے منقول ہے کہ

انہیں اُنکے والد سے انہیں اپنے دادا سے روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کے موقع پر پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں کہیں اور دوسری میں قرأت سے قبل پانچ تکبیریں کہیں اور دوسری میں قرأت سے قبل پانچ تکبیریں کہیں۔ ترمذیؒ کا قول ہے کہ میں نے محمد یعنی امام بخاریؒ سے اس روایت کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس باب میں اس سے زیادہ صحیح روایت کوئی اور نہیں اور میں بھی اسی پر فتویٰ دیتا ہوں۔

تذکیر و موعظت کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز مکمل کر لیتے تو فارغ ہونے کے بعد لوگوں کے مقابل کھڑے ہو جاتے۔ لوگ صفوں پر بیٹھے ہوتے تو آپ ان کے سامنے وعظ کہتے، وصیت کرتے اور امر و نہی فرماتے اور اگر لشکر بھیجنا چاہتے تو اسی وقت بھیجتے یا کسی بات کا حکم کرنا ہوتا تو حکم فرماتے۔ عیدگاہ میں کوئی منبر نہ تھا جس پر چڑھ کر (وعظ فرماتے ہوں) نہ مدینہ کا منبر یہاں لایا جاتا، بلکہ آپ زمین پر کھڑے ہو کر تقریر کرتے۔

حضرت جابرؓ بتاتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید کے دن نماز میں حاضر ہوا تو آپ نے خطبہ سے پہلے اذان اور اقامت کے بغیر نماز شروع کی۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت بلالؓ کے کاندھے کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور اللہ سے ڈرنے کا حکم فرمایا، اُس کی اطاعت کی رغبت دلائی اور نصیحت کی اور پھر (انعاماتِ خداوندی وغیرہ) یاد دلائے۔ پھر آپ خواتین کی طرف تشریف لے گئے۔ اور انہیں نصیحت کی (متفق علیہ)

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الضحٰی کے موقع پر عیدگاہ میں جاتے تو سب سے پہلے نماز پڑھتے پھر فارغ ہو کر لوگوں کے سامنے تشریف لاتے اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوتے (مسلم) حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن نکلتے تو لوگوں کے ساتھ دو رکعت نماز (عید) پڑھتے، پھر سلام پھیر کر اپنی سواری پر چڑھ کر لوگوں کے سامنے تشریف لاتے، لوگ بیٹھے ہوتے ان سے آپ فرماتے صدقہ کرو یہ سن کر اکثر عورتیں مختلف اشیاء انگوٹھی اور بندوں کا صدقہ کرتیں[1]۔ اور اگر آپ کو کوئی ضرورت

---

[1] اس حدیث سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ شوہروں کو صدقہ کی ترغیب دیتے، نہ کہ عورتوں کو، یا یہ ہوتا کہ عورتیں یہ ارشاد سن کر، اپنے شوہروں تک آپ کا یہ ارشاد پہنچاتیں اور وہ جو کچھ دینا چاہتے دے دیتے۔ لیکن عورتوں (باقی ص۳۰۲ پر)

ہوتی مثلاً کسی (وفد یا لشکر) کو بھیجنا ہوتا تو آپ اسے سرانجام دیتے ورنہ واپس تشریف لے جاتے اور صحیحین میں بھی حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور سب سے پہلے نماز پڑھی، پھر لوگوں کے سامنے خطبہ دیا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہو گئے تو آپ اتر پڑے، پھر عورتیں حاضر ہوئیں تو انہیں نصیحت کی (الحدیث) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کبھی منبر پر اور کبھی سواری پر خطاب فرماتے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے لیے کچی اینٹوں کا یا مٹی کا کوئی منبر بنا دیا گیا ہو۔ ان دونوں روایتوں کی صحت میں کوئی شک بھی نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسجد (نبوی) سے منبر نہیں لے جایا جاتا تھا سب سے پہلے جس نے اُسے (مسجد نبوی) سے نکالا وہ مروان بن حکم (اموی) تھا۔ اس کی مخالفت کی گئی۔ رہا کچی اینٹوں یا مٹی کا منبر تو سب سے پہلے مروان کی امارت کے تحت مدینہ میں کثیر بن صلت نے (منبر) بنایا جیسا کہ صحیحین میں ہے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ میں کسی اونچی جگہ کھڑے ہو جاتے اسے (چبوترہ کہا جاتا تھا) پھر آپ وہاں سے اتر کر عورتوں کی طرف تشریف لاتے اور ان کے سامنے خطاب اور وعظ فرماتے اور نصیحت فرماتے۔

خطبات کا آغاز حمد و ثنا سے

آپ تمام خطبات الحمد للہ (اللہ کی حمد و ثنا) سے شروع کرتے کسی بھی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آپؐ نے عیدین کا خطبہ تکبیر سے شروع کیا ہو، سنن ابن ماجہؒ میں حضرت سعدؓ سے مروی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ میں کثرت سے تکبیر کہا کرتے اور عیدین کے خطبات میں تو ان کی اور بھی کثرت ہو جاتی۔ یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ خطبات عیدین کا افتتاح تکبیروں سے آپ کرتے تھے، بلکہ عیدین و استسقاء کے خطبات کے افتتاح میں لوگوں کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان کا افتتاح تکبیر سے ہوگا بعض کہتے ہیں کہ خطبہ استسقاء کا افتتاح استغفار سے ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ الحمد سے ہوگا اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا فرمان ہے کہ بہتر یہی (موخر صورت) ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

(بقیہ حاشیہ ص۳۰۱) نے بھی ایسا کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ ارشاد نبوی سُنا اور وہیں بیٹھے بیٹھے، جو چیزیں پاس تھیں ان میں سے جو چاہا دے دیا، یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ جو مال بیوی کا ہو، — خواہ ذاتی طور پر یا شوہر کا دیا ہوا — اس پر تصرف میں وہ شوہر کی اجازت کی محتاج نہیں ہے، بلکہ بطورِ خود جو چاہے کرسکتی ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

فرمایا ہے کوئی کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہ ہو گا وہ بے کار اور رائگاں ہے۔
آپ اپنے تمام خطبات الحمد اللہ (اللہ کی حمد) سے شروع کرتے۔ آپ نے تمام حاضرین کو اجازت دی، چاہیں تو بیٹھیں اور چاہیں تو چلے جائیں اور اس کی اجازت دی کہ اگر جمعہ کے دن عید آجائے تو جمعہ کے باعث نمازِ عید مختصر کر دیں۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم (عید گاہ میں) جاتے وقت مختلف راستوں سے آتے جاتے۔ ایک راستے سے تشریف لاتے اور دوسرے رستے سے جاتے۔ بعض نے اس کا مقصد یہ بیان کیا ہے" تاکہ دونوں راستوں کے مکینوں کو سلام کر سکیں" اور بعض کے نزدیک مقصد یہ تھا کہ دونوں گروہ آپ کی برکت حاصل کر سکیں"۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ دونوں راستوں کے حاجت مندوں کی ضرورت پوری کر سکیں۔ ایک قول کے مطابق اس طرزِ عمل کا منشا یہ تھا کہ تمام راستوں اور شاہراہوں میں اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو سکے"۔ ایک قول کے مطابق یہ تھا کہ اسلام اور اہلِ اسلام کی عزت و شوکت، نیز اس کے شعائر کا قیام دیکھ کر منافقین جل اٹھیں اور ایک قول کے مطابق مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ زمین کا ہر ٹکڑا گواہی دے۔ کیونکہ مسجد اور عید گاہ میں جانے والے کے ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند ہوگا اور دوسرے قدم پر ایک گناہ معاف ہوگا۔ اسی طرح وہ گھر لوٹ کر آئے گا۔ کہتے ہیں کہ یہی زیادہ صحیح ہے۔
نیز مروی ہے کہ آپ عرفہ کے دن فجر کی نماز سے لے کر ایامِ تشریق کے آخری دن کی نماز عصر تک اس طرح تکبیریں کہتے۔
اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔

نماز کسوف

سورج گہن کے موقع پر آں حضرتؐ کا اسوہ

نماز کسوف آپؐ نے کس طرح پڑھی؟ جب سورج گہن میں آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیز قدم اٹھاتے، گویا سراسیمگی کے عالم میں پشت مبارک پر چادر ڈالے برآمد ہوتے (ایک مرتبہ) کسوف (سورج گہن) کی کیفیت یہ تھی کہ دن کے شروع میں دو یا تین نیزے تک آفتاب بلند ہوا تھا کہ گہن میں آگیا۔ فوراً ہی آپؐ (مسجد) میں آئے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ اور ایک طویل سورت پڑھی اور جہر (بہ آواز بلند) سے تلاوت کی۔ پھر رکوع کیا اور دیر تک رکوع میں رہے، پھر رکوع سے سر اٹھایا اور دیر تک کھڑے رہے، لیکن یہ قیام پہلے قیام سے کم تھا۔ جب سر اٹھایا تو فرمایا:-

سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔

یعنی: جس نے اللہ کی تعریف کی۔ اللہ نے اُس کی سن لی۔ اے ہمارے پروردگار تو ہی تعریف کا سزاوار ہے۔

پھر قرأت شروع فرمائی، پھر رکوع کیا جو دیر تک جاری رہا۔ لیکن رکوع پہلے رکوع سے کم (طویل) تھا۔ پھر رکوع سے سر اٹھایا، پھر ایک طویل سجدہ کیا اور اسے خوب طول دیا۔ پھر دوسری رکعت میں بھی پہلی رکعت کی طرح کیا۔ اس طرح ہر رکعت میں دو رکوع اور دو سجدے بن گئے۔ گویا آپ نے دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار سجدے کیے۔

آپؐ نے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کیا اس نماز میں آپ نے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کیا اور ارادہ کیا کہ جنت میں سے (انگور کا) ایک خوشہ

توڑلیں اور وہ (صحابہؓ) کو دکھائیں اور آگ میں دوزخیوں کو بھی دیکھا (نیز) ایک عورت (کو دوزخ میں) دیکھا۔ کہ ایک بلی اسے نوچ رہی ہے (جسے بے دردی سے) اس نے باندھ دیا تھا، یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مرگئی اور عمرو بن مالک کو دیکھا جو آگ کے اندر اپنی ایڑیاں گھسیٹ رہا ہے اور یہ پہلا آدمی تھا جس نے دینِ ابراہیم علیہ السلام کو بدل دیا اور اس میں حاجیوں کے ایک چور کو عذاب میں مبتلا دیکھا۔

نماز سے فراغت کے بعد آپ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

"بے شک سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ یہ کسی کی موت یا پیدائش پر گہن میں نہیں آتے۔ اس لیے جب تم یہ (صورت) دیکھو تو اللہ تعالیٰ کو پکارو، تکبیر کہو، نماز پڑھو اور صدقہ کرو۔ اے امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، خدا کی قسم خدا سے زیادہ کسی کو اس پر غیرت نہیں آتی کہ اس کا بندہ زنا کرے، یا اس کی بندی زنا کرے۔ اے امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی قسم جو مجھے معلوم ہے اگر تمہیں بھی معلوم ہوتا تو تم کم ہنستے اور زیادہ روتے"

نیز اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"میں نے اس جگہ وہ چیز دیکھ لی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ جنت کا ایک خوشہ توڑلوں۔ جب تم نے مجھے آگے بڑھتے دیکھا تھا اور میں نے دوزخ کو بھی دیکھا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے سے سخت تر ہو رہا تھا۔ جب تم نے مجھے پیچھے ہٹتے دیکھا تھا۔ ایک لفظ یہ ہے کہ میں نے آگ کو دیکھا اور آج سے زیادہ ہولناک منظر کبھی نہیں دیکھا"

اور میری طرف وحی کی گئی کہ قبروں میں تم آزمائے جاؤ گے یا قرب آمد دجال کے زمانے میں کوئی تم میں سے کسی کے پاس آئے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ اس آدمی کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ تو مومن — یا فرمایا کہ یقین رکھنے والا (موقن) — کہے گا کہ (یہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ ہمارے پاس دلائل اور ہدایت لے کر تشریف لائے ہم نے قبول کیا۔ ایمان لائے اور اطاعت کی تو اس سے کہا جائے گا سو جا تو نیک ہے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تو مومن تھا۔ اور منافق — یا فرمایا کہ مرتاب (شک کرنے والا) کہے گا، میں نہیں جانتا۔ میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا تو میں نے بھی وہی کہہ دیا"

دوسری روایت میں جو امام احمد بن حنبل نے تخریج کی ہے یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے جب سلام پھیرا تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور پھر شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ (محمد صلعم) اس کے بندے، اس کے رسول ہیں۔ پھر فرمایا:۔

"اے لوگو! میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں (یہ بتاؤ) کیا تم جانتے ہو کہ میں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کی تبلیغ میں کچھ کمی کی؟

ایک آدمی کھڑا ہو گیا اس نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دے اور آپ نے اپنی امت کو نصیحت فرمائی۔ اور جو آپ پر ذمہ داری ڈالی گئی تھی پوری کردی"۔

پھر آپ نے فرمایا، مابعد بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سورج

کسوف وخوف کا تعلق کسی کی زندگی یا موت سے نہیں

یا اس چاند کا گہن یا ان ستاروں کا اپنے مطالع سے ہٹ جانا اہلِ زمین کے بڑے بڑے لوگوں کی موت کے باعث ہوتا ہے۔ یقیناً ان لوگوں نے جھوٹ بولا ہے یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نشانیاں ہیں اس کے بندے ان سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کون تائب ہوتا ہے؟ خدا کی قسم جب میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا تو میں نے دنیا وآخرت میں تمہارے ساتھ ہونے والے واقعات دیکھے اور خدا خوب جانتا ہے کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک تیس کذاب (از حد جھوٹے) نہ آجائیں۔ آخری (کذاب) کانا دجالی ہوگا جس کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔ گویا کہ ابو تحیی کی آنکھ ہو۔ اور جب وہ خروج کرے گا تو جلدی ہی اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگے گا تو جو اس پر ایمان لائے گا، اس کی تصدیق کرے گا اور اس کی اتباع کرے گا اس کا گزشتہ کوئی نیک عمل اسے فائدہ نہ دے گا اور جو اس کا انکار کرے گا، اس کی تکذیب کرے گا۔ اس سے کسی گزشتہ برائی (غلطی) پر مواخذہ نہ ہوگا اور وہ حرم شریف اور بیت المقدس کے علاوہ بہت جلد ساری زمین پر گھوم جائے گا۔ اور وہ مسلمانوں کا بیت المقدس میں محاصرہ کرے گا جس سے یہ بہت زیادہ دہشت زدہ ہو جائیں گے، ان پر سراسیمگی طاری ہو جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے لشکر کو ہلاک کرے گا۔ یہاں تک کہ دیوار کی بنیاد یا درخت کی جڑ سے آواز آئے گی۔

اے مسلمان، اے مومن یہ یہودی ہے۔

(یا فرمایا، کہ یہ کافر ہے) آ اور اسے قتل کردے۔

مروی ہے کہ آپؐ نے دوسرے طریقوں پر بھی نماز کسوف ادا کی ہے۔ مثلاً ہر رکعت میں تین

رکوع اور ہر رکعت میں چار رکوع اور ایک صورت یہ بھی تھی جیسے عام نماز کی ہوتی ہے کہ ہر رکعت میں ایک رکوع ہو لیکن کبار ائمہ اس کی صحت کے قائل نہیں۔ جیسے امام احمدؒ، امام بخاریؒ اور شافعیؒ اسے غلط سمجھتے ہیں۔

شافعیؒ کہتے ہیں کہ ان سے ایک آدمی نے سوال کیا۔

بعض لوگوں کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر رکعت میں تین رکوع کیے۔

شافعی کہتے ہیں میں نے سائل سے دریافت کیا، آیا تمہاری بھی یہی رائے ہے؟ اس نے کہا نہیں تو! لیکن آپ اس کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے، جبکہ یہ آپ کی دو رکعت والی روایت میں ایک رکوع زیادہ بتایا گیا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یہ ایک طرح سے منقطع ہے۔ اور ہم متفرد پر منقطع کو ثابت نہیں کرتے۔ لہٰذا ہم اس وجہ کو قطعاً غلط سمجھتے ہیں۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں شافعیؒ کا منقطع سے مطلب عبید بن عمیر کا قول ہے اور محدثین کا ایک گروہ تعدد رکوع میں روایات کی تصحیح کرتا ہے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار (نماز کسوف) پڑھی۔ تو یہ تمام صورتیں جائز ہوں گی اس طرف اسحٰق بن راہویہ، محمد بن اسحاق بن خزیمہ، ابوبکر بن اسحاق ضبعی اور ابو سلیمان خطابی گئے ہیں اور ابن منذرؒ نے بھی اسے مستحسن سمجھا ہے اور امام بخاریؒ و شافعیؒ نے جو روایات ہیں ترجیح دی ہے وہ زیادہ اولیٰ ہے اور میں بھی حضرت عائشہؓ کی روایت کی طرف جاتا ہوں اور اکثر روایات اسی پر مبنی ہیں اور یہی مذہب ابوبکرؓ اور قدماء کا ہے اور اسی کو استاذ ابو العباس بن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے اور باقی تمام روایات کو وہ ضعیف بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بار نماز کسوف پڑھی تھی۔ جب اس دن گہن پڑا تھا، جب آپؐ کے صاحبزادے ابراہیمؑ کی وفات ہوئی تھی۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف پڑھائی اور لوگوں کو ایسے مواقع پر ذکر الٰہی، نماز، دعاء و استغفار، صدقہ اور (غلاموں) کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔

نماز استسقاء

طلب باراں کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت طیّبہ

نبی اکرمؐ کی دعائے استسقاء یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی طریقوں پر بارش کی دعا فرمائی۔

ایک بار جمعہ کے دن منبر پر خطبہ کے دوران آپ نے دعائے بارش کی: اور کہا:

اللھم اغثنا اللھم اغثنا اللھم اسقنا اللھم اسقنا۔

یعنی: اے اللہ ہم پر بارش فرما، اے اللہ ہم پر بارش فرما۔ اے اللہ ہمیں پلا، اے اللہ ہمیں پلا۔

دوسرے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے وعدہ فرمایا کہ ایک دن وہ میدانِ نماز میں باہر نکلیں گے۔ چنانچہ جب سورج نکل آیا تو آپ اس طرح برآمد ہوئے کہ سراپا خشوع تضرع بنے ہوئے تھے، یکسر خاکساری اور انکسار کا پہلو لیے ہوئے جب آپ میدان نماز میں پہنچے تو منبر پر چڑھے اگر یہ روایت درست اور صحیح ہو ورنہ کسی طریقہ پر آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، اس کی بزرگی بیان کی۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ دیا اس کے یہ الفاظ منقول ہیں:۔

"سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، بڑا مہربان نہایت رحم کرنے اور روز جزا کا مالک، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو غنی (بے پرواہ) ہے اور ہم محتاج، ہم پر بارش نازل فرما اور جو کچھ ہم پر نازل فرما اُسے ایک مدت تک معیشت اور گزران کا (سبب) بنا دے۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور تضرع وانابت اور دعا میں مشغول ہو گئے اور (ہاتھ) اونچا کرنے میں مبالغہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو گئی۔ پھر آپ نے لوگوں کی طرف پیٹھ کی اور قبلہ رُخ ہو گئے اور اس وقت قبلہ رُخ حالت میں آپ نے اپنی چادر کو بھی بدل لیا چنانچہ دائیں طرف کو بائیں اور بائیں کو دائیں طرف کر لیا۔ پیٹھ کے حصہ کو سامنے اور سامنے کے حصہ کو پیٹھ کی طرف کر لیا۔ اس وقت آپ کے بدن پر سیاہ چادر تھی اور قبلہ رُخ حالت میں آپ نے دعا شروع کر دی۔ لوگ بھی اسی طرح (قبلہ رخ) تھے۔ آخر آپ اتر آئے۔

پھر آپ نے نمازِ عید کی طرح ندا و اذان اور اقامت کے بغیر دو رکعتیں ادا کیں اور ان دو رکعتوں میں جہر (بہ آواز بلند) ۔ سے قرأت کی، پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سبح اسم ربك الاعلیٰ اور دوسری میں ھل اتاك حدیث الغاشیۃ کی تلاوت کی۔

تیسرا طریقہ یہ منقول ہے کہ آپؐ نے جمعہ کے دن کے علاوہ کسی اور دن مدینہ کے منبر سے محض دعائے بارش کی۔ اس موقع پر آپ سے کوئی نماز استسقاء منقول نہیں ۔

چوتھا یہ کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے آپؐ نے دعائے بارش کی۔ آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اللہ تعالیٰ سے جو دُعا کی وہ یہ ہے :۔

اللھم اسقنا غیثا مغیثا مریعا طبقا عاجلا غیر رائث نافعاً غیر ضار۔

یعنی: "اے اللہ ہماری تشنگی ایسی بارش سے دور کر دے جو فریاد رس ہو۔ ارزاں کرنے والی، جلدی آنے والی، دیر نہ کرنے والی، نفع دینے والی اور ضرر نہ دینے"۔

پانچویں یہ کہ آپ نے زوراء کے قریب دعا مانگی جو مسجد کے دروازے سے باہر ہے اور جسے آج کل باب السلام کہتے ہیں (اس وقت) آپ مسجد کے دائیں جانب اتنے فاصلہ پر تھے جتنی دور پتھر پھینکا جا سکے۔

چھٹی بار آپ نے کسی غزوہ میں دعا کی جب مشرکین نے سبقت کر کے پانی پر قبضہ کر لیا تھا اور مسلمان پیاس سے بے حال ہو رہے تھے ۔ انہوں نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی، اس موقع پر بعض منافقین کہنے لگے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی سیرابی کے لیے دعا مانگی تھی اگر یہ نبی ہیں تو یہ بھی اپنی قوم کے لیے سیرابی کی دعا کریں گے ۔

چنانچہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے فرمایا :۔

کیا انہوں نے یہ کہا ہے، شاید تمہارا پروردگار تمہیں سیراب کر دے ۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی۔ ابھی آپ نے ہاتھ ہٹائے نہ تھے کہ بادلوں نے سایہ کر لیا اور بارش شروع ہو گئی۔ چنانچہ وادی میں سیلاب آگیا، لوگوں نے پانی پیا اور خوب سیر ہو کر پیا۔

آپؐ سے جو دعا منقول ہے وہ یہ ہے:۔

اللھم اسق عبادك وبھائمك وانشر رحمتك واحی بلدك المیت اللھم اسقنا غیثا مغیثا مریئا مریعًا نافعًا غیر ضار عاجلا غیر آجل۔

یعنی "اے اللہ ہمیں سیراب کر، فریادرس کرنے والے مینہ سے جس کا انجام اچھا ہو اور جو ارزانی کرنے والا ہو، نفع دینے والا ہو، ضرر نہ کرنے والا ہو، جلدی کرنے والا اور دیر نہ کرنے والا ہو۔"

آپ نے جب کبھی بھی طلب باراں کے لیے دعا کی تو ضرور بارش ہوئی اور جب بارش زیادہ ہونے لگی تو آپؐ سے لوگوں نے بادل چھٹ جانے کی درخواست کی۔ آپ نے بادلوں کے چھٹ جانے کی بھی دعا فرمائی اور کہا:

اللھم حوالینا ولا علینا اللھم علی الآکا والجبال والظراب وبطون الاودیة ومنابت الشجر۔

یعنی: "اے اللہ ہمارے اردگرد اور ہمارے اوپر نہ ہو۔ اے اللہ ٹیلوں اور پہاڑوں اور وادیوں کے علاقہ میں اور درختوں کی جڑوں پر بارش کر۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بادل دیکھتے تو دعا کرتے۔

اللھم صیبا نافعًا

یعنی اے اللہ یہ بارش بھرپور اور فائدہ مند ہو۔ ایسے موقع پہ آپؐ جسم مبارک سے کپڑا ہٹا لیتے تاکہ اس پر بارش کا پانی پڑے۔

آپ سے اس کا سبب پوچھا گیا۔ تو فرمایا، کیونکہ یہ اپنے پروردگار سے نیا عہد ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس نے خبر دی جسے میں متہم نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا مطلب حضرت عائشہؓ سے تھا۔ حضرت برید بن ہاد سے مروی ہے کہ جب سیلاب سا آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔ آؤ ہمارے ساتھ ادھر آؤ جسے اللہ تعالیٰ نے پاک کرنے والا بنا دیا۔ پھر ہم اس سے طہارت حاصل کرتے ہیں اور اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بادل اور ہوا دیکھتے

تو آپ کے چہرہ سے معلوم ہوجاتا۔ آپ ادھر اُدھر (پریشان) پھرتے۔ جب بارش ہوجاتی تو خوش ہوجاتے اور پریشانی جاتی رہتی۔ آپ خطرہ محسوس کرتے تھے کہیں یہ عذاب نہ ہو۔

سالم بن عبداللہ کو اپنے والد سے مرفوعاً روایت پہنچی ہے کہ جب آپ دعائے بارش کرتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اللھم اسقنا غیثا مغیثا مریئا غدقا مجللا عاما طبقا سحا دائما اللھم اسقنا الغیث ولا تجعلنا من القانطین اللھم ان بالعباد والبلاد والبھائم والخلق من اللاواء والجھد والضنك ما لا نشکوہ الا الیك اللھم انبت لنا الزرع وادر لنا الضرع واسقنا من برکات السماء وانبت لنا من برکات الارض اللھم ارفع عنا الجھد والجوع والعری واکشف عنا من البلاء ما لا یکشفه غیرك اللھم انا نستغفرك انك کنت غفارا فارسل السماء علینا مدرارا۔

یعنی "اے اللہ ہمیں سیراب کر ایسے مینہ سے جو فریاد رسی کرے، ارزانی لائے، کثیر ہو، بھرپور ہو تمام ہو، گھنا ہو، خوب دائمی ہو اے اللہ ہمیں مینہ سے سیراب کر ہمیں مایوس نہ فرما۔ بندے، شہر، چوپائے اور مخلوقات، دکھ، مصیبت اور تنگی میں مبتلا ہیں۔ پس ہم صرف تیرے سامنے فریاد کرتے ہیں۔ اے اللہ ہمارے لیے کھیتی اُگا اور ہمارے لیے دودھ چلا اور ہمیں آسمانی برکات سے پلا اور زمین کی برکات ہمارے لیے اُگا۔ اے اللہ ہم سے دکھ، بھوک، عریانی اٹھا۔ اور ہماری تکالیف دور کر دے جو تیرے سوا اور کوئی نہیں دور کر سکتا۔ اے اللہ ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں۔ بے شک تو ہی بخشنے والا ہے ہم پر آسمان (سے بارش) خوب برسا۔"

امام شافعیؒ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں پسند کرتا ہوں کہ امام دعائے باراں میں یہی الفاظ استعمال کیا کرے۔

نیز کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بارش کے لیے دعا مانگتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب بارش کا پہلا قطرہ گرتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائی بارش کو اپنے جسد انور پر لیتے اور مجھے اس نے بتایا ہے کہ جسے میں متہم نہیں سمجھتا انہیں عبدالعزیز بن عمرؒ سے انہیں مکحول سے انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت پہنچی کہ آپ نے فرمایا:

افواج کے مقابلہ کے وقت اور قیام نماز کے وقت اور بارش کے وقت دعا کی قبولیت کا

سوال کرو۔

اور مجھے ایک سے زیادہ رواۃ سے یاد ہے کہ نزول بارش اور اقامتِ نماز کے وقت دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں موصول کی حدیث سے جو انہیں سہل بن سعدؓ سے اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کے متعلق پہنچی) ہے۔ معلوم ہوا کہ اذان کے وقت، لڑائی کے وقت اور بارش کے وقت دعا ردّ نہیں ہوتی۔

حضرت ابوامامہؒ سے مروی ہے۔ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت پہنچی۔ آپ نے فرمایا چار مواقع پر آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

۱۔ جب فوج صف بستہ ہو، جنگ و پیکار کے لیے۔

۲۔ نزولِ بارش کے وقت۔

۳۔ قیامِ نماز کے وقت۔

۴۔ اور کعبہ مکرمہ کی زیارت کے وقت۔

دورانِ سفر میں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات اور سنن

آں حضرتؐ کے سفر کی نوعیت

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر چار طرح کے ہوتے تھے۔

۱۔ سفر ہجرت۔
۲۔ سفر جہاد، یہ اکثر ہوتا رہتا تھا۔
۳۔ سفر عمرہ۔
۴۔ اور سفر حج۔

جب آپؐ سفر کے لیے نکلتے تو ازواج مطہرات کو ساتھ لے جانے کے لیے قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکل آتا اسی کو ساتھ لے جاتے۔ البتہ جب آپؐ نے حج کے لیے سفر کیا تو تمام ازواج مطہراتؓ کو ساتھ لیا۔

جب آپ سفر کرتے تو ابتدائے دن میں نکلتے۔ آپ جمعرات کو تشریف لے جانا پسند کرتے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ آپ کی امت کو سویرے سویرے (جانے) میں برکت دے۔ اور جب آپ کوئی لشکر یا وفد بھیجنا چاہتے تو ابتدائے وقت میں بھیجتے اور اگر مسافر تین ہوتے تو انہیں حکم فرماتے کہ ایک کو امیر بنا لیں[1]۔ آپ نے مسافر کو تنہا سفر سے منع فرمایا اور فرمایا کہ ایک سوار شیطان ہے، دو شیطان دو شیطان ہیں۔ تین دراصل سوار ہیں اور منقول ہے کہ جب آپ سفر کے لیے اُٹھتے تو پڑھتے:۔

---

[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں ضبط و نظم کی کتنی اہمیت ہے (رئیس احمد جعفری)

اللھم الیک توجھت وبک اعتصمت اللھم اکفنی ما اھمنی ومالا اھتم بہ اللھم زودنی التقوی وغفرلی ذنبی ووجھنی للخیر اینما توجھت

یعنی: "اے اللہ میں تیری طرف متوجہ ہوا اور تیرا ہی دامن پکڑتا ہوں۔ اے اللہ جس کا مجھے غم ہے اور جس کا غم نہیں (ان سب میں) میری کفایت فرما۔ اے اللہ مجھے تقویٰ عطا فرما اور میرے گناہوں کو بخش دے اور بھلائی کی طرف میرا رُخ کر دے۔ خواہ میرا رخ کسی طرف بھی ہو۔"

جب آپ کے سامنے سواری پیش کی جاتی تو آپ رکاب میں پاؤں رکھتے وقت بسم اللہ کہتے۔ اور جب اس کی پشت پر سوار ہو جاتے تو یہ دعا پڑھتے:۔

الحمد اللہ الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔

پھر پڑھتے: الحمد اللہ الحمد اللہ الحمد اللہ، اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر۔

پھر پڑھتے: سبحانک انی ظلمت نفسی فاغفرلی انہ لا یغفر الذنوب الا انت۔

(نیز) پڑھا کرتے: اللھم انا نسئالک فی سفرنا ھذا البر والتقوی ومن العمل ماترضی اللھم ھون علینا سفرنا واطوعنا بعدہ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل اللھم انی اعوذ بک من وعثاء السفر وکآبہ المنقلب وسوء المنظر فی الاھل والمال۔

یعنی: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس نے ہمارے لیے اسے مسخر کیا اور ہم اُسے جمع کرنے والے نہیں تھے اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔

تو پاک ہے بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، سو مجھے بخش دے، کیونکہ بخشنے والا صرف تو ہی ہے۔

اے اللہ ہم اس اپنے سفر میں تجھ سے نیکی، تقویٰ اور اس عمل کا سوال کرتے ہیں جس سے تو راضی ہو۔ اے اللہ ہم پر ہمارا سفر آسان کر دے اور ہمارے لیے اس کی دوری لپیٹ دے۔ اے اللہ سفر میں تو ہی آقا ہے اور گھر میں تو ہی محافظ ہے۔ اے اللہ میں سفر کی ایذا اور تکلیف دہ واپسی اور گھر اور حال میں برے منظر سے پناہ چاہتا ہوں۔

جب واپس تشریف لاتے تو سابقہ دعا بھی پڑھتے اور ان الفاظ کا اضافہ کر دیتے۔

آیبون تائبون عابدون لربنا حامدون۔

یعنی: لوٹنے والے، توبہ کرنے والے اپنے پروردگار کی عبادت کرنے والے تعریف کرنے والے۔

نیز آپ اور صحابہ کرامؓ جب بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب نیچے وادیوں میں اترتے تو تسبیح کہتے اور جب کسی بستی کے پاس آتے اور اس میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے:

اللھم رب السموات السبع وما اظللن ورب الارضین السبع وما اقللن و رب الشیاطین وما اضللن ورب الریاح وما ذرین اسألك من خیر ھذہ القریة وخیر جمعت فیھا واعوذ بك من شرھا وشر ما جمعت فیھا اللھم ارزقنا جناھا واعذنا من وباھا وحببنا الی اھلھا وحبب صالحی اھلھا الینا۔

یعنی: اے ساتوں آسمانوں کے پروردگار اور جن پر وہ سایہ گستر ہیں اور ساتوں زمینوں کے پروردگار اور جو کچھ انہوں نے اٹھا رکھا ہے اور شیاطین کے پروردگار اور جن کو انہوں نے گمراہ کیا اور ہواؤں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انہوں نے اڑایا۔ میں تجھ سے اس بستی کی بھلائی اور جو بھلائی اس میں تو نے جمع کر رکھی ہے۔ مانگتا ہوں اور میں اس کے شر سے اور جو اس میں شر جمع ہے اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ ہمیں اس کے پھلوں کا رزق عطا فرما اور ہمیں اس کی وبا سے بچا اور اس کے رہنے والوں میں ہمیں محبوب کر دے اور اس کے نیک کلمینوں کے لیے ہمارے دل میں محبت ڈال۔

بہ حالت سفر نماز میں قصر کا معمول

اور چار رکعت والی نماز کو قصر کرتے۔ چنانچہ جب آپ (سفر کے لیے) نکلتے تو مدینہ واپس پہنچنے تک (چار رکعت) والی نماز میں دو رکعتیں پڑھتے۔ آپ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے سفر میں چار رکعتیں مکمل پڑھی ہوں۔ رہی حضرت عائشہؓ کی روایت کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں کبھی قصر کرتے اور نماز مکمل پڑھتے، کبھی افطار کرتے اور کبھی روزہ رکھتے یہ روایت صحیح نہیں۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو کہتے سنا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔ یہ روایت باطل ہے۔ ام المومنین، رسول اللہؐ اور جمیع صحابہؓ کے خلاف کیونکر جا سکتی تھیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دو دو رکعتیں فرض کی تھیں! پھر جب آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو صلاۃ حضر میں دو دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا اور صلاۃ سفر جوں کی توں قائم رہی، پھر

یہ کس طرح گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے خلاف عمل کریں گی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی کا خیال تھا کہ نماز قصر خوف وسفر دونوں سے مشروط ہے۔ اس لیے جب خوف ختم ہو گیا تو سببِ قصر زائل ہو گیا یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ امن میں سفر کرتے ہوئے نمازیں ہمیشہ قصر کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو اس آیت کے مفہوم میں دشواری ہوئی تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ اللہ کا صدقہ ہے اور امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کی وضاحت تھی کہ (عبادت سے) مفہوم حکم مراد نہیں اور مامون وخائف دونوں سے قصر نماز کا گناہ اٹھ جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ مندرجہ مفہوم کی ایک مخصوص نوع ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت قصر کی متقاضی ہے جو از روئے تخفیف شامل ہے قصرِ ارکان اور قصر تعداد پر دو رکعتیں کم کر دینے سے اور یہ دو باتوں سے مشروط ہے۔ سفر اور خوف۔

جب دونوں باتیں پائی جائیں تو قصر مباح ہو گا اور تعداد وارکان میں قصر کر کے نماز پڑھی جائے گی۔ اور اگر دونوں مذکورہ شرائط ختم ہو گئیں تو وہ مامون ومقیم بن گئے اور قصر کا حکم بھی جاتا رہا۔ پھر انہیں مکمل نماز پڑھنا ہو گی اور اگر دونوں میں سے ایک سبب پایا جائے تو ایک پر قصر کا حکم مرتب ہو گا یعنی جب خوف اور اقامت ہو تو عددِ رکعات پورے ہوں گے۔ البتہ ارکان میں قصر ہو گا۔ یہ قصر کی ایک قسم ہے، قصر مطلق نہیں جس کا ذکر آیا ہے اور اگر سفر اور امن کی حالت ہو تو عددِ رکعات میں قصر ہو گا۔ اور ارکان مکمل ہوں گے۔ اس کا نام نمازِ امن ہو گا۔ اور یہ بھی قصر کی ایک نوع ہو گی۔ قصر مطلق کو گاہے گاہے عددِ رکعات میں کمی کے باعث اسے نمازِ مقصور کہتے ہیں اور کبھی کبھی ارکان کی تکمیل کے باعث اسے نماز تام بھی کہتے ہیں۔ اور یہ آیت مذکورہ کے حکم قصر کے تحت داخل نہیں۔ پہلی اصطلاح اکثر متاخرین فقہا کے ہاں معروف ہے اور دوسری اصطلاح صحابہ رضی جیسے حضرت عائشہ رضی اور حضرت ابن عباس رضی وغیرہ سے متبادر ہے۔

حضرت عائشہ رضی نے فرمایا نماز دو رکعتوں میں فرض کی گئی اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو سفر کی نماز سابقہ مقدار میں رہ گئی اور حضر کی نماز میں اضافہ ہو گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سفر کی نماز چار سے کم ہو کر (دو تک) نہیں آئی بلکہ یہ اسی طرح فرض ہے اور حالتِ سفر میں (ابتدا سے) ہی دو رکعت فرض ہیں اور حضرت ابن عباس رضی نے فرمایا اللہ

تعالیٰ نے تمہارے نبیؐ کی زبان سے حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف میں ایک رکعت فرض کی (متفق علیٰ حدیث عائشہؓ) البتہ امام مسلمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے منفرد روایت کی ہے۔

سفر کی نماز چار کے بجائے دو رکعت فرض ہے

حضرت عمرؓ بن خطاب فرماتے ہیں، نماز سفر کی دو رکعتیں ہیں، جمعہ کی دو رکعتیں ہیں۔ اور عید کی دو رکعتیں ہیں اور یہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق مکمل نماز ہیں، قصر نہیں ہیں اور جس نے افترا باندھا وہ نامراد ہوا۔ یہ بات حضرت عمرؓ سے ثابت ہے۔ انہوں نے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ کیا ہم امن کی حالت میں بھی قصر کرتے ہیں؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صدقہ ہے یہ جو اللہ کی تم پر خیرات ہے لہٰذا اس کا صدقہ قبول کرو۔

ان دونوں روایتوں میں کوئی تناقض نہیں، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں جواب دیا کہ یہ تم پر اللہ کا صدقہ ہے اور اس کا دین آسان اور سہل ہے تو حضرت عمرؓ جان گئے کہ آیت کا مطلب قصرِ عددِ رکعات نہیں جیسا کہ اکثر لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور فرمایا نماز سفر کی دو ہی رکعتیں ہیں اور یہ مکمل ہیں، قصر شدہ نہیں، لہٰذا آپ سے ثابت نہیں ہوتا کہ قصر عدد مباح ہے نماز کا جی چاہے پوری پڑھ لے، جی چاہے قصر کر لے۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں ہمیشہ دو دو رکعتیں پڑھیں اور ایک بار نمازِ خوف کے سوا آپؐ نے کبھی بھی چار رکعتیں نہیں پڑھیں جس کا ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

حضرت عثمانؓ کی روش اور اس کی تاویل

حضرت انسؓ بتاتے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف گئے۔ تو آپ مدینہ واپس آنے تک دو دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے (متفق علیہ) اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو خبر ملی کہ حضرت عثمانؓ بن عفان نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھیں تو فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں اور میں نے حضرت عمرؓ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں۔ کاش مجھے چار رکعتوں میں دو مقبول رکعتیں حاصل ہو سکیں۔ حضرت عثمانؓ کے اس فعل کی تاویلات مذکور ہیں بشرطیکہ یہ روایت درست بھی ہو) ان میں سے ایک تاویل یہ ہے کہ انہوں نے منیٰ میں نکاح کیا تھا اور (مسئلہ ہے) کہ مسافر جب کسی جگہ ٹھہرے اور وہاں نکاح کرنے تو اسے مکمل نماز

پڑھنی چاہیے۔ اس مسئلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع حدیث منقول ہے۔ چنانچہ عکرمہ بن ابراہیم ازدی نے ابو ذُباب سے انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا کہ حضرت عثمان نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھی اور فرمایا کہ اے لوگو! جب میں یہاں آیا تو میں نے یہاں نکاح کیا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جب کوئی آدمی کسی شہر میں نکاح کرے تو وہ وہاں پر مقیم کی نماز پڑھے۔ اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں روایت کیا اور عبداللہ بن زبیر حمیدیؒ نے اپنی مسند میں (بیان کیا) اور بیہقیؒ نے انقطاع اور تضعیف کی بنا پر اسے معلول قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس پر طعن نہیں کیا، حالانکہ جرح کرنا اور مجروحین (کا تذکرہ کرنا ان کی عادت ہے۔

احمدؒ اور حضرت ابن عباسؓ کی نص یہ ہے کہ مسافر اگر نکاح کرے تو اسے (وہاں) مکمل نماز پڑھنی چاہیے۔ ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور ان کے اصحاب کا یہی قول ہے اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے کسی حد تک یہ عذر معقول ہے اور حضرت عائشہؓ کے لیے یہ توجیہہ کی گئی ہے کہ وہ ام المومنین تھیں اس لیے جہاں بھی اتریں وہیں ان کا وطن تھا۔ یہ توجیہہ بالکل کمزور ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے باپ تھے اور ازواج مطہرات کی امومیت (والدہ بننا) آپ کی ابوبیت کی فرع ہے۔ لیکن اس توجیہہ کے مطابق آپؐ نے کبھی سفر میں مکمل (نماز) نہیں پڑھی۔

ہشامؒ بن عروۃ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ (حضرت عائشہؓ) سفر میں چار رکعت پڑھا کرتیں۔

میں نے عرض کیا کاش آپ دو رکعتیں پڑھتیں۔

انہوں نے فرمایا: اے میرے بھانجے یہ میرے لیے کچھ بوجھ نہیں۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مسافر کی نماز اگر دو رکعت ہوتی تو حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن مسعودؓ مکمل نماز کیوں پڑھتے؟ اور نہ مسافر کو مقیم کے ساتھ مکمل نماز پڑھنے دیتے۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ کیا، مکمل بھی کی اور قصر بھی کیا (نیز) حضرت ابراہیم بن محمد نے طلحہؓ بن عمر سے، انہوں نے عطاء بن رباح سے انہوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں (نماز) مکمل بھی پڑھی اور قصر بھی کیا۔ بیہقیؒ بتاتے ہیں کہ ایسے ہی مغیرۃ بن زیاد نے عطاء سے روایت کیا ہے اور سند کے لحاظ سے زیادہ صحیح روایت ابوبکر حارثیؒ نے ہمیں بتائی، انہوں نے دارقطنی سے انہوں نے

محاعل سے انہوں نے سعید بن محمد بن ایوب سے انہوں نے ابوعاصم سے انہوں نے عمر بن سعید سے انہوں نے عطاء سے انہوں نے حضرت عائشہ رض سے روایت کیا کہ آپ سفر میں مکمل نماز بھی پڑھتے قصر بھی کرتے، روزہ بھی رکھتے اور افطار بھی کرتے۔

دارقطنی رح فرماتے ہیں کہ یہ اسناد صحیح ہے۔ پھر اس کے بعد ابوبکر نیشاپوری کی سند سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے عباس دوری سے انہوں نے ابونعیم سے انہوں نے علاء بن زہیر سے انہوں نے عبدالرحمن بن اسود سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے مکہ تک سفر عمرہ کیا۔ عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان میں نے قصر بھی کیا اور مکمل نماز بھی پڑھی روزہ بھی رکھا اور افطار بھی کیا۔

حضرت عائشہ رض کی روایت کی حیثیت

آپ نے فرمایا: اے عائشہ رض تم نے اچھا کیا اور میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح کو فرماتے سنا کہ یہ حدیث حضرت عائشہ رض پر جھوٹی تہمت ہے (اور حقیقت یہ ہے) کہ حضرت عائشہ رض، کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رض کے خلاف دوسرے طریقہ پر نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں جبکہ انہیں قصر کرتے دیکھ چکی تھیں، پھر یہ کیونکہ ممکن ہو سکتا ہے کہ بغیر کسی سبب کے وہ مکمل نماز پڑھنے لگتیں؟ حالانکہ انہیں کی روایت ہے کہ نماز کی دو رکعتیں فرض کی گئیں۔ پھر حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور سفر کی نماز ویسے ہی (دو رکعتوں کی صورت میں) رہنے دی گئی۔ پھر یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ (حضرت عائشہ رض) اللہ کے فرائض میں زیادتی کرتیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رض کی مخالفت کرتیں۔

امیہ بن خالد نے حضرت عبداللہ بن عمر رض سے کہا کہ ہم حضر کی نمازِ خوف قرآن میں پاتے ہیں لیکن قرآن میں نماز سفر نہیں ملتی۔ تو حضرت ابن عمر رض نے فرمایا، اے میرے بھائی بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ہم کچھ نہ جانتے تھے تو اب جس طرح ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا اسی طرح ہم بھی کرتے ہیں۔

اور حضرت انس رض بتاتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف نکلے۔ آپ مدینہ واپس تشریف لانے تک دو دو رکعتیں پڑھتے رہے۔

حضرت ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (سفر میں) رفاقت کی۔ آپ اور ابوبکر رض، عمر رض، عثمان رض کوئی بھی دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھتا اور یہ تمام احادیث صحیح ہیں۔

سفر کی حالت میں سنت پڑھنے کی ضرورت نہیں

آپ سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے بہ حالت سفر فرض سے پہلے یا بعد میں وتر اور فجر کی سنتوں کے علاوہ (دوسری سنتیں) پڑھی ہوں۔ البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر اور فجر کی سنت کو سفر و حضر کسی موقع پر ترک نہ فرماتے۔

حضرت ابن عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کی ہے۔ آپ (سفر) میں کبھی تسبیح[۱] نہ پڑھتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

یعنی "تمہارے لیے رسولؐ کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے"۔

آپؐ سے ثابت ہے کہ آپؐ سواری کی پشت پر تسبیح (نوافل) پڑھتے تھے، جدھر بھی اس کا رُخ ہوتا اور صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں اپنی سواری کی پشت پر نوافل پڑھتے تھے۔ جدھر بھی اس کا رُخ ہوتا اس سے وہ نمازِ شب (تہجد وغیرہ) مراد لیتے تھے۔ لیکن فرائض (سواری پر نہ پڑھتے) البتہ وتر سواری پر ادا کر لیتے تھے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ رات کو نوافل پڑھتے۔ حالانکہ (فرائض) میں آپ قصر کر رہے ہوتے۔

اور صحیحین میں عامر بنؒ ربیعہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سفر میں رات کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سواری کی پشت پر نوافل پڑھتے دیکھا۔ یہ قیام اللیل تھا۔ یعنی تہجد کی نماز تھی۔

امام احمد بن حنبلؒ سے سفر میں نوافل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ بہ حالت سفر نوافل پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سفر کرتے تو فرض نماز سے قبل اور بعد نوافل پڑھا کرتے۔ یہ طریقہ حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، جابرؓ، انسؓ، ابن عباسؓ اور ابو ذرؓ سے مروی ہے۔ البتہ حضرت ابن عمرؓ فرائض سے قبل اور بعد میں نوافل نہ پڑھتے تھے۔ ہاں درمیان شب میں وتر کے ساتھ (نوافل پڑھ لیتے) غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قصر نماز (فرض سے قبل اور بعد میں

---

[۱] تسبیح سے مراد سنت ہے۔

(نوافل) نہیں پڑھتے تھے۔ اور نہ اس سے قبل یا بعد میں پڑھنے سے منع فرماتے کیونکہ محض تطوع (رضاکارانہ فعل) ہے نہ کہ سنن راتبہ جو اقامت کی صورت میں ضروری اور لازمی ہوتی ہیں۔

رہی حضرت عائشہؓ کی وہ روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار رکعت اور اس کے بعد دو رکعت کبھی ترک نہیں فرماتے تھے اور اسے بخاریؒ نے صحیح بخاری میں روایت بھی کیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس سے اس بات کی صراحت نہیں ہوتی کہ آپؐ نے (ظہر کی قبل یا بعد کی سنتیں) سفر میں بھی ادا کی ہیں۔ بلکہ خیال یہ ہے کہ بخاریؒ نے آپ کا معمول بتایا ہے جب آپ سفر میں نہ ہوتے اور سفر کے حالات سے عورتوں کی نسبت مرد زیادہ واقف ہوتے ہیں اور حضرت ابن عمرؓ بتا چکے ہیں کہ آپؐ نے دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی اور خود حضرت ابن عمرؓ بھی اس سے قبل یا بعد میں کچھ نہیں پڑھتے تھے۔

سواری پر نفل پڑھ لینے کا جواز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ نوافل سواری پر بھی پڑھ لیتے خواہ جس طرف اس کا رخ ہوتا۔ رکوع و سجود اشاروں سے کرتے۔ آپ کا سجدہ رکوع سے قدرے نیچا ہوتا۔

اور احمدؒ اور ابو داؤدؒ نے حضرت انسؓ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ تکبیر افتتاح (تحریمہ) میں اپنی اونٹنی کو قبلہ رخ کر لیتے۔ پھر باقی تمام نماز اس سمت میں پڑھتے رہتے جس طرف اونٹنی جارہی ہوتی۔ اس حدیث میں شبہ ہے۔ تمام رواۃ جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا حال بیان کیا ہے۔ انہوں نے مطلق بات کہی ہے کہ آپ سواری پر نماز پڑھتے خواہ سواری کا رخ کسی طرف ہوتا۔ نہ تکبیر تحریمہ وغیرہ کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے جیسا کہ حضرت عامر بن ربیعہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے اور ان حضرات کی احادیث حضرت انسؓ کی روایت سے زیادہ صحیح ہیں اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اور آپؐ نے راحلہ پر اور حمار پر بھی نماز پڑھی۔ اگر یہ روایت صحیح ہو، اسے مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمرؓ کی (سند) سے نقل کیا ہے۔

بارش اور کیچڑ کے باعث (آپ نے اصحابہؓ کے ساتھ سواریوں پر بھی فرض نماز پڑھی اگر یہ روایت صحیح ہو۔

احمدؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ ایک تنگ جگہ پر پہنچے آپؐ اپنی سواری پر تھے اور اوپر آسمان تھا اور نیچے کیچڑ۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا۔ آپ نے موذن کو اذان دینے کا حکم دیا، اس نے اذان دی اور اقامت کہی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سواری

پرسوار آگے بڑھے اور اشاروں سے نماز پڑھائی اور سجدہ رکوع سے زیادہ جھک کر گیا۔

ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے جس میں عمر بن رباح منفرد ہیں لیکن حضرت انسؓ کے فعل سے یہ ثابت ہے۔

دو وقت کی نمازیں ایک وقت میں پڑھنے کی اجازت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت طیبہ یہ تھی کہ جب آپ سورج ڈھلنے سے قبل سفر اختیار کرتے ظہر کو عصر کے وقت تک مؤخر کر دیتے اور پھر دونوں کو جمع فرماتے اور اگر سفر شروع کرنے سے قبل سفر اختیار فرماتے تو ظہر پڑھتے پھر سوار ہوتے اور جب سفر میں جلدی ہوتی تو مغرب کو عشاء کے قریب تک مؤخر کر کے عشاء کے ساتھ عشاء کے وقت میں پڑھتے۔

حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں ابوبکر بن محمد بن احمد بن بالویہ نے انہیں موسیٰ بن ہارون نے انہیں قتیبہ بن سعید نے انہیں لیث بن سعد نے بتایا انہیں یزید بن ابی حبیب سے انہیں ابی طفیل سے انہیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم سے روایت ملی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں تھے۔ جب آپ سورج ڈھلنے سے پیشتر سفر اختیار فرماتے تو ظہر کا وقت مؤخر کر لیتے۔ یہاں تک کہ اُسے عصر کے قریب لے آتے اور دونوں کو جمع کر لیتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر اختیار فرماتے تو ظہر اور عصر اکٹھی پڑھ لیتے۔ پھر چل پڑتے اور جب مغرب سے قبل سفر کرتے تو مغرب کو مؤخر کرتے تا آنکہ عشاء کے ساتھ اسے ادا کرتے اور جب مغرب کے بعد سفر فرماتے تو عشاء میں جلدی کر لیتے اور اسے مغرب کے ساتھ ہی پڑھ لیتے۔ حاکمؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے تمام رواۃ ثقہ ہیں اور شاذ الاسناد والمتن ہے اور اس کو معلل بھی نہیں سمجھتے کہ معلول کہہ سکیں۔

اور اسحٰق بن راہویہ نے روایت کی ہے کہ انہیں شبابہ سے انہیں لیث سے، انہیں عقیل سے انہیں ابن شہاب سے انہیں حضرت انسؓ سے روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں ہوتے اور سورج ڈھل جاتا تو ظہر اور عصر اکٹھی پڑھتے۔

یہ سند آپ کے سامنے ہے شبابہ دراصل شبابہ بن سوار ثقہ ہے اس کی روایت سے استدلال پر اتفاق ہے اور امام مسلمؒ نے اس کی روایت حضرت لیث بن سعد سے شیخین کی شرط کے مطابق اس سند کے ساتھ نقل کی ہے اس کا اقل درجہ یہ ہے کہ اس سے حضرت معاذ کی روایت کو قوت ملتی ہے اس کی اصل صحیحین میں موجود ہے لیکن اس میں جمع تقدیم نہیں۔

ابوداؤدؒ فرماتے ہیں، ہشام نے عروۃ سے انہوں نے حسین ابن عبداللہ سے انہوں نے کریب سے انہوں نے ابن عباسؓ سے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مفصل یعنی جمع تقدیم کے متعلق حضرت معاذؓ کی روایت کی طرح روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"حسین بن عبداللہ بن عبیداللہ بن عباس نے کریب سے انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں سفر کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ بتاؤں؟ جب سورج ڈھل جاتا وہ اپنے گھر میں زوال کے وقت ظہر و عصر کی نماز اکٹھی پڑھتے اور جب سورج ڈھلنے سے قبل سفر کرتے تو ظہر کو عصر کے وقت تک مؤخر کرتے اور دونوں کو عصر کے وقت میں ادا کرتے۔

راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے انہوں نے یہی بات مغرب اور عشاء کے متعلق کہی تھی۔

اور اسماعیل بن اسحاق نے بتایا کہ انہیں اسماعیل بن ابی اویس نے انہیں ان کے بھائی نے انہوں نے سلیمان بن مالک سے انہوں نے ہشام بن عروۃ سے انہوں نے کریب سے انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب سفر میں جلدی ہوتی۔ تو آپؐ سورج ڈھلنے سے قبل نکلتے، سوار ہوتے اور چل پڑتے، پھر اترتے، ظہر اور عصر کو جمع فرما کر پڑھتے اور اگر سورج ڈھلنے تک نہ چلتے تو ظہر اور عصر کو ایک ساتھ ادا کر کے پھر سوار ہوتے۔ جب سوار ہونے کا ارادہ فرماتے اور (دوسری طرف) نماز مغرب کا وقت ہو چکا ہوتا تو مغرب و عشاء کو جمع فرماتے۔

ابوالعباس بن شریح بتاتے ہیں کہ یحیٰی بن عبدالحمید نے ابوخالد احمر سے انہوں نے حجاج سے انہوں نے حکم سے انہوں نے مقسم سے انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سورج ڈھلنے (کے بعد) سفر کرتے تو ظہر اور عصر کو ایک ساتھ پڑھ لیتے اور اگر سورج ابھی نہ ڈھلا ہوتا تو ظہر کو مؤخر کرتے۔ آخر کار عصر کے وقت سے (ایک ساتھ) ادا کرتے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ جمع تقدیم اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ عرفہ میں وقوف کی خاطر آپ نے ظہر اور عصر کو جمع کیا تاکہ دعا کے وقت سے متصل ہو جائے۔ اور باوجود اس کے کہ نماز عصر کی ادائیگی بغیر تکلیف کے ممکن ہوتی۔ پھر بھی اتر کر اسے منقطع نہ فرماتے، اس لیے مشقت اور ضرورت کے باعث جمع (بین الصلوتین) اولیٰ ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عرفہ کے دن عصر کا مقدم کرنا زیادہ مناسب ہے تاکہ یہ دعا کے ساتھ ہی متصل ہو جائے۔ اس لیے اسے نماز عصر سے قطع نہ کیا جائے اور مزدلفہ میں مناسب

یہ ہے کہ سفر برابر جاری رہے اور مغرب کے لیے اتر کر اس کو منقطع نہ کیا جائے، کیونکہ اس طرح لوگوں کو بہت ہی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سفر میں تعجیل کے وقت جمع بین الصلاتین کی اہمیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ نہ تھی کہ سواری کی حالت میں جمع بین الصلاتین کرتے جیسا کہ اکثر لوگ کیا کرتے ہیں اور نہ حالت نزول میں یہ عادت طیبہ تھی۔ یہ صرف اس وقت ہوتا جب آپ کو سفر کی جلدی ہوتی۔ اور جب آپ نماز کے بعد چل رہے ہوتے جیسا کہ ہم تبوک کے متعلق بتا چکے ہیں۔

اور عرفہ کے سوا آپ سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے بغیر سفر کے نماز جمع کی ہو، تاکہ وقوف کا اتصال ہو جائے جیسا کہ شافعیؒ اور ہمارے شیخ (ابن تیمیہؒ) نے فرمایا، یہی وجہ ہے کہ (جمع بین الصلوٰتین) کو ابو حنیفہؒ نے عرفہ سے مختص بنایا ہے اور اسے قربانی کا تتمہ قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں سفر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

البتہ احمدؒ و مالکؒ اور شافعیؒ نے اس کا سبب سفر قرار دیا ہے۔ یہ مختلف الرائے ہو گئے۔ اس لیے شافعیؒ اور احمدؒ نے ایک روایت کے مطابق سفر طویل کو اس کا سبب قرار دیا ہے اور اہل مکہ کے لیے اسے جائز قرار نہیں دیا۔ امام مالکؒ اور احمدؒ نے دوسری روایت کے مطابق اہل مکہ کے لیے عرفات میں قصر اور جمع کو جائز بتایا ہے اور ہمارے شیخ نے اسے اختیار کیا ہے اور ابو الخطاب نے عبادات میں اسے (اختیار کیا ہے) پھر ہمارے شیخ نے اسے رد کیا ہے اور چھوٹے اور طویل سفر میں اسے قصر اور جمع کرنے کے متعلق وجۂ جواز قرار دیا ہے جیسا کہ سلف کی کثیر جماعت کا مذہب ہے۔ امام مالکؒ اور ابو الخطابؒ نے اہل مکہ کے لیے مخصوص بتایا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے قصر و افطار (سفر میں روزہ نہ رکھنے) میں سفر کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ سفر مطلق میں آپ نے اسے مطلق چھوڑ دیا جیسا کہ ہر سفر میں تیمم کو مطلق کر دیا ہیں اس سلسلہ میں آپ سے صحت کے ساتھ کچھ بھی منقول نہیں۔

اور ایک دن، دو دن یا تین دن کی تحدید جو مروی ہے۔ تو اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔

تلاوتِ قرآن

لحن و ترتیل کے ساتھ یا سادگی سے؟

موافق اور مخالف مسلک آپ کا معمول تلاوت میں ترتیل تھا، تیزی اور سرعت کے ساتھ تلاوت نہ کرتے بلکہ ایک ایک حرف کرکے واضح طور پر تلاوت فرماتے۔ آپ ایک ایک آیت کی تلاوت وقفہ کرکے کرتے اور مد کے حروف کو کھینچ کر پڑھتے۔ مثلاً "رحمٰن" اور رحیم کو مد سے پڑھتے اور تلاوت کے آغاز میں آپ شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگتے اور پڑھتے: اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم،

اور گاہے گاہے یوں پڑھتے: اللھم انی اعوذ بک من الشیطان الرجیم من ھمزہ و نفخہ و نفثہ۔ آپ تلاوت سے قبل تعوذ پڑھتے اور دوسروں سے قرآن مجید سننا پسند فرماتے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حکم فرمایا تو انہوں نے آپ کے سامنے تلاوت کی۔ آپ سن رہے تھے۔ اس موقع پر اس قدر خشوع طاری ہوا کہ آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

آپ کھڑے، بیٹھ کر، لیٹ کر، وضو اور بغیر وضو کے، جنابت کے علاوہ (ہر حالت) میں قرآن پاک پڑھ لیتے اور اس کی تلاوت سے منع نہ فرماتے اور آپ بہترین انداز سے تلاوت فرماتے اور کبھی کبھی آپ کی آواز لوٹ آتی جیسا کہ انّا فتحنا لک فتحًا پڑھتے وقت آپ کی آواز لوٹ گئی اور عبداللہ بن مغفل نے آپ کی ترجیع کی کیفیت تین بار آ آ آ کی صورت میں بیان کی۔ (بخاری) اور جب آپ کی مندرجہ ذیل احادیث کو جمع کیا جائے۔

۱۔ "قرآن پاک کو اپنی آوازوں سے زینت بخشو۔"

۲۔ "جو قرآن میں تغنی سے تلاوت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔"

۴ - اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اس سے زیادہ اذن نہیں دیا جیسا کہ اچھی آواز کا احسان کیا ہے کہ وہ قرآن کو تغنی کے ساتھ پڑھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (آواز میں) ترجیع اونٹنی کو چلانے کے لیے اضطراری امر نہ تھی بلکہ قصداً تھی۔ کیونکہ اگر یہ اونٹنی کو ہنکانے کے لیے ہوتی تو قصد کے ضمن میں داخل نہ ہوتی اور نہ حضرت عبداللہ بن مغفل اس کی حکایت کرتے۔ اور آپ اسے از خود کرتے تاکہ سکون حاصل کریں۔ اور آپ دیکھتے کہ اس طرح اونٹنی تیز چل پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی آواز منقطع ہو جاتی۔ پھر بتاتے ہیں کہ آپ قراٗت میں ترجیع کیا کرتے۔ اس لیے ترجیع ان کے فعل کی طرف منسوب کی گئی اور اگر محض اونٹنی ہنکانے کے لیے ہوتا تو آپ سے قصداً ترجیع ہوتی۔

ایک شب آپ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کی تلاوت سنی جب (ابو موسیٰؓ) کو خبر دی گئی تو کہنے لگے: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر از حد حسین اور اچھے انداز میں تلاوت کرتا اور اپنی آواز سے خوب زینت دیتا۔

اور ابو داؤدؒ نے سنن میں عبد الجبار ورد سے نقل کیا ہے انہوں نے بتایا کہ میں نے ابن ابی ملیکہ کو کہتے سنا کہ عبداللہ بن یزید نے بتایا کہ ہمارے پاس سے ابو لبابہؓ گزرے۔ ہم ان کے پیچھے چل پڑے۔ آخر وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ اچانک ایک آدمی کو جس کی ظاہری حالت کمزور تھی میں نے کہتے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے:

جو قرآن مجید کو تغنی سے (اچھی آواز سے) نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔

راوی نے بتایا کہ پھر میں نے ابن ابی ملیکہ سے کہا۔ اے ابو محمد: اگر انسان کی آواز اچھی نہ ہو تو پھر کیا کرے؟!

وہ فرمانے لگے جہاں تک ہو سکے اسے اچھا بنائے۔

میری رائے میں اس مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں لوگوں کے اختلاف ہر فریق کے طریق و اصول احتجاج اور صحیح صورت مسئلہ کا ذکر ضروری اور لازمی ہے۔ اور یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد و نصرت سے صحیح مذہب کونسا ہے؟

ایک گروہ کا خیال ہے، الحان کی قراٗت مکروہ ہے۔ یہ مذہب امام احمدؒ اور مالکؒ

وغیرہ کا ہے۔ امام احمدؒ نے علی بن سعید کی روایت میں الحان کی قرأت کے متعلق فرمایا ہے کہ مجھے یہ اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ یہ محدث (بدعت) ہے مروزی کی روایت کے مطابق آپؒ نے الحان کو بدعت قرار دیا ہے اور (فرمایا ہے) کہ اسے نہ سننا چاہیے۔

عبدالرحمٰن متطبب کی روایت کے مطابق بھی آپؒ نے الحان کی قرأت کو بدعت کہا ہے۔ ان کے لڑکے عبداللہ (نیز) یوسف بن موسیٰ، یعقوب بن حبان، اثرم، ابراہیم بن حارث کی روایت کے مطابق الحان کی قرأت کے متعلق آپؒ نے فرمایا کہ یہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ہاں! اگر ایسا پُرسوز ہو (تو پھر حرج نہیں) جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ پڑھا کرتے تھے۔

اور صالح کی روایت ہے آپ نے فرمایا۔ قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو۔ یعنی خوش آوازی سے پڑھو! اور مروزی کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی پر حسن صوت سے زیادہ اذن نہیں دیا تاکہ وہ قرآن مجید کو تغنی سے پڑھے اور ایک یہ قول بھی منقول ہے کہ:

"جس نے تغنی کے ساتھ قرآن نہ پڑھا وہ ہم میں سے نہیں"۔

تو ابن عیینہ فرماتے ہیں قرآن تغنی سے پڑھنا چاہیے۔

شافعیؒ فرماتے ہیں آواز بلند کرے۔ ان کے سامنے سورہ فتح کے واقعہ اور ترجیع کے متعلق معاویہ بن قرۃ کی روایت بیان کی گئی تو ابوعبداللہ نے اس کو الحان کے معنی میں ماننے سے انکار کر دیا، جن روایات سے الحان کی رخصت پر استدلال کیا جاتا ہے ان کا انکار کیا۔

ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا کہ ان سے نماز میں الحان کے متعلق دریافت کیا گیا تو وہ فرمانے لگے کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ اور فرمایا کہ یہ تو غنا ہے، لوگ اس طرح گاتے ہیں۔ تاکہ اس پر چند دراہم مل جائیں۔

وہ حضرات جن سے ان کی کراہت منقول ہے وہ یہ ہیں:۔ انس بن مالکؓ، سعید بن مسیبؓ سعید بن جبیرؓ، قاسم بن محمدؒ، حسنؒ، ابن سیرینؒ، اور ابراہیم نخعیؒ۔

اور عبداللہ بن یزید عکبری نے بتایا کہ میں نے ایک آدمی سے سنا کہ وہ امام احمدؒ سے دریافت کرتا تھا کہ الحان سے تلاوت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

انہوں نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

اس نے کہا محمد۔

تو فرمانے لگے، اگر تجھے مو محمد...... کھینچ کر کہا جائے تو کیا پسند ہو گا؟!
قاضی ابو یعلیٰ فرماتے ہیں کہ یہ کراہت بیان کرنے میں مبالغہ ہے (یعنی از حد مکروہ ہے)۔

حسن بن عبد العزیز حرولی نے کہا کہ ایک آدمی نے وصیت کی اور ترکہ میں ایک لونڈی چھوڑی جو الحان سے قرآن پڑھتی تھی۔ تو میں نے احمد بن حنبل اور حرث بن مسکین اور ابو عبید سے دریافت کیا کہ میں اسے کیسے فروخت کروں؟ تو وہ کہنے لگے اسے سادہ طور پر یعنی نہایت معمولی نرخ پر فروخت کر دو۔ میں نے انہیں اس میں ہونے والا نقصان بتایا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ اسے سادہ طور پر کم نرخ پر بیچ دو۔ قاضی فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس لیے یہ فرمایا کہ اس لونڈی سے سماع مکروہ تھا اس لیے اس پر گانے کی طرح اجرت لینا جائز نہیں۔ ابن بطال فرماتے ہیں کہ ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ تغنی بالقرآن کا مطلب اچھی آواز سے تلاوت، قرأت میں ترجیع اور آواز و لحن میں تحسین ہے نیز بتایا کہ یہ ابن مبارکؒ اور نضر بن شمیل کا قول ہے۔

اور جن لوگوں کے نزدیک قرآن کو الحان سے پڑھنا جائز ہے، ان کے بارے میں طبریؒ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ ابو موسیٰؓ سے کہا کرتے کہ ہم نے پروردگار کا صرف ذکر کیا اور ابو موسیٰؓ پڑھتے ہیں اور الحان کرتے ہیں اور فرمایا کہ جو قرآن میں ابو موسیٰؓ کی طرح تغنی کر سکے تو اسے مناسب ہے۔

اور حضرت عقبہ بن عامرؓ قرآن مجید (تلاوت میں) سب لوگوں سے زیادہ اچھی آواز میں پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ ان سے کہنے لگے کہ میرے سامنے فلاں سورت پڑھو۔ چنانچہ انہوں نے تلاوت کی سن کر حضرت عمرؓ رو پڑے اور فرمایا:

میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ نازل ہو چکی ہے۔

راوی کہتا ہے کہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ نے اس کی اجازت دی ہے۔ عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ عبد الرحمٰن بن اسود بن ابی یزید رمضان کے مہینہ میں مساجد میں اچھی آواز کی تلاش کیا کرتے اور طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ الحان کے ساتھ قرآن مجید سنا کرتے اور محمد بن عبد الحکیم بتلاتے ہیں کہ میں نے اپنے والد اور امام شافعیؒ اور یوسف بن عمروؒ کو لحن سے قرآن پاک سنتے دیکھا۔ ابن جریر طبریؒ نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

لحن کو جائز قرار دینے والے بتاتے ہیں کہ ابن جریر کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ حدیث کا مطلب تحسین آواز اور غنائے معقول ہے کہ قاری سننے والے کو غمزدہ بنا دے ابوالحسن بطال نے بتایا ہے کہ اس مسئلہ میں اس روایت سے بھی اشکال واقع ہو جاتا ہے جیسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا انہیں زید بن حباب سے انہیں موسیٰ بن ابی رباح سے انہیں اپنے والد سے انہیں عقبہ بن عامر سے روایت ملی کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قرآن سیکھو اور اسے تغنّی سے پڑھو اور اسے لکھو۔ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ یہ بہت جلد حافظہ سے نکل جاتا ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ عمر بن ابی شیبہؒ نے بتایا کہ ابو عاصم نبیل کے سامنے تغنی باالقرآن کے سلسلہ میں ابن عیینہؒ کی تاویل ذکر کی گئی کہ "اس سے استغناء چاہتے ہیں"۔ تو انہوں نے فرمایا: ابن عیینہ نے کچھ بھی نہیں کیا۔

ہمیں ابن جریج سے انہیں عطاء بن علید بن عمیر سے روایت ملی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس معزفہ (باجہ) تھا، جس سے آپ غنا کے ساتھ تلاوت کرتے، خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔

اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (حضرت داؤد) علیہ السلام ستر لحنوں میں زبور پڑھتے تھے اور ایسے طریقے سے پڑھتے کہ عام لوگ اس سے طرب حاصل کرتے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ابن عیینہ کی تاویل کے متعلق دریافت کیا گیا تو وہ کہنے لگے ہم اسے بہتر جانتے ہیں۔ اگر ان کا مطلب استغناء کا ہوتا تو فرماتے من لم یستغن باالقرآن لیکن جب آپؐ نے یتغنی باالقرآن فرمایا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ ان کا مطلب تغنی ہے۔ فرماتے ہیں تحسین آواز اور تلاوت میں تزئین و تطریب ایسی چیز ہے کہ جو نفوس میں مؤثر، سماع کی داعی اور اس طرف مائل کرنے میں خوب (اثر رکھتی) ہے۔ تو گویا اس طور پر الفاظ میں سننے والوں کے لیے میلان اور قلوب میں ان کے معانی کی تنفیذ میں (شدت) پیدا ہو جاتی ہے اور حصول مقصد میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ گویا یہ کڑوی دوا میں مٹھاس ہے جس سے مقام مرض تک دوا کی رسائی آسانی سے ہو جاتی ہے اور کھانے میں خوبی پیدا کرنے اور مسالہ جات کے قائم مقام ہے تاکہ طبیعت اسے قبول کرنے پر راغب ہو سکے، جس طرح ایک عورت اپنے مرد کے لیے خوشبو زیورات اور حسن پیدا کر کے جاذبیت پیدا کرتی ہے تاکہ مقاصد نکاح پورے ہو سکیں۔

اور کہتے ہیں کہ چونکہ آدمی کے لیے طرب اور اشتیاقِ غنا ایک لازمی امر ہے اس لیے طربِ غنا

کی بجائے طرب قرآن متعین کیا گیا جیسے کہ ہر حرام و مکروہ کے عوض میں بہتر چیز مقرر ہوئی اور تیروں کے ذریعہ تقسیم کرنے کی بجائے استخارہ مقرر ہوا۔ جو توحیدِ خالص اور توکل سے عبارت ہے اور بدکاری کی جگہ نکاح، جوئے کی جگہ نیزوں سے مسابقت اور سماعِ شیطانی کی بجائے سماعِ رحمانی قرآنی متعین ہوا۔ اور اس کے نظائر کثرت سے ملتے ہیں اور حرام چیز زیادہ تر یا کلیتاً مفسدہ پر مشتمل ہوتی ہے اور تطریب و لحن سے پڑھنے میں کوئی ایسا (مفسدہ) نہیں پایا جاتا کیونکہ وہ وضعی کلام سے خارج نہیں ہوتی اور سامع اور اس کے فہم میں آڑے نہیں آتی، بلکہ اس کے برعکس صورت ہوتی ہے۔

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ لحن و طرب کلمات کو ان کی اصل وضع سے نکال دیتے ہیں اور سامع اور اس کے فہم و درک میں حائل ہوتے ہیں۔ اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ حالات و واقعات اس کے خلاف ہیں اور فرماتے ہیں کہ "یہ تلحین و تطریب ایک ایسا امر ہے جو کبھی تو کیفیت ادا کو ظاہر کرتا ہے۔ کبھی سلیقہ اور امر طبعی پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی تکلف اور بناوٹ سے عبارت ہوتا ہے اور کیفیاتِ اداءِ کلام کو اس کے مفردات کو وضع سے خارج نہیں کرتیں بلکہ یہ تو آواز نکالنے والے کی آواز کی صفات ہوتی ہیں، جو (آواز کو) باریک اور موٹا کرنے اور اس میں امالہ کرنے، قاری کی طویل و متوسط مد کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ لیکن یہ کیفیات صرف حروف کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور الحان و تطریب کا آوازوں سے تعلق ہوتا ہے اور ان کیفیات کے آثار نقل کرنا ناممکن ہے۔

ہاں ادائے حروف کی (کیفیات قدرے بیان ہو سکتی ہیں) اس لیے ہم اس کے الفاظ نقل کرتے ہیں، لیکن یہ مکمل نقل نہ ہوگی بلکہ صرف ممکن حد تک ہم اسے نقل کر سکیں گے جیسا کہ سورۃ فتح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجیع اس طرح بیان ہوئی: آآآ۔

تطریب و تلحین دو باتوں سے عبارت ہے۔ مد اور ترجیع۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ رحمٰن اور رحیم پڑھتے وقت مد کو کھینچتے (طویل کر کے پڑھتے) نیز گزشتہ صفحات میں آپ سے ترجیع بھی ثابت ہو چکی ہے۔

(لحن) کے مانعین نے کئی طرح کے استدلال دیئے ہیں۔ ایک روایت حضرت حذیفہؓ بن یمان سے ہے۔ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ:

قرآن پاک کی عرب کے لحن اور آواز میں تلاوت کرو۔ اور اہل کتاب اور فساق کے لحن سے بچو۔ کیونکہ عنقریب میرے بعد ایسی اقوام آئیں گی جو قرآن پاک کو غناء اور نوحہ کے انداز میں پڑھیں گی (قرآن) ان کے حلق سے آگے نہ بڑھے گا۔ ان کے قلوب فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور ان کے قلوب

بھی مفتون ہوں گے، جنہیں وہ اپنی شان دکھا رہے ہوں گے اسے ابوالحسن اور زرین نے تجرید الصحاح میں روایت کیا اور ابو عبداللہ حکیم ترمذی ؒ نے نوادر الاصول میں نقل کیا ہے۔

قاضی ابو یعلیٰ ؒ نے جامع میں اس سے اور اس کے ساتھ ایک اور حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرائط قیامت ذکر فرمائیں اور ان میں سے اس کا بھی تذکرہ کیا کہ قرآن کو باجہ (گانا) تصور کر لیا جائے گا۔ ایک آدمی جو نہ زیادہ پڑھا ہوا اور نہ افضل ہو گا محض اس وجہ سے ان کے سامنے تلاوت کرے گا کہ وہ اسے غناء کے انداز میں گائے گا اور فرمایا کہ زیاد نہدی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس قراء کو لے کر آیا۔ اس سے کہا گیا کہ پڑھو تو اس نے آواز بلند کی اور طرب انگیز طریقہ (سے پڑھا) اس کی آواز بلند تھی، حضرت انس نے اپنا چہرہ کھولا، آپ کے چہرہ پر سیاہ دھجی تھی اور فرمایا:

اے شخص وہ تو اس طرح نہ پڑھتے تھے۔

اور جب حضرت انس ؓ کوئی غلط بات دیکھتے تو اپنے چہرہ سے دھجی اٹھاتے اور منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طرب انگیز موذن کو اذان میں طرب پیدا کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ ابن جریج نے حضرت عطاء سے انہوں نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طرب انگیز طریقہ پر اذان پڑھنے والا ایک موذن تھا آپ نے فرمایا کہ اذان آسان اور سہل ہے۔ اگر تیری اذان آسان اور سہل ہو (تو اذان دے، ورنہ اذان مت دے (دار قطنی)

اور عبدالغنی بن سعید حافظ نے حضرت قتادہ سے انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرات مد سے ہوتی جس میں ترجیع نہ تھی۔

اور منقول ہے کہ ترجیع و تطریب میں غیر مہموز ہمزہ اور غیر ممدود مد ہوتی ہے اور ایک الف کی ترجیع میں کئی الف ایک واؤ میں کئی واؤ اور ایک یاء کی ترجیع میں کئی یاء بن جاتی ہیں۔ یہ قرآن مجید (کے الفاظ میں) زیادتی ہے اور یہ ناجائز ہے۔

اور جو سلف کے حالات سے کچھ باخبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ تکلفات اور موسیقی کے الحان کے ساتھ تلاوتِ قرآن سے بیزار تھے، جو مد و دگنی چنی موزوں کردہ حرکات و ایقاع کا نام ہے اور وہ اس انداز کی تلاوت کرنے میں اللہ تعالیٰ سے از حد خائف تھے۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ (صحابہؓ) تحزین و تطریب سے پڑھتے اور قرآن میں اپنی آوازوں کو خوبصورت بناتے۔ کبھی تو غمناک طریقہ سے اور کبھی طرب اور اشتیاق آمیز طریقہ سے تلاوت کرتے اور یہ ایک ایسا امر ہے جو عین اقتضائے طبیعت ہے اور شدتِ تقاضائے طبائع کے باعث شارع علیہ السلام نے اسے ممنوع قرار نہیں دیا، بلکہ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا اور اسے مستحب فرمایا اور بتایا کہ جو اس طرح پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی تلاوت سنتا ہے اور فرمایا جو قرآن کو تغنی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔

اور اس روایت میں دو وجوہ ہیں ایک امر واقع ہے جس پر ہم سب عمل پیرا ہیں۔ اور دوسرا اس طریقہ کی مخالفت جو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخالف طریقہ و سنت پر ہو۔

مریضوں کی عیادت

مریضوں کی عیادت میں مسلم، کافر مشرک کی قید نہیں

کافر خادم کی عیادت صحابہ میں سے جو بیمار ہو جاتا آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔

اہل کتاب میں سے ایک آپؐ کا خادم تھا آپؐ نے اُس کی بھی عیادت کی۔ آپ نے اپنے چچا کی عیادت کی، حالانکہ وہ مشرک تھے۔ ان دونوں پر آپؐ نے اسلام پیش کیا۔ چنانچہ یہودی مسلمان ہو گیا۔

آپؐ مریض کے قریب تشریف لے جاتے اور اس کے سرہانے بیٹھتے اس کا حال دریافت فرماتے اور پوچھتے کیسے ہو؟

منقول ہے کہ آپؐ مریض سے پوچھتے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ فرماتے کہ کیا تمہیں کسی چیز کی خواہش ہے؟ اگر وہ کچھ چاہتا اور آپؐ سمجھتے کہ یہ اس کے لیے نقصان دہ نہیں تو اُسے کھانے کا حکم فرماتے۔

آپؐ مریض پر داہنا ہاتھ پھیرتے اور دعا پڑھتے:

اللھم رب الناس اذھب الباس واشف انت الشافی لا شفاءك لا یغادر سقماً۔

یعنی: اے اللہ لوگوں کے پروردگار دکھ دور کر اور شفاء عطا فرما دے تو ہی شفاء دینے والا ہے۔ تیرے سوا کہیں سے کوئی شفا نہیں۔ ایسی (شفاء) کہ کوئی بیماری نہ رہنے دے۔

اور یہ دعا بھی پڑھا کرتے: امسح الباس رب الناس بیدك الشفاء لا

کاشف لہٗ الا انت۔

یعنی: اے لوگوں کے پروردگار دکھ ہٹا دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں شفاء ہے تیرے سوا کوئی (اس روگ) کو کھولنے والا نہیں۔

اور آپ مریض کے لیے تین بار دعا فرماتے، جیسا کہ آپ نے حضرت سعدؓ کے لیے دعا کی۔ اے اللہ سعد کو شفاء دے اے اللہ سعد کو شفاء دے اے اللہ سعد کو شفا دے۔

اور جب آپ مریض کے پاس تشریف لاتے تو فرماتے، کوئی فکر نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بسا اوقات فرماتے: یہ بیماری (گناہوں کا) کفارہ اور طہور بن جائے گی۔

اور جس کے زخم یا پھوڑا یا کوئی تکلیف ہوتی آپؐ اس پر دم کیا کرتے۔ چنانچہ شہادت کی انگلی زمین پر رکھ دیتے۔ پھر اسے اٹھا لیتے اور پڑھتے۔

بسم اللہ تربۃ اَرضنا بریقۃ بعضنا لیشفی سقیمنا باذن ربنا۔
یعنیؐ اللہ کے نام سے ہماری زمین کی مٹی ہم میں سے بعض کے لعاب سے ہمارے بیمار کو شفاء دے گی، ہمارے پروردگار کے اذن سے۔"

یہ صحیحین میں منقول ہے اور یہ ان الفاظ کے خلاف ہے جو اس روایت میں آتے ہیں کہ ستر ہزار ایسے ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور وہ ایسے ہوں گے کہ نہ تو وہ دم کریں گے اور نہ دم کرائیں گے۔ تو واقعہ یہ ہے "لا یرقون دم نہ کریں گے"۔ کا لفظ راوی کی طرف سے بربنائے غلطی اضافہ ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو فرماتے سنا کہ یہ حدیث یوں ہے" کہ وہ، وہ لوگ ہیں جو جھاڑ (پھونک) نہ کرائیں گے"۔ میں (ابن قیمؒ) کہتا ہوں کہ یہ لوگ جنت میں اس وجہ سے داخل ہوں گے کہ ان کی توحید کامل ہو گی، انہیں اپنے پروردگار پر ہر طرح توکل ہو گا، اسی کی طرف سکون ملے گا، اسی پر اعتماد کریں گے اور اسی سے راضی رہیں گے اور اپنی تمام ضروریات اسی کے سامنے پیش کریں گے وہ لوگوں سے جھاڑ پھونک کا اور نہ اس کے علاوہ کسی طرح کا سوال کریں گے اور نہ کوئی بدفالی اُن کے عزائم میں آڑ بن سکے گی۔ کیونکہ بدفالی (شگون) توحید کو ناقص اور کمزور کر دیتی ہے۔

(فرمایا) اور جھاڑ (دم) کرنے والا محسن ہے۔ اور دم کرانے والا سائل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دم کیا ہے، دم کرایا نہیں اور فرمایا کہ جو تم میں سے اپنے بھائی کو نفع دے سکے اسے چاہیے کہ وہ ضرور نفع دے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صحیحین کی اس روایت کا کیا جواب ہو گا جو حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر جاتے تو ہاتھ اکٹھے کر لیتے پھر ان پر پھونکتے اور قل ھواللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر پھونکا کرتے اور ان دونوں (ہتھیلیوں) کو جہاں تک ہو سکتا جسم پر مل لیتے اور سر سے شروع کرتے اور چہرہ سے یعنی وہ حصہ جو جسم میں سے سامنے کا ہوتا، آپ تین مرتبہ ایسا کرتے۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے تو آپؐ مجھے حکم دیتے کہ میں ایسا کروں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت تین طرح سے مروی ہے۔ ایک ابھی مذکور ہو چکا ہے۔

دوسرا یہ کہ آپؐ اپنے جسم مبارک پر پھونک لیتے۔

تیسرے یہ کہ حضرت عائشہ رضؓ ان (سورتوں کو پڑھ کر) آپؐ پر پھونک دیا کرتیں اور برکت کی خاطر آپ دست مبارک کو جسدِ اطہر پھیرتیں۔

(اور چوتھے) الفاظ یہ ہیں کہ جب آپ بیمار ہوتے تو اپنے آپ پر معوذات پڑھتے اور پھونک لیتے۔

یہ الفاظ خود ایک دوسرے کی وضاحت کر رہے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے آپؐ پر پھونک لیتے لیکن ضعف اور تکلیف کے باعث آپ اپنے سارے جسدِ اطہر پر ہاتھ نہ پھیر سکتے اس لیے حضرت عائشہ رضؓ کو حکم دیتے کہ پھونک لینے کے بعد آپ کے ہاتھوں کو جسدِ اطہر پر پھیر دیں۔ تو یہ دراصل دم کرانا نہیں ہے اور نہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ آپؐ مجھے حکم دیتے کہ میں آپ پر دم کروں۔ بلکہ بات صرف اس قدر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے آپؐ پر دم کر چکنے کے بعد (عائشہ رضؓ) سے فرماتے کہ وہ آپ کے ہاتھوں کو (بدن مبارک) پر پھیر دیں۔ پھر (حضرت عائشہ رضؓ) نے فرمایا کہ آپؐ مجھے حکم دیتے کہ میں یہ کروں، یعنی آپؐ کے ہاتھوں کو آپؐ کے جسدِ اطہر پر پھیر دوں جیسا کہ آپ (صحت کی حالت میں) خود کرتے تھے۔

اور مریض کی عیادت کے لیے کوئی دن مقرر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ میں سے نہیں تھا۔ اور نہ اوقات میں سے کوئی متعین وقت تھا۔ بلکہ آپ دن رات تمام اوقات میں (حسبِ ضرورت) مریضوں کی عیادت فرماتے۔

اور مسند میں آپؐ سے منقول ہے کہ جب ایک آدمی اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ جنت کے باغ میں چلتا ہے یہاں تک کہ وہ بیٹھ جاتا ہے اور اسے رحمت ڈھانپ

یعنی ہے چنانچہ اگر وہ صبح کو عیادت کرے) تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کو (عیادت کرے) تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔

ایک لفظ یہ ہے کہ جو مسلمان بھی دوسرے مسلمان کی عیادت کرے گا تو اللہ اُس کے لیے ستر ہزار فرشتے بھیجے گا، جو اس کے لیے دعائے رحمت کرتے رہیں گے۔ یعنی دن کی کسی گھڑی میں (عیادت کی ہوگی)، یہاں تک کہ شام ہو جائے اور رات کی کسی گھڑی میں (عیادت کی ہوگی) یہاں تک کہ صبح ہو جائے گی۔

اور آپ بیماری چشم کے مریضوں کی بھی عیادت فرمایا کرتے۔

اور کبھی آپ مریض کی پیشانی پر دست مبارک رکھتے، پھر اس کے سینہ اور پیٹ پر (ہاتھ) پھیرتے اور دعا کرتے۔ اے اللہ اسے شفا دے۔

اور آپ چہرے پر بھی (ہاتھ) پھیرتے اور جب آپ مریض سے مایوس ہو جاتے تو ——— پڑھتے: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یعنی ہم اللہ کے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

نماز جنازہ

مسجد میں پڑھنی چاہیے یا مسجد کے باہر؟

میت کے لیے دعائے مغفرت

جنازوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ تمام دوسری امتوں کے خلاف زیادہ کامل اور میت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اچھائی پر مشتمل تھی۔

آپ ایسا طرز اختیار فرماتے، جس سے میت کو قبر میں اور حشر کے دن نفع پہنچے، اور اس کے اہل و اقارب کے ساتھ اچھا برتاؤ جس سے ان کا غم کم ہو، اور زندہ لوگوں کی عیادت بھی آپ کے دل میں تھی۔

جنازوں میں آپ کی سنت طیبہ تھی خدائے تعالیٰ کی عبادت مکمل طور پر قائم کرنا، میت پر احسان اور اسے اللہ تعالیٰ کے دربار کی طرف احسن و افضل طریقہ پر روانہ کرنا۔ صحابہؓ کا قطاروں کی صورت میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا، میت کے لیے بخشش چاہنا اور مغفرت اور رحمت اور عفو و درگذر کی دعا کرنا، پھر اس کے آگے آگے چلنا یہاں تک کہ اسے لحد تک وداع کیا جائے۔

اس کے بعد آپ صحابہؓ سمیت قبر کے سامنے کھڑے ہوتے اور میت کے لیے تثبیت کی دعا کرتے جس کی اسی وقت ضرورت ہوتی اور گاہے گاہے اس کی قبر پر تشریف لے جاتے۔ میت کو سلام فرماتے اور اس کے لیے دعا کرتے جیسے احباب و عزیز ایک قبیلہ ایک آدمی کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔

چنانچہ مریض کے ساتھ آپ کا پہلا سلوک حالت مرض میں تذکیر آخرت ہوتا آپ اسے وصیت اور توبہ کا حکم دیتے، اور جو اس کے پاس آتا اسے حکم دیتے کہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کی تلقین کرے تاکہ کلمہ طیبہ اس کا آخری کلام ہو۔

پھر ان اقوام کی عادات کی ممانعت جو بعث و نشور (حشر و نشر) پر ایمان نہیں رکھتیں، جیسے چہرے پر تھپڑ مارنا، کپڑے پھاڑنا، سر منڈوانا اور واویلا کرتے ہوئے آواز بلند کرنا وغیرہ۔

میت کے لیے آنسو بہانا جائز ہے اور میت کے لیے خشوع اور ایسا گریہ کہ جس میں آواز نہ ہو اور صرف دل ہی غمگین ہو سنت قرار دیا۔ آپ خود بھی اس پر عمل پیرا ہوتے اور فرماتے تھے، آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمگین ہے، اور ہم وہی کہتے ہیں جس سے ہمارا پروردگار راضی ہو۔

آپ نے اپنی امت کے لیے حمد و استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا) اور اللہ پر راضی رہنا مسنون قرار دیا، اور یہ باتیں گریۂ چشم اور غم دل کے منافی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ تمام مخلوق میں سے سب سے راضی بقضاء اللہ اور سب سے زیادہ حمد کرنے والے تھے اور اس کے باوجود اپنے صاحبزادے ابراہیم علیہ السلام کی وفات پر وفور محبت و رحمت و رقت کے باعث رو دیئے۔ اور آپ کا قلب اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا و شکر سے بھرپور اور زبان اس کے ذکر و حمد میں مشغول تھی۔

اور بعض لوگوں کو اس بات میں اشکال ہو جاتا ہے کہ ایک عارف کا لڑکا فوت ہو گیا تو وہ ہنسنے لگا، پوچھا گیا کہ تو اس حالت میں ہنس رہا ہے؟

وہ کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک امر کا فیصلہ فرمایا تو میں نے چاہا کہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو جاؤں۔ تو اہل علم کی ایک جماعت کو اس میں اشکال سا ہو گیا اور کہنے لگے کہ جس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام فوت ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیوں رونے لگے؟ حالانکہ آپ تو تمام مخلوق سے زیادہ اللہ کے امر و فیصلہ پر راضی ہیں اور یہ عارف اس قدر راضی ہوا کہ ہنس دیا؟

میں نے حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو فرماتے سنا کہ اس عارف کی سنت سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت زیادہ کامل ہے، کیونکہ آپ نے عبد ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اس طرح آپ کا قلب رضائے الٰہی اور بچے کے متعلق رحمت و رقت کے لیے وسعت اختیار کر گیا۔ چنانچہ آپ نے اللہ کے امر فیصلہ پر رضا ظاہر کی اور حمد بیان کی، اور رحمت و رقت کے باعث روئے۔ رقت نے آپ کو رونے پر، عبودیت اور اللہ کی محبت نے رضا و حمد پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس عارف کا قلب دو مختلف اوصاف کا متحمل نہ ہو سکا، اور دونوں کے شہود و قیام کے لیے اس کے باطن میں وسعت پیدا نہ ہو سکی اس لیے اس کی عبودیت رضا اس کی عبودیت رحمت و رقت میں آڑے آگئی۔

میت کی تطہیر و تجہیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ میت کی تطہیر و تجہیز اور خوشبو وغیرہ لگانے میں جلدی کرتے اور سفید کپڑوں میں تکفین کرتے۔

میت لائی جاتی اور میت لائے جانے کے بعد جب آپ کو بلایا جاتا آپ تشریف لا کر اس کے

پاس ٹھہرتے، یہاں تک کہ تجہیز ہو جاتی اور پھر آپ نماز جنازہ پڑھتے اور اسے قبر تک پہنچاتے۔ پھر صحابہؓ نے محسوس کیا کہ یہ بات آپ کے لیے تکلیف دہ ہے، لہٰذا مریض کے فوت ہو جانے کے بعد آپؐ کو بلاتے، آپ تجہیز و غسل و کفن کے وقت موجود رہتے۔ پھر محسوس کیا کہ یہ بھی آپ کے لیے باعث مشقت ہے، تو صحابہؓ ہی تجہیز و تکفین کرتے اور چارپائی پر میت کو لے جاتے، آپؐ مسجد سے باہر اس کا جنازہ پڑھتے۔

اور مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا آپ کی سنت مراقبہ نہیں، بلکہ آپ مسجد سے باہر ہی جنازہ پڑھا کرتے تھے اور گاہے گاہے مسجد میں بھی جنازہ پڑھ دیتے جیسا کہ آپ نے سہیل بن بیضاء اور اس کے بھائی کا مسجد میں جنازہ پڑھا لیکن یہ آپ کی سنت اور عادت میں شامل نہ تھا۔

اور سنن ابوداؤد میں صالح مولی توامۃ کی روایت سے مروی ہے۔ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی۔ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسجد میں نماز جنازہ پڑھے، اس کے لیے کچھ (اجر) نہیں۔

روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ خطیب نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ "اس پر کچھ نہیں اور دوسرے روایت کرتے ہیں" کہ اس کے لیے کچھ نہیں" ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے اس کے الفاظ ہیں:- فلیس لہٗ شیٔ اس کے لیے کچھ نہیں۔ لیکن امام احمدؒ وغیرہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

صالح راوی ائمہ اسماء الرجال کی نظر میں

امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ یہ صالح مولی توامۃ کے متفردات میں سے ہے۔ بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صالح کے متفرد ہوتے ہوئے ثقہ ہے، اور حضرت عائشہؓ کی روایت اس سے زیادہ صحیح ہے، اور صالح کے عدل میں اختلاف ہے۔ مالکؒ اس پر جرح کرتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے مسجد میں نمازِ (جنازہ) پڑھی۔

میں کہتا ہوں کہ صالح فی نفسہٖ ثقہ ہے جیسا کہ عباس نے ابن معین سے روایت کی ہے کہ وہ فی نفسہٖ ثقہ ہے اور ابن ابی مریم اور یحییٰ نے کہا کہ ثقہ حجت ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ مالکؒ نے اسے ترک کیا ہے، تو وہ کہنے لگے کہ مالکؒ نے انھیں اس وقت پایا جب کہ (کبر سنی کے باعث) ان کے حواس جاتے رہے اور ثوریؒ کی ملاقات بھی اسی زمانہ کی ہے لیکن ابن ابی ذویبؒ نے اس حالت تک پہنچنے سے قبل ان سے (حدیث) کا سماع کیا اور علی بن فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں۔ ہاں البتہ (کبر سنی کے باعث) ان کے حواس درست نہ رہے تھے۔ ثوریؒ نے ان سے اس حالت کے بعد سماع کیا اور ابن ابی ذویب کا سماع

اس سے قبل تھا اور ابن حبان فرماتے ہیں کہ ان کی (عقل) حالت ایک سو پچیس ھ میں خراب ہوئی، اور ثقہ رجال سے ایسی روایات کرنے لگے جو موضوعات سے ملتی جلتی تھی، اور ان کی قدیم اور جدید احادیث مختلط ہو کر رہ گئیں اور ان میں فرق نہ کیا جا سکا اس لیے ان کا ترک اولیٰ ہے۔ ( )

خطابیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے مسجد میں نمازِ (جنازہ) پڑھائی اور یہ بھی معلوم ہے کہ عام مہاجرین و انصار بھی اس میں شریک ہوئے اور ان کا ترکِ انکار اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے اور فرمایا، کہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت تاویل سے اگر ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو کہ اجر میں کمی ہو جائے گی وہ اس طرح کہ، جو مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھے، تو خیال یہ ہے کہ وہ واپس چلا جائے گا اور دفن میں شریک نہ ہوگا اور جو جنازہ کے ساتھ چلے اور قبرستان کے قریب جنازہ پڑھے وہ دفن میں بہرحال شریک ہوگا، اور دو قیراط اجر کا مستحق ہوگا، نیز کثرت اقدام پر الگ ثواب حاصل ہوگا اس طرح مسجد میں جنازہ پڑھنے والا اس آدمی سے اجر میں خسارے میں رہ گیا جو کہ مسجد سے باہر جنازہ پڑھتا ہے۔

رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ فلاشئی لہ "(اس کے لیے کچھ اجر نہیں") ایک جماعت نے اس کی یہ تاویل کی ہے فلہ شئی علیہ کہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں، تاکہ دونوں لفظ متحد ہو جائیں اور تناقض نہ رہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا، یہاں بھی اس کا معنیٰ فَعَلَيْهَا یعنی اگر تم برائی کرو گے تو تمہارے لیے یعنی تم پر ہوگی، دونوں احادیث میں یہ لوگوں کے طریقے (بیان) ہیں اور صحیح مسلک وہی ہے جو ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر ہوا کرے بجز کسی عذر کے اور دونوں امور جائز ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ نماز جنازہ مسجد سے باہر ہو۔

میت کو وفورِ محبت یا عقیدت سے بوسہ دینا جائز ہے

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے تو میت کو ڈھانپ دیا جائے اس کی آنکھیں بند کی جائیں اور اس کے چہرے اور بدن کو (کپڑے) سے چھپا دیا جائے۔

بسا اوقات آپ میت کا بوسہ لے لیتے جیسا کہ آپ نے عثمان بن مظعونؓ کا بوسہ لیا اور روئے، اسی طرح حضرت صدیق رضی اللہ عنہ، نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

اور آپ میت کو تین پانچ یا غسال کے خیال کے مطابق (جس قدر ضرورت ہو) غسل دینے کا حکم دیتے اور آخری غسل کافور سے (پانی) سے دینے کا حکم دیتے۔

اور میدان جنگ کے شہید کو غسل نہ دیتے۔ امام احمدؒ سے منقول ہے کہ آپؐ نے شہداء کے غسل سے منع فرمایا، البتہ آپ ان سے لوہا (ہتھیار) اور چمڑے (کا سامان لباس) اتار لیتے، اور انھیں ان کے کپڑوں میں دفن کر دیتے، اور ان پر نماز جنازہ نہ پڑھتے اور جب کوئی محرِم فوت ہو جاتا تو آپ اسے پانی اور بیری (کے پتوں کے جوشاندہ کا) غسل دیتے اور اسے دو کپڑوں میں کفن دیتے۔ اور یہ محرم کے دونوں اپنے کپڑے یعنی تہ بند اور چادر ہوتی اور خوشبو لگانے اور سر ڈھانپ دینے کا حکم دیتے۔ اور میت کے ولی کو حکم دیتے کہ کفن اچھی طرح دیں اور سفید (کپڑے کا) کفن دیں، از حد مہنگے کفن سے منع فرماتے اور جب کفن تمام جسم کو ڈھانپ دینے سے کم پڑ جاتا تو اس کا سر چھپا دیتے اور پاؤں پر گھاس ڈال دیتے۔

مقروض کا قرض نماز جنازہ سے پہلے ادا ہو جانا چاہیے

نمازِ جنازہ کے لیے جب آپ کے سامنے میت لائی جاتی تو آپ دریافت فرماتے:

کیا اس پر قرض ہے یا نہیں؟

اگر اس پر قرض نہ ہوتا تو جنازہ پڑھ دیتے اور اگر قرض ہوتا تو جنازہ نہ پڑھتے اور صحابہؓ سے فرماتے کہ وہی اس کا جنازہ پڑھ لیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا (نماز) شفاعت تھی اور آپ کی شفاعت ضرور قبول ہو جاتی، ادھر یہ بندہ رہن میں (مقروض) تھا اور جب تک (قرض) ادا نہ کر دیا جائے جنت میں داخلہ نہیں ملتا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو فراخی اور کشائش مرحمت کی تو آپؐ مقروض کا جنازہ پڑھ دیتے اور اس کا قرض اپنے پاس سے ادا کر دیتے اور اس کا مال اس کے وارثوں کو دے دیتے۔

جب آپ نماز جنازہ شروع فرماتے تو تکبیر کہتے اور اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے۔

حضرت ابن عباسؓ نے جنازہ پڑھایا تو پہلی تکبیر کے بعد بلند آواز سے سورۂ فاتحہ پڑھی اور (بعد میں) فرمایا "تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔

اسی طرح ابوامامہ بن سہل نے فرمایا کہ پہلی (تکبیر) کے بعد سورہ فاتحہ پڑھنا سنت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا (لیکن) اس کی سند صحیح نہیں۔ ہمارے شیخ (ابن تیمیہؒ) فرماتے ہیں کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں بلکہ سنت ہے اور ابوامامہ بن سہل نے صحابہؓ کی ایک جماعت سے نمازِ جنازہ میں درود شریف

پڑھنا بھی نقل کیا ہے اور یحیی بن سعید انصاری نے حضرت سعید مقبری سے انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا کہ انھوں نے نمازِ جنازہ میں حضرت عبادہ بن صامت سے درود شریف کے متعلق پوچھا، انھوں نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں تمہیں بتاؤں گا (کہ جب نمازِ جنازہ) شروع کرو تو تکبیر کہو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے اور دعا کرو :-

اللھم ان عبدك فلانا كان لا يشرك بك وانت اعلم به ان كان محسنا فزد في احسانه وان كان مسيا فتجاوز عنه اللھم لا تحرمنا اجره ولا تضلنا بعده

"یعنی اے اللہ بے شک تیرا فلاں بندہ تیرے ساتھ شرک نہ کرتا تھا اور تو ہی حقیقت کو زیادہ جانتا ہے، اگر وہ نیک (محسن) تھا تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما اور اگر بُرا تھا تو اس سے درگذر فرما، اے اللہ ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کرنا اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرنا۔"

نمازِ جنازہ کا مقصد میت کے لیے دعا

اس طرح دعاؤں کے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے :

اللھم اغفر له وارحمه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس وابدله دارا خيرا من داره واهلا خيرا من اهله وزوجا خيرا من زوجه وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار

یعنی اے اللہ اسے بخش دے، اس پر رحم فرما، اس کو معاف کردے اس کو باعزت مکان دے، اس کا گھر وسیع کردے۔ اسے پانی برف اور ٹھنڈ سے دھو دے اور اس کو اس طرح گناہوں سے پاک کردے جس طرح کہ سفید کپڑے کو میل سے صاف کیا جاتا ہے اور اس کے اپنے گھر سے بہتر گھر اپنے اہل سے بہتر اہل اپنے زوج سے بہتر زوج عطا فرما اور اسے جنت میں داخل فرما اور اسے قبر کے عذاب سے اور آگ کے عذاب سے بچالے۔"

نیز آپ کی ایک دعا یہ بھی منقول ہے :

اللھم اغفر لحينا وميتنا وصغيرنا وكبيرنا وذكرنا وانثانا وشاهدنا وغائبنا اللھم من احييته منا فاحيه على الاسلام والسنة ومن توفيته منا

فتوفہ علی الایمان اللھم لا تحرمنا اجرہٗ ولا تفتنا بعدہٗ

"یعنی اے اللہ ہمارے زندہ اور مردہ کو چھوٹے اور بڑے کو مذکر اور مونث کو موجود اور غائب کو بخش دے۔ اے اللہ ہم میں سے تو جسے زندہ رکھے تو اسے اسلام اور سنت پر زندہ رکھ اور جسے فوت کرے تو حالتِ ایمان میں فوت کر۔ اے اللہ ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کرنا اور اس کے بعد آزمائش میں نہ ڈالنا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مردے کے لیے خلوص سے دعا کرنے کا حکم دیتے۔

نماز جنازہ میں کتنی تکبیریں کہنی چاہئیں؟

اور آپ چار تکبیریں کہتے اور صحیح روایت یہ ہے کہ آپ پانچ تکبیریں کہتے اور آپ کے بعد صحابہؓ چار پانچ اور چھ (تک) تکبیریں کہا کرتے، چنانچہ زیدؓ بن ارقم نے پانچ تکبیریں کہیں اور بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ تکبیریں کہی تھیں (مسلم) اور حضرت علیؓ بن ابی طالب نے حضرت سہیل بن حنیف کی (نمازِ جنازہ) میں چھ تکبیریں کہیں۔ نیز اہل بدر پر آپ نے چھ تکبیریں کہیں۔ دوسرے صحابہؓ پر پانچ تکبیریں اور باقی لوگوں پر چار (دار قطنی)

اور سعید بن منصور نے حکم سے انھوں نے ابن عیینہ سے نقل کیا کہ (صحابہؓ) اہل بدر پر پانچ چھ اور سات تکبیریں تک کہا کرتے، یہ صحیح آثار ہیں اس لیے اس میں ممانعت کی کوئی بات ہی نہیں۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چار سے زیادہ کو منع نہیں فرمایا، بلکہ آپ نے خود اور آپ کے بعد صحابہؓ نے اس پر عمل کیا۔

اسوۂ حسنۂ نبیؐ

قبریں اونچی اور پختہ کرنے اور نالہ وشیون کی ممانعت

نماز جنازہ کی تکبیریں

مروی ہے کہ نماز جنازہ میں آپ ایک سلام پر اکتفا کرتے، ایک حدیث میں آپ سے دو سلام بھی مروی ہیں۔ بیہقیؒ وغیرہ نے حضرت مقبری کی حدیث سے انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی تو چار تکبیریں کہیں اور ایک سلام کیا۔ لیکن امام احمد اثرم کی روایت میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے۔ خلال نے اسے معلومات میں ذکر کیا ہے۔ اور ابراہیم ہجری بتاتے ہیں کہ ہمیں عبداللہ بن ابی اوفیٰ نے بتایا کہ انھوں نے اپنی بیٹی کا جنازہ پڑھا تو چار تکبیریں کہیں۔ پھر تھوڑی دیر خاموش ٹھہرے رہے۔ ہم نے خیال کیا کہ پانچویں تکبیر کہیں گے (لیکن) پھر انھوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔ جب فارغ ہوئے ہم نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو وہ کہنے لگے کہ میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، جتنا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کیا کرتے تھے۔

اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کام ایسے ہیں جنھیں لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے، ان میں سے ایک جنازہ میں نماز کی طرح سلام پھیرنا ہے۔ ان دونوں کو بیہقیؒ نے ذکر کیا، لیکن ابراہیم بن مسلم ہجری کو ابن معینؒ۔ نسائی اور ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن ابی اوفیٰ سے اس کے خلاف مروی ہے۔ امام احمدؒ نے ان سے اور احمد بن قاسم سے نقل کیا کہ وہ ایک سلام پھیرتے تھے۔ ابوعبداللہ سے دریافت کیا گیا کیا آپ کسی صحابی کو جانتے ہیں کہ جو جنازہ میں دو طرف سلام پھیرتا ہو؟ فرمایا نہیں صرف چھ صحابہؓ ایسے ہیں جن سے یہ منقول ہے

کہ وہ دائیں طرف خفیف سا ایک سلام پھیرتے تھے پھر ان کے نام بتلائے جو یہ ہیں:

حضرت ابن عمرؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابوہریرہؓ، واثلہ بن اسقع۔ ابن ابی اوفیٰ۔ زید بن ثابت۔

اور امام بیہقیؒ نے علی بن ابی طالب۔ جابر بن عبداللہ۔ انس بن مالک اور ابوامامہ بن سہل بن حنیف کا نام بھی ذکر کیا ہے، تو یہ سب دس صحابہ ہوئے۔

اور ابو امامہؓ وہ ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔ اور آپ نے ان کا نام ان کی والدہ کے دادا ابو امامہ، اسعد بن زرارہ کے نام پر رکھا۔ یہ صحابہ اور کبار تابعین میں ہوگئے۔

اور رہا رفع یدین کا معاملہ، تو امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ اثر کے باعث اور نماز میں سنت پر قیاس کرتے ہوئے رفع یدین سمجھا جائے گا، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر تکبیر پر حالت قیام میں رفع یدین فرمایا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں شافعی کا اثر سے مطلب وہ ہے جو ابن عمرؓ اور انس بن مالکؓ سے مروی ہے، کہ آپ پہلی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے اور داہنا ہاتھ بائیں پر رکھ دیتے (سنن بیہقی)

اور ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب) قبر پر نماز جنازہ پڑھی تو اس میں داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ دیا (لیکن) یہ روایت یزید بن سنان راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ نماز جنازہ اگر آپ سے چھوٹ جاتی، قبر پر نماز جنازہ پڑھتے چنانچہ آپؐ نے ایک بار ایک رات کے بعد نماز جنازہ پڑھی۔ ایک بار تین (رات کے بعد) اور ایک بار ایک ماہ کے بعد (نماز جنازہ پڑھی) اور اس میں کوئی انتہائی مدت نہیں مقرر ہے۔

احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قبر پر نماز جنازہ میں کس کو شک ہے؟ جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب نماز جنازہ فوت ہو جاتی تو آپ قبر پر جنازہ پڑھتے اور یہ چھ وجوہ ہے ہے جو سب کے سب حسن ہیں۔

نیز امام احمدؒ نے قبر پر جنازہ پڑھنے میں ایک ماہ کی مدت کا تعین کیا ہے کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ وہ مدت تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے اتنی مدت کے بعد بھی جنازہ پڑھا۔

امام شافعیؒ نے میت کے بوسیدہ نہ ہو جانے تک کی مدت مقرر فرمائی ہے اور مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ولی کے سوا سب کو منع کیا ہے جب کہ ولی غائب ہو (اور جنازہ نہ پڑھ سکا تو جب موقع ملے پڑھ لے)۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ آپؐ مرد کے سر کے قریب اور عورت کے وسط میں کھڑے ہوتے۔

طفل کی نماز جنازہ پڑھنا بھی سنت نبویؐ ہے

صحیح روایت میں آپ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

بچے پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔

اور سنن ابن ماجہ میں مرفوع روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اپنے بچوں کی نماز جنازہ پڑھو، کیونکہ وہ تمہارے (ایسے نیک اعمال ہیں جو تم نے آگے بھیجے ہیں۔

احمد بن ابی عبیدہ کہتے ہیں کہ میں نے احمدؒ سے سوال کیا کہ سقط پر آپ کس وقت جنازہ پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

فرمایا جب چار ماہ کا (حمل ساقط) ہو کیونکہ اس وقت اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی روایت ہے کہ طفل (بچے) پر جنازہ پڑھا جائے۔

آپ نے فرمایا، یہ صحیح مرفوع روایت ہے۔

میں نے کہا اس میں تو چار ماہ کا کوئی بیان نہیں۔

آپ نے فرمایا، حضرت سعید بن مسیب کا قول بھی ہے۔ اب اگر کہا جائے کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جنازہ پڑھا جس روز وہ فوت ہوئے، تو اس میں اختلاف ہے۔ سنن ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم بن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو اس وقت ان کی عمر اٹھارہ ماہ تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جنازہ نہیں پڑھا۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں یعقوب بن ابراہیم نے بتایا کہ انھیں اپنے والد سے انھیں ابن اسحٰق سے انھیں عبداللہ بن ابوبکر۔ بن محمد بن عمرو بن حزم سے انھیں عمرۃ سے انھیں حضرت عائشہ رضؓ سے یہ روایت پہنچی۔ امام احمدؒ روایت حنبل میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قطعاً منکر ہے۔

اور خلال فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ کو بتایا گیا کہ مجھے میرے والد نے انھیں اسود بن عامر نے انھیں اسرائیل نے انھیں جابر نے بتایا اور انھیں عامر سے انھیں حضرت براءؓ بن عازب سے روایت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کا جنازہ پڑھا، اور ان کی عمر سولہ ماہ کی تھی۔ اور ابوداؤد نے بہنی سے نقل کیا کہ جب ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقاعد میں ان کا جنازہ پڑھا، اور یہ مرسل ہے اور بہنی کا نام عبداللہ بن یسار کوفی ہے۔

اور حضرت عطاء بن ابی رباح سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے کا جنازہ پڑھا جب کہ ان پر صرف ۱۷ راتیں گزری تھیں ، یہ روایت بھی مرسل ہے اور اس میں ایک (راوی) عطاء ہیں اور یہ عمر میں تجاوز کر چکے تھے ، اس لیے ان آثار میں لوگوں کا اختلاف ہے چنانچہ جن لوگوں نے نمازِ جنازہ کو ثابت کیا ہے اور حضرت عائشہؓ سے منقول روایت کو صحیح نہیں مانا ہے جیسے امام احمدؒ وغیرہ ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مراسیل حضرت براءؓ کی حدیث کے باعث ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں ۔

اور بعض لوگوں نے جابر جعفی کی روایت کے ذریعہ ، حضرت براءؓ کی حدیث کو اور ان مراسیل کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ابن اسحٰق کی روایت ان سے صحیح تر ہے ۔

ابراہیمؓ کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کے سبب میں بھی اختلاف ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کا جنازہ اس لیے نہیں پڑھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی وجہ سے وہ نمازِ جنازہ سے بے نیاز ہو گئے ۔ کیونکہ نمازِ جنازہ کی حیثیت (عذاب سے نجات دلانے کے لیے) شفاعت کی ہوتی ہے جیسے شہید نمازِ جنازہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ جس دن ان کی وفات ہوئی اسی دن سورج گہن میں آگیا ، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ جنازہ کی بجائے نمازِ کسوف میں مصروف ہو گئے ۔ ایک اور جماعت کا خیال ہے کہ ان آثار میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم ضرور دیا تھا ۔ اب بعض کا خیال ہے کہ آپؐ نے نمازِ جنازہ پڑھوائی لیکن نمازِ کسوف میں مصروفیت کی وجہ سے خود شریک نہ ہو سکے اور ایک قول یہ ہے کہ جنازہ نہیں پڑھا ، اس لیے ایک گروہ کہتا ہے کہ اثبات کی روایت زیادہ قابلِ قبول ہے کیونکہ اس میں علم کی زیادتی ہے اور جب نفی و اثبات میں تعارض ہو جائے تو اثبات مقدم سمجھا جاتا ہے ۔

خود کشی کرنے والے اور خائن کی نمازِ جنازہ آپ نہیں پڑھتے تھے

اور حد (سزا) کے باعث مقتول کی نمازِ جنازہ میں اختلاف ہے جیسے زانی جو سنگسار کیا جا چکا ہو ۔

صحیح روایت سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہینہ کو رجم کیا اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھی حضرت عمرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ اس کا جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے زنا کیا ہے ۔

آپؐ نے فرمایا ، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر آدمیوں میں تقسیم کر دی جائے تو سب تک

اس کی وسعت پہنچ جائے اور کیا اس سے بھی زیادہ کسی کی توبہ افضل ہو سکتی ہے جب کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی (رضا) پر اپنے آپ کو از خود قربان کر دیا۔ (مسلم)

اور صحیح بخاری میں ماعز بن مالک کے اسی طرح کے قصہ میں منقول ہے کہ آپؐ نے اس کے لیے کلمات خیر ارشاد فرمائے، اور اس کا جنازہ پڑھا اور بریدہ بن حصیب سے بتایا، کہ آپؐ نے فرمایا ماعز بن مالک کے لیے بخشش کی دعا مانگو چنانچہ لوگوں نے دعا مانگی کہ اے اللہ ماعز بن مالک کو بخش دے۔ ان دونوں واقعات کا مسلم نے صحیح میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے اس کا جنازہ پڑھا (بخاری) اور یہ عبد الرزاق کی حدیث ہے جو معلل ہے۔ حضرت ابو بردہ اسلمیؓ نے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کی نمازِ جنازہ پڑھی اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے روکا (ابوداؤد)

میں کہتا ہوں کہ غامدیہ کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں ثابت ہے کہ آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا رہی ماعز کی روایت تو اس کے بارے میں یا تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ الفاظ میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ صلوٰۃ کا مطلب دعا ہے کہ آپؐ نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے، اور ترک صلوٰۃ کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے تادیباً اور زجراً نماز جنازہ نہیں پڑھی، اور اگر یوں کہا جائے کہ الفاظ میں تعارض ہے تو پھر ہم حدیث غامدیہ کی طرف رجوع کریں گے کہ وہ بالکل صاف اور واضح ہے۔

نماز جنازہ پڑھنے کے بعد آپ جنازہ کی مشایعت بھی کرتے

آپ کے بعد خلفائے راشدین اور ان کے اتباع کی یہ سنت رہی ہے کہ اگر سوار ہوتے تو جنازہ سے پیچھے رہتے اور اگر پیدل ہوتے تو قریب رہتے چاہے پیچھے اور آگے آگے یا دائیں بائیں۔

اور آپ میت کو لے جانے کے لیے جلدی کا حکم فرماتے۔ چنانچہ صحابہ جنازہ لے کر تیز تیز چلتے، اور آج کے زمانہ کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھانا یہ سنت کے خلاف انتہائی مکروہ اور بدعت ہے۔ اور اہل کتاب یہودیوں کے مماثل ہے اور جو ایسا کرتا تھا، حضرت ابوبکرؓ اسی پر کوڑا اٹھاتے اور فرماتے کہ تم نے دیکھا ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت میں رمل (تیز روی) کرتے تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازے کے ساتھ چلنے (کی کیفیت) کے متعلق پوچھا، تو آپؐ نے فرمایا خبب (دلکی دتیز دوڑنا) سے کم (چلو) اسے اہل سنن نے روایت کیا اور جب آپؐ جنازہ کے ساتھ جاتے تو پیدل چلتے اور فرماتے، میں سوار نہیں ہوتا جب کہ فرشتے پیدل جارہے ہوں، جب آپ فارغ ہو جاتے تو کبھی پیدل تشریف لاتے اور کبھی سوار ہو کر تشریف لاتے اور جب آپ

(جنازہ) کے ساتھ چلتے تو جب تک وہ رکھ نہ دیا جاتا آپ بھی نہ بیٹھتے۔
اور فرمایا، جب تم جنازہ کے ساتھ چلو تو (جنازہ) رکھ دینے سے قبل نہ بیٹھو۔
شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ رکھ دینے سے مراد زمین پر رکھ دینا ہے۔

غائبانہ نمازِ جنازہ آپ کا عام معمول نہ تھا

کئی مسلمان (دور دراز علاقوں میں) وفات پا جایا کرتے تھے تو آپ ان کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے، صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ نے (عام) میت کے جنازہ کی طرح حبش کے شہنشاہ نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی، اس وجہ سے تین مذہب پیدا ہو گئے۔
ایک یہ کہ غائبانہ نمازِ جنازہ مشروع اور امت کے لیے سنت ہے کہ ہر غائب کا جنازہ پڑھیں، آپ سے منسوب ایک روایت کے مطابق امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا یہی قول ہے، ابو حنیفہؒ اور مالکؒ نے فرمایا کہ یہ فعل آپ کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسروں کے لیے نہیں۔ ان موخر ائمہ کے اصحاب فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ (آنحضرتؐ) کے سامنے چارپائی کر دی گئی ہو اور آپؐ نے اس طرح جنازہ پڑھا ہو کہ آپ (نجاشی) کو گویا حاضر اور سامنے دیکھ رہے ہوں، اگرچہ وہ دور تھا اگرچہ صحابہؓ نے نہیں دیکھا (لیکن) (صحابہؓ) جنازہ پڑھنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع عمل ہیں۔
انھوں نے فرمایا "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے یہ منقول نہیں کہ آپؐ نے سوا (نجاشی) کے ہر آدمی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہو اور جیسے آپؐ کا فعل ہے اس طرح آپ کا ترکِ (فعل) بھی سنت ہے، اور آپؐ کے بعد کسی دوسرے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دور و دراز کی مسافت سے بھی کسی میت کی چارپائی دیکھ لے اور اس کی خاطر (حجاب) اٹھا دیا جائے تاکہ وہ اس کا جنازہ پڑھ سکے اس بحث سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔
اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں" بہتر یہ ہے کہ اگر غائب کسی ایسے علاقے میں فوت ہو جائے جہاں اس کا جنازہ نہ پڑھا گیا ہو تو پھر اس کا جنازہ غائبانہ پڑھ دیا جائے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کا جنازہ پڑھا، کیونکہ وہ کفار کے درمیان فوت ہوا تھا اور اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا اور ایسی جگہ فوت ہو جہاں اس کا جنازہ پڑھا گیا ہو تو پھر غائبانہ جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ فرض کفایہ ہے جو ادا ہو چکا، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی بھی اور نہیں بھی پڑھی۔ آپؐ کا فعل اور ترکِ (فعل) دونوں سنت ہیں۔ اس کا ایک مقام ہے اور اس کا (دوسرا) مقام ہے۔ اور احمدؒ کے مذہب میں تین اقوال ہیں اور ان کی صحیح ترجمانی یہی ہے

اور مشہور یہ ہے کہ ان کے اصحاب کے خیال میں نماز جنازہ مطلقاً (غیر مشروط) پڑھی جائے۔

صحیح روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ کے سامنے سے جب جنازہ گذرا تو اس کے لیے کھڑے ہوئے اور کھڑے ہونے کا حکم دیا، اور بیٹھنا بھی آپ سے ثابت ہے، اس لیے یہ مختلف فیہ مسئلہ بن گیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ قیام منسوخ ہے اور بیٹھے رہنا آخری فعل تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں امر جائز ہیں۔ اور آپ کا فعل (قیام) استحباب کو اور ترکِ (قیام) جواز کو ظاہر کرتا ہے اور دعوائے نسخ سے یہ (تاویل) زیادہ مناسب ہے۔

میّت کے لیے قبر کیسی بنائی جائے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی، کہ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت، اور نصف النہار کے وقت دفن نہ کیا جائے۔

اور آپ کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ لحد بناتے اور قبر گہری کرواتے اور میت کے سر اور پاؤں کی جگہ کو فراخ کرواتے۔

اور آپ سے منقول ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھا جاتا تو آپ یہ دعا پڑھتے:

بسم اللہ وبا اللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ۔

اور ایک روایت میں ہے بسم اللہ وفی سبیل اللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ

(۱) یعنی اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے ساتھ اور اللہ کے رسول ؐ کی ملت پر۔ (۲) اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے راستہ میں اور اللہ کے رسول ؐ کی ملت پر۔

نیز آپ سے منقول ہے کہ آپ میت کی قبر پر جب اسے دفن کیا جاتا تو سر کی جانب تین بار چلو بھر کر مٹی ڈالتے اور جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو آپ اور آپ کے صحابہ ؓ اس کی قبر پر کھڑے ہو جاتے اور اس کے لیے تثبیت کی دعا کرتے اور صحابہ ؓ کو حکم فرماتے کہ اس (میت) کے لیے ثبات کی دعا کریں۔ اور آپ قبر کے پاس بیٹھ کر نہ پڑھتے اور نہ میت کو تلقین کرتے، جیساکہ آج کل لوگ کرتے ہیں۔

وہ کام جو خلافِ سنت ہیں

اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں کہ قبروں کو (از حد) اونچا کیا جائے۔ نہ پکی اینٹوں یا پتھروں یا کچی اینٹوں سے پختہ کرنا اور لیپنا سنت میں داخل ہے، اور نہ ان پر قبے بنانا مسنون ہے۔

یہ تمام حرکات مکروہ بدعات ہیں اور یکسر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہیں۔
ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضؓ کو بھیجا کہ جس تصویر کو دیکھیں مٹا دیں اور جس بلند قبر کو دیکھیں اسے ہموار کر دیں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ ہے، کہ ان بلند و بالا تمام قبروں کو ہموار کر دیا جائے۔ نیز آپؐ نے قبر پر چونا لگانے اور اس پر عمارت تعمیر کرنے سے منع فرمایا۔ اور ان پر کتبے تحریر کرنے کی ممانعت کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی قبریں نہ ہی (از حد) بلند و بالا تھیں اور نہ ہی بالکل ہموار تھیں۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور آپؐ کے صاحبین رضی اللہ عنہما کی قبریں ہیں۔

مقابر کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے کی ممانعت فرمائی اور آپؐ نے اس کو سختی سے روکا، ایسا کرنے والوں پر آپ نے لعنت کی ہے اور قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز آپؐ نے اپنی امت کو اس بات سے بھی روکا ہے کہ وہ آپؐ کی قبر کو عید (میلہ عرس وغیرہ لگانے کا مرکز) بنالے اور قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت کی۔
اور آپ کی سنت یہ تھی کہ قبروں کی توہین نہ کی جائے اور نہ انھیں روندا جائے اور نہ بیٹھک یا تکیہ لگایا جائے اور نہ (اس شدت) سے عزت کی جائے کہ انھیں سجدہ گاہیں بنا لیا جائے اور ان کے پاس یا ان کی طرف نماز پڑھی جانے لگے، میلے شروع ہو جائیں اور انھیں بت بنالیں، گویا ان کی پوجا ہو رہی ہے۔

زیارتِ قبور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ

آپؐ جب اپنے صحابہؓ کی قبروں پر تشریف لے جاتے تو ان کے لیے دعا کرتے، ان کے لیے بخشش چاہتے اور جذبہ رحمت سے متاثر ہو کر تشریف لے جاتے، یہی زیارت قبور ہے، جو امت کے لیے آپؐ نے مشروع اور مسنون بتائی ہے اور حکم دیا ہے کہ جب لوگ قبور کی زیارت کریں تو یہ دعا کریں:

السلام علیکم اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون نسال اللہ لنا ولکم العافیۃ

یعنی، اے مومن اور مسلمان اہل دیار تم پر سلامتی ہو اور بے شک ہم اگر اللہ نے چاہا تو تم سے ملنے والے ہیں۔ ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کی دعا

(درخواست کرتے ہیں۔

یہ آپ کی سنت تھی کہ آپؐ قبور کی زیارت کے موقع پر ان کے لیے دعا۔ ترحم اور استغفار چاہتے جو نماز کے موقع پر کی جاتی ہے، لیکن مشرکین نے اس سنت کا انکار کیا اور میت کو پکارنے لگے (اللہ) سے شرک کرنے لگے اور اپنی ضروریات (میت) کے سامنے پیش کر کے اس سے مدد چاہنے لگے اور اس کی طرف توجہ کرنے لگے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ کے صریحاً خلاف ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت توحید اور میت پر احسان کرنے سے عبارت ہے اور ان (مشرکین) کا طریقہ شرک۔ میت اور اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کرنے کا سبب ہے، اور اس کی تین اقسام ہیں:

۱۔ یا تو میت کے لیے دعا کریں گے۔

۲۔ یا میت کے وسیلہ سے دعا کریں گے۔

۳۔ اور یا اس کے پاس (جاکر) دعا کریں گے۔

ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان (مُردوں) کے قریب جاکر دعا کرنا مساجد میں دعا کرنے سے زیادہ اولیٰ اور باعثِ قبولیت ہے، لیکن نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپؐ کے صحابہؓ کی سنتِ طیبہ پر غور کرے گا۔ اس کے سامنے ان دونوں طریقوں کا فرق صاف اور واضح ہو جائے گا، توفیق خیر دینے والا خدا ہی ہے۔

پسماندگان سے تعزیت داخلِ سنت ہے

اور میت کے اہلِ خانہ سے تعزیت بھی نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ میں داخل تھی۔

آپؐ کا یہ طریقہ نہ تھا کہ تعزیت کے لیے جمع ہوتے اور (میت کے لیے قبر کے پاس یا دوسری جگہ قرآن مجید پڑھتے۔ یہ تمام باتیں جدید اور مکروہ قسم کی بدعات ہیں، بلکہ سنت یہ ہے کہ اللہ کے فیصلہ پر سکون و رضا کا ثبوت پیش کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے اور اناللہ و انا الیہ راجعون پڑھا جائے۔ اور اس مصیبت کے باعث کپڑے پھاڑنے واویلا اور بین کرتے ہوئے آواز بلند کرنے یا بال منڈوا دینے سے آپ نے بیزاری کا اعلان کیا ہے۔

اور آپ کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ میت کے اہلِ خانہ (تعزیت کے لئے آنے والے) لوگوں کو کھانا نہ کھلائیں بلکہ آپ نے حکم دیا کہ دوسرے لوگ (دوست اور عزیز) ان کے لیے کھانا تیار کر کے انھیں بھیجیں۔ اور یہ چیز اخلاقِ حسنہ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور پسماندگان کو سبک دوش کرنے والا عمل تھا،

کیونکہ اس وقت وہ اپنی مصیبت کے باعث لوگوں کو کھانا کھلانے سے (معذور) ہوتے ہیں۔
اور آپؐ کی سنت یہ تھی کہ (نعی) میت (کے ماتم کی) منادی نہ کی جائے بلکہ آپ اس سے منع فرماتے اور فرمایا کرتے کہ یہ جاہلیت کے کاموں میں سے ہے۔
اور حضرت حذیفہؓ نے اس بات کو ناپسند سمجھا ہے کہ جب کوئی مر جائے تو لوگوں کو آواز دے کر بتایا جائے اور فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ نعی (موت کی منادی) نہ بن جائے۔

نمازِ خوف

حالتِ جنگ میں نماز پڑھنے کی مختلف صورتیں

نمازِ خوف میں ایک رکعت بھی جائز ہے اللہ تعالیٰ نے خوف و سفر کی حالت میں ارکانِ نماز اور تعدادِ رکعات میں قصر کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ جب سفر ہو خوف نہ ہو تو تعدادِ (رکعات میں) قصر کرنے اور جب خوف ہو سفر نہ ہو تو قصرِ ارکان کی اجازت عطا کی ہے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیبہ تھی اور اس سے سفر و خوف کی حالت میں آیت قصر کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

اور نمازِ خوف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیبہ یہ تھی کہ جب دشمن آپ کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا تو تمام مسلمان آپ کی اقتداء کرتے۔ آپؐ تکبیر کہتے، آپؐ رکوع کرتے وہ سب رکوع کرتے، پھر آپؐ سر اٹھاتے وہ بھی آپؐ کے ساتھ سر اٹھا لیتے۔ پھر آپؐ سجدہ میں جاتے اور جو صف آپؐ کے قریب تر ہوتی (وہ بھی سجدہ کرتی) اور آخری صف دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہتی۔ جب آپ پہلی رکعت سے فارغ ہوتے اور دوسری کے لیے اُٹھتے تو آپ کے کھڑے ہونے پر دوسری صف سجدہ کرتی۔ پھر وہ پہلی صف کی جگہ کھڑے ہوتے اور پہلی صف مؤخر ہو جاتی تاکہ صفِ اول کی فضیلت دونوں گروہوں کو حاصل ہو جائے اور صفِ ثانی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسری رکعت میں دو سجدوں میں شریک ہو سکے۔ جس طرح صفِ اوّل نے پہلی رکعت میں دو سجدوں کی نعمت حاصل کر لی تھی۔ اسی طرح اجر و ثواب میں دونوں گروہ برابر کے شریک ہو جائیں یہ انتہائی عدل تھا۔

اسی طرح جب آپؐ رکوع میں تشریف لے گئے تو دونوں گروہوں نے پہلے کی طرح عمل کیا اور جب آپ تشہد کو قعدہ میں گئے تو دوسری صف نے دو سجدے کیے اور پھر آپ کے ساتھ

تشہد میں شریک ہوگئی، اس طرح آپ نے سب کے ساتھ ہی سلام پھیر دیا اور اگر دشمن قبلہ کے علاوہ کسی دوسرے رُخ پر ہوتا اس وقت کبھی آپؐ دو جماعتیں بنا لیتے۔ ایک جماعت دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہتی اور دوسری جماعت کے ساتھ۔ آپؐ نماز پڑھتے، اس طرح کہ جماعت آپؐ کے ساتھ ایک رکعت پڑھتی اور پھر نماز کی حالت ہی میں وہ دوسرے گروہ کی جگہ جا کر کھڑی ہو جاتی اور دوسرا گروہ اس کی جگہ آکر آپؐ کے ساتھ ایک رکعت ادا کرتا۔ پھر سلام پھیر دیا جاتا اور امام کے سلام کے بعد ہر گروہ ایک ایک رکعت خود ادا کرتا ——

اور کبھی ایک گروہ کے ساتھ آپؐ ایک رکعت ادا کرتے پھر دوسرے کی طرف تشریف لے جاتے اور آپ کھڑے ہوتے کہ وہ گروہ اپنی رکعت ثانیہ ادا کر لیتا، پھر دوسرا گروہ آتا اور آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھ لیتا، پھر جب آپ تشہد میں بیٹھتے تو وہ دوسرا گروہ کھڑا ہو کر اپنی رکعت ادا کرتا اور آپؐ تشہد میں اس کا انتظار کرتے اور جب وہ بھی تشہد پڑھ لیتا تو مل کر سلام پھیر دیتے اور کبھی آپؐ ایک جماعت کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرتے اور وہ گروہ آپ سے قبل سے سلام پھیر لیتا (اور آپ تشہد میں بیٹھے رہتے) آخر دوسرا گروہ آتا اور آپ اس گروہ کو دو رکعتیں پڑھاتے اور ان کے ساتھ سلام پھیر دیتے۔ اس صورت میں آپ چار رکعتیں ادا کرتے۔ اور صحابہؓ دو دو رکعتیں پڑھتے اور کبھی ایسا ہوتا کہ آپ ایک گروہ کے ساتھ دو رکعتیں ادا فرماتے اور اس کے ساتھ ہی سلام پھیر دیتے۔ پھر دوسرا گروہ آتا آپؐ اس کے ساتھ بھی دو رکعتیں پڑھتے اور سلام پھیر دیتے۔ اس صورت میں آپ ہر گروہ کے ساتھ ایک ایک نماز پڑھتے اور کبھی آپ ایک گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھتے اور وہ چلا جاتا اور وہ گروہ کوئی اور رکعت نہ پڑھتا۔ پھر دوسرا گروہ آجاتا۔ آپؐ اس کے ساتھ ایک رکعت پڑھتے اور وہ (گروہ) مزید کوئی رکعت نہ پڑھتا۔ اس صورت میں آپؐ کی تو دو رکعتیں ہوتیں لیکن (صحابہؓ) کی ایک ایک رکعت ہوتی۔

ان تمام مندرجہ بالا صورتوں میں نماز (خوف) جائز ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ نماز خوف کے متعلق جو روایت بھی آئی ہے اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ چھ یا سات صورتیں مذکور ہیں اور یہ سب جائز ہیں۔

زکوٰۃ

کس مال پر زکوٰۃ واجب ہے اور کس پر نہیں؟

زکوٰۃ وصول کرنے کا عادلانہ اصول زکوٰۃ کے سلسلہ میں آپؐ کا طرز و مؤقف ہر اعتبار سے کامل و مکمل تھا، وقت کے لحاظ سے بھی، قدر کے لحاظ سے بھی اور نصاب کے لحاظ سے بھی۔ اسی موقف زکوٰۃ میں بھی۔ ارباب اموال اور مساکین کے ضروریات و مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو مال اور صاحب مال کے لیے باعث طہارت بنایا ہے چنانچہ اسے صرف اغنیاء پر ہی واجب کیا ہے، یہی وجہ ہے جو زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ زوال نعمت سے محفوظ رہتا ہے، بلکہ اس میں برکت اور بڑھوتی ہوتی رہتی ہے، آفات کو اس سے دور کر دیا جاتا ہے، اس طرح گویا زکوٰۃ ادا کرنا، زکوٰۃ ادا کرنے والے کے لیے ایک قسم کی حفاظت، فصیل اور قلعہ بن جاتا ہے۔

(زکوٰۃ) چار اقسام کے مال پر لگائی گئی، جو کہ زیادہ تر لوگوں میں رواں دواں رہتا ہے، جس کی اہمیت سب مانتے ہیں۔

۱۔ ایک فصل اور پھل۔

۲۔ دوسرے چوپائے، اونٹ، گائے اور بکریاں وغیرہ۔

۳۔ تیسرے وہ دو جوہر جنہیں قوام عالم کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی سونا اور چاندی۔

۴۔ چوتھے مختلف قسم کا مال تجارت۔

زکوٰۃ ہر سال میں صرف ایک بار فرض ہے۔ نیز اسے فصلوں اور پھلوں کے پکنے اور مکمل ہونے سے مشروط کر دیا گیا اور یہ سب سے زیادہ منصفانہ (قانون) ہے۔ کیونکہ ہر ماہ یا ہر جمعہ اسے فرض قرار دینا صاحب مال کے لیے ضرر رساں تھا اور عمر میں صرف ایک بار فرض کرنا مساکین

کے حق میں نقصان دہ تھا چنانچہ سال میں ایک بار فرض کرنا فی الحقیقت سب سے زیادہ منصفانہ ہے۔

علاوہ ازیں صاحبِ مال کی کوشش و حصولِ دولت کے تفاوت کو دیکھ کر اس میں بھی فرق کر دیا گیا۔ چنانچہ ایسی دولت جو کسی کو اچانک جمع شدہ مل جائے جیسے رکاز (زمین میں دبا ہوا خزانہ)، تو اس پر صرف خمس (پانچواں حصہ) فرض کیا گیا اور اس کے لیے سال کا گزرنا شرط قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ جونہی ایسا (خزانہ) ملے اسی وقت خمس کی ادائگی واجب ہو گئی۔

رہے پھل اور فصلیں جن میں انسان کو بہت کم مشقت اور تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس پر رکاز سے نصف یعنی عشر (دسواں حصہ) زکوٰۃ لگائی۔ کیونکہ زمین کی درستی اور بوائی وغیرہ میں کسی خاص کلفت اور مشقت سے سابقہ نہیں پڑتا، نہ ڈول کھینچنا پڑتے ہیں، نہ پانی خریدنا پڑتا ہے لیکن اگر زمین کو سیراب کرنے کے لیے خادموں یا مزدوروں سے کام لیا جائے، ڈولوں سے سینچائی کی جائے، کنویں کھودے جائیں تو پھر اور کم ہے۔ یعنی نصف عشر (بیسواں حصہ) مال کا نمو صاحب مال کے سفر یا ذاتی درو بست کا نتیجہ ہو یا وقفہ و انتظار کا پابند ہو تو ایسے مال پر ربع عشر (چالیسواں حصہ) لازم آتا ہے اور یہ تو ظاہر بات ہے کہ اس موخر الذکر کی تکلیف فصلوں اور پھلوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ فصلوں اور پھلوں کا نمو تجارت کے بڑھنے سے زیادہ آسان اور سہل ہے۔ اس لیے ان کے واجبات بھی تجارت سے زیادہ ہونے چاہئیں اور انہار یا آسمان کے پانی (بارش)، کے ذریعہ ڈول یا چھڑکاؤ کی بنسبت زیادہ نمو ہوتا ہے اور خزانہ جیسی صورت میں تمام انواع سابقہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے اور چونکہ ہر مال گروہ کم ہی ہو، مواساۃ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تحمل (زکوٰۃ) کے لیے ایک نصاب مقرر ہوا تا کہ ارباب مال کو ضرر نہ پہنچے اور مساکین کو خاطر خواہ فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ چاندی کا نصاب دو صد درہم، سونے کا بیس مثقال۔ دانوں اور پھلوں کا پانچ وسق جو عرب کے پانچ اونٹوں کے بوجھ کے برابر ہوتا ہے اور بکریوں کے لیے چالیس بکریاں، گائے کے لیے تیس گائیں اور اونٹوں کے لیے پانچ اونٹ نصاب مقرر ہوا۔

لیکن اگر نصاب اپنی جنس کی چیز کی ادائیگی کا متحمل نہ ہو تو پھر ایک بکری واجب ہو گی اور اگر پانچ پانچ سے مکرر (ضرب) ہو گئے تو پچیس بن گئے اب اس کی جنس ہی سے ایک (اونٹ، گائے وغیرہ) کا متحمل ہو گا اور یہی واجب بھی ہو گا اور اب کہ اونٹوں کی کثرت و قلت کے حساب سے اس واجب کی عمر میں کمی و بیشی بھی مقرر ہو گئی جیسے کہ ابن مخاض بنت مخاض اس سے آگے بڑھ کر ابن لبون

اور بنت لبون اور اس کے بڑھ کر حقہ اور حق اور اس سے بڑی (عمر کی) جذع اور جذعۃ: تو جوں جوں اونٹوں کی تعداد بڑھے گی (مال زکوٰۃ) کے جانور کی عمر بڑھتی جائے گی۔ تاآنکہ عمر کے آخری حصہ (مکمل اونٹ) تک جا پہنچے گی تو اب گویا تعداد کی زیادتی کو (زکوٰۃ) کے مال کی زیادتی کے مقابلہ میں رکھا گیا۔ اس لیے اللہ کی حکمت یہ ہوئی کہ اموال پر اس قدر بوجھ ڈالا گیا جو مؤساۃ کے لیے کافی ہو اور (امرا) پر بوجھ نہ بنے اور دوسری طرف مساکین کے لیے بھی کافی ہو اور انہیں دوسری (طرف) کی احتیاج نہ رہے۔ چنانچہ اغنیاد کے مال پر اس قدر (زکوٰۃ) فرض کی گئی کہ جو فقراء کو کافی ہو۔

(لیکن بایں ہمہ) دونوں گروہوں کی طرف سے ظلم ہونے لگا، اغنیاء نے واجبات کو روک لیا اور لینے والوں نے استحقاق کے بغیر لینا شروع کر دیا، اس طرح ہر دو گروہ کی طرف سے مساکین و غرباء کو عظیم نقصان پہنچا۔ اور مسألہ میں کئی اقسام کے حیلے تراشے گئے (چنانچہ) پروردگار کریم نے خود صدقات (کے مصارف) کو تقسیم فرمایا اور ان کی آٹھ انواع بنائیں اور یہ دو قسم کے لوگوں میں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور ضرورت کی شدت وضعف، کمی و زیادتی کے مطابق سوال کرتا ہے۔ جیسے فقراء اور مساکین، مقروض اور مسافر لوگ ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اسے منفعت کے باعث لیتا ہے، جیسے زکوٰۃ جمع کرنے والے، ملازمین، تالیف، قلوب اور لوگوں کے درمیان اصلاح کے باعث مقروض ہو جانے والے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے اور لینے والا محتاج نہ ہو۔ اور نہ اس سے مسلمانوں کا فائدہ وابستہ ہو تو اس کا زکوٰۃ میں کچھ بھی حصہ نہیں۔

زکوٰۃ صرف مستحق کو دینی چاہیے

جب آپؐ کو معلوم ہوتا کہ یہ شخص مال زکوٰۃ کا مستحق ہے تو آپ اسے عطا کرتے اور اگر کوئی اہل زکوٰۃ آپ سے درخواست کرتا تو اس کو یہ کہہ دینے کے بعد زکوٰۃ دیتے۔

"یاد رکھو! کہ اس میں غنی اور کمانے کے قابل انسانوں کا کوئی حصہ نہیں"۔

آپؐ صاحب مال سے زکوٰۃ لے کر مستحق کو عطا فرماتے، آپؐ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ جس علاقے کی زکوٰۃ جمع ہوتی وہیں تقسیم کی جاتی۔ اگر بچ رہتی تو پھر آپؐ کے پاس بھیج دی جاتی چنانچہ آپؐ اسے (دوسری جگہ) تقسیم فرماتے! یہی وجہ تھی کہ آپؐ اپنے عاملین کو وادیوں میں بھیجتے۔ اور بستیوں میں نہ بھیجتے بلکہ حضرت معاذؓ کو حکم دیا کہ اہل یمن سے زکوٰۃ لے کر انہیں کے فقراء میں تقسیم کر دو۔ اور یہ نہ فرمایا کہ میرے پاس لے کر آجانا اور نہ آپؐ کا یہ طریقہ تھا کہ عاملین کو چوپایوں، پھلوں

اور فصلوں جیسے ظاہری اموال کے مالکوں کی طرف بھیجا تھا بلکہ آپ کھجوروں کے مالکوں کے پاس اندازہ کرنے والے کو بھیجتے اور وہ ان کی کھجوروں کے پاس سے گزرتا اور دیکھتا کہ کتنے وسق کھجوریں ہو رہی ہیں اور ان پر زکوٰۃ کی مقدار کا اندازہ کرتا اور آپ اندازہ کرنے والے کو حکم دیتے کہ ان کے لیے تیسرا یا چوتھا حصہ چھوڑ دے چنانچہ وہ (چوتھائی حصہ) کو اندازے میں ظاہر نہ کرتا کیونکہ کھجوریں آفات سے کم ہی محفوظ رہتی ہیں۔ یہ اندازہ اس لیے کیا جاتا تاکہ اربابِ مال کے پھلوں کو خوراک بنانے، ختم کر ڈالنے اور انہیں اپنے تصرف میں لے آنے سے قبل ہی زکوٰۃ کی مقدار معلوم کر لی جائے۔ اس لیے آپ اندازہ کرنے والے کو اہلِ خیبر اور ان کے مزارعین کے پاس بھیجتے اور وہ ان کے پھلوں اور فصلوں کا اندازہ کر لیتا اور اس (زکوٰۃ) کے ایک حصہ کا یقین کر ڈالتا۔ پھر آپ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو (ان کی طرف) بھیجتے۔ اور جب یہ لوگ انہیں رشوت دینا چاہتے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ فرماتے:

"تم مجھے حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں تمہارے پاس اس ہستیؐ کے پاس سے آیا ہوں جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اور تم لوگ (اس حرکت کے باعث) میرے نزدیک بندروں اور خنازیر سے زیادہ قابلِ نفرت ہو۔ لیکن تمہارے ساتھ نفرت اور حضورؐ کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ میں تم سے انصاف نہ کروں تو وہ (یہود) کہتے، اسی وجہ سے (یعنی اس انصاف کے باعث) آسمان و زمین قائم ہیں۔

اور گھوڑے، خچر، گدھے، سبزیوں، ریگستانوں اور ایسے پھلوں سے آپ زکوٰۃ نہ لیتے۔ جو نہ تولے جاتے تھے اور نہ ان کا ذخیرہ ہوتا۔ سوائے انگور اور کھجور کے، کیونکہ ان دونوں کی زکوٰۃ کیا کرتے اور خشک و تر کا امتیاز نہ برتتے تھے۔

کیا شہد پر زکوٰۃ واجب ہے؟

شہد کے بارے میں آپ کا طرزِ عمل مختلف فیہ ہے چنانچہ ابو داؤدؒ نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی کہ بنی متعان کا ایک آدمی ہلال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شہد کا عشر لے کر حاضر ہوا۔ نیز اس نے اس وادی کے لیے اس کی درخواست قبول فرمائی پھر جب حضرت عمر بن خطاب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ بنے تو سفیان بن وہب نے آپؓ سے اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے لکھا تو حضرت عمرؓ نے جواب بھیجا کہ اگر وہ تمہیں بھی شہد کا عشر اسی طرح ادا کرے جس طرح نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتا رہا ہے تو اس کا علاقہ اس کی

نگرانی میں رہنے دو اور اگر ایسا نہ کرے تو یہ (علاقہ) برساتی مکھیاں (عطیہ خدا) ہیں جس کا جی چاہے کھائے۔

اس حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں" کہ ہر دس قرب میں ایک قرب، اور سنن ابن ماجہؒ میں حضرت عمرو بن شعیب کی روایت ہے کہ انہیں اپنے والد سے، انہیں دادا سے روایت پہنچی کہ آپ نے شہد سے عشر (دسواں حصہ) لیا اور مسند امامؒ میں ابو لیسارۃ ثقفی سے مروی ہے انہوں نے بتایا، کہ میں نے عرض کیا۔

اے اللہ کے رسول، میرے پاس شہد (کا چھتہ) ہے۔

آپؐ نے فرمایا، دسواں حصہ ادا کرو۔

میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ، اسے میری نگرانی میں رہنے دیجیے۔

آپ نے منظور فرما لیا۔

اور عبد الرزاق نے عبید اللہ بن محرر سے انہوں نے زہری سے انہوں نے ابو سلمہ سے انہوں نے حضرت ابو زہرہؓ سے روایت کیا کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ نے اہل یمن کو لکھا کہ "شہد میں سے دسواں حصہ لیا جائے گا"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں انس بن عیاض نے انہوں نے حارث بن عبد الرحمن سے انہوں نے ابو ذئاب سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے سعد بن ابی ذئاب سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔ پھر میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول میری قوم کے لیے ان کے اموال میں سے زکوٰۃ کا حصہ متعین فرما دیجیے جب وہ اسلام لا کر عمل پیرا ہوں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرما لیا (پھر) مجھے ان پر گورنر (عامل) مقرر کر دیا۔ (آپؐ کے بعد) حضرت ابو بکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ نے بھی مجھے ان پر گورنر مقرر کیے رکھا۔ راوی نے بتایا کہ ان کے ساتھ اس وقت کوئی سیاہ خام بھی تھا۔ انہوں نے کہا میں نے شہد کے متعلق اپنی قوم سے بات کی اور اس سے کہا کہ اس پر بھی زکوٰۃ (ادا کرنا) ہوگی۔ کیونکہ جس پھل کی زکوٰۃ ادا نہیں کی جاتی۔ اس میں کچھ بھی خیر نہیں ہوتی۔ قوم نے جواب دیا کہ آپ کے خیال میں کس قدر (زکوٰۃ) ہوگی؟ میں نے کہا کہ "دسواں حصہ"۔ پھر میں نے دسواں حصہ لے لیا اور حضرت عمرؓ بن خطاب سے ملا اور تمام واقعہ عرض کیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے لیا اور اس کی قیمت مسلمانوں کے صدقات (کے مال) میں رکھ دی۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔

احادیث اور احکام احادیث میں اختلاف

ان احادیث اور ان کے احکام میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بخاریؒ فرماتے ہیں، صحیح مسئلہ کے مطابق شہد میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم ثابت نہیں اور ابن منذر فرماتے ہیں کہ شہد کے عشر میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت ہے اور نہ کوئی اجماع ثابت ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ شہد میں عشر کی روایت ضعیف ہے اور جس روایت میں ہے کہ عشر نہ لیا جائے گا عمر بن عبدالعزیز کی روایت کے سوا وہ بھی ضعیف ہیں اور سعد بن ابی ذناب ایسا قول نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد میں سے صدقہ لینے کا حکم نہیں دیا اور اگر کچھ فرمایا ہے تو دینے والے کے لیے اسے تطوع (یعنی نفلی صدقہ) کی صورت دی ہے۔ شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میرا خیال تو یہ ہے کہ (شہد والے) سے کچھ نہ لیا جائے، کیونکہ نہ لینے کی روایات تو ثابت ہیں۔ لیکن لینے کی روایات ثابت نہیں۔ اس لیے اسے معاف ہی (رکھا جائے) اور یحییٰ بن آدم نے روایت کیا کہ ہمیں حسین بن زید نے بتایا انہوں نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ شہد میں زکوٰۃ نہیں؟ یحییٰ بتاتے ہیں کہ حسن بن صالح سے شہد کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے بھی اس میں کوئی (زکوٰۃ) نہیں بتائی اور حضرت معاذؓ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے شہد میں سے کچھ نہیں لیا۔ حمیدیؒ کہتے ہیں کہ ہمیں سفیان سے انہیں ابراہیم بن میسرہ سے انہیں طاؤس سے انہیں معاذ بن جبل سے روایت پہنچی کہ ان کے پاس گائے کا سر اور شہد لایا گیا تو حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے ان دونوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز (زکوٰۃ) کا حکم نہیں دیا۔ شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں مالکؒ سے اور انہیں عبداللہ بن ابی بکر سے معلوم ہوا تھا، بتایا کہ میرے والد کے پاس حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا مکتوب آیا اور وہ اس وقت منیٰ میں تھے، فرمایا کہ گھوڑوں اور شہد پر زکوٰۃ مت لینا۔ یہ آثار ایک دوسرے کو قوی کرتے ہیں۔ اُن کے مخارج بھی متعدد ہیں اور فرق بھی مختلف ہیں اور ان میں مرسل روایات مسند روایات کے (اجماع) سے قوی ہو جاتی ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ یہ (شہد) عشری زمین سے لیا جائے تو اس وقت اس کی عشر واجب ہے اور اگر یہ خراجی زمین سے

حاصل کیا گیا ہو تو پھر اس پر کچھ بھی واجب نہ ہوگا، کیونکہ خراجی زمین کے مالک پر جو خراج واجب ہوتا ہے وہ فصلوں اور پھلوں ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا اب اسی وجہ سے کوئی دوسرا ٹیکس اس پر عائد نہیں کیا جا سکتا اور عشری زمین کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے مالک پر کوئی ٹیکس عائد نہیں۔ لہٰذا اس کی پیداوار پر اسے زکوٰۃ دینا پڑے گی۔

امام احمدؒ نے دونوں قسم کی زمینوں کو مساوی قرار دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خراجی اور عشری سب پر (عشر) واجب قرار دیا ہے۔ لیکن وجوب کے حامیوں کے مابین اختلاف ہے کہ آیا اس کا نصاب معین ہے یا نہیں؟

ایک یہ قول ہے کہ قلیل و کثیر سب پر واجب ہے یہ ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا نصاب متعین ہے لیکن اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ دس رطل (مقدار نصاب) ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ پانچ افراق ہے اور ایک فرق چھتیس عراقی رطل کا ہوتا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کا نصاب دس افراق ہے (امام احمدؒ کے اصحاب کا فرق کے اندازے میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ ساٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ دوسرے کے مطابق چھتیس رطل کا اور تیسرے کے مطابق سولہ رطل کا ہوتا ہے اور یہی امام احمدؒ کی ظاہری کلام کا مطلب ہے۔

زکوٰۃ ادا کرنے والے کے لیے دُعا

اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مال زکوٰۃ لے کر آتا تو آپ اُس کو دُعا دیتے۔ چنانچہ کبھی آپ اس طرح دُعا فرماتے۔

اللّٰھم بارك فیه وفی ابله

یعنی اے اللہ اسے اور اس کے اونٹوں کو برکت عطا فرما۔

اور کبھی کہتے: اللّٰھم صل علیه۔

یعنی اے اللہ اس پر رحم فرما۔

اور زکوٰۃ کی مد میں اچھا اچھا مال چھانٹ لینے کا دستور نہ تھا بلکہ اوسط درجہ کا مال (لینے کا اصول مروج تھا) اس لیے آپؐ نے حضرت معاذؓ کو مال زکوٰۃ کے لیے (اچھا اچھا مال لینے سے) منع فرمایا

ایک کے لیے صدقہ دوسرے کے لیے ہدیہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ کرنے والے کو اپنے صدقہ کا (مال) خریدنے سے منع فرماتے۔ اور

اگر کوئی فقیر کسی غنی کو صدقہ کا مال ہدیہ کے طور پر دیتا تو آپ اس کو کھا لینے کی اجازت دیتے چنانچہ حضرت بریرہؓ پر جو مال صدقہ کیا گیا تھا آپؐ نے اس میں سے کھایا اور فرمایا کہ یہ مال اس کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔

کبھی آپؐ مال صدقہ میں سے مسلمانوں کے مصالح (رفاہی کاموں کے لیے قرض لے لیتے۔ مثلاً آپ نے ایک لشکر ترتیب دیا۔ لیکن اونٹ کم رہ گئے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ صدقہ کی جوان اونٹیوں میں سے لاؤ اور آپ اپنے ہاتھ سے اونٹ کو نشان لگاتے تھے۔ آپ ان کے کانوں میں نشان لگاتے تھے۔ اور جب کبھی قحط سالی ہو جاتی تو آپ مالکان (زمین) سے صدقہ کا قرض بھی لے لیتے جیسے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے دو سال کے صدقہ کا مال قرض لیا۔

فطرہ اور اس کی اہمیت

عید کی نماز سے پہلے پہلے ادا کر دینا سنت ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہر مسلمان اور چھوٹے بڑے مرد، عورت، آزاد، غلام ہر ایک پر حتیٰ کہ جو کسی کی کفالت میں ہو اس پر بھی کھجور یا جو یا پنیر کشمش کا ایک صاع صدقہ فطر فرض فرمایا ہے۔ نیز آپ سے آٹے یا گندم کا ایک صاع بھی منقول ہے اور معروف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے ان مذکورہ اشیاء کے مقابلہ میں گندم کا نصف صاع مقرر کیا ہے (ابوداؤد) اور صحیحین میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مقدار مقرر کی ہے۔ اس سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مرسل اور مسند آثار ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ ان میں سے حضرت ثعلبہ بن عبداللہ بن ابی صغیر کی روایت ہے انھوں نے اپنے والد سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

گندم کا ایک صاع دو آدمیوں پر تقسیم ہوگا) (مسند امام احمدؒ)

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے بصرہ کے منبر پر رمضان کے آخر میں خطبہ دیا، اور فرمایا، اپنے روزے کا صدقہ ادا کرو۔ لیکن لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں یعنی اہل مدینہ والوں سے فرمایا، اٹھو اور اپنے بھائیوں کو سکھاؤ، کیونکہ یہ نہیں جانتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آزاد، غلام، مرد، عورت پر کھجور یا جو کا ایک صاع یا گندم کا نصف صاع فرض کیا ہے، لیکن جب علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انھوں نے اشیاء کی ارزانی دیکھی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو فراخی اور کشادگی عطا فرمائی ہے، لہٰذا گندم اور دوسری سب چیزوں میں ایک صاع ادا کیا کرو۔ اور ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ اس مذہب کو قوی سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ کفارات

میں امام احمد نے اسی قول پر قیاس کیا ہے اور فرمایا ہے کہ دوسری چیزوں کی نسبت گندم نصف صاع واجب ہے۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ نماز عید سے قبل صدقہ ادا فرما دیا کرتے اور سنن میں آپؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

جس نے نماز سے قبل ادا کیا وہ مقبول زکوٰۃ ہے اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو وہ ایک عام صدقہ ہے۔

اور صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، کہ عیدگاہ کی طرف لوگوں کے روانہ ہونے سے پہلے ہی صدقہ فطر ادا کر دیا کرو۔ ان دونوں روایات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ (صدقہ) کو نمازِ عید سے موخر نہ کیا جائے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہ فوت ہو جاتا ہے۔ یہی درست مسلک ہے، کیونکہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں اور نہ کوئی ناسخ ہے، اور نہ اجماع اس کی نفی کرتا ہے اور ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ اسی مذہب کو قوی سمجھتے تھے۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ قربانی امام کی ادائے نماز پر موقوف ہے نہ کہ وقت پر اور اگر کوئی امام کی نماز سے قبل قربانی کا جانور ذبح کرلے تو اس کا ذبیحہ قربانی نہیں ہوگا بلکہ یہ محض بکری کا گوشت ہے۔ یہی بات دوسرے مسائل میں بھی صادق آتی ہے، دو مواقع پر آپؐ سے بھی یہی فعل ثابت ہے۔

صدقہ فطر مساکین کے لیے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ بھی کہ آپؐ یہ صدقہ فطر مساکین کے لیے مختص فرما دیتے اور اقسام ثمانیہ پر ایک ایک مٹھی تقسیم نہ کرتے۔ نہ آپؐ نے اس کا حکم دیا اور نہ آپ کے بعد صحابہؓ یا تابعین میں سے کسی نے ایسا کیا بلکہ ہمیں جو اقوال پہنچے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے صرف مساکین پر ہی صرف کیا جاسکتا ہے اور یہ قول دوسرے قول سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اسے اقسام ثمانیہ پر تقسیم کر دیا جائے۔

نفلی صدقات میں سنتِ رسولؐ

نفلی صدقات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ آپؐ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا صدقہ کر دیتے۔ آپ تمام لوگوں سے زیادہ صدقات کرتے، اور جب اللہ تعالیٰ آپؐ کو کچھ عطا فرماتے اور آپ اس کی کثرت و قلت نہ چاہتے اور آپ سے جو بھی سوال کرتا، آپ اس کو تھوڑا یا بہت ضرور عطا فرماتے اور آپ کی عطا ایسی تھی کہ جیسے فقر کا کوئی خطرہ ہی نہ ہو۔ آپؐ کے نزدیک صدقہ کرنا سب سے زیادہ محبوب تھا اور آپ جو کچھ عطا فرماتے اس سے آپ کو عطیہ دینے والے سے بھی کہیں زیادہ فرحت اور خوشی ہوتی۔ آپ تمام

لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپؐ کا ہاتھ گویا (عطا کرنے میں) ایک چلتی ہوئی آندھی تھا۔ کوئی ضرورتمند آتا تو اسے اپنے آپ پر بھی ترجیح دیتے، کھانے میں بھی اور لباس میں بھی۔ آپ کے عطایا اور صدقات کئی انواع کے تھے، کبھی ہبہ کرتے، کبھی صدقہ کرتے کبھی ہدیہ دیتے کبھی ایک چیز خریدتے پھر بیچنے والے کو اس کی قیمت اور وہ چیز دونوں عطا فرما دیتے جیسا حضرت جابرؓ کے ساتھ معاملہ فرمایا، کبھی قرض لیتے اور اس سے زیادہ یا افضل اور بہتر عطا فرماتے۔ کبھی کچھ خریدتے تو اس کی قیمت بہت زیادہ عطا فرماتے، ہدیہ قبول فرما لیتے لیکن ہر ممکن صدقہ اور احسان کی صورت میں لطف وکرم کرتے ہوئے اس سے زیادہ یا دگنا عطا فرماتے، آپؐ کا صدقہ و احسان آپؐ کے حالات اور ملکیت کے مطابق ہوتا۔ چنانچہ آپؐ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا خرچ کر ڈالتے۔ آپ صدقہ کرنے کا حکم دیتے، اس کی ترغیب دیتے۔ آپ حال و قال کے مطابق اس کی دعوت دیتے۔ جب کسی بخیل کو دیکھتے تو اسے سخاوت وعطاء کی ترغیب دیتے۔ جو بھی آپ کی مصاحبت میں رہ جاتا اور آپؐ کے طریق کار کو دیکھ پاتا تو وہ بھی اپنے آپ کو جود وسخاء سے روک نہ سکتا، اور آپؐ کی سنت طیبہ یہ بھی کہ احسان و صدقہ اور نیکی کی دعوت دیتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصول کمال و شرح صدر کے اسباب

آپؐ کے شرح صدر کا سب سے بڑا سبب کامل طور پر اور پوری قوت کے ساتھ عقیدۂ توحید تھا، اس چیز کی زیادتی ہی آپؐ کے انشراح صدر کا سبب تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ

لیعنی کیا وہ جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا، تو وہ اپنے پروردگار کی جانب سے نور پر ہے۔

اور فرمایا فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ

یعنی، پس جس کے متعلق اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے اسلام کے لیے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جس کے متعلق چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور بے قرار سا بنا دیتا ہے۔ گویا وہ آسمان پر (زبردستی سے) چڑھ رہا ہے۔

اس طرح شرح صدر کے سب سے بڑے اسباب توحید اور ہدایت ہیں اور تنگی قلب کے سبب سے

بڑے محرکات شرک اور گمراہی ہیں۔ اور اسی قبیل میں سے نور ہے جسے اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں ڈال دیتا ہے اور یہ نور ایمان کا نور ہوتا ہے، چنانچہ یہ سینہ کو کھولتا اور وسعت عطا کرتا اور قلب میں فرحت پیدا کرتا ہے اور جب بندے کے قلب سے نور ضائع ہوتا ہے تو وہ تنگ (دل) اور پریشان ہو جاتا ہے، اور گویا وہ سب سے زیادہ تنگ اور دشوار قسم کے قیدخانہ میں ہوتا ہے۔

جامع ترمذی میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب نور قلب میں داخل ہوتا ہے تو (قلب) میں وسعت و انشراح پیدا ہو جاتا ہے۔

عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول اس کی علامت کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا (اس کی علامت) دوام کے گھر کی طرف انابت اور دارالغرور (دنیا) سے نفرت، اور موت کے آنے سے قبل ہی اس کی تیاری ہے۔ چنانچہ بندے کو انشراح کے باعث اس نور کا حصہ عطا ہوتا ہے۔

یہی معاملہ نور حسی اور ظلمت حسی کا ہے، وہ سینہ میں وسعت پیدا کرتی ہے اور یہ تنگ دلی پیدا کرتی ہے۔ اسی قبیل سے علم ہے، وہ سینہ میں اس قدر انشراح اور فراخی پیدا کرتا ہے کہ دنیا بھر سے زیادہ وسعت حاصل ہو جاتی ہے لیکن جہالت، تنگ دلی اور انقباض پیدا کرتی ہے اس لیے بندے کا علم جس قدر بڑھتا ہے انشراح اور وسعتِ قلب میں اسی قدر اضافہ ہوتا ہے اور یہ ہر علم کی خاصیت نہیں بلکہ صرف اسی علم کی خاصیت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ وہی علم فائدہ بخش ہے، اسی علم کے حاملین تمام انسانوں سے زیادہ وسیع (ظرف والے) فراخ دل، اخلاقِ حسنہ کے مالک اور خوش عیش ہوتے ہیں۔ اسی سے انابت الی اللہ اور اللہ کی محبت قلبی اس کی طرف جھکاؤ، اس کی عبادت کو نعمت سمجھنے کا احساس ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس سے زیادہ بندے میں کوئی بات شرح قلب کی موجب نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات انسان یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ اگر میں جنت میں اسی حالت میں (انابت اللہ کی حالت میں) ہوتا تو میری زندگی کیا خوب ہوتی۔

انشراح قلب۔ خوش نفسی اور تنعم قلبی میں محبت کو خاص طور پر بہت زیادہ دخل ہے جسے اس کا احساس ہوتا ہے وہی اس کا رمز شناس ہوتا ہے، اور جس قدر محبت قوی اور شدید ہوگی اسی قدر سینہ میں فراخی اور انشراح ہوگا، تنگ دلی پاس بھی نہیں پھٹکتی، البتہ اگر وہ اہل باطل اور بے کار لوگوں کو دیکھ لے تو انھیں دیکھ لینے سے اس کی آنکھوں میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے اختلاط اس کے لیے روحانی بخار بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اعراض، دوسروں کے ساتھ تعلق قلب، اللہ کے ذکر سے غفلت اور دوسروں کی محبت، تنگ دلی کے سب سے بڑے اسباب ہوتے ہیں، کیونکہ جو اللہ کے سوا کسی اور سے محبت رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اسی کے باعث اسے سزا دے گا اور غیر اللہ کے زنداں میں اس کا قلب محبوس کر دے گا، پس کرۂ ارض پر اس سے زیادہ بدبخت، تنگ دل اور بدحال کون ہوگا؟ ہر حالت اور ہر مقام پر ذکر خدا کی مداومت شرح صدر کے اسباب میں سے ہے، اس لیے انشراح صدر اور نعیم قلب کے لیے ذکر میں ایک عجیب تاثیر رکھی گئی ہے اور تنگی، انقباض اور عذاب کے لیے غفلت ہی ایک عجیب تاثیر ہے۔

خلق کے ساتھ احسان کا برتاؤ

اسی طرح خلق کے ساتھ احسان کا برتاؤ ہے جو احسان کرنے والا، خلق کے ساتھ روا رکھتا ہے مالی طور پر بھی اور دوسرے طریقوں پر بھی، محسن اور کریم ساری خلقت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شرح صدر کا حامل ہوتا ہے، اس کا نفس پاک ہوتا ہے اور وہ نعیم قلب کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، اور بخیل جس میں احسان کا مادہ نہیں پایا جاتا، وہ سب لوگوں سے زیادہ تنگ ظرف، بدحال اور حزن و ملال کا مجموعہ ہوتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل اور سخی کی مثال دی ہے کہ جیسے دو آدمی ہوں، جن کے بدن پر لوہے کے لباس ہوں جیسے ہی سخی صدقہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا لباس کھل جاتا اور فراخ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے کپڑے گھسیٹتا ہے اور نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ اور جونہی بخیل صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو لوہے کے لباس کی ہر کڑی اپنی جگہ پر جم جاتی ہے اور وہ ذرا بھی فراخ نہیں ہوتا، تو گویا یہ سخی مومن کے شرح صدر اور وسعتِ قلب کی مثال ہے اور دوسری مثال بخیل کی تنگ ظرفی اور انقباضِ قلب کی ہے۔

شجاعت اور وسعتِ ظرف

اسی طرح شجاعت ہے کیونکہ شجاع وسعتِ ظرف اور فراخی قلب کا مالک ہوتا ہے، اور بزدل تمام لوگوں میں تنگ ظرف اور منقبض ہوتا ہے اس کے لیے کوئی فرحت اور خوشی نہیں اور نہ لذت و نعمت ہے۔ ہاں اگر کچھ حاصل ہوگا تو صرف ویسی ہی لذت چوپاؤں اور حیوانات کو فہم و فراست سے عاری ہونے کے سبب حاصل ہے۔

اسی طرح بلکہ ان تمام مذکورہ صفات سے زیادہ اہم یہ ہے کہ دل ان تمام صفاتِ مذمومہ سے خالی کر دیا جائے جو تنگی اور عذاب کا سبب بنتے ہیں اور اس کی صحت میں آڑے بن کر رہ جاتے کیونکہ

جب تک انسان شرح صدر کے اسباب کی طرف راغب نہ ہوگا اور صفاتِ مذمومہ اس کے قلب سے خارج نہ ہوں گے تو اسے کماحقہٗ انشراح صدر حاصل نہ ہوگا۔

قلب کے انقباض وحبس کے محرکات

اسی طرح نظر، کلام، استماع مخالطت (میل جول) اور اکل، نوم (کھانے اور پینے) فضول اور لغو چیزوں کا ترک کرنا اور ان سے بچنا ہے کیونکہ یہ فضولیات آلام و غموم اور ہموم کو قلب میں انقباض وحبس اور تنگی پیدا کرتے ہیں اور عذاب کا سبب بنتے ہیں۔ بلکہ دنیا و آخرت کا بیشتر عذاب الٰہی کی کرشمہ سازی ہے۔

(واقعہ یہ) ہے کہ ان آفات میں سے کسی آفت میں حصہ لے کر انسان، کسی قدر تنگ ظرف اور بدحالی ہو جاتا ہے اور کسی قدر پریشان اور منقبض ہو جاتا ہے۔

(واقعہ یہ ہے) کہ ان خصائلِ حمیدہ میں سے کچھ حصہ حاصل کر کے بھی انسان کس قدر خوش عیش ہو جاتا ہے اور اس کی قوت اسی پر دائر اور اسی کے گرد سرگرداں ہوتی ہے، اس آدمی کا حصہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔

بے شک نیک لوگ البتہ نعمتوں میں (گھرے ہوئے) ہوں گے۔

اور برے آدمی کا حصہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں ہے:

اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ

بے شک فاسق لوگ دوزخ میں ہوں گے۔

ان دونوں کے درمیان کئی امتیازات ہیں جنھیں صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاقِ حسنہ میں اکمل ہیں۔ آپ ہی سے شرح صدر وسعت قلب، آنکھوں کی ٹھنڈک اور روحانی زندگی حاصل ہو سکتی ہے گویا آپ شرحِ صدر اور حیاتِ (روحانی) اکمل الخلق ہیں اور اس اتباع کے باعث بندے کو بھی جو شرح صدر اور لذتِ روح حاصل ہو وہ شرحِ صدر اور ذکر کے لیے درجہ کمال میں حاصل ہوگا۔ آپ کے متبعین کو ان کے اتباع کے مطابق اللہ کی جانب سے حفاظت، عصمت (تحفظ) دفاع، اعزاز اور امداد و اعانت حاصل ہوگی، بعض کو کم اور بعض کو زیادہ، پس جو بھلائی پائے اسے چاہیے کہ وہ اللہ کی حمد کرے اور جسے اس کے علاوہ کچھ اور (یعنی سزا) ملے تو چاہیے کہ صرف اپنے آپ کو مستحق ملامت خیال کرے۔

روزہ اور اس کے برکات و مصالح

صوم رمضان کے تدریجی مرحلے، رخصت و عزیمت کے پہلو

عبد اور معبود کا باہمی راز روزے سے مقصود شہوات سے حبس نفس اور مالوفات سے انقطاع اور قوائے شہوانیہ کی تعدیل ہے۔ تاکہ انتہائی سعادت اور پورے انعامات حاصل ہو سکیں، اور اسے شرف قبول حاصل ہو، جو دراصل ذریعہ ہے تزکیہ نفس کا اور اسی میں حیات ابدی مضمر ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے، جس میں انسان دوسرے کی بھوک، دوسرے کی پیاس اور دوسرے کی کلفت پورے طور پر محسوس کر سکتا ہے، اکل و شرب کی یہ کمی شیطان کے لیے تنگنائے بن جاتی ہے، جس سے اس کا گزرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نیز معاد و معاش کے مضرات کی گنجائش کم ہو جاتی ہے یہ (بدن) کے ہر عضو کو تسکین بخشتا اور ہر قوت کی بے راہ روی کو قابو میں رکھتا ہے۔ گویا یہ پرہیزگاری کی لگام اور جنگ کرنے والوں کی ڈھال ہے۔ صالحین اور مقربین کی ریاضت ہے اور تمام اعمال میں روزے کا عمل ہی ایسا ہے جو صرف رب العالمین کے لیے ہے، کیونکہ روزے دار ہر چیز سے رکا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور شہوت رضائے الٰہی کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ گویا اس نے نفسانی خواہشات، محبوب باتیں اور لذات دنیاوی اللہ کی محبت اور رضا کی وجہ سے ترک کر دیں۔

یہ عمل (روزے کا) بندے اور اس کے پروردگار کے درمیان ایک راز ہے جسے صرف وہی جانتا ہے۔

اس میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سب سے اکمل اور حصول مقصود کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، نیز عوام کے لیے آسان تر بھی ہے، چونکہ مرغوبات و شہوات سے بچنا تمام

کاموں سے زیادہ مشکل اور سخت تر تھا۔ اس لیے اسے ہجرت کے بعد اسلام کے عہد متوسط تک مؤخر کیا گیا تاکہ عوام کے قلوب توحید اور نماز پر جم جائیں اور قرآن کے اوامر سے مالوف ہو جائیں۔ چنانچہ یہ کام ہجرت کے بعد عہد اسلام کے وسط تک اٹھا رکھا گیا۔ یہ تدریجی طور پر بروئے عمل آیا۔ ہجرت کے بعد دوسرے سال یہ فرض کیا گیا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو تو آپ نو رمضانوں کے روزے رکھ چکے تھے۔

روزے کے تین مراتب تھے:۔

پہلا طریقہ تخییر تھا، یعنی اگر کوئی چاہے تو ہر روز فقیر کو کھانا کھلاتا رہے اور خود روزہ نہ رکھے پھر یہ ہوا کہ بوڑھا شخص یا عورت اگر چاہیں تو ہر روز فقیر کو کھانا کھلا دیا کریں اور خود روزہ نہ رکھیں، نیز مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اگر اپنی یا بچہ کی صحت کا خطرہ ہو تو قضا کی تاکید کے ساتھ وقتی طور پر مسکین کو ہر روز کھلا کر روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی۔

دوسرا طریقہ لازمی روزے کا تھا، اگر روزے دار کچھ کھانے سے پہلے سو جاتا تو اگلی رات تک اس پر کھانا پینا حرام تھا۔

اس دوسرے طریقہ کو تیسرے طریقہ نے منسوخ کر دیا اور یہ قیامت تک مشروع رہیگا۔

صوم وصال پر آپ کا عمل لیکن صحابہؓ کو ممانعت

آپ رمضان شریف میں کثرت سے کئی اقسام کی عبادتیں کرتے، چنانچہ رمضان مبارک میں حضرت جبریل علیہ السلام سے آپ قرآن مجید کی منزلوں کی (تکرار) کرتے جب حضرت جبریل علیہ السلام سے ملاقات ہوتی تو آپ تیز آندھی سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ سخاوت کرتے۔ آپ لوگوں سے بہت زیادہ سخی تھے۔ لیکن رمضان میں تو صدقات واحسان، تلاوت قرآن مجید، نماز، ذکر اور اعتکاف میں از حد اضافہ ہو جاتا اور دوسرے مہینوں کی نسبت رمضان المبارک کے مہینہ کو عبادت کے لیے مخصوص فرما لیتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آپ صوم وصال (مسلسل روزہ) رکھتے تاکہ آپ ہر وقت اپنے پروردگار کی عبادت میں مصروف رہ سکیں۔

(لیکن) آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صوم وصال سے منع فرماتے تھے۔

وہ عرض کرتے کہ آپ تو یا رسول اللہ صوم وصال رکھتے ہیں؟

تو آپ فرماتے: میں تمہاری طرح نہیں ہوں، میں رات گزارتا ہوں اور ایک روایت میں

آتا ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پاس ہوتا ہوں، وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اس خور و نوش میں لوگوں کا اختلاف ہے اور اس میں دو قول ملتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ خور و نوش حسی ہے، جو (مادی) منہ سے (کھایا جاتا تھا) کہتے ہیں کہ یہی الفاظ کا حقیقی مطلب ہے اور اس سے روگرداں ہونے کی حاجت نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ کے خور دو نوش عطا کرنے کا مطلب علوم کی غذا ہے اور اللہ کے سامنے لذتِ مناجات، اس کے قرب میں سکونِ چشم اس کی محبت کے انعامات کا فیضان ہے جو قلب پر نازل ہوتا ہے اس کے علاوہ اس قسم کے دیگر احوال، جو غذائے قلبی، انعامات روحانی سکونِ نفس و روح کی حیثیت رکھتے ہیں اور جسے کچھ بھی تجربہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ بدن قلبی اور روحانی غذا کے مقابلہ میں یکسر حیوانی غذا سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسا آدمی جو اپنے مطلوب کو حاصل کر لے، مسرور ہو اور اپنے محبوب کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہو، اس سے راضی ہو محبوب کے لطف و کرم۔ ہدایا و احسانات ہر وقت اسے مل رہے ہوں اور محبوب بھی اس سے آگاہ ہو اور اس کا اعزاز کرتا ہو۔ اس کا ازحد اکرام بھی کرتا ہو اور محبت کامل بھی رکھتا ہو۔ تو کیا یہ محب کے لیے سب سے بڑی غذا نہیں؟ (اگر دنیاوی مواقع پر ایسے حالات ہو سکتے ہوں) تو (ذرا سوچیے تو سہی)، اس حبیب کی کیا کیفیت ہوگی؟ جس سے زیادہ بزرگ کوئی نہیں جس سے زیادہ عظمت کسی کی نہیں۔ اور جس سے زیادہ جمیل و کامل کوئی نہیں اور جس سے زیادہ محسن کوئی نہیں جب محب کا دل اس کی محبت سے لبریز ہو گیا اور قلب کے تمام اجزاء بدن کے تمام جوارح اس کی ملکیت میں آگئے جب اس کی محبت سب سے زیادہ گہری اور اثر انگیز ہوتی ہے اور اپنے حبیب کے ساتھ یہ اس کی شان ہوتی ہے تو یہ کیسے نہ ہوتا کہ یہ محب اپنے حبیب کے ہاں سے دن رات نہ کھاتا پیتا، یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے پروردگار کے پاس ہوتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور اگر یہ مادی خور و نوش ہوتا تو صوم وصال تو الگ رہا آپ صائم (روزے دار) ہی نہ ہوتے اور یہ کیفیت اگر صرف رات کی حالت ہوتی تو وہ صوم وصال نہ ہوتا۔

صوم وصال کے بارے میں تین قول

نیز آپ صحابہؓ کے سوال پر کہ آپ صوم وصال رکھتے ہیں؟ جواب نہ دیتے کہ "میں وصال نہیں کرتا" اور یہ نہ فرماتے کہ "میں تمہاری طرح نہیں ہوں"۔ بلکہ آپؐ نے تو وصال کا اقرار کیا۔ اور اس بات کی

نفی فرما دی کہ آپؐ کی اور صحابہؓ کی حالت یکساں نہیں، بلکہ امتیازی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک یعنی صوم وصال رکھا۔ تو لوگوں نے بھی وصال شروع کر دیا۔ پھر آپ نے انہیں منع فرمایا۔ عرض کیا گیا کہ آپ وصال کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں تم جیسا نہیں ہوں۔ مجھے کھلایا اور پلایا جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر رحمت کے باعث صوم وصال سے منع فرمایا اور سحری تک اجازت دی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا وصال مت کرو، جو وصال کرنا چاہے تو اُسے چاہیے کہ سحری تک وصال کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وصال جائز ہے یا حرام ہے یا مکروہ ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے اور اس میں تین اقوال ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ اگر استطاعت ہو تو جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ حضرت ابن زبیرؓ کئی کئی ایام تک وصال کرتے تھے۔ اس مسلک والوں کا خیال یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے صوم وصال رکھا حالانکہ آپ نے انہیں منع کر دیا تھا جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ نے صوم وصال سے منع فرمایا اور فرمایا کہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں چنانچہ جب (صحابہؓ) نہ رکے تو انہوں نے آپ کے ساتھ ایک دن دو دن تین دن (صوم وصال) رکھا تو منع فرمانے کے بعد بھی آپؐ کا صحابہؓ کے ساتھ مل کر وصال ثابت ہے۔ اگر یہ ممانعت حرام کے معنی میں ہوتی تو صحابہؓ رکنے سے انکار نہ کرتے اور آپ اس کے بعد اور ان کے عمل کا اقرار (یعنی تائید) نہ فرماتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب صحابہؓ نے منع کرنے کے بعد بھی (صوم وصال) رکھا۔ حالانکہ (حضورؐ) جانتے تھے اور اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے رحمت و تخفیف کے ارادہ (سے منع) فرمایا تھا اور حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت کے باعث صوم وصال کی مخالفت کی تھی (متفق علیہ)

(۲) دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ وصال جائز نہیں۔ امام مالکؒ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور ثوریؒ کا یہی مذہب ہے ابن عبدالبرؒ ان سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اسے کسی کے لیے بھی جائز نہیں بتایا۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی کراہت پر شافعیؒ کی نص موجود ہے اور ان کے اصحاب کا اختلاف

ہے۔ بعض نے مکروہ تحریمی اور بعض نے تنزیہی بتایا ہے اور حرام بتانے والوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت سے استدلال کیا ہے اور نہی و ممانعت تحریم کی مقتضی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا فرمان "رحمت کے باعث" تحریم کی نفی نہیں کرتا، بلکہ تاکید کرتا ہے کیونکہ یہ بھی رحمت کے باعث ہوا کہ اسے ان پر حرام کر دیا، بلکہ تمام مناہی (ممنوعات) امت پر رحمت اور اس کے تحفظ و دفاع کی خاطر ہی ہیں۔

رہا ممانعت کے بعد بھی وصال کرنا تو یہ اس لیے نہیں کہ ممانعت کے باوجود اُن کے صیام وصال کو برداشت کیا اور یہ (مقصد بھی تھا) کہ ممانعت کا سبب اس کی حکمت اور مضر عنصر بھی کھل کر سامنے آجائے۔ چنانچہ جب وصال کا ضرر اور مخالفت کی حکمت عیاں ہو گئی تو یہی قبولیت ممانعت اور ترک وصال کی داعی بن گئی کیونکہ جب انہیں وصال سے عبادت میں تکلیف محسوس ہونے لگی جو اللہ کے حقوق میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ ترجیح کام ہے اور فرائض ظاہری اور باطنی امور میں ہرج ہونے لگا اور بھوک ان (حقوق کی ادائیگی) میں رکاوٹ بننے لگی تو ان کے سامنے وصال کی ممانعت کی حکمت اور ضرر آگیا اور ان کا کہنا ہے کہ صحیحین میں حضرت عمر بن خطابؓ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رات اس قدر ہو جائے اور دن اس قدر چلا جائے اور سورج غروب ہو جائے تو (گویا) روزے دار افطار کر لے۔ اور صحیحین میں اسی طرح حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے مروی ہے ان کا کہنا ہے کہ آپ نے وقت افطار آنے پر مفطر قرار دے دیا، اگرچہ افطار نہ کرے اور یہ بات شرعاً وصال میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے (نیز) ان کا کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری امت فطرت پر رہے گی اور جب تک میری امت افطار میں جلدی کرتی رہے گی۔ تب تک بھلائی پر رہے گی اور سنن میں آپؐ سے مروی ہے کہ جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے تب تک دین غالب رہے گا۔ (اور) یہودی اور عیسائی (افطار میں) دیر کرتے ہیں (نیز) سنن میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا سب سے زیادہ محبوب بندہ وہ ہے جو سب سے جلدی افطار کرے یہ روایت تاخیر افطار کی کراہت ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا جو (افطار) کو ترک کر دے تو یہ کس قدر (غلط) کام ہو گا؟!

اور جب ایک بات مکروہ ہو تو وہ عبادت شمار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عبادت کو کم از کم مستحب کا درجہ ضرور حاصل ہونا چاہیے۔

(۳) تیسرا قول جو تمام اقوال سے زیادہ اعتدال پسندانہ ہے یہ ہے کہ سحری سے سحری تک وصال جائز ہے۔ یہ ہی احمدؒ اور اسحٰقؒ سے منقول ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

"وصال نہ کرو اور جو تم میں سے وصال کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ سحری تک وصال کرے (بخاری)"

یہ روزے کے لیے سب سے زیادہ سہل اور معتدل وصال ہے اور یہ عشاء کے کھانے کے قائم مقام ہے۔ فرق یہ ہے کہ ذرا موخر ہو گیا تو (اس صورت میں) روزے دار دن رات میں ایک بار کھائے گا۔

رؤیت ہلال کی تحقیق اور شاہد کی شہادت

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ جب تک رویت ہلال کی تحقیق نہ ہو جائے یا کوئی عینی گواہ نہ مل جاتا آپ روزے شروع نہ کرتے جیسا کہ آپؐ نے حضرت ابن عمرؓ کی شہادت قبول کر کے روزہ رکھا۔ نیز ایک اعرابی کے کہنے پر روزہ شروع کر دیا۔ اور ان دونوں کی خبر پر اعتماد کیا اور انہیں لفظ شہادت کا پابند نہیں کیا اگر یہ خبر دینا ہو تو خبر واحد میں رمضان کے لیے کافی ہو جاتی اور اگر شہادت ہوتی تو شاہد کو لفظ شہادت کہنے کا پابند نہ کرتے اور اگر رویت یا شہادت دونوں نہ ہوتیں تو آپ شعبان کے تیس دن پورے کرتے اور اگر تیسویں رات کو بادل یا ابر حائل ہو جاتا تو آپ تیس دن مکمل کرتے اور پھر (اگلے روز) روزہ رکھتے۔

اور آپ بادل کے دن کا روزہ نہیں رکھتے تھے نہ آپ نے اس کا حکم دیا، بلکہ فرمایا:

جب بادل ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کیے جائیں۔

اور آپ خود بھی ایسا ہی کرتے۔ اس طرح یہ آپ کی سنت بھی تھی اور یہ آپ کا حکم بھی تھا اور یہ روایت آپ کے اس فرمان کے منافی نہیں کہ جب تم پر بادل چھا جائے تو اس کا اندازہ کر لو اور قدر (اندازہ) سے مراد حساب مقدر ہے اور اس سے مراد تکمیل (ماہ) ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

اَکْمِلُوا الْعِدَّۃَ: عدت پوری کرو۔

اور اکمال سے مراد اس ماہ کو مکمل کرنا ہے جس کی (آخری تاریخ پر) بادل چھا گیا جیسا کہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ "شعبان کی مدت پوری کرو۔" اور فرمایا جب تک دیکھ نہ لو تب تک روزہ نہ رکھو اور جب تک (چاند) دیکھ نہ لو تب تک افطار نہ کرو۔ اگر بادل چھا جائیں۔ تو

مدت مکمل کرو اور یہ جو اکمال مدت کا حکم دیا اس سے مراد مہینہ ہے اور یہ روزے اور افطار کے موقع پر ہے۔

اس سے زیادہ واضح روایت آپ کا فرمان ہے" کہ مہینہ انتیس دن کا ہے اس لیے جب تک اُسے دیکھ نہ لو تب تک روزہ نہ رکھو اور اگر بادل چھا جائیں تو مدت (ماہ) پوری کرو۔ لفظی طور پر ابتدائے ماہ اور معنوی طور پر آخر ماہ کی طرف راجع ہے، اس لیے یہ جائز نہیں۔ کہ لفظی مطلب کی نفی کر دی جائے اور فقط معنوی مراد کو درست قرار دیا جائے۔

(نیز) آپؐ نے فرمایا، کہ مہینہ تیس دن کا بھی ہے اور مہینہ انتیس دن کا (بھی) ہے۔ اگر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو اور فرمایا، کہ رمضان سے قبل روزے مت رکھو (بلکہ) چاند دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو لیکن اگر ابر کا ٹکڑا رکاوٹ بن جائے تو تیس (دن) مکمل کرو۔

اور فرمایا: رمضان کا (روزے رکھ کر) استقبال نہ کرو۔ ایک لفظ یہ بھی ہے کہ رمضان شروع ہونے سے ایک یا دو دن قبل روزے مت رکھو، ہاں ایسا آدمی جو پہلے سے روزے رکھتا چلا آرہا ہے وہ روزہ رکھ سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یوم غیم (بادل کا دن) اس نہی میں داخل ہے مرفوعاً حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رمضان سے قبل (اس کے استقبال کے لیے) روزے مت رکھو (بلکہ) اسے دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر ہی افطار کرو۔ اگر ان کے درمیان بادل آڑ بن جائے تو تیس دن پورے کرو۔ (صحیح ابن حبانؒ)

اگر چاند میں شک ہو جائے تو؟

اور حضرت سماکؒ نے حضرت عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ ہلال رمضان کے دیکھنے میں لوگوں کو شک ہوا۔ بعض نے کہا کہ آج (روزہ) ہے) اور بعض نے کہا کہ کل ہوگا چنانچہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتانے لگا کہ اس نے چاند دیکھا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود و کارساز نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں) کی گواہی دیتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں بے شک دیتا ہوں۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے لوگوں میں منادی کرادی کہ روزے رکھو، پھر فرمایا کہ اسے دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر ہی افطار کرو۔ اگر تم پر

بادل چھا جائیں تو تیس دن کا اندازہ کر لو، پھر روزے رکھو اور اس سے قبل ایک دن کا روزہ مت رکھو۔

یہ تمام احادیث صحیح ہیں، بعض روایات صحیحین میں ہیں اور بعض صحیح ابن حبانؒ، حاکم وغیرہ میں ہیں۔ اگرچہ بعض کو معلول قرار دیا گیا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی صحت استدلال معلول نہیں رہتی، اگر کہا جائے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ ہے تو حضرت عمر بن خطابؓ، علیؓ بن ابی طالب، عبداللہ بن عمرؓ، انسؓ بن مالک، ابوہریرہؓ، معاویہؓ، عمرؓ بن عاص، حکمؓ بن ایوب غفاری عائشہؓ، اسماءؓ بنت ابی بکر نے آپ کے خلاف کیوں کہا؟ نیز سالمؓ بن عبداللہ، مجاہدؒ، طاؤسؒ، ابوعثمان نہدیؒ، مطرف بن شخیرؒ، میمون بن مہرانؒ، بکر بن عبداللہ مزنی نے کیوں مخالفت کی؟ نیز اہل حدیث سنت کے امام احمد بن حنبلؒ نے کیسے مخالفت کی؟

اب ہم ان ائمۂ کرام کے مستند اقوال پیش کرتے ہیں۔ ولید بن مسلم کہتے ہیں انہیں ثوبانؒ سے انہیں اپنے والد سے انہیں مکحولؒ سے روایت پہنچی کہ جب چاندرات کو آسمان پر ابر ہوتا تو حضرت عمر بن خطابؓ روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے کہ یہ رمضان پر تقدم نہیں ہے بلکہ تحری ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق شافعیؒ نے بتایا کہ انہیں عبدالعزیز بن محمد دراوردی نے انہیں محمد بن عبداللہ عمرو بن عثمان سے انہوں نے اپنی والدہ فاطمہ بنت حسینؓ سے روایت کیا کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا کہ میں شعبان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کو رمضان کے مہینہ میں افطار کرنے سے بہتر سمجھتا ہوں اور درست! ابن عمرؓ کے متعلق تو کتاب عبدالرزاق میں ہے کہ ہمیں معمر سے انہیں ایوب سے ابن عمرؓ کے متعلق روایت پہنچی کہ جب بادل ہوتا تو وہ صبح کو روزہ سے ہوتے اور اگر بادل نہ ہوتا تو افطار کر لیتے اور صحیحین میں ان سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اسے (چاند کو) دیکھو تو روزہ رکھو اور جب اسے دیکھ لو تو افطار کرو۔ اور اگر بادل چھا جائیں تو اس مہینہ کو مکمل کرو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نافع کی روایت سے مزید بتایا ہے کہ جب شعبان کی انتیس تاریخ ہوتی تو حضرت عبداللہؓ کسی کو (چاند) دیکھنے کے لیے بھیجتے۔ اگر وہ دیکھ لیتا تو وہی بات ہوتی اور اگر نہ دیکھتے اور نہ بادل آڑے آتا تو آپ صبح کو افطار کرتے اور اگر بادل وغیرہ سامنے ہوتا تو صبح کو روزہ رکھتے

اقوال متعددہ و مختلفہ

رہی حضرت انسؓ والی روایت تو امام صاحب نے فرمایا: ہمیں اسماعیل بن ابراہیم نے انہیں یحییٰ بن ابی اسحٰق نے بتایا کہ ہمیں نے

ظہر یا اس کے قریب چاند دیکھا، تو لوگوں نے روزہ کھول لیا۔ چنانچہ ہم حضرت انسؓ بن مالک کے پاس حاضر ہوئے اور انہیں چاند دیکھنے اور لوگوں کے افطار کرنے کی خبر دی۔ وہ فرمانے لگے یہ میرے لیے اکتیسواں دن مکمل کرے گا اور یہ اس وجہ سے ہے کہ حکمؒ بن ایوب نے لوگوں کے روزے سے قبل میرے پاس پیغام بھیجا کہ میں کل روزہ رکھوں گا۔ چنانچہ میں نے ان کی مخالفت کرنا پسند نہ کیا اور روزہ رکھ لیا (اس لیے) آج میں (اپنا روزہ) رات تک مکمل کروں گا۔

حضرت معاویہؓ کے متعلق یہ ہے: احمدؒ فرماتے ہیں ہمیں مغیرہؒ نے انہیں سعیدؒ بن عبدالعزیز نے انہیں مکحول اور ابن حلبس نے بتایا کہ حضرت معاذ بن ابی سفیانؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں شعبان کے مہینہ کا روزہ رکھنے کو رمضان کے مہینہ میں افطار کرنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔

حضرت عمروؓ بن عاص کے متعلق یہ ہے: احمدؒ نے فرمایا: ہمیں زید بن حباب نے انہیں ابن لہیعہ سے انہیں عبداللہ بن ہبیرہ سے انہیں عمرو بن عاص کے متعلق روایت پہنچی کہ وہ رمضان کے مشکوک دن کا روزہ اکٹھا کرتے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق یہ ہے کہ ہم نے ابوہریرہ کو فرماتے سنا کہ "اگر میں رمضان کے مہینہ میں ایک دن کی عجلت کر لوں تو یہ مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ میں اس ہی ایک دن کی تاخیر کر لوں، کیونکہ جب میں عجلت کروں گا تو اس میں سے (ایک روزہ بھی) فوت نہ ہوگا۔ اور اگر دیر کر دی تو فوت ہو جائے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ ہے کہ سعیدؓ بن منصور نے فرمایا: ہمیں ابوعوانہ سے انہیں یزید بن جبیرؓ سے انہیں اس قاصد سے خبر ملی جو رمضان کے مشکوک دن میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ شعبان میں روزہ رکھنا مجھے رمضان میں افطار کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے متعلق مروی ہے کہ سعیدؒ (مذکور) نے بتایا کہ ہمیں یعقوب بن عبدالرحمٰن سے انہیں ہشامؒ بن عروہ سے انہیں فاطمہ بنت منذرؓ سے خبر ملی کہ جب کبھی رمضان کی ابتداء میں بادل چھا جاتے تو حضرت اسماءؓ ایک دن قبل روزہ شروع کرتیں اور تقدم کرنے کا حکم بھی فرماتیں۔ احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں روح بن عبادہ انہیں حماد بن سلمہ سے انہیں ہشام بن عروہؓ سے انہیں فاطمہ سے انہیں اسماءؓ سے روایت ملی کہ حضرت اسماءؓ رمضان کے مشکوک دن کا روزہ رکھا کرتی تھیں۔

جس قدر اقوال ہم نے احمدؒ کی سند سے لکھے ہیں۔ یہ مسائل فضل بن زیادہ سے ہیں اور اثرم کی روایت میں ہے کہ جب آسمان پر بادل یا کوئی دوسری بات ہوتی تو صبح کو روزہ رکھتے اور اگر آسمان پر کوئی ایسی بات (چاند دیکھنے میں رکاوٹ) نہ ہوتی تو صبح کو افطار کرتے۔ اسی طرح ان کے دونوں بیٹوں صالح اور عبداللہ نے مروزی اور فضل بن زیاد وغیرہ سے نقل کیا ہے۔

اس کا جواب کئی طرح سے ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ اقوال و آثارِ صحابہؓ میں کوئی ایسا صریح اثر نہیں جس میں وجوب پایا جائے۔ یہاں تک کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف قرار دیا جائے بلکہ ان سے زیادہ سے زیادہ احتیاطی قسم کا روزہ منقول ہے اور حضرت انسؓ سے تو صراحتاً منقول ہے کہ انہوں نے امراء (حکام) کی مخالفت سے کراہت کے سبب روزہ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے امام احمدؒ نے ایک روایت میں فرمایا کہ لوگ روزہ رکھنے اور افطار کرنے کے سلسلہ میں امام (حاکم) کے اتباع ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعلی نصوص ہم بیان کر چکے ہیں۔ نیز ان کا قول جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یوم غیم (بادل والے دن) کا روزہ واجب نہیں اور نہ حرام ہے۔ بلکہ جس نے افطار کیا اس نے جواز سے فائدہ اٹھایا اور جس نے روزہ رکھا اس نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا۔

دوسرے یہ کہ بعض صحابہؓ اس دن کا روزہ رکھا کرتے تھے اور بعض نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ گزر چکا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا روزہ اس مہینہ میں واضح اور صریح تر ہے۔ ابن عبدالبر نے اسے نقل کیا اور طاؤسؒ یمانی اور احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی خیال ہے۔

اور حضرت عائشہؓ و اسماءؓ جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادیاں تھیں۔ ان کا بھی یہی خیال ہے اور میں نہیں جانتا کہ ان کے علاوہ کوئی اور بھی حضرت ابن عمرؓ کے مذہب کی طرف گیا ہے۔

اور حضرت عمرؓ بن خطاب، علیؓ بن ابی طالب، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ اور انسؓ بن مالک رضی اللہ عنہم نے مشکوک دن کا روزہ مکروہ بتایا گیا ہے۔

شعبان کا آخری نفلی روزہ

میں کہتا ہوں کہ حضرت علی، عمر، عمار، حذیفہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ شعبان کا آخری نفلی روزہ ممنوع ہے اس کے متعلق حضرت عمارؓ کا قول ہے کہ جس نے مشکوک دن کا روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔ رہا یوم غیم کا روزہ تو یہ احتیاطی طور پر ہے اس لیے کہ اگر یہ رمضان میں سے ہے تو فرض ہے، ورنہ نفلی ہے۔ چنانچہ صحابہؓ کے مرویات کا مطلب اس کا جواز ہے۔ حضرت ابن عمرؓ

اور حضرت عائشہؓ بھی ویسا ہی کرتے تھے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہؓ کی روایت موجود ہے کہ جب شعبان (کے آخری دن) بادل چھا جاتا تو آپ تیس دن مکمل کرتے، پھر روزہ رکھتے اور ان کی روایت کو ان کے فعل کی وجہ سے روک دیا گیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو وہ اس کی مخالفت نہ کرتیں اور ان کے روزے کو حدیث کے معلول ہونے کا سبب قرار دیا۔ حالانکہ مسئلہ اسی طرح نہیں۔ کیونکہ (حضرت عائشہؓ) نے واجب سمجھ کر روزہ نہیں رکھا بلکہ انہوں نے تو احتیاطاً رکھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مجمل وار سے یہ سمجھا کہ روزے صرف مدتِ (ماہ) مکمل ہونے پر واجب ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ نے یہ نہیں سمجھا کہ سرے سے یہ جائز ہی نہیں ہیں یہ بحث اس مسئلہ میں سب سے زیادہ معتدل ہے اور اسی پر تمام احادیث و آثار جمع ہو سکتے ہیں۔

اور معمر کی روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے جو انہیں ایوب سے انہیں نافع سے انہیں ابن عمرؓ سے پہنچی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلالِ رمضان کے متعلق فرمایا کہ جب تم اسے دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب دیکھ لو تو افطار کرو اور اگر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کر لو اور ابن ابی داؤد نے نافعؒ سے نقل کیا کہ اگر بادل چھا جائیں تو تیس دن کی مدت مکمل کرو اور مالک و عبیداللہ نے نافع سے روایت کیا کہ اس کا اندازہ کر لو۔ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حدیث کا مطلب تیس دن مکمل کرنے کا وجوب نہیں بلکہ جواز سمجھا۔ اس طرح جب انہوں نے تیسویں دن کا روزہ رکھا تو گویا دو جائز کاموں میں احتیاطاً ایک (جائز) کام کیا۔

ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کے خلافیات

اور حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو (رمضان کے) مہینہ کا ایک یا دو دن پہلے سے (استقبال) کرتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزے نہ رکھو۔ گویا (حضرت عباسؓ) ابن عمرؓ کا انکار کر رہے ہیں اور یہ دونوں صحابہؓ ایسے ہی تھے۔ ایک قدرے تشدد کی طرف مائل تھے اور دوسرے رخصت کی طرف مائل تھے اور یہی صورتِ حال دوسرے مسائل میں بھی جاری تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تشدد کے باعث بعض ایسے امور کے بھی پابند تھے۔ دیگر صحابہؓ جن کے موافق نہ تھے۔ آپ وضو میں آنکھوں کا اندرونی حصہ بھی دھوتے تھے۔ یہاں تک کہ اس وجہ سے نابینا بھی ہو گئے اور جب آپ سر کا مسح کرتے تو کانوں کے لیے نیا پانی لیتے اور حمام میں جانے سے منع کرتے اور جب داخل ہوتے تو اس کے بعد غسل کرتے۔ (دوسری طرف) حضرت ابن عباسؓ حمام میں جاتے (اور حضرت ابن عمرؓ)

دو ضربات سے تیمم کرتے۔ ایک چہرے کے لیے اور ایک کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے۔ اور ایک ہی ضرب پر اکتفا نہ کرتے اور نہ ہتھیلیوں پر اور حضرت ابن عباسؓ ان کے خلاف کرتے۔ کہا کرتے کہ تیمم میں چہرے اور ہتھیلیوں کے لیے ایک ہی ضرب ہوگی۔ نیز حضرت ابن عمرؓ عورت کا بوسہ لینے پر وضو ضروری سمجھتے اور اس کا فتویٰ بھی دیتے اور جب آپ اپنے بچوں کا بوسہ لیتے تو کلی کرتے پھر نماز پڑھتے اور حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میں نے اس (بیوی) کا بوسہ لیا ہے یا میں نے خوشبو سونگھی ہے (یعنی اُن کے نزدیک اس پر وضو نہ کرنا پڑتا) نیز حضرت ابن عمرؓ حکم دیا کرتے کہ جسے نماز کی حالت میں یاد آجاتے کہ اس پر فوت شدہ نماز کی قضا باقی ہے۔ نماز ختم کرے، پھر فوت شدہ نماز ادا کرے۔ پھر جس نماز میں مشغول تھا اس کا اعادہ کرے۔ یہ مسند ابویعلی میں مرفوع روایت ہے اور صاف تر بات یہ ہے کہ یہ حضرت ابن عمرؓ پر موقوف ہے۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً منقول ہے اور صحیح نہیں اور بتایا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوع طور پر مروی ہے —— ۔ الغرض حضرت ابن عمرؓ تشدد و احتیاط کے طریقہ پر چلا کرتے تھے اور معمر نے حضرت ایوب سے انہوں نے نافع سے انہوں نے (ابن عمر) سے روایت کیا کہ جب وہ امام کے ساتھ ایک رکعت پالیتے تو دوسری رکعت اس کے ساتھ اور ملالیتے اور جب نماز سے فارغ ہوجاتے تو دو سجدۂ سہو کرتے۔ زہریؒ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ کسی اور نے بھی یہ کیا ہو۔

ایک مسلمان کی شہادت بھی کافی ہے

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت طیبہ یہ بھی کہ ایک مسلمان کی شہادت پر لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیتے اور دو مسلمانوں کی گواہی پر روزے سے خروج (افطار) کا حکم فرماتے۔

اور آپ کی عادتِ طیبہ یہ بھی کہ جب وقتِ عید گزرنے کے بعد دو شاہد چاند دیکھنے کی گواہی دیتے تو آپ افطار کر دیتے اور لوگوں کو بھی افطار کا حکم فرماتے۔ لیکن عید کی نماز اگلے روز اس کے وقت پر ادا فرماتے اور آپ افطار میں جلدی کرتے، اس کی ترغیب دیتے (نیز) سحری کھانے اور سحری کھانے کی ترغیب بھی دیتے۔ اور آپ (سحری کھانے) کو مؤخر کرتے، اس میں تاخیر کی ترغیب دیتے اور کھجور سے افطار کرنے پر آمادہ کرتے۔ اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے۔ یہ امت پر کمال شفقت و نصیحت کے باعث تھا کیونکہ خلوئے معدہ میں میٹھی چیز کو طبیعت زیادہ قبول کرتی ہے اور اس سے کافی فائدہ بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً بصارت کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور مدینہ کی میٹھی کھجور ہی ان کے ہاں غذا بھی ہے خشک اور تر کھجور ان کے ہاں پھل (کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور پانی کا معاملہ یوں ہے کہ روزے کے باعث جگر میں خشکی ہو جاتی ہے اور جب پانی سے اس کو مرطوب کیا جائے گا تو اس کے بعد غذا سے اس کا فائدہ مکمل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بھوکے پیاسے کو چاہیے کہ کھانے سے قبل تھوڑا سا پانی پی لے۔ پھر اس کے بعد کھانا کھائے۔ اس کے علاوہ پانی اور کھجوریں اصلاح قلب کے لیے کافی مفید ہوتے ہیں جنہیں ماہرین قلب جانتے ہیں۔

افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرنی چاہیے

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز (مغرب) پڑھنے سے قبل افطار کیا کرتے تھے اور اگر تر کھجوریں مل جاتیں تو ان سے افطار فرماتے اگر نہ ملتیں تو خشک کھجوروں سے افطار کر لیتے۔ اگر وہ بھی نہ ملتیں تو پانی کے چند گھونٹوں سے ہی افطار کر لیا کرتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ افطار کے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت فتقبل منا انک انت السمیع العلیم

یعنی: "اے اللہ میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا پس اسے ہماری طرف سے قبول فرما۔ بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

نیز آپ سے یہ دعا بھی مروی ہے کہ آپ پڑھا کرتے: اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت۔

یعنی "اے اللہ میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر میں نے افطار کیا"۔

اور ابوداؤد نے حضرت معاذ بن زہرہ سے روایت کیا انہیں معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہی (مذکورہ دعا) پڑھا کرتے تھے اور مروی ہے کہ جب آپ افطار کر لیتے تو یہ دعا پڑھتے:

ذھب الظماء وابتلت العروق وثبت الاجران شاء اللہ تعالیٰ۔

یعنی پیاس چلی گئی، رگیں تر ہو گئیں اور اجر ثابت ہو گیا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

اور حسین بن واقدہ کی حدیث میں حضرت مروان بن سالم مقنع سے انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ روزے دار کی ایک دعا افطار کے وقت مسترد نہیں ہوتی (ابن ماجہ)

اور صحیح روایت میں آپ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب رات اس قدر ہو جائے اور دن اس قدر چلا جائے تو (گویا) روزے دار کا افطار ہو گیا۔ اس کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ حکمی طور پر اسی کا افطار ہو گیا۔ اگرچہ اس کی نیت نہ کرے (دوسری تفسیر یہ ہے) کہ وقت افطار ہو گیا جیسا کہ کہتے ہیں۔

صبح ہوئی شام ہوئی وغیرہ۔

اور روزے دار کو آپ گندی باتیں کرنے، سختی برتنے، دشنام طرازی اور گالیوں کا جواب دینے سے منع فرماتے تھے۔ بلکہ آپ حکم فرماتے کہ جو گالی دے اسے کہہ دو میں روزے سے ہوں۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ بات زبان سے کہے یہ ظاہر حدیث کا مطلب ہے اور ایک قول ہے کہ دل میں کہے اور اپنے آپ کو یاد دلائے کہ میں روزہ سے ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ فرض روزہ میں زبان سے کہے اور نفلی روزہ ہو تو دل میں کہے، کیونکہ یہ صورت ریاکاری سے دور ہے۔

سفر میں روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی رخصت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں سفر کیا تو حالتِ سفر میں کبھی روزہ رکھا اور کبھی افطار کیا اور صحابہؓ نے بھی دونوں طریقوں کو اختیار فرمایا (نیز) جب دشمن قریب ہوتا تو آپ افطار کا حکم فرماتے تاکہ جنگ کرنے میں انہیں قوت حاصل ہو۔

دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے قوت حاصل کرنے کی خاطر افطار کرنا جائز ہے۔ اس میں دو قول ہیں اور سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ ابن تیمیہؒ نے یہی قول اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جب دمشق کے باہر افواج اسلامی کو دشمن سے مقابلہ کرنا پڑا تو انہوں نے اس کا فتویٰ دیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ محض سفر کے لیے افطار کرنے سے یہ افطار اولیٰ ہے۔ بلکہ سفر کی حالت میں افطار کو مباح قرار دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ حالتِ (جنگ) میں بھی افطار مباح ہے۔ کیونکہ اس حالت میں زیادہ استحقاقِ جواز ہے، کیونکہ سفر میں صرف مسافر سے قوت مختص ہے لیکن جنگ میں اس کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے (قوت مطلوب) ہے اور سفر کی تکلیف جہاد کی مشقت زیادہ سخت ہے اور مسافر کے افطار سے مجاہد کا افطار زیادہ مصالح اور فوائد کا حامل ہوتا ہے

(نیز) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اعدوالھم ما استطعتم من قوۃ

یعنی دشمن کے مقابلہ میں جس قدر استطاعت ہو قوت مہیا کرلو۔

اور جنگ کے وقت اسباب قوت میں سے افطار ایک عظیم قوت کا باعث ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیراندازی کو قوت قرار دیا اور یہ مقصد تب ہی ہو سکتا ہے جب غذا اور افطار کے ذریعہ قوت و تعاون حاصل ہو۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو ایک مرتبہ حکم فرمایا جب وہ دشمن کے قریب ہو چکے تھے۔

"تم اپنے دشمن کے قریب پہنچ چکے ہو۔ اس لیے افطار کر لو، تمہیں قوت حاصل رہے گی۔"
یہ رخصت تھی، پھر دوسری جگہ اترے تو فرمایا:
"تم کل صبح دشمن کا مقابلہ کرو گے اور افطار تمہارے لیے قوت کا باعث ہوگا۔ اس لیے افطار کر لو۔"

چونکہ یہ ایک مقام جنگ تھا اس لیے آپؐ نے دشمن کے قریب ہونے اور قوت کی احتیاج کو سبب قرار دیا۔ جس کے ذریعہ دشمن کا مقابلہ کرنا مقصود ہے۔ سفر اگرچہ ایک سبب تھا لیکن یہ سفر کے علاوہ ایک دوسرا مستقل سبب تھا اور اسی پر علیٰ بن یونس کی روایت روشنی ڈالتی ہے جو انہوں نے شعبہ سے انھوں نے عمرو بن دینار سے روایت کی۔ فرمایا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو فرماتے سنا کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آج قتال کا دن ہے اس لیے افطار کرو، سعید بن ربیع نے شعبہ سے روایت کیا ہے کہ قتال کو اس افطار کی علت قرار دیا۔

اور جب جہاد کے علاوہ محض سفر ہی ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افطار کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رخصت ہے جو اس کے مطابق کرے تو اچھا ہے۔ اور جو روزہ رکھنا چاہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

ماہِ رمضان میں جہاد و سفر

سفر شروع کرتے ہی مجاہد اور مسافر کے لیے سہولت

غزوۂ بدر اور فتح مکہ رمضان میں

آپؐ نے ماہِ رمضان میں بسلسلۂ جہاد و غزوات کئی مرتبہ سفر فرمایا، ان میں سب سے بڑا غزوہ بدر، اور غزوۂ فتح مکہ تھا۔

حضرت عمرؓ بن خطاب فرماتے ہیں کہ ہم رمضان المبارک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو غزووں میں شریک ہوئے۔ یوم بدر اور فتح مکہ میں۔ چنانچہ ہم نے دونوں میں افطار کیا۔ اور جو دار قطنیؒ وغیرہ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے بتایا۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان شریف میں عمرہ کے لیے (حدیث) تو یہ ان کے خلاف غلط بیانی ہے اور یہی اصل واقعہ ہے، یا یہ ہوگا کہ کوئی روایت ان سے مروی ہوگی بعد میں اس میں گڑبڑ ہوگئی ہوگی، جس طرح حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں تصرف ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ کیا (تو حضرتِ عائشہ رضؓ) نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن پر رحم کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی عمرہ کیا وہ بھی آپ کے ساتھ ہوا کرتے تھے اور حضورؐ نے کبھی بھی رجب میں عمرہ نہیں کیا اس طرح آپ کے تمام عمرے ذی قعدہ میں تھے۔ ماہِ رمضان میں آپ نے کبھی عمرہ نہیں کیا۔

سفر کی حد نہ مقرر کرنا چاہیے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت طیبہ یہ نہ تھی کہ سفر کی حد مقرر کریں جس کے مطابق روزے دار افطار کرے اور نہ آپ سے اس باب میں کچھ صحیح طور پر مروی ہے اور وحیہ بن خلیفہ کلبی نے تین میل کے سفر پر بھی افطار کیا ہے۔ اور جن لوگوں نے روزہ رکھا ان سے کہہ کر یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کر گئے۔

اور صحابہؓ جب سفر اختیار کرتے تو مکانات سے (مقامی آبادی) گزرنے بغیر ہی افطار کر دیتے

اور فرماتے کہ یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و عاداتِ طیبہ تھی جس طرح عبید بن جبیر نے بتایا کہ رمضان کے مہینہ میں فسطاط سے میں ابوبصرہ غفاری کے ساتھ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے ایک کشتی میں سوار ہوا ابھی ہم آبادی سے ہٹے نہ تھے کہ انھوں نے دسترخوان بچھا دیا اور فرمایا آؤ (کھانا کھاؤ) میں نے عرض کیا کیا آپ آبادی نہیں دیکھتے ؟

حضرت ابوبصرہؓ نے فرمایا، کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کرتا ہے ؟ (ابوداؤد مسند احمد)

اور مسند احمدؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ میں فسطاط سے اسکندریہ جانے کے لیے ابوبصرہؓ کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا۔ جب ہم لنگرگاہ (بندرگاہ) کے قریب ہوئے تو انھوں نے دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ میں پاس آیا، تو مجھے کھانے کی دعوت دی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ میں نے کہا اے ابوبصرة اللہ کی قسم ابھی تو ہم سے ہمارے مکانات بھی اوجھل نہیں ہوئے۔ وہ کہنے لگے، کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کرنا چاہتا ہے ؟

میں نے کہا، نہیں ! کہنے لگے، پھر کھاؤ !

راوی کا قول ہے کہ پھر ہم (منزل) پر پہنچنے تک افطار ہی کرتے رہے۔

اور محمد بن کعب بتاتے ہیں، میں رمضان میں حضرت انس بن مالک کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ سفر کا ارادہ کر رہے تھے، ان کی سواری چل پڑی تھی اور لباسِ سفر پہن چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کھانا منگایا اور کھایا، میں نے عرض کیا، یہ سنت ہے ؟

کہنے لگے (ہاں) سنت ہے۔

پھر سوار ہوئے، ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ دار قطنیؒ نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ (کھانا) کھایا اور (اس وقت) سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ یہ آثار اس مسئلہ میں واضح تر ہیں کہ جو ماہ رمضان میں کسی دن سفر کا ارادہ کرے تو اسے افطار کرنے کی پوری اجازت ہے۔

جنبی کے لیے رعایت وسہولت

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ طیبہ یہ تھی کہ اگر آپؐ جنبی ہوتے اور فجر کا وقت آجاتا تو فجر (طلوع ہوجانے کے بعد) غسل فرماتے، اور روزہ بھی رکھ لیتے، اور رمضان میں بہ حالت صوم تقبیل بھی کر لیتے۔ وہی وہ روایت جو ابوداؤدؒ نے مصدع بن یحییٰ سے انھوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے، کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں بوسہ لے لیتے اور ان کی زبان چوس لیتے۔

اس حدیث کی سند پر جرح

اس حدیث میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے مصدع کو ضعیف[1] قرار دیا ہے۔ سعدی کہتے ہیں کہ یہ راستہ سے ہٹا ہوا اور کھوٹا ہے۔

ایک گروہ نے اسے حسن کہا ہے اور بتایا ہے کہ ثقہ اور صدوق ہے۔ مسلمؒ نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں اس سے روایت قبول کی ہے (نیز) اس کے اسناد میں محمد بن دینار طاحی بصری ہے، اس شخص کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ یحییٰ اسے ضعیف کہتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اسے لیس بہ باس کہتے ہیں۔ دوسروں نے اسے صدوق قرار دیا۔ ابن عدی کہتے ہیں (روایت کا یہ حصہ) کہ "آپ ان کی زبان چوس لیتے تھے" صرف محمد بن دینار سے ہی مروی ہے۔ نیز اس کے اسناد میں سعد بن اوس مختلف فیہ راوی ہے۔ یحییٰ بصری اسے ضعیف بتاتے ہیں اور دوسروں نے اسے ثقہ قرار دیا، ابن حبان اسے ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ ایک روایت میں جو مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں میمونہؓ سے مروی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ لونڈی تھیں بتاتی ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا اور وہ دونوں روزے سے تھے، تو اس حالت میں کیا کیا جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا، دونوں کا افطار ہوگیا (روزہ ٹوٹ گیا) لیکن اس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت صحیح نہیں۔ اس میں ابو یزید ضنی ہے جس نے حضرت میمونہؓ سے روایت کی۔ اور یہ (مرویٔ عنہ) بنت سعد ہیں۔ دار قطنی فرماتے ہیں یہ غیر معروف ہے۔ بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں اس سے روایت نہیں کرتا۔ یہ حدیث منکر ہے، اور ابو یزید مجہول ہے اور جوان اور بوڑھے میں آپ سے کوئی امتیاز صحیح سند سے مروی نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے بہتر ابوداؤد کی روایت ہے جو انھوں نے نصر بن علی سے انھوں نے احمد زبیری سے انھوں نے اسرائیل سے انھوں نے اغرؒ سے انھوں نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روزے دار کی مباشرت (بوس و کنار وغیرہ فقط) کے متعلق پوچھا، آپ نے اسے اجازت دی، پھر دوسرے نے پوچھا تو آپ نے منع فرمایا، جسے رخصت دی وہ بوڑھا تھا۔ اور جسے روکا وہ جوان تھا۔ اور اگرچہ بخاری و مسلم اور باقی صحاح ستہ نے اسرائیل سے استدلال کیا ہے لیکن اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اس کے اور اغر کے درمیان ابو العنبس عدوی کوفی ہے جس کا نام حارث بن عبید ہے

---

[1] علمائے حدیث اور ائمہ جرح و تعدیل نے اس حدیث کو یکسر غلط بتایا ہے۔ اس طرح کی حدیثیں ان لوگوں نے وضع کرلی تھیں جو مسلمانوں کے نام رکھ کر داعیٔ اسلام اور اسلام کے خلاف مصروف عمل رہتے تھے (رئیس احمد جعفری)

اور یہ ساکت عنہ راوی ہے ۔

بھول چوک سے کھانا پینا روزے کو قائم رکھتا ہے

اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت طیبہ یہ تھی کہ بھول کر کھانے پینے والے سے قضاء ساقط کر دیتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا پلایا ہے اس لیے یہ خورد و نوش اس کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ وہ افطار کردے بلکہ وہ اپنے (ارادی) افعال سے مفطر قرار دیا جائے گا اور یہ نیند میں خورد و نوش کے قائم مقام ہوگا کیونکہ سونے والے کے افعال پر کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا، اور نہ بھول کر (کھانے والے پر مواخذہ ہوگا)۔

حالتِ صوم میں آپ کے معمولات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر ثابت یہی ہے کہ روزے دار کے لیے کھانا پینا، اور پچھنے لگوانا، قے کرنا، روزے کو باقی نہیں رکھتا اور قرآن اس بات پر شاہد ہے کہ جماع کرنا بھی کھانے پینے کی طرح مفطر ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور سرمہ لگانے سے متعلق آپ سے کوئی صحیح روایت مروی نہیں، اور صحیح یہ ہے کہ آپ روزے کی حالت میں مسواک کیا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے آپؐ سے نقل کیا کہ آپ روزے کی حالت میں اپنے سر پر پانی ڈال لیا کرتے تھے اور کلی کرتے ناک میں پانی ڈالتے، حالانکہ آپ کا روزہ ہوتا۔ البتہ روزے دار کو ناک میں مبالغہ سے پانی ڈالنے سے روکا گیا ہے، البتہ آپؐ نے روزہ کی حالت میں پچھنے نہیں لگوائے۔

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ یحییٰ بن سعید نے بتایا کہ شعبہ سمجھتے تھے کہ حکمؒ نے روزوں میں پچھنے لگوانے کی حدیث مقسم سے نہیں سنی، یعنی وہ حدیث، سعید سے، انھوں نے حکم سے، انھوں نے مقسم سے، انھوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے" تو بتلایا کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ یحییٰ بن سعید انصاری نے اسے منکر کہا ہے اور میمون بن مہران کی ابن عباس سے قریباً پندرہ مرویات ہیں اور اثرمؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ سے اس حدیث کا ذکر سنا، لیکن وہ اس کی تضعیف فرمایا کرتے تھے اور زکریا بن اسحٰق سے مروی ہے کہ انھوں نے عمرو بن دینار سے انھوں نے عطاء، اور طاؤس سے انھوں نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ احرام میں پچھنے لگوائے۔ اور ابن عباسؓ کے یہ اصحاب اس کا ذکر نہیں کرتے کہ آپؐ روزے سے تھے اور حنبلؒ فرماتے ہیں کہ

ہمیں ابو عبداللہ نے انھیں وکیع نے انھیں یاسین زیارت نے انھیں ایک آدمی نے انھیں حضرت انس رض نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں یہ فرمانے کے بعد پچھنے لگوائے کہ پچھنے لگانے والا اور پچھنے لگوانے والا دونوں کا (روزہ) ٹوٹ گیا۔

ابو عبداللہ کہتے ہیں وہ آدمی میرا خیال ہے کہ ابان بن ابی عیاش تھے، جن سے استدلال ٹھیک نہیں اور اثرم کہتے ہیں، میں نے ابو عبداللہ سے کہا۔ محمد بن معاویہ نیشاپوری نے ابو عوانہ سے انھوں نے سوی سے انھوں نے حضرت انس رض سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے "تو (ابو عبداللہ) نے اس کا انکار کیا اور اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ وجوہ سے ثابت ہے۔ الغرض یہ صحیح طور پر ثابت نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے اور نہ صحیح طور پر یہ ثابت ہے کہ آپ نے دن کے آغاز یا انتہاء پر روزے دار کو مسواک کرنے سے منع فرمایا ہو۔ بلکہ اس کے خلاف ہی مروی ہے۔ اور آپ سے منقول ہے کہ روزے کی بہترین فضائل ہی سے مسواک ہے (ابن ماجہ من حدیث مجالد) لیکن اس میں ضعف ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے روزے میں سرمہ لگایا، نیز آپ سے مروی ہے آپ (صحابہ رض کے پاس تشریف لائے اور آپ کی دونوں آنکھیں اثمد (سرمہ کی قسم) سے بھری تھیں، لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے اور آپ سے اثمد کے متعلق مروی ہے کہ روزے دار اس سے پرہیز رکھے، یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

ابو داؤد رح فرماتے ہیں کہ مجھے یحییٰ بن معین نے بتایا کہ یہ حدیث منکر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ روزوں میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تو کہا جاتا کہ اب افطار نہ کریں گے اور کبھی افطار کرتے تو کہا جاتا کہ اب روزے نہ رکھیں گے اور رمضان کے علاوہ آپ نے کبھی بھی مکمل مہینے کے روزے نہیں رکھے اور شعبان کے مہینہ سے زیادہ کسی ماہ میں روزے نہیں رکھتے تھے جیسا کہ بعض لوگوں کا رویہ ہے اور رجب میں آپ بالکل روزے نہیں رکھتے تھے اور نہ اس کے روزے مستحب سمجھتے تھے، بلکہ آپ سے اس ماہ کے روزوں کی نہی (ممانعت) منقول ہے (ابن ماجہ)

اور آپ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھنے کی زیادہ تر کوشش کرتے اور حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سفر و حضر میں ایام بیض کے روزے افطار نہ کرتے (نسائی) اور آپ ان روزوں کی ترغیب دیا کرتے۔ حضرت ابن مسعود رض فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ کے تین سفید دنوں (ایام بیض) کے روزے رکھا کرتے تھے (ابوداؤد، نسائی)
اور حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ حضورؐ اس کی پرواہ نہ کرتے کہ کس ماہ کے روزے رکھے (مسلم)،
ان آثار میں کوئی تناقض نہیں۔ رہے ذالحجہ کے دس روزے تو اس میں اختلاف ہے۔ حضرت
عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ کو ان دس دنوں میں کبھی روزہ رکھتے نہیں دیکھا۔ (مسلم)

اور حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں، چار چیزوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترک نہ فرماتے (۱) یوم عاشورہ
(۲) دس دن (۳)، اور ہر ماہ کے تین دنوں کے روزے (۴)، اور فجر کی دو رکعتیں (مسند امام احمدؒ)

اور امام احمد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بیوی سے روایت کیا کہ آپ ذی الحجہ کے نو روزے،
عاشورا اور مہینہ کے تین دنوں کے روزے یا مہینہ میں دو اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے۔ ایک
میں آیا ہے دو جمعراتوں کے روزے رکھا کرتے، یہ روایت اگر صحیح ہو تو بھی مثبت نافی پر مقدم
ہوتا ہے۔

رہے شوال کے چھ روزے تو آپ سے صحیح روایت میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا، رمضان
کے فوراً بعد یہ روزے رکھنا ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ہے۔

رہا عاشورہ کا روزہ، تو آپ تمام ایام میں سے اس کا زیادہ خیال رکھتے تھے

عاشوراء کا روزہ

صوم عاشوراء کے متعلق آپؐ کا فرمان

صحابہ رضؓ کو عاشورا کا روزہ رکھنے کا حکم

جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہود کو دیکھا کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں اور اس دن کی عظمت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم سے زیادہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے حقدار ہیں، چنانچہ آپؐ نے روزہ رکھا اور صحابہ رضؓ کو روزے کا حکم دیا۔

یہ واقعہ رمضان کے فرض ہونے سے قبل کا ہے، اس لیے جب رمضان فرض ہوا، تو آپؐ نے فرمایا جس کا جی چاہے روزہ (عاشوراء کا) رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔

بعض لوگوں کو اس میں اشکال ہو گیا ہے، ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں بہ ماہ ربیع الاول تشریف لائے، اس لیے ابن عباس رضؓ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا وہ یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔

(۲)، اس سلسلہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جو صحیحین میں مروی ہے کہ اشعث بن قیس حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آئے وہ کھانا کھا رہے تھے تو انھوں نے کہا ابو محمدؒ آؤ کھانا کھالو۔ انھوں نے کہا کیا آج یوم عاشوراء نہیں ہے؟ انھوں نے دریافت کیا تم جانتے ہو کہ یوم عاشوراء کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا، کیا ہوتا ہے بتائیے؟

فرمایا، رمضان کے فرض ہونے سے قبل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن روزہ رکھا کرتے تھے اور جب رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی تو آپؐ نے اسے ترک کر دیا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء کا روزہ رکھا اور اس کا حکم دیا، تو عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسول اس دن کی یہود ونصاریٰ بہت عزت کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اگلا سال آئے گا

توہم انشاءاللہ نو تاریخ کا بھی روزہ رکھیں گے، لیکن اگلا سال آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کا روزہ رکھنا اور اس کا حکم دینا وفات سے ایک برس پہلے کا واقعہ ہے۔

عاشوراء کا روزہ فرض نہیں ہے

اور سابق حدیث میں یہ تھا کہ یہ واقعہ آپؐ کی مدینہ میں تشریف آوری کے (اوائل کا ہے) نیز حضرت ابن مسعودؓ نے بتایا۔ رمضان کے باعث یوم عاشوراء کا روزہ متروک ہوا۔ یہ ابن عباسؓ کی مذکورہ روایت کے خلاف ہے اور یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ آپؐ نے اس کی فرضیت ترک کردی کیونکہ صحیحین میں حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرض نہ تھا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ یہ عاشوراء کا دن ہے، اللہ نے تم پر اس کا روزہ فرض نہیں کیا، البتہ میں روزہ سے ہوں، جس کا جی چاہے روزہ رکھ لے اور جس کا جی چاہے افطار کرے، لیکن ظاہر ہے کہ امیر معاویہؓ نے اسے فتح مکہ کے بعد ہی سنا ہوگا، کیونکہ فتح کے بعد ہی وہ ایمان لائے تھے۔

ایک اور اشکال بھی ہے وہ یہ کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہود و نصاریٰ اس دن کا بہت احترام کرتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو نو تاریخ کا روزہ ضرور رکھوں گا، لیکن اگلا سال جب آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے۔

نیز صحیح مسلم میں حکم بن الحرج سے روایت ہے کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا وہ زمزم کے پاس اپنی چادر کا تکیہ بناکر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔

میں نے عرض کیا مجھے یوم عاشورا کے روزہ سے متعلق بتایئے۔

آپ نے فرمایا کہ اگر تم محرم کا چاند دیکھو تو نو تاریخ تک شمار کرو، اور نو تاریخ کی صبح کا روزہ رکھ لو۔

میں نے پوچھا کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح روزہ رکھا کرتے تھے؟ فرمایا، ہاں۔

(۵) ایک اور اشکال بھی ہے وہ یہ کہ اگر اسلام کی ابتداء میں یہ روزہ واجب اور فرض ہوتا، تو آپؐ اس کی قضا کا حکم کیوں نہ دیتے جو رات کو بغیر نیت کیے سو گیا ہو؟ اور اگر فرض نہیں تھا تو آپ نے ان لوگوں کو روزہ رکھ لینے کا حکم کیوں دیا جو کھانا کھا چکے تھے؟ جیسا کہ مسند اور سنن میں

کئی وجوہ سے منقول ہے کہ جس نے کھانا کھا لیا ہے۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ باقی دن کا (روزہ) بھی مکمل کرلے۔ یہ صورت تو واجب میں ہی ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا ابن مسعودؓ کا قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ جب رمضان کی فرضیت نازل ہوئی۔ تو آپؐ نے عاشورا کا روزہ ترک کر دیا۔ حالانکہ اس کا استحباب تو متروک نہیں ہو سکتا۔

ایک اور اشکال بھی ہے وہ یہ کہ حضرت ابن عباسؓ نے نو تاریخ کو یوم عاشوراء قرار دیا اور بتایا کہ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھا کرتے تھے اور انہی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ "یوم عاشوراء کا روزہ رکھو اور یہودیوں کی مخالفت کرو" (اس طرح) کہ ایک روز اس سے پہلے اور ایک روز اس کے بعد بھی روزہ رکھو (مسند احمدؒ) اور انہی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ عاشورا کا روزہ دس تاریخ کا ہے (ترمذی)

اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت سے ان اشکالات کا جواب یہ ہے۔

پہلے اشکال کا جواب

پہلا اشکال کہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہود کو یوم عاشورا کا روزہ رکھتے ہوئے پایا تو اس میں یہ ذکر نہیں کہ جس دن آپ تشریف لائے اسی دن وہ روزے سے تھے، کیوں کہ آپؐ ربیع الاول کے دوسرے عشرہ میں دوشنبہ کے روز تشریف لائے اور دوسرے روز جب یہ واقعہ پیش آیا تب آپؐ کو پہلی بار علم ہوا، اور قیام مکہ کے زمانہ میں آپ کو اس کا علم نہ تھا، اور یہ اس صورت میں ہے کہ اہل کتاب قمری تاریخوں سے روزوں کا حساب رکھتے ہوں، لیکن اگر شمسی تاریخوں سے حساب کرتے ہوں تو پھر سرے سے اشکال ہی اٹھ جاتا ہے اور جس دن موسیٰ علیہ السلام نے نجات پائی وہ محرم کی ابتداء میں یوم عاشورا کا دن ہوگا۔ اہل کتاب نے شمسی حساب سے اسے منضبط کیا، اور اتفاق ایسا ہوا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول میں مدینہ تشریف لائے تو یہی موقع تھا کیونکہ اہل کتاب کے روزے شمسی حساب سے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے روزے قمری حساب سے، اسی طرح حج کا معاملہ ہے اور ہر ماہ جس میں کوئی واجب یا مستحب ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم موسیٰ علیہ السلام کے تم سے زیادہ حقدار ہیں، اس طرح اس دن کی عظمت و تعیین میں اولیت کا حکم عیاں ہوگیا، اور (یہود) نے شمسی سالوں کے باعث اس کی تعیین میں غلطی کی، جیسے کہ نصاریٰ نے اپنے روزوں کے متعلق غلطی کی کہ انھیں سال کے ایک موسم میں مختص کردیا، جس میں مختلف مہینے آتے ہیں۔

دوسرے اشکال کا جواب

(۲) اشکال ثانی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قریش بھی عاشورا کا

روزہ رکھا کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزہ رکھا کرتے، تو یقیناً قریش بھی اس دن کا احترام کرتے تھے اور اسی دن کعبہ مشرفہ پر غلاف چڑھایا کرتے اور یہ روزہ اس کی عظمت کا اکمال تھا، لیکن قریش قمری حساب سے رکھتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے دسویں تاریخ متعین کر رکھی تھی، پھر جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو (یہود) کو دیکھا وہ بھی اس دن کی عظمت مانتے ہیں اور نفسِ عظمت کے باعث اس دن کا روزہ رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا آپؐ خود اس کام کے موسیٰؑ کے یہود سے زیادہ حقدار ہیں۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس دن کا روزہ رکھا تھا، تو ہم یہود سے زیادہ ان کی اقتداء کے مستحق ہیں، اور خصوصاً اس لیے بھی کہ ہم کہا کرتے ہیں، ہم سے پہلے کی شرائع ہماری ہیں، بشرطیکہ ہماری مخالفت نہ کریں۔

اگر کوئی اعتراض کرے تمہیں کہاں سے علم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (یہود) سے دریافت فرمایا تو انھوں نے کہا کہ یہ بہت بڑا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اس دن نجات دی، فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے روزہ رکھا اور ہم بھی (اقتداء) میں روزہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کے حقدار ہیں اور آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور (صحابہؓ) کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا، پس ثابت ہوا کہ آپؐ نے ان کی اس بات کی تصدیق فرمادی اور تکذیب نہیں فرمائی، لہٰذا معلوم ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے (اس دن کا) روزہ رکھا۔ اگر اس قدر تعظیم کو ماقبل ہجرت کے واقعات سے ملا دیا جائے تو تاکید زیادہ ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (مختلف) شہروں میں منادی بھیجا، جو عاشوراء کے روزے کی منادی کرتا تھا اور (کہتا تھا) کہ جو کھا چکا وہ اب شام تک رک جائے (یعنی روزہ مکمل کرے) اور ظاہر کلام سے یہی ثابت ہے کہ آپؐ نے اس کی تاکید کی اور واجب قرار دیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیسرے اشکال کا جواب

(۳) اشکال ثالث یہ ہے کہ رمضان کے فرض ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے اور جب رمضان فرض ہوا تو آپؐ نے ترک فرما دیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپؐ نے اسے بالکل چھوڑ دیا، بلکہ یہ ہے کہ عاشوراء کا روزہ فرضیت رمضان سے قبل فرض تھا اور اب اس کا وجوب متروک ہوگیا، لیکن استحباب متروک نہیں ہوا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے ایک سال قبل ایک موقع پر

جب عرض کیا گیا کہ یہود بھی عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں اگلے برس تک زندہ رہا تو عاشوراء کے علاوہ نو تاریخ کا روزہ بھی ضرور رکھوں گا اور فرمایا، یہود کے طریقہ کی مخالفت کرو، اور اس سے ایک دن قبل اور ایک دن بعد یعنی اس کے ساتھ ملاکر (دس تاریخ کا) روزہ رکھو۔

اور یہ یقینی امر ہے کہ یہ آخر زمانہ کی بات ہے ورنہ شروع شروع میں تو جن معاملات میں کوئی حکم خدا کی طرف سے نہ ملتا آپؐ اہل کتاب سے توافق کو پسند فرمایا کرتے۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا استحباب متروک نہیں، اور جو لوگ اس روزے کو غیر واجب سمجھتے ہیں ان کے قول سے دو باتوں میں ایک لازم آتی ہے، یا تو یہ کہا جائے کہ اس کا استحباب متروک ہے اور اب یہ مستحب نہیں رہا یا کہا جائے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، کی ذاتی رائے ہے اور ان پر اس کا استحباب مخفی رہا، اور یہ بعید از عقل بات ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ) کو اس کی ترغیب دی اور فرمایا، کہ عاشورا کا روزہ گذشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہے، اور صحابہؓ آپ کی وفات تک یہ روزہ رکھتے رہے۔ اور آپؐ سے اس روزے کے متعلق کراہت یا نہی کا ایک حرف بھی منقول نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ اس روزے کا صرف وجوب متروک ہے، استحباب متروک نہیں۔

چوتھا اشکال اور اس کا جواب

(۴) چوتھا اشکال یہ ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو ضرور نو تاریخ کا روزہ رکھوں گا (لیکن) آپ آئندہ سال فوت ہوگئے اور ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نو تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ دونوں روایتیں ابن عباسؓ ہی کی ہیں یہ بھی، اور وہ بھی، اور ان دونوں میں کوئی تناقض نہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نو تاریخ کا روزہ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر اگلے سال تک زندہ رہے تو یہ بھی روزہ رکھیں گے۔ یا حضرت ابن عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل پر اور آئندہ عزم پر اعتماد کرتے ہوئے بتادیا اور مقید طور پر آپؐ سے یہ روایت درست بھی ہے۔ یعنی اگر زندہ رہے تو ایسا ہی کریں گے۔ اس طرح ہر ایک میں دو احتمالات ہیں اس لیے دونوں روایتوں میں کوئی تناقض نہیں۔

اشکالِ خامس، اس کا جواب جو گذر چکا ہے وہ کافی ہے۔

اشکال سادس، قولِ ابن عباس ہے کہ "نو تاریخ تک شمار کرو اور نو کی صبح کو روزہ رکھو، اور جو شخص ابن عباس کے مجموعہ مرویات کا بہ انصاف نظر مطالعہ کرے گا، اس کے لیے یہ اشکال بے معنی ہو جائے گا اور وہ ان کی وسعت علم کا قائل ہوجائے گا، کیونکہ انھوں نے نو تاریخ کو

یوم عاشورار قرار نہیں دیا، بلکہ سائل کو بتایا کہ "نو تاریخ کا روزہ رکھو" اور سائل کے سابقہ علم کو کافی سمجھا کہ یوم عاشورار دس تاریخ ہے جیسا کہ تمام لوگ سمجھتے ہیں، نیز سائل کو ساتھ ساتھ نو تاریخ کا روزہ رکھنے کا حکم دیا اور بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو آپؐ نے ایسا ہی کیا ہوگا، پھر تو کوئی سوال ہی نہیں اور یا پھر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل میں عزم وارادہ کی بنا پر اسے آپؐ کا فعل قرار دیا ہوگا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے روایت کیا تھا "عاشورار سے ایک دن قبل اور ایک دن بعد روزہ رکھو، اور انھوں نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یوم عاشورا کو یعنی دس تاریخ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا"۔ یہ تمام آثار آپؐ سے منقول ہیں، جو ایک دوسرے کی تصدیق وتائید کرتے ہیں،

صوم عاشورار کے تین مراتب ہیں:

۱۔ سب سے کامل ترین صورت یہ ہے کہ اس سے قبل اور اس کے بعد بھی ایک ایک دن روزہ رکھے۔

۲۔ اس کے بعد یہ ہے کہ نو اور دس تاریخ کا روزہ رکھے اکثر احادیث اس پر شاہد ہیں۔

۳۔ اور اس کے بعد صرف تنہا دس تاریخ کا روزہ آتا ہے۔ رہا، صرف نو تاریخ کا روزہ، تو یہ احادیث فہمی کی کمی، ان کے الفاظ اور فرق کے عدم تتبع کا نتیجہ ہے۔ اور یہ لغت شرع سے بعید ہے اور اللہ ہی صائب راہ کی توفیق دینے والا ہے۔

عرفات میں یوم عرفہ کا روزہ

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ عرفات میں یوم عرفہ کو افطار کرتے، یہ صحیحین سے ثابت ہے۔

نیز آپؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے عرفات میں عرفہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے اہل سنن نے روایت کیا ہے۔

نیز آپؐ سے صحیح روایت میں ثابت ہے کہ اس دن کا روزہ سالِ ماضیہ وباقیہ کا کفارہ ہوتا ہے۔ (مسلم)

اور عرفہ کے دن افطار کرنے کے کئی اسباب نقل کیے، ایک تو یہ کہ اس طرح دعا کرنے میں قوت رہتی ہے۔ نیز فرضی روزوں کی صورت میں بھی سفر میں افطار افضل ہے۔ چہ جائیکہ نفلی روزے ہوں نیز یہ جمعہ کا دن تھا۔ اور آپؐ نے تنہا اس دن روزہ رکھنے کو ممنوع فرمایا۔ چنانچہ آپؐ نے چاہا کہ اس دن لوگوں کو اپنا افطار کرنا دکھادیں، تاکہ مخصوص طور پر اس دن کے روزہ کی نہی موکد ہوجائے اگرچہ آپ کا روزہ جمعہ کی بجائے محض یوم عرفہ کا ہوتا۔

اور ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ کا مسلک دوسرا تھا، جو یہ ہے کہ یہ دن عید کے اجتماع کی طرح اہل عرفہ

کے لیے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ دنیا کے علاوہ صرف اہل عرفہ کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے، جسے اہل سنن نے روایت کیا ہے کہ "یوم عرفہ، یوم نحر اور ایام منیٰ ہم اہل اسلام کے لیے عید کے دن ہیں اور یہ تو معلوم ہی ہے۔ اہل عرفہ کے اس اجتماع کے باعث صرف انہی کے لیے یہ عید کا دن ہوتا ہے۔

آنحضرت کن دنوں میں زیادہ روزے رکھتے تھے؟

مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہفتے اور اتوار کا روزہ کثرت سے رکھتے تھے۔ اور اس سے یہود و نصاریٰ کے طریقہ کی مخالفت مقصود ہوتی تھی جیسا کہ مسند اور سنن نسائی نے کریب مولیٰ ابن عباس رضؓ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں، کہ مجھے حضرت ابن عباس نے اور کچھ صحابہ رضؓ نے حضرت ام سلمہ رضؓ کے پاس بھیجا، تاکہ میں ان سے معلوم کروں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر کن ایام میں روزے رکھا کرتے تھے؟

انھوں نے فرمایا، ہفتے اور اتوار کے دن (روزے رکھا کرتے تھے) اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ دونوں دن مشرکین کے لیے عید کے دن ہیں، اور میں ان کی مخالفت پسند کرتا ہوں۔

لیکن یہ حدیث مشکوک ہے، کیونکہ یہ محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت میں سے ہے اور ان کے بعض احادیث کا انکار کیا گیا ہے۔ عبدالحق نے احکام میں ابن جریج کی حدیث کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے عباس بن عبداللہ بن عباس سے انھوں نے اپنے چچا فضل سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے علاقہ میں حضرت عباس رضؓ سے ملاقات کی" لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ ابن قطان کہتے ہیں کہ یہ حسب نقل ضعیف ہے۔ اور محمد بن عمر کہتے ہیں مجہول ہے، اور اس نے ہفتہ اور اتوار کے دن روزہ نہ رکھنے کے متعلق حضرت ام سلمہ رضؓ سے روایت کی ہے اور بتایا کہ عبدالحق نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے اور یہ محمد بن عمر غیر معروف ہے اور ان کا لڑکا عبداللہ بن محمد بن عمر ان سے روایت کرتا ہے اور اس کا حال بھی معروف نہیں۔

ویسے اس حدیث کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ حسن ہے۔

اور امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے عبداللہ بن بشر سلمی سے انھوں نے اپنی ہمشیرہ صماء رضؓ سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہفتے کا روزہ نہ رکھو، ہاں اگر تم پر فرض ہو اور تمہیں دکھانے کے لیے کچھ نہ ملے تو انگور کا ایک دانہ کھا لو یا درخت کی ایک شاخ ہی چاب لو۔

لوگ ان احادیث کے بارے میں مختلف الرائے ہوگئے ہیں، مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب عبداللہ بن بشر کی حدیث سے ہے (ابوداؤد) ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ نسائی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔

اور اہلِ علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس حدیث اور ام سلمہؓ کی روایت میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ روزے سے ممانعت کا مطلب انفراد ہے۔ ابوداؤدؒ نے بھی یہی شرح کی ہے، اور بتایا ہے کہ نہی محض ہفتے کے روزہ کے ساتھ مختص ہے۔ اور روزہ رکھنے کی حدیث کا مطلب اتوار سمیت روزے سے ہے، فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہے کہ آپؐ نے تنہا جمعہ کا روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی، لیکن اگر اس سے قبل یا بعد میں بھی رکھ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے وہ اشکال بھی زائل ہوجاتا ہے کہ آپؐ کا روزہ اس دن کی تعظیم کے لیے تھا، اور یوں احترام کے معاملہ میں اہلِ کتاب سے توافق ہوگیا۔ اگرچہ روزے کی صورت مخالفت کی متضمن ہے (حالانکہ یہ اس وقت ہوتا جب آپ محض مفرد طور پر (صرف دسویں تاریخ کا) روزہ رکھتے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے افراد کا حکم نہیں دیا، اور جب دوسرے دن کے ساتھ بھی (جمع کرکے) روزہ رکھا گیا تو یہ اس دن کی تعظیم نہ ہوگی۔

صوم وصال کی ممانعت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ نہیں تھی کہ آپؐ مسلسل روزے رکھتے ہوں، بلکہ آپؐ نے فرمایا، جس نے ہمیشہ روزے رکھے اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔

اور آپؐ کا مطلب یہ نہ تھا کہ جس نے ایام محرمات کا روزہ رکھا، کیونکہ یہ سوال اس کے جواب میں فرمایا، کہ جس نے صیام دہر رکھا اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ اور نہ فعلِ محرم کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ "نہ ایسے شخص نے روزہ رکھا، نہ افطار کیا" کیونکہ اس (صیام الدھر) میں افطار و صیام برابر ہیں جس پر نہ ثواب ہے اور نہ لذت ہے، اور نہ اس کے جواب میں فرمایا "جس پر اللہ تعالےٰ روزے حرام کردے تو یہ مطلقاً جواب نہیں۔ نیز جس نے صوم دہر کو پسند کیا اس نے گویا مستحب اور حرام کا ارتکاب کیا یعنی ایام استحباب میں اس نے مستحب روزے رکھے اور ایام تحریم میں اس نے فعل حرام کا ارتکاب کیا، تو ان دونوں صورتوں میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔ لہٰذا اس پر فرمان نبوی کے اطلاق کا غلط ہونا ظاہر ہے۔

نیز ایام تحریم شریعت میں مستثنیٰ نہیں لہٰذا شرعاً یہ دن روزے کے قابل ہی نہیں ہیں اس لیے صحابہؓ

ان ایام کے متعلق تو دریافت ہی نہیں کر سکتے تھے، بلکہ وہ جان چکے تھے کہ ان ایام میں روزے کی قبولیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اور اگر صحابہؓ نہ جانتے ہوتے تو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے اس ارشاد "نہ اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا" سے جواب نہیں دے رہے تھے کیونکہ اس میں تحریم کا کوئی بیان ہی نہیں ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ جس میں کوئی شک نہیں یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھنا ایک دن افطار کرنا صیام الدھر سے افضل، اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور مسلسل صیام الدھر مکروہ ہے کیونکہ اگر مکروہ نہ ہوتا، تو تین ناممکنات میں سے ایک بات ضرور ہوتی۔ یہ کہ ایک دن روزے اور ایک دن افطار کے عمل سے یہ اللہ کو زیادہ محبوب اور افضل ہوتا، کیونکہ یہ کام بھی زیادہ ہے، حالانکہ حدیث کی رو سے یہ خیال مردود ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد علیہ السلام کا طریقۂ صوم زیادہ محبوب ہے اور اس سے افضل بھی کوئی نہیں۔

یا پھر افضلیت میں اس سے مساوی ہوں گے، یہ بھی محال ہے۔

اور یا مباح مساوی الطرفین ہوں گے یعنی نہ مستحب نہ مکروہ۔ یہ بھی محال ہے کیونکہ یہ صورت (نہ مستحب نہ مکروہ ہونا) عبادات کی شان نہیں، بلکہ عبادت یا مرجوح ہوتی ہے یا راجح۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اگر کہا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جو رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو گویا اس نے صوم الدھر رکھا۔ نیز جو ہر ماہ میں تین روزے رکھے اس کے متعلق بھی آپؐ نے فرمایا کہ یہ بھی صوم الدھر کے برابر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوم الدھر دوسری صورتوں سے افضل ہے۔ اور یہی امر مطلوب ہے اور اس کا ثواب اس قدر زیادہ ہے کہ آپؐ نے اس سے تشبیہ دی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ محض اندازہ کرنے کے لیے تشبیہ سے اس کا جواز لازم نہیں آتا چہ جائیکہ اسے مستحب سمجھ لیا جائے، بلکہ تشبیہ کا مطلب تو اس قدر ہے کہ اگر (صوم الدہر) مستحب ہوتے (تو اس قدر ثواب ملتا) اور نفس حدیث سے اس کی حجت نکلتی ہے کہ آپؐ نے ہر ماہ تین روزے رکھنے کو صوم الدھر کا قائم مقام قرار دیا کیونکہ نیکی کا اجر دس گنا ہوتا ہے پس جس نے (چھتیس روزے رکھے) اُسے تین سو ساٹھ دن کا اجر ملے گا اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ (صوم الدھر) قطعاً حرام ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا آپ کا مطلب یہ تھا کہ تین سو ساٹھ دن کے روزوں کے برابر ثواب ملے گا۔

اس طرح شوال کے چھ روزے رمضان سے متصل بعد رکھے جائیں تو سال بھر کا ثواب ملے گا، پھر آپؐ نے آیت پڑھی:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها

یعنی جو نیکی کرے گا، تو اس کے لیے اس سے دس گنا اجر ہوگا۔

اس لیے یہ چھتیس روزے تین سو ساٹھ روزوں کے برابر ہوں گے اور یہ بالاتفاق غیر جائز ہے بلکہ کبھی ایسے مشبہ بہ کی مثال دی جاتی ہے جو یکسر ممتنع بلکہ متخیل ہوتا ہے اور یہ تشبیہ محض امکانی بنیاد پر ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص کے جہاد سے متعلق سوال کے جواب میں آپؐ نے فرمایا، جب مجاہد نکل کھڑا ہو، تو کیا ایسا کر سکتا ہے کہ کھڑا رہے اور سست نہ ہو؟ اور روزہ رکھے رہے اور افطار نہ کرے؟ گویا یہ بات عادتاً محال ہے، بالکل ایسے ہی جیسے شرعاً تین سو ساٹھ روزے رکھنا ممنوع اور متخیل ہے، چنانچہ آپؐ نے اس عمل کو ایسے اعمال سے تشبیہ دی کہ خوب اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ کے نزدیک سب سے محبوب قیام حضرت داؤد علیہ السلام کا قیام ہے اور یہ تمام شب کے قیام سے از روئے سنت صریحہ بھی افضل ہے۔

نیز آپؐ نے اس آدمی کی مثال دی جو عشاء اور صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام شب قیام کیا۔

اگر کہا جائے کہ تم حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث کے متعلق کیا کہو گے کہ "جس نے صوم الدہر رکھا، تو اس پر جہنم اس قدر تنگ ہو گیا" آپؐ نے اپنی مٹھی بند کرلی (مسند احمد)

جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے معنی میں اختلاف ہے، ایک قول میں کہا گیا ہے کہ جہنم اسے جکڑتے ہوئے تنگ ہو جائے گی، کیونکہ اس نے اپنے آپ پر شدت کی اور غلط بوجھ لادا، نیز اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طاہرہ سے اعراض کیا اور (مزید براں) اس کا اعتقاد تھا کہ (صوم داؤد) کے علاوہ (صوم الدھر) افضل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ اس کی طرف سے جہنم تنگ ہو جائے گی، یعنی اس کے لیے اس میں کوئی جگہ نہ ہوگی اور اس گروہ نے اس تاویل کو اس لیے ترجیح دی کہ جب روزے دار نے اپنے آپ شہوات کی تمام راہیں مسدود کر دیں، اور روزے سے انھیں ہٹایا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر آگ تنگ کر دی اس لیے (آگ) میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، کیونکہ اس نے (جہنم) کے تمام راستوں کو تنگ کر دیا۔

گھر میں کھانے کو نہ ہوتا تو آپؐ نفلی روزہ رکھ لیتے

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں

تشریف لاتے اور دریافت فرماتے، کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ اگر جواب انکار میں ملتا تو فرماتے "پھر آج میرا روزہ ہے" چنانچہ دن کے وقت نفلی روزے کی نیت کر لیتے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ نفلی روزے کی نیت کر لیتے اور بعد میں حضرت عائشہ بتاتیں، کہ فلاں چیز پکی ہے تو آپ افطار کر لیتے۔[1] پہلی روایت صحیح مسلم میں ہے، دوسری نسائی میں مذکور ہے۔

رہی وہ روایت جو سنن میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ میں اور حفصہؓ روزے سے تھیں ہمارے سامنے کھانا پیش کیا گیا، ہمارا جی چاہا اور ہم نے اس میں سے کھا لیا۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت حفصہؓ آپؐ کے پاس مجھ سے پہلے چلی گئیں اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول ہم دونوں روزے سے تھے۔ ہمارے سامنا کھانا پیش کیا گیا ہمارا جی چاہا تو ہم نے کھانا کھا لیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے بدلہ میں کسی دن قضا کر لینا۔

یہ حدیث معلول ہے، ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اسے مالک بن انس اور معمر اور عبداللہ بن عمر اور زیاد بن سعد وغیرہ حفاظِ حدیث نے زہری سے انھوں نے حضرت عائشہؓ سے مرسلاً روایت کیا ہے اور اس میں عروہ کی سند ذکر نہیں کی اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ اور ابوداؤد نسائیؒ نے شریک سے انھوں نے زمیل مولائے عروہؓ سے انھوں نے حضرت عائشہ سے موصولاً روایت کیا۔ نسائی فرماتے ہیں کہ زمیل غیر مشہور ہے۔ بخاریؒ فرماتے ہیں کہ عروہ سے زمیل کا اور زمیل سے شریک کا سماع معروف نہیں اور نہ اس سے حجت لی جا سکتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب روزے سے ہوتے اور کسی قوم کے پاس اترتے تو روزہ مکمل فرماتے، اور افطار نہ کرتے، جیسا کہ آپؐ ام سلیم کے پاس تشریف لائے انھوں نے کھجور اور گھی پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا، گھی کو اپنے مشکیزے میں ڈال دو، اور کھجوروں کو برتن میں لوٹا دو، کیونکہ میں روزے سے ہوں۔

لیکن ام سلیمؓ آپؐ کے ہاں اہل بیت کے درجہ میں تھیں اور صحیح روایت میں آپؐ سے ثابت ہے کہ "جب تمہیں کوئی کھانے کی دعوت دے اور تم روزے سے ہو تو چاہیئے کہ کہہ دو میں روزے سے ہوں۔

اور وہ حدیث جو ابن ماجہؒ، ترمذیؒ اور بیہقیؒ نے حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ "جو کسی قوم کے پاس (مہمان) اترے اسے چاہیئے کہ وہ میزبان کی اجازت کے بغیر روزہ ہرگز نہ رکھے"۔ ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے، ہم نہیں جانتے کہ کسی ثقہ راوی نے اسے ہشام

---

[1] نفلی روزہ اس طرح توڑا جا سکتا ہے، بلکہ کسی کے پاس خاطر سے بھی توڑا جا سکتا ہے، لیکن اس کی قضا ضروری ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

بن عروہ سے روایت کیا ہو۔

آپؐ صرف جمعہ کے روزے کو پسند نہیں کرتے تھے

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ فعلاً اور قولاً جمعہ کے مفرد روزہ کو مکروہ سمجھتے، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ، ابوہریرہؓ، جویریہؓ بنت حرث، عبداللہ بن مسعود اور حضرت جنادہ ازدی وغیرہ کی حدیث سے صحیح طور پر اس (جمعہ) کا افراد ممنوع ہے اور جمعہ کے دن آپؐ اس وقت پانی پیا جب آپ منبر پر تشریف فرما تھے اور (صحابہؓ) کو دکھا رہے تھے کہ آج یعنی جمعہ کے دن آپؐ روزہ نہیں رکھتے (مسند امام احمد)

اور روزے کی ممانعت کا سبب بیان کیا کہ یہ یوم عید ہے۔ امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہے اس لیے اپنے عید کو روزے کا دن نہ بناؤ، ہاں اگر اس سے قبل یا بعد میں بھی روزہ رکھو (تو پھر اجازت ہے)

اگر کوئی کہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کا کیا جواب ہے جس میں بتایا گیا " میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن افطار سے کبھی نہیں دیکھا " اسے اہل سنن نے روایت کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ہم قبول کرتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (جمعہ) سے ایک دن قبل یا بعد میں بھی (آپؐ روزہ رکھتے) اور اگر صحیح نہیں تو ہم مسترد کرتے ہیں کیونکہ یہ غرائب میں سے ہے، ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ غریب ہے۔

آں حضرتؐ کی سعی

ابنِ حزم کی رائے اور اس پر تبصرہ

ابنِ قیّم کا محاکمہ

ابن حزم فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر اونٹ پر سوار ہو کر لگائے، تین میں آپ دوڑ رہے تھے اور چار میں چل رہے تھے، یہ ان کے اوہام کا نتیجہ ہے اور بالکل غلط ہے کیونکہ ان کے علاوہ کسی سے بھی ایسا قول مروی نہیں اور نہ کسی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بات روایت کی ہے بلکہ یہ خانہ کعبہ کے طواف کا تھا اس لیے ابو محمدؒ نے غلطی سے اسے صفا اور مروہ کے درمیان کی سعی کی طرف منتقل کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں سب سے عجیب بات اس سے استدلال ہے جیسا کہ بخاریؒ میں حضرت ابن عمرؓ کی سند سے روایت کیا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے تو آپ نے طواف کیا اور پہلا کام استلام رکن کا کیا، پھر تین طواف دوڑ کر کیے، اور چار میں (آہستہ) چلے اور جب قبلہ کا طواف مکمل کر لیا تو مقام ابراہیم پر دو رکعتیں ادا کیں۔ پھر سلام پھیرا اور تشریف لے گئے اور صفا پر پہنچے۔ پھر صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگائے، اس کے بعد باقی حدیث ذکر کی ہے (ابن حزم) نے فرمایا کہ ہم صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو منصوص نہیں پاتے بلکہ یہ متفق علیہ ہے۔ یہ ان کے الفاظ ہیں۔

میں (ابن قیمؒ) کہتا ہوں کہ بطن وادی کے تمام چکروں میں سعی تو متفق علیہ ہے۔ البتہ پہلے تین پھیروں میں رمل (تیز دوڑنے) کے متعلق جہاں تک ہم جانتے ہیں ان کے سوا نہ کسی نے کہا اور نہ نقل کیا، میں نے اپنے شیخ (ابن تیمیہؒ) سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ (ابن حزمؒ) کے اغلاط میں سے ہے انھوں نے حج نہیں کیا اور یہ ایسی ہی غلطی ہے جیسے کوئی کہے کہ آپؐ نے چودہ مرتبہ سعی کی، اور آپؐ کے آنے جانے کو ایک ایک سعی سمجھتا رہا حالانکہ یہ غلط ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے کسی نے نقل نہیں کیا، نہ ائمہ سلف میں سے کسی نے فرمایا جن کے اقوال ہر جگہ مشہور ہوئے اور اگر متاخرین میں سے کسی نے یہ کہا ہو۔ جو اپنے آپ کو ائمہ سلف کی طرف منسوب کرتا ہے (تو بھی غلط ہے) نیز یہ قول بھی اس نظریہ کو باطل کرتا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ پر سعی ختم کی۔ اب اگر جانا اور آنا ہر ایک مستقل سعی ہوتی تو صفا پر ختم ہوتی، حالانکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مروہ کے پاس پہنچے تھے تو اس پر چڑھے اور قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ کی تکبیر و توحید بیان کی اور جس طرح صفا پر کیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا۔ چنانچہ جب مروہ کے پاس آپ کی سعی مکمل ہو گئی تو ہر اس آدمی کو جس کے پاس ھدی (قربانی کا جانور) نہ تھا، تاکیداً حلال ہونے کا حکم فرمایا چاہے وہ حج قران کر رہا ہو یا مفرد۔ نیز آپ ﷺ نے ہر اس آدمی کو بھی حلال ہونے (احرام اتارنے) کا حکم دیا جس نے عورت سے مقاربت کی، خوشبو لگائی اور سلا ہوا کپڑا پہنا (اور فرمایا) کہ یوم الترویہ تک اسی طرح رہو۔

اور آپ ﷺ نے خود ہدی کے باعث احرام نہ اتارا اور فرمایا کہ اگر میں گذشتہ کو آئندہ پر اٹھا رکھتا تو میں ہدی نہ چلاتا، اور اسے عمرہ ہی بنا دیتا۔ اور آپ ﷺ کے متعلق روایت ہے کہ آپ ﷺ نے احرام اتار دیا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہیں پر آپ ﷺ نے حلق کرانے والوں کے لیے تین بار اور قصر کرانے والوں کے لیے ایک بار دعائے بخشش فرمائی اور یہیں پر سراقہ بن مالک بن جعشم نے دریافت کیا جب آپ فسخ اور حلال ہونے کا حکم فرما چکے تھے کہ یہ کیا یہ اسی سال کے لیے ہے یا ابد تک کے لیے؟

آپ ﷺ نے فرمایا، کہ ابد تک کے لیے، اور ابوبکر رضؓ، عمر، علی رضؓ، طلحہ رضؓ اور زبیر رضؓ نے ھدی کی وجہ سے احرام نہ اتارا۔ نیز آپ کی ازواج مطہرات رضؓ نے احرام اتار دیا کیونکہ وہ حج قران ادا کر رہی تھیں، لیکن حضرت عائشہ رضؓ ایسا نہ کر سکیں کیونکہ ایام کے باعث ان کے لیے اس پر عمل کرنا تھا۔ حضرت فاطمہ رضؓ نے بھی ھدی نہ ہونے کے باعث احرام اتار دیا۔ حضرت علی رضؓ کے پاس ھدی تھا اسی لیے انھوں نے احرام نہ اتارا۔

اور جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اھلال (تہلیل) کرے وہ احرام باندھے رکھے۔ اگر اسی کے پاس ھدی ہے اور اگر ہدی نہیں تو احرام اتار دے اور جب تک آپ ﷺ مکہ میں اور مکہ کے باہر جہاں آپ مسلمانوں کے ہمراہ اترے تھے یوم الترویہ کے دن تک برابر یعنی چار دن اتوار، پیر، منگل اور بدھ تک آپ کا یہاں قیام رہا اور قصر کرتے رہے، اور جمعرات کو چاشت کے وقت آپ ﷺ مسلمانوں کے ہمراہ

منیٰ کی طرف تشریف لے گئے۔ چنانچہ ان میں سے جو احرام اتار چکے تھے اور مسجد میں داخل نہیں ہوئے تھے انھوں نے یہاں سے احرام باندھا، بلکہ یوں کہئے کہ انھوں نے (ایسی جگہ) احرام باندھا کہ مکہ ان کی پشت پر تھا۔ جب آپ منیٰ پہنچ گئے تو آپؐ یہاں اترے اور یہیں پر نمازِ ظہر و عصر پڑھی۔ اور یہیں رات گزاری، اور یہ جمعہ کی رات تھی۔ جب صبح ہوئی تو آپؐ یہاں سے عرفات کی طرف چل پڑے اور اس راستہ پر چلے جو آج کل لوگوں کے راستہ پر دائیں جانب ہے، اور آپؐ کے بعض صحابہؓ تلبیہ کہہ رہے تھے اور بعض تکبیرات کہہ رہے تھے، آپ سن رہے تھے اور آپؐ نے دونوں میں سے کسی پر بھی تکبیر نہیں کی۔ چنانچہ مقام نمرۃ پر آپؐ کے ارشاد کے مطابق خیمہ لگا دیا گیا۔ یہ عرفات کے مشرقی حصّہ میں ایک بستی ہے اور آج کل مٹ چکی ہے۔ آپ یہاں اترے۔ آخر کار جب سورج ڈوبنے لگا تو آپنے اپنی سانڈنی قصویٰ کو سفر کا حکم دیا۔ وہ چل پڑی یہاں تک مقام عرفہ میں وادی کے وسط میں تشریف لے آئے۔ یہاں آپؐ نے اس حالت میں کہ سانڈنی پر تشریف فرما تھے ایک عظیم خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اسلام کے قواعد کو محکم فرمایا، اور شرک و جاہلیت کے دستور مٹا دیئے۔ نیز ان محرمات کے حرام ہونے پر زور دیا جس کے حرام ہونے پر اقوام (عالم) کا اتفاق ہے۔ یعنی خون۔ اموال، لوگوں کی آبرو (کہ ان میں دست درازی نہ کی جائے) اور جاہلیت کے کاموں کو اپنے قدموں تلے روند دیا اور جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیئے۔ عورتوں سے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا، اور عورتوں کا مردوں پر اور ان کا عورتوں پر حق واضح فرمایا اور بتایا کہ معروف حد تک رزق اور لباس ان کا حق ہے اور اس کا اندازہ نہیں بتایا، اور خاوندوں کو حق دیا کہ اگر یہ ایسے لوگوں کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دیں، جنھیں خاوند نامناسب خیال کرتا ہے تو ان کو دھول لگا دیں اور اُمت کو کتاب اللہ سے سختی کے ساتھ وابستہ رہنے کا حکم دیا اور بتایا کہ جب تک وہ کتاب اللہ سے تمسک قائم رکھیں گے اس وقت تک گمراہ نہ ہوں گے۔

پھر آپنے بتایا کہ ان سے (صحابہؓ سے) آپؐ کے متعلق پوچھا جائے گا اور معلوم کیا کہ وہ کیا جواب دیں گے اور کیا گواہی دیں گے؟ (صحابہؓ) نے عرض کیا، پھر ہم گواہی دیں گے کہ بے شک آپنے تبلیغ کی آپنے نصیحت فرمائی (احکام اسلام ہم تک پہنچا دیئے، اس پر آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا (اے اللہ گواہ رہنا تین بار فرمایا)

اور آپؐ نے حکم دیا کہ جو موجود ہیں وہ غیر موجود تک آج کی بات پہنچا دیں۔

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ام فضل بنت حرث ھلالی نے جو عبداللہ بن عباسؓ کی والدہ ہیں آپؐ کی

خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا۔ آپؐ نے لوگوں کے سامنے اسے نوش کیا۔ آپؐ اونٹ پر سوار تھے جب آپؐ نے خطبہ ختم کیا تو حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم فرمایا چنانچہ نماز کی اقامت ہوئی۔

لیکن (یہ موخر حصہ، ابن حزمؒ) کے وہم کا نتیجہ ہے کیونکہ دودھ پینے کا واقعہ اس کے بعد کا ہے جب آپؐ عرفات کی طرف چلے اور وہاں وقوف کیا۔ صحیحین میں صراحتاً حضرت میمونہؓ کی روایت سے منقول ہے کہ لوگوں نے یوم عرفہ کے موقعہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روزے کے متعلق (تکلیف کی) شکایت کی چنانچہ (ام فضلؓ) نے (دودھ) کا ایک پیالہ بھیجا، آپ موقف میں کھڑے تھے لوگ دیکھ رہے تھے اور آپؐ نے (دودھ) پیا۔ ایک لفظ یہ ہے کہ آپ عرفات کے (میدان) میں کھڑے تھے اور مقام خطبہ موقوف نہ تھا، کیونکہ آپؐ نے عرفہ کے مقام پر خطبہ دیا، جو جائے وقوف نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمرۃ کے مقام پر اترے اور عرفہ کے مقام پر خطبہ دیا۔ پھر عرفات میں وقوف فرمایا اور آپؐ نے ایک ہی خطبہ دیا۔ ایسا نہ تھا کہ آپؐ نے دو خطبے دیئے ہوں اور ان کے درمیان بیٹھے ہوں۔ خطبہ مکمل کرنے کے بعد آپؐ نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اور نماز قائم کی چنانچہ آپ نے نماز ظہر کی دو رکعتیں ادا کیں اور ان میں تلاوت آہستہ (سرّی) سے کی چونکہ یہ جمعہ کا دن تھا اس لیے فرمایا کہ مسافر پر جمعہ لازم نہیں ہے۔ پھر آپؐ کھڑے ہوئے اور نمازِ عصر بھی دو رکعتیں ادا فرمائیں۔ آپکے ہمراہ اہل مکہ بھی تھے انھوں نے بھی قصر اور جمع کر کے نماز ادا کی۔ اور انھیں مکمل نماز ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ترکِ جمع کا حکم دیا اور جس نے یہ کہا کہ آپؐ نے فرمایا اپنی نمازیں مکمل کرو کیونکہ ہم مسافر ہوں، اس نے واضح طور پر غلط کہا اور بدترین وہم کا مظاہرہ کیا۔ یہ بات تو آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمائی تھی جب (اہل مکہ) اپنے گھروں میں مقیم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام کے صحیح فتوی کے مطابق اہل مکہ عرفات میں قصر اور جمع کریں گے، جیسا کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا۔

سفر کے قصر میں مسافت یا ایام کی تعداد

اب اس بات کی بھی وضاحت ہوگئی کہ سفرِ قصر میں مسافت کی یا ایام کی تعداد متعین نہیں اور نہ نمازِ قصر میں نسک موثر ہے، بلکہ تاثیر وہی ہے جسے اللہ نے سبب بنایا اور وہ سفر ہے۔ سنت کا مقتضی یہی ہے اور جس طرف ملحدین گئے ہیں اس کا یہاں کوئی مقام نہیں۔

اور جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے تو سوار ہوئے اور موقف میں تشریف لائے چنانچہ آپؐ نے پتھروں کے پاس پہاڑ کے دامن میں وقوف فرمایا، قبلہ رخ ہوگئے آپؐ اسی وقت اونٹ پر تھے اور جبل مشاۃ آپؐ کے سامنے تھا، پھر غروبِ آفتاب تک دعا۔ تضرع اور عاجزی کرنے میں مشغول ہوگئے اور لوگوں کو

بطن عرفہ سے اٹھ جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ عرفہ کا یہی مقام وقوف کے لیے مختص نہیں اور فرمایا کہ میں نے یہاں وقوف کیا (لیکن) عرفہ پورا کا پورا جائے وقوف ہے اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے مشاعر میں ٹھہرے رہیں اور وہیں وقوف کریں کیونکہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی وراثت ہے۔

نیز یہاں اہل نجد سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے حج کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یوم عرفہ حج کا دن ہے اس لیے جس نے صبح کی نماز سے قبل یہاں وقوف کرلیا تو اس نے حج کو پالیا۔ ایام تشریق تین دن ہیں لیکن جو دو دن کا تقدم یا تاخر پڑے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اور دعا کرتے وقت آپؐ نے سینہ تک دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے دست طلب بڑھاتے وقت فرمایا: کہ یوم عرفہ کی دعا تمام دعاؤں سے بہتر ہوتی ہے۔

اور جائے وقوف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ مبارکہ میں سے یہ دعا منقول ہے :-

اللھم لك الحمد کالذی نقول وخیراً مما نقول۔ اللھم لك صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی والیك مآبی ولك ربی تراثی اللھم انی اعوذ بك من عذاب القبر ووسوسة الصدر وشتات الامر اللھم انی اعوذ بك من شر ما تجیٔ به الریح (ترمذی)

"یعنی اے اللہ تو ہی سزاوار حمد ہے، جو ہم کہہ سکتے ہیں اور ہمارے نطق و کلام سے بہتر، اے اللہ میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا تیرے ہی لیے ہے، اور تیری طرف ہی مجھے لوٹنا ہے اور اے میرے پروردگار تو ہی میرا وارث ہے، اے اللہ میں عذاب قبر، دل کے وسوسوں اور پراگندگی امور سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اے اللہ میں اس شر سے جو آندھی لے کر آئے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

نیز آپ کی دعاؤں میں یہ بھی منقول ہے :

اللھم انك تسمع کلامی وتری مکانی وتعلم سری وعلانیتی ولا یخفی علیك شیٔ من امری انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر والوجل المشفق المقر المعترف بذنوبی اسالك مسألة المسکین وابتھل الیك ابتھال المذنب الذلیل وادعوك دعاء الخائف الضریر من خضعت لك رقبته، وفاضت لك عیناہ وذل جسدہ ورغم انفه لك اللھم لا تجعلنی بدعائك رب شقیا وکن بی رؤفا رحیما یاخیر المسئولین ویاخیر المعطین (طبرانی)

"یعنی اے اللہ تو میرا کلام سنتا ہے اور میری جگہ دیکھ رہا ہے، اور میرے پوشیدہ وظاہر کو جانتا ہے اور تجھ سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں، میں تنگ دست محتاج فریادی پناہ کا جویا خوفزدہ ہراساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کرنے والا ہوں۔ میں تجھ سے مسکین کی طرح مانگتا ہوں، اور ایک بے مایہ گناہ کار کی طرح تجھ سے عاجزی کرتا ہوں، اور میں سراپا الم خوفزدہ کی پکار کی طرح تجھے پکارتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے خم ہے اور جس کی آنکھیں تیرے لیے آب گوں ہیں، اس کا جسم نکما ہوگیا اور تیرے لیے اس کی ناک خاک آلود ہوئی، اے اللہ اے پروردگار مجھے دعا کے (قبول نہ کرنے کے باعث) بدبخت نہ بنانا اور میرے لیے مہربان رحم کرنے والا بن جانا اے بہترین وہ ذات جس سے مانگا جائے، اور بہترین عطا کرنے والے۔"

اور امام احمدؒ نے حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث سے نقل کیا جو انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے دادا سے روایت کی کہ عرفہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر دعا یہ ہوتی تھی:—

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہ الحمد بیدہ الخیر وھو علیٰ کل شیٔ قدیر۔

"یعنی خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود و کارساز نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی حمد ہے۔ اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوم عرفہ میری اور زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کی دعا یہ ہے:

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیٔ قدیر اللھم اجعل فی قلبی نوراً وفی صدری نوراً وفی سمعی نوراً وفی بصری نوراً اللھم اشرح لی صدری ویسر لی امری واعوذ بک من وسواس الصدر وشتات الامر وفتنۃ القبر اللھم انی اعوذ بک من شر ما یلج فی اللیل وشر ما یلج فی النھار وشر ما تھب بہ الریاح وشر بوائق الدھر

"یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود و کارساز نہیں وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہی ہے اسی کی حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ میرے دل میں نور ڈال دے۔ میرے سینہ میں نور، میرے کانوں میں نور، میری آنکھوں میں نور بھر دے اے اللہ میرا سینہ کھول دے اور میرا

کام آسان فرمادے اور قلب کے وسوسوں اور پریشان امری، اور قبر کی آزمائش سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اے اللہ میں ہر اس چیز کے شر سے جو رات کے وقت داخل ہوتی ہے اور جو دن کے وقت داخل ہوتی ہے، تیری پناہ چاہتا ہوں اور جو ہواؤں کے ساتھ چلتی ہے اور زمانہ کے مہلکات کے شر سے (تیری پناہ چاہتا ہوں)۔"

ان ادعیہ کی اسناد کمزور ہیں۔

اور اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً

"یعنی آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (اسلام) پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا۔"

اور یہیں پر ایک مسلمان اپنی سواری سے گر پڑا، اور وہ حالتِ احرام میں تھا گرنے سے وہ فوت ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے اس کے دونوں کپڑوں (احرام کی چادروں) کا ہی کفن دیا جائے اور اسے خوشبو نہ لگائی جائے اور اس کو پانی اور بیری کے پتوں کا غسل دیا جائے (نیز) اس کا سر اور چہرہ نہ چھپایا جائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اسی طرح اٹھائے گا کہ یہ تلبیہ (لبیک) کہہ رہا ہوگا۔

اس واقعہ سے بارہ احکام مستنبط ہوتے ہیں

(۱) ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے باعث میت کا غسل واجب ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ مرنے سے (انسان) ناپاک نہیں ہوتا، اگر مرنے سے ناپاک ہو جاتا تو غسل سے اس کی نجاست میں اضافہ ہی ہوتا، کیونکہ حیوان کی موت کی نجاست عینی ہوتی ہے۔ اب اگر نجس بتانے والوں نے کوشش کی کہ اسے غسل سے پاک کیا جائے تو یہ کلیہ باطل ہو جائے گا کہ "موت سے انسان نجس ہو جاتا ہے" اور اگر کہیں کہ یہ پاک نہ ہوگا تو پھر غسل، اس کے کفن کو، کپڑوں کو اور غسل دینے والے کو مزید نجس کر دے گا۔

(۳) تیسرا حکم میت کے متعلق مشروع یہ ہے کہ اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا صرف پانی سے نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مواقع پر میت کے لیے بیری کے پتوں سے غسل کا حکم دیا، ایک تو یہی موقع ہے، دوسرے اپنی صاحبزادی کے لیے ایسا ہی حکم صادر فرمایا، تیسرے اس عورت کے لیے جو ایام سے ہو۔ بیری کے پتوں سے غسل کے وجوب میں امام احمد کے دو قول ہیں۔

(۴)، چوتھا حکم یہ ہے کہ پاک کرنے سے پانی کی قوتِ طہوریت زائل نہیں ہوتی، جیساکہ جمہور کا مذہب ہے، احمدؒ کی دونوں مرویات میں سے یہ زیادہ منصوص ہے، اگرچہ (احمدؒ) کے متاخرین اصحاب نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

(۵) پانچواں حکم محرم کے لیے غسل کا جواز، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مسور بن مخرمہؓ کے درمیان اس مسئلہ میں مباحثہ بھی ہوا۔ اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ احرام میں غسل دیا اور اس امر پر اتفاق ہے کہ آپؐ جنابت کے باعث غسل کا حکم دیا کرتے تھے۔ امام مالکؒ نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اس کا سر پانی میں غائب ہو، کیونکہ یہ بھی ستر کی ایک نوع ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عباسؓ نے ایسا کیا ہے۔

(۶) چھٹا حکم یہ کہ محرم کو پانی اور بیری کے استعمال کی ممانعت نہیں، اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے بھی اپنی دو روایتوں میں سے اظہر روایت میں اسے مباح بتایا اور مالکؒ و ابوحنیفہؒ نے اسے ممنوع بتایا (نیز احمدؒ نے اپنے لڑکے صالحؒ کی ایک روایت کے مطابق اس سے منع فرمایا)، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول نے غسل کے ذریعہ میل کچیل دور کرنے اور جوئیں قتل کرنے سے نہیں روکا اور بیری خوشبویات میں سے بھی نہیں۔

(۷)، ساتواں حکم یہ ہے کہ میراث اور قرض دونوں سے کفن مقدم ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ اسے دونوں کپڑوں کا کفن دیا جائے لیکن میراث اور قرض کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا۔ اگر بات دوسری ہوتی تو آپ ضرور معلوم فرماتے جس طرح زندگی میں قرض پر لباس مقدم ہے اسی طرح مرنے کے بعد (کفن مقدم ہے) یہ جمہور کا کلام ہے۔

(۸) آٹھواں حکم، کفن میں دو کپڑوں پر جوازِ اقتصار، اور یہ دو کپڑے تہہ بند اور چادر ہونی چاہئے جمہور کا یہی قول ہے اور قاضی ابو یعلیؒ فرماتے ہیں کہ استطاعت ہوتے ہوئے تین کپڑوں سے کم کرنا جائز نہیں۔ اگر دو کپڑوں میں ہوتا تو جس میت کے یتیم پیچھے رہ جاتے ہیں ان کو تین کپڑوں کا کفن ناجائز ہوتا۔ لیکن صحیح حدیث اس کے خلاف ہے۔

(۹)، نواں حکم، محرم کو خوشبو استعمال کرنا ممنوع ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (میت کو) خوشبو سے قریب کرنے کو منع فرمایا اور شہادت دی کہ اسے تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔ اور محرم کو خوشبو کی ممانعت کے سلسلہ میں یہی اصل مدار ہے رہا محض خوشبو کا سونگھ لینا تو جس نے اسے حرام قرار دیا، ان نے صرف قیاس حرام قرار دیا ہے ورنہ نہی کے الفاظ صراحت کے ساتھ اسی پر حاوی

نہیں، اور اس باب میں اجماع ثابت ہے جس کا اتباع لازم ہے، ہاں اس کی حرمت وسائل کی حرمت کے طریقہ پر گفتگو ہوسکتی ہے۔ کیونکہ خوشبو کا سونگھنا، بدن اور کپڑوں پر اسے لگا لینے کا داعی بن جاتا ہے، جیسے اجنبی عورت کی طرف دیکھنا حرام ہے کیونکہ یہ دوسرے محرمات کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن جو خوشبو بغیر کسی قصد و ارادہ کے ناک تک چلی آئے یا اس لیے قصداً سونگھی، تاکہ خریدتے وقت اس کی عمدگی کا اندازہ ہو سکے تو اس صورت میں ممنوع نہیں اور محرم پر ناک بند کرڈالنا واجب نہ ہوگا۔ پہلی صورت تو اچانک نظر پڑجانے کے قائم مقام ہے۔ اور دوسری صورت بمنزلہ منگنی کرنے والے کے ہے (کہ اگر منگنی کرتے وقت ایک نظر عورت پر ڈال لے تو گناہ نہیں) اور جن لوگوں نے خوشبو سونگھنے کو مباح قرار دیا ہے انھوں نے محرم کو اجازت دی ہے کہ احرام سے قبل خوشبو کو دوامی حیثیت سے لگالے۔

اصحاب ابوحنیفہؒ نے اسی بات کی صراحت کی ہے چنانچہ انھوں نے جوامع الفقہ لابی یوسفؒ میں فرمایا ہے کہ "اس میں کوئی ہرج نہیں کہ محرم اس خوشبو کو سونگھ لے جو اس نے احرام سے قبل لگا رکھی ہے۔ مصنف المفید نے فرمایا ہے کہ خوشبو لگنے کے بعد اس کی ذیل میں آجاتی ہے تاکہ احرام باندھ لینے کے بعد اس سے تھکاوٹ کی تکالیف دور کردے تو گویا یہ (محرم کے حق) میں ویسی ہے جیسے روزے دار کے لیے سحری (کا کھانا) ہوتا ہے جس سے وہ روزے کی حالت میں بھوک اور پیاس کی تکلیف پر قابو پاسکتا ہے۔ بخلاف کپڑے (کی خوشبو) کے وہ اس سے جدا ہے، فقہا میں اس کے متعلق اختلاف ہے کہ کیا اس کے (اثرات) کو دوام بخشنا ممنوع ہے جیساکہ یہ ابتدا ہی میں ممنوع ہے یا اس کے (اثرات) کو قائم رکھنا جائز ہے۔

اس سلسلے میں دو قول ہیں، چنانچہ جمہور علماء اتباع سنت کے باعث اسے قائم رکھنے کو جائز سمجھتے ہیں جیساکہ صحیح حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ثابت ہے کہ آپؐ احرام باندھنے سے قبل خوشبو لگایا کرتے تھے۔ پھر آپؐ کے سر مبارک اور ڈاڑھی پر بھی خوشبو کے اثرات دیکھے جاتے اور ایک لفظ میں ہے "آپؐ تلبیہ کہہ رہے ہوتے" اور یہ تمام الفاظ اس غلط تاویل کو باطل کردیتے ہیں کہ "یہ (خوشبو لگانا) احرام سے قبل تھا لیکن جب آپؐ نے غسل فرمایا تو اس کا اثر چلا گیا" روایت کا ایک لفظ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھنے کا ارادہ فرماتے تو سب سے بہترین خوشبو لگاتے جو مہیا ہوسکتی، بعض کے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، لیکن اختصاص کی کوئی دلیل بھی تو ہونی چاہیے، علاوہ ازیں ابوداؤد میں حضرت عائشہ کی روایت ہے

کہ ہم احرام کی حالت میں مشک ملتے

(۱۰) دسواں حکم، محرم کو اپنا سر چھپانے کی ممانعت ہے اور اس میں تین درجات ہیں۔ بعض بالاتفاق ممنوع ہیں اور بعض بالاتفاق جائز ہیں اور بعض مختلف فیہ۔

پہلی صورت یہ ہے کہ سر لمس کرنے والی اور بدن سے متصل چیز مثلاً پگڑی، قبع، طاقیہ وغیرہ اور دوسرے مثلاً خیمہ، مکان اور درخت وغیرہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ثابت ہے کہ نمرہ میں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا حالانکہ آپؐ محرم تھے۔

البتہ امام مالکؒ نے محرم کو اس بات کی ممانعت کی ہے کہ وہ درخت پر کپڑا لٹکا کر اس کا سایہ حاصل کرے۔ لیکن اکثر ائمہؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور (امام مالکؒ) کے اصحاب نے محرم کو اس بات سے منع کیا کہ وہ محمل کے سایہ میں چلے اور تیسرے محمل (اونٹ) کی ٹانگ یا ہودج، تو اس بارے میں جواز کے تین اقوال ہیں، شافعیؒ اور ابوحنیفہؒ اس طرف (جواز کی طرف ہیں)۔ دوسرا قول ممانعت کا ہے اور اگر (سایہ) حاصل کیا تو فدیہ دے، یہ امام مالکؒ کا مذہب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر (سایہ) حاصل کیا تو اس پر فدیہ نہیں۔ یہ تینوں روایات امام احمدؒ سے منقول ہیں۔

(۱۱) گیارھواں حکم: محرم کو چہرہ چھپانا ممنوع ہے، اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ شافعی رحمۃ اللہ اسے مباح کہتے ہیں۔ امام احمدؒ بھی ایک روایت میں اسے مباح سمجھتے ہیں اور مالکؒ و ابوحنیفہؒ اسے ممنوع فرماتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ بھی اسے ممنوع بتاتے ہیں اور جن چھ صحابہؓ نے اسے مباح بتایا ہے، ان کے نام حسب ذیل ہیں، حضرت عثمانؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ زیدؓ بن ثابت۔ زبیرؓ۔ محمد بن ابی وقاص اور جابرؓ۔

(۱۲) بارھواں حکم، موت کے بعد بھی احرام کو باقی رہنے دینا کیونکہ موت سے احرام منقطع نہیں ہوتا۔ یہ حضرت عثمانؓ۔ علیؓ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے اور امام احمد۔ شافعیؒ۔ اسحٰق نے اسی کی تائید کی ہے۔ البتہ ابوحنیفہؒ۔ مالکؒ اور اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ موت سے احرام منقطع ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو حلال (غیر محرم) کے ساتھ کیا جاتا ہے کیونکہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی فوت ہو جائے تو تین باتوں کے سوا اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور ان ائمہؒ نے فرمایا ہے کہ اس واقعہ کی حدیث (عمل کے منقطع نہ ہونے کی) میں کوئی دلیل نہیں، کیونکہ یہ آپؐ کے ساتھ خاص تھا، جیسے یہ ائمہ کرام نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ کے

متعلق فرماتے ہیں کہ یہ بھی آپؐ کے ساتھ مختص تھی۔

جمہور علمائے کرام فرماتے ہیں کہ دعوائے تخصیص خلافِ اصل ہے، اس لیے یہ قبول نہ ہوگا۔ اور حدیث میں آپؐ کا یہ فرمان کہ "یہ تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا" درحقیقت علت ہی کی طرف اشارہ ہے یہ حکم اگر آپؐ کے ساتھ خاص ہوتا تو آپ اس علت کی طرف اشارہ نہ فرماتے۔

اور اگر کہا جائے کہ ناقص علت سے تعلیل درست نہیں (تو اس کا جواب یہ ہے) کہ شہدائے احد میں بھی ایسی نظیر ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ انھیں انہی کے لباس میں زخموں کے ساتھ تکفین کردو، کیونکہ انھیں قیامت کے دن خون کے رنگ اور مشک کی خوشبو کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

لہٰذا یہ آپؐ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

یہی مثال یہاں ہے کہ اسے اس کے دونوں کپڑوں میں دفن کردو، کیونکہ قیامت کے روز یہ تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا۔ اور تم نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ شہدائے احد کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ اس حکم کو تمام شہداء کی طرف متعدی کردیا ہے۔ حالانکہ یہاں بھی تخصیص کی وجہ مذکورہ امکان تھا۔

عود الی المقصود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج

عرفات کی طرف کوچ جب آفتاب غروب ہوگیا اور زردی بھی ختم ہوگئی اور غروب آفتاب میں کوئی شبہ نہیں رہا تو آپؐ عرفات سے چل پڑے اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ ناقہ کی لگام اپنی طرف کھینچ لی۔ یہاں تک کہ اس کا سر کجاوے کے قریب آگیا۔ آپؐ فرماتے جاتے تھے:

"اے لوگو! اطمینان سے (چلو) کیونکہ ایضاع یعنی سرعت نیکی نہیں"۔

اور آپؐ مازمین کے راہ سے چلے اور ضب کے راستہ سے عرفہ میں داخل ہوئے۔

عید کے مواقع پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عادت طیبہ تھی کہ آپ راستہ بدل دیا کرتے، اور اس کی حکمت کا ذکر "عید میں آپ کی سنتِ طیبہؐ" کے اندر گزر چکا ہے۔ پھر آپؐ نے وہ چال اختیار کی جسے "سیر عنق" کہتے ہیں، یعنی نہ بہت آہستہ نہ بہت تیز، جب آپؐ کو وسیع میدان نظر آتا تو ذرا تیز ہو جاتے اور جب کسی ٹیلے پر پہنچتے تو اونٹنی کی باگ قدرے ڈھیلی چھوڑ دیتے، یہاں تک کہ وہ چڑھ جاتی۔ آپ سارا راستہ مسلسل تلبیہ کہتے رہتے۔

راستے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اترے اور پیشاب سے فارغ ہو کر ہلکا سا وضو فرمایا۔ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا "الصلاۃ یا رسول اللہ"۔

آپؐ نے فرمایا، نماز آگے ہے۔ پھر آپؐ چل پڑے، یہاں تک کہ مزدلفہ تشریف لائے اور نماز کا وضو فرمایا۔ پھر موذن کو اذان کہنے کا حکم دیا۔ پھر اقامت کہہ کر کجاوے اتارنے اور اونٹوں کو بٹھانے سے قبل نماز پڑھی۔ چنانچہ جب لوگوں نے کجاوے اتار لیے تو نماز شروع ہوئی۔ پھر آپؐ نے اذان کے بغیر صرف اقامت سے ہی عشا کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ نہیں پڑھا۔

یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے دونوں نمازیں دو اذانوں اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھیں۔

ایک روایت میں اذان کے بغیر دو اقامتیں مذکور ہیں۔

اور صحیح یہ ہے کہ آپؐ نے دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا فرمائیں، جیسا کہ آپؐ نے عرفہ میں کیا تھا، پھر آپؐ سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی، اور اس رات کو آپؐ بیدار نہیں ہوئے اور نہ صحیح روایت میں عیدین کی راتوں میں آپؐ کی بیداری سے متعلق کچھ منقول ہے۔

اپنے اہل کے ضعف کے پیش نظر انھیں اجازت دی کہ وہ طلوعِ فجر سے قبل منیٰ کی طرف بڑھ جائیں، اور یہ چاند کے غروب ہونے کے وقت کا واقعہ ہے اور انھیں حکم دیا کہ جب تک آفتاب طلوع نہ ہو جائے تب تک رمی جمار (کنکر مارنا) نہ کریں (ترمذی صحیح حدیث)۔

خلال کہتے ہیں کہ مجھے علی بن حرب سے انھیں ہارون بن عمران سے انھیں سلیمان بن ابی داؤد سے انھیں ہشام بن عروہ سے انھیں اپنے والد سے روایت ملی کہ ام سلمہ رضؓ نے فرمایا، مزدلفہ کی رات جن لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل میں سے آگے بھیجا، آپؐ نے ان میں مجھے مقدم رکھا، وہ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رات کو رمی کی، پھر مکہ واپس چلی گئی۔ اور میں نے وہاں صبح کی نماز پڑھی، پھر منیٰ کی طرف لوٹی۔

ایک راوی حدیث پر جرح

میں کہتا ہوں، سلیمان بن ابی داؤد یہ وہی دمشقی خولانی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ ابن داؤد ہے۔ ابوزرعہ نے احمدؒ سے روایت کی کہ یہ اہل جزیرہ میں سے ایک آدمی تھا اور کچھ نہ تھا (نکما)، اور عثمان بن سعید اسے ضعیف بتاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں صحیحین کی روایت جو قاسم بن محمد سے مروی ہے بھی اس کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے، انھوں نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا، فرماتی ہیں کہ حضرت سودہؓ نے مزدلفہ کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپؐ انھیں اپنے سے اور لوگوں کے ہجوم سے قبل بھیج دیں اور یہ کمزور عورت تھیں، فرماتی ہیں کہ آپؐ نے انھیں اجازت دی تو وہ پہلے ہی چلی گئیں اور ہم رک گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی پھر ہم ان کے ساتھ ہی گئے، لیکن میرا جی چاہا تھا کہ سودہ کی طرح میں بھی اجازت مانگ لوں یہ میرے لیے زیادہ سہولت کا باعث ہوتا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سودہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات رضؓ آپؐ کے ہمراہ تشریف لے گئیں۔ اب اگر کہا جائے کہ دارقطنیؒ وغیرہ نے حضرت عائشہ رضؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس کا کیا جواب ہے جس میں وہ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو اجتماع کی رات اکٹھی نکلنے اور کنکر مارنے کا حکم دیا، جس سے فارغ ہو کر وہ پھر صبح کو اپنے گھر واپس آجاتی تھیں اور (حضرت عائشہ رضؓ)

وفات تک اسی پر عمل پیرا رہیں ؟

جواب یہ ہوگا کہ محمد بن حمید راوی کو ایک سے زیادہ ائمہ کذاب قرار دے کر رد کرتے ہیں ۔ نیز اسے صحیحین کی روایت بھی رد کرتی ہے نیز خود ان کا قول بھی رد کرتا ہے کہ میں نے چاہا جس طرح حضرت سودہ رضؓ نے اجازت چاہی اسی طرح میں بھی اجازت حاصل کر لیتی اگر کہا جائے کہ چلو اس کا تو جواب ہو گیا لیکن صحیح مسلم کی حضرت ام حبیبہ رضؓ سے روایت کا کیا جواب دو گے ؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک ایک گروہ کے ساتھ بھیجا الخ ، نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات اپنے ضعیف اہل کو آگے بھیج دیا اور ابن عباس رضؓ بھی ان میں سے تھے ۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے حضرت سودہ رضؓ کو بھی آگے بھیجا اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے اپنی باقی ازواج مطہرات کو روک لیا ، اور ان کو ہمراہ لے گئے اور ام حبیبہ رضؓ کی صحیح مسلم کی روایت اگر محفوظ (صحیح) ہے تو وہ بھی جانے والے ضعفاء میں ہوں گی ۔ اگر کہا جائے امام احمدؒ کی روایت جو انھوں نے حضرت ابن عباس رضؓ سے کی اس کا کیا جواب دیا جائے گا ؟ "کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نحر کے دن اپنے اہل کے ساتھ منیٰ کی طرف بھیجا ، چنانچہ انھوں نے فجر سے متصل ہی کنکر مارے ؟" اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ان کی دوسری روایت کو مقدم سمجھیں گے ۔ جیسے امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور صحیح بتایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمزور اہل کو آگے بھیج دیا اور فرمایا تب تک رمی نہ کرنا ، جب تک کہ آفتاب طلوع نہ ہو جائے اس لیے کہ انھیں رمی مقدم کرنے میں کوئی عذر نہیں ۔ باقی عورتوں کو آپ نے بھیجا تو انھوں نے لوگوں کی مزاحمت و اجتماع عظیم کے خوف سے قبل از طلوع آفتاب رمی کر لی ۔

چند مسائل فقہیہ کا استنباط حدیث بالا سے اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عذر یعنی مرض یا بڑھاپے وغیرہ کے باعث طلوعِ آفتاب سے قبل بھی رمی کرنا جائز ہے جب کہ لوگوں کے ہجوم کا خطرہ ہو ۔ ہاں تندرست کے لیے ناجائز ہے ۔ اور اس مسئلہ میں تین مذاہب ہیں ۔ ایک مطلقاً نصف رات کے بعد جائز ہونا ، خواہ وہ عاجز ہو یا توانا ، یہ شافعیؒ اور احمدؒ کا قول ہے ۔ دوسرے صرف طلوعِ آفتاب کے بعد جائز ہے ۔ یہ ابو حنیفہ کا قول ہے تیسرے یہ کہ ذی قدرت کے لیے صرف طلوعِ آفتاب کے بعد جائز ہے جیسا اہل علم کے ایک گروہ کا خیال ہے اور جس پر حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نصف شب کے بعد نہیں بلکہ چاند کے غائب ہونے کے بعد جلدی کرنا ہے اور جنھوں نے نصف شب کی قید لگائی ہے ۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے ۔

عید اور حج اکبر کا دن

جب فجر طلوع ہوگئی تو آپؐ نے وقت سے پہلے قطعاً نہیں بلکہ ابتدائے وقت میں نحر کے دن اذان اور اقامت کہہ کر نماز پڑھی۔ یہی عید اور حج اکبر کا دن ہوتا ہے، نیز یہی دن ہر مشرک سے اللہ و رسول کے اعلانِ بیزاری کا دن ہے۔

پھر آپ سوار ہوئے یہاں تک کہ مشعر حرام کے پاس اپنے موقف میں آئے۔ چنانچہ (یہاں پہنچ کر) آپؐ قبلہ رخ ہوئے اور دعا و تضرع، تکبیر و تہلیل اور ذکر (الٰہی) میں مشغول ہوگئے، حتیٰ کہ کافی روشنی ہوگئی اور یہ واقعہ طلوع آفتاب کے وقت کا ہے۔ اور اسی مقام پر عروہ بن مضرس طائی نے دریافت کیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول میں جبل طے سے حاضر ہوا ہوں، اور میں نے اپنی سواری کو چلایا، اور اپنے آپ کو بھی تھکا دیا۔ اللہ کی قسم میں نے ہر پہاڑ پر وقوف کیا تو کیا میرا بھی حج ہوگیا؟ اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو ہماری اس نماز میں حاضر ہوا اور جس نے ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم چل پڑیں (اور آپؐ اس سے قبل عرفات میں ایک دن یا رات وقوف کر چکے تھے) تو اس کا حج مکمل ہوگیا، ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح بتایا ہے۔

چنانچہ اس حدیث سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ عرفہ کی طرح مزدلفہ میں وقوف اور شب گذارنا بھی رکن ہے۔ یہ دو صحابہؓ ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کا مذہب ہے اور ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، علقمہؒ، حسن بصریؒ، اوزاعیؒ۔ حماد بن ابی سلیمانؒ، داؤد ظاہریؒ اور ابو عبید القاسمؒ بن سلام کا یہی مذہب ہے۔ محمدؒ بن جریر اور ابن خزیمہؒ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور شوافع کے تین وجوہ میں سے ایک یہ ہے:-

دین میں غلو کرنے سے بچو

آپؐ نے جائے وقوف میں وقف کیا اور لوگوں کو آگاہ کیا کہ سارا مزدلفہ موقف ہے۔ پھر آپ مزدلفہ سے فضل بن عباس کو پیچھے بٹھا کر چلے اور راستہ بھر تلبیہ کہتے رہے، اور حضرت اسامہ بن زیدؓ قریش کی جماعت کے ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ اس راستہ میں آپؐ نے ابن عباسؓ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کے لیے سات عدد جمار کے کنکر چنیں اور انھیں اسی رات کو پہاڑ سے اکھاڑ کر الگ نہیں کیا جیسے وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں کچھ بھی علم نہیں اور نہ کنکریاں رات کو چن لی تھیں بلکہ (ابن عباسؓ) نے پتھر کے ڈھیر سے سات کنکر چن لیے چنانچہ آپؐ انھیں اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے ـــ اور فرمانے لگے، اس طرح رمی کرو اور دین میں غلو کرنے سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے جنھوں نے دین میں غلو کیا وہ ہلاک ہوئے۔

اسی راہ میں بنی خثعم کی ایک خوبصورت عورت حاضر ہوئی اور اس نے اپنے باپ کی طرف سے حج کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ وہ بوڑھا تھا اور سواری پر ٹھہر نہ سکتا تھا۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ وہ

اُس کی طرف سے حج کرلے۔ اور فضل (بن عباس) اس عورت کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عورت فضل کی طرف تکنے لگی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنا ہاتھ (فضل) کے چہرہ پر رکھ دیا اور اس کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ نیز یہاں ایک اور آدمی نے آپؐ سے اپنی ماں کے متعلق دریافت کیا کہ وہ بہت ہی ضعیفہ ہے اگر اسے سوار کیا جائے تو برداشت نہ کرسکے گی، اگر اُسے باندھ دیا جائے تو خودکشی کرلے گی۔

آپؐ نے فرمایا کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتا؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں ضرور، آپؐ نے فرمایا، تو اپنی ماں کی طرف سے حج کر۔

جب آپ وادی محسر میں تشریف لائے تو اونٹنی کو تیز کردیا اور جن مقامات میں اللہ نے اپنے دشمنوں پر عذاب نازل کیا تھا وہاں آپ کی عادتِ طیبہ یہ تھی کہ تیز چلتے۔ اس جگہ (وادئ محسر) اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا جس کا واقعہ (اللہ) نے قرآن میں بتایا اور اس وادی کو وادی محسر اس لیے کہتے ہیں کہ اس وادی میں ہاتھیوں کو حسر یعنی واپس جانے سے روک کر (تباہ کردیا گیا اور محسر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان حدفاصل ہے۔ نہ اس میں پرعذاب اور نہ عرفات اور حرام کے درمیان حد ہے اس طرح ہر دو مشاعر کے درمیان ایک حد ہے جو نہ اس میں داخل ہے نہ اس میں۔ منیٰ حرم میں داخل ہے اور مشعر بھی ہے اور محسر حرم میں داخل تو ہے لیکن مشعر نہیں اور مزدلفہ حرم بھی ہے اور مشعر بھی ہے اور عرفہ حل میں ہے اور مشعر نہیں ہے اور عرفہ حل میں بھی داخل ہے اور مشعر بھی ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں سے درمیانی راستہ پر چلے جو جمرئ پر جا نکلتا ہے یہاں تک کر آپؐ منیٰ میں تشریف لائے اور جمرۂ عقبہ پر پہنچ گئے اور وادی کے نچلی جانب ٹھہرے۔ بائیں طرف کعبہ شریف دائیں طرف منیٰ اور سامنے جمرہ تھا۔ اور آپؐ سواری پر تھے۔ چنانچہ آپ طلوعِ آفتاب کے بعد اپنی سواری پر سے ایک ایک کرکے کنکر مارے اور ہر کنکر کے ساتھ تکبیر کہتے رہے۔ اس وقت آپؐ نے تلبیہ ختم کیا اور اس راستہ میں برابر تلبیہ کہتے رہتے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے رمی کی۔ اور بلالؓ اور اسامہؓ آپؐ کے ہمراہ تھے۔ ایک نے اونٹنی کی مہار پکڑ رکھی تھی اور دوسرے نے گرمی سے بچاؤ کے لیے آپؐ پر

۵؎ اس واقعہ سے کیا مستنبط ہوتا ہے؟

رسالت مآبؐ کی موجودگی میں، ایک خوبصورت نوجوان، اور ایک خوبصورت خاتون کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگتے ہیں ـــــ یہ فعل غلط تھا، لیکن اس میں انسانی فطرت بھی کارفرما تھی آپؐ نے ان دونوں باتوں کا لحاظ فرمایا، عتاب نہیں فرمایا، سزا نہیں دی، ایک کا رخ بدل دیا، دوسرے کی آنکھ پر دست مبارک رکھ دیا۔ بات ختم ہوگئی۔ (رئیس احمد جعفری)

سایہ کررکھا تھا۔ اس واقعہ سے محرم کے لیے محمل وغیرہ کا سایہ کرنے کا جواز نکلتا ہے بشرطیکہ یوم النحر کے اس واقعہ میں سایہ کرنا ثابت ہو جائے اور اگر ایام منیٰ میں اس کے بعد کا واقعہ ہو تو پھر یہ حجت نہیں بن سکتا۔ اور حدیث میں اس بات کی وضاحت نہیں کہ یہ کب کا واقعہ ہے۔

خطبۂ وداع

منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امت کو پیام

قربانی کے دن کی عظمت پھر آپؐ منیٰ واپس ہوئے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں لوگوں کو قربانی کے دن کی حرمت و عظمت اور اللہ کے ہاں اس کی فضیلت سے آگاہ کیا اور تمام ممالک پر مکہ کی فضیلت بیان فرمائی اور کتاب اللہ کے مطابق حکمرانی کرنے والوں کی سمع و طاعت کا حکم دیا[1] پھر ارشاد فرمایا کہ لوگ آپؐ سے مناسکِ حج سیکھ لیں، اور فرمایا کہ شاید میں اس سال کے بعد حج نہ کر سکوں[2]۔ آپؐ نے مناسکِ حج سکھائے اور مہاجرین و انصار کو اپنے اپنے مقامات پر اتارا، اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کے بعد مبتلائے کفر نہ ہو جائیں کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگیں[3] پھر اپنی طرف سے تبلیغ کا حکم دیا اور فرمایا کہ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو مسئلہ پہنچایا جاتا ہے، وہ سننے والے سے زیادہ محفوظ (فہم و فراست کے مالک) ہوتے ہیں۔

نیز آپؐ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا، کہ کوئی آدمی اپنی جان پر ظلم نہ کرے۔ اور مہاجرین کو قبلہ کے دائیں طرف اور انصار کو بائیں طرف اتارا۔ باقی لوگ ان کے ارد گرد تھے اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کے خطبہ کی خاطر) لوگوں کی قوتِ سماعت کھول دی، یہاں تک کہ اہلِ منیٰ نے اپنے اپنے

---

[1] سمع و طاعت کی شرط یہ ہے کہ حکومت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق کی جائے۔

[2] آپؐ نے محسوس فرما لیا تھا کہ رفیق الاعلیٰ یعنی خدائے تبارک و تعالیٰ کی طرف سے طلبی کا فرمان آچکا ہے اور آپؐ دنیا سے رختِ سفر باندھنے والے ہیں۔

[3] باہمی جدال و قتال گویا کفر کا ہم پایہ ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

گھروں میں آپؐ کا خطبہ سنا۔

آپؐ نے خطبہ میں مزید فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو اور پانچوں نمازیں ادا کرو، اور مہینے کے روزے رکھو اور جب تمہیں (قرآن و سنت کے مطابق) حکم دیا جائے تو اطاعت کرو، اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ پھر آپؐ نے لوگوں کو وداع کیا۔ تو (لوگ) کہنے لگے یہ حجۃ الوداع ہے اور یہیں پر آپؐ سے پوچھا کہ جو رمی سے قبل حلق کروالے یا رمی سے قبل ذبح کرے۔ تو آپؐ نے فرمایا، کوئی حرج نہیں[1]۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن دیکھا کہ آپؐ سے جو بھی پوچھا جاتا آپؐ فرماتے کرلو اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ پھر آپؐ منیٰ میں قربانی کے مقام پر تشریف لے گئے چنانچہ وہاں تریسٹھ اونٹ ذبح کیے۔ آپؐ کھڑے ہوکر اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ کر ذبح کر رہے تھے، اور آپؐ نے تقریباً ساٹھ اونٹ ذبح کیے۔ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ باقی کو ذبح کردیں۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ ان جانوروں کا چمڑا اور گوشت مساکین میں تقسیم کردیں اور فرمایا کہ قصاب کو گوشت بنانے کے عوض اس میں سے کچھ نہ دیں۔ اب اگر کہا جائے کہ صحیحین کی حضرت ابوبکرہ سے مروی حدیث کا جواب دو گے کہ جو انھوں نے یوم النحر کو منیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے متعلق روایت کرتے ہوئے بتایا۔ پھر آپ دو نہایت چتکبرے مینڈھوں کی طرف گئے اور انھیں ذبح فرمایا اور بکریوں کے ریوڑ کی طرف تشریف لے گئے اور اسے ہم میں تقسیم کیا (مسلم)؟

تو جواب یہ ہے کہ مینڈھوں کے ذبح ہونے کا واقعہ مکہ میں ہوا اور حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق مدینہ میں مینڈھے ذبح کیے گئے۔ کہتے ہیں کہ اس میں لوگوں کے لیے دو طریقے ہیں، ایک حضرت انسؓ کا قول کہ آپؐ نے مدینہ میں دو انتہائی خوبصورت دو سینگوں والے مینڈھے ذبح کیے اور نماز عید ادا فرماکر دنبوں کی طرف تشریف لے گئے، چنانچہ حضرت انسؓ نے مکہ میں آپؐ کے اونٹوں کی قربانی کرنے اور مدینہ میں مینڈھے قربانی کرنے میں فرق بتادیا۔ اور وضاحت کردی کہ یہ دونوں مختلف واقعات ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منیٰ میں قربانی کا ذکر کیا ہے۔ بتایا ہے، کہ آپؐ نے (یہاں) اونٹ ذبح کیے اور یہ اونٹ ہدی کے طور پر تھے۔ جو آپؐ لے کر آئے تھے، یہ وہاں بکریوں کے ذبح کرنے سے افضل تھے۔

---

[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے لوگوں کی سہولت اور آسانی کا کتنا زیادہ خیال رکھا ہے (رئیس احمد جعفری)

حج تمتع یا حج قران

ایک اہم اختلافی مسئلہ کی تحقیق

آں حضرت جب مقام سرف میں پہنچے تو حضرت عائشہ ایام سے ہو گئیں انہوں نے حج کے ساتھ عمرہ کی نیت بھی کر رکھی تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتی ہوئی آئیں۔

آپ نے پوچھا، "کیوں رو رہی ہو؟ —— شاید ایام آ گئے؟"

کہنے لگیں، "ہاں یہی ہوا ہے"!"

آپ ﷺ نے فرمایا، " (روتی کیوں ہو؟) یہ وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنات آدم کے لیے لکھ دی ہے، وہ سب کچھ کرو جو ایک حاجی کرتا ہے، بس بیت اللہ کا طواف نہ کرنا"!"

حج تمتع یا حج افراد کے بارے میں علماء کا اختلاف

حضرت عائشہ کے اس واقعہ کے سلسلے میں علماء کے مابین اس بات پر منازعت ہے کہ آیا ان کا یہ حج تمتع تھا، یا حج افراد؟[1]

اگر حج تمتع تھا تو آیا انہوں نے عمرہ کا ارادہ ترک کر دیا، اور حج افراد کی نیت کر لی؟ اور حج کر کے

---

[1] حج کی صورتیں:-

(۱) حج افراد —— اس میں صرف حج کی نیت کرتے ہیں بعد ازاں عمرہ۔

(۲) حج تمتع —— میقات سے صرف عمرہ کی نیت کرتے ہیں، تا آنکہ عمرہ کے ارکان ادا کرتے ہیں اس کے بعد احرام اتار دیتے ہیں، پھر ۸ ذی الحج کو حج کے ارادے سے دوبارہ احرام باندھتے ہیں۔

(۳) حج قران —— اس میں حج اور عمرہ کی نیت ایک ساتھ کی جاتی ہے اور جب تک جملہ مناسک حج ادا نہ ہو جائیں، حاجی احرام نہیں اتار سکتا۔ (رئیس احمد جعفری)

قارن ہوگئیں؟

اور تنعیم سے دوبارہ جس عمرہ کی نیت کرکے چلی تھیں آیا وہ واجب تھا یا نہیں؟ ——

چند تنقیحات اور ان کا جواب

حضرت عائشہ کے اس واقعہ کے پیش نظر فقہا اس باب میں مختلف ہیں کہ عورت جب عمرہ کا احرام باندھے اور ایام سے ہو جائے اور طواف بیت اللہ اس کے لیے قبل از تعریف ممکن نہ ہو، تو آیا وہ عمرہ کا احرام اتار دے گی، اور حج افراد پر اکتفا کرے گی، یا حج اور عمرہ دونوں کرے گی، اور قارن ہو جائے گی ——!؟

پہلا قول فقہاء کوفہ کا ہے، یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا، دوسرا قول فقہائے حجاز کا ہے، یعنی امام مالک ، واحمد اور ان کے اتباع کا،

تنعیم سے حضرت عائشہ عمرہ کی نیت کرکے جب پھر سے چلیں تو اس باب میں چار مسلک ہیں۔

(۱) تنعیم سے عمرہ کی نیت کرکے پھر سے روانہ ہونا، محض رضاکارانہ تھا، ورنہ حج و عمرہ کرکے وہ سعی و طواف سے سبک دوش ہو چکی تھیں، وہ متمتع تھیں، پھر عمرہ بھی حج میں شامل کر لیا۔ اور قارن ہوگئیں،

یہ مسلک اصح اقوال و احادیث پر مبنی ہے، اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں، امام شافعی اور احمد کا مسلک یہی ہے۔

(۲) جب حضرت عائشہ ایام سے ہوئیں، تو آں حضرت ؐ نے انہیں ہدایت کی کہ عمرہ چھوڑ دیں، اور حج افراد کی نیت کر لیں، جب حج سے فارغ ہو گئیں، اور احرام کھولا، تو آپ ؐ نے حکم دیا کہ قضائے عمرہ کی نیت کریں، اور عمرہ ادا کریں، جس کا انہوں نے احرام باندھا تھا،

یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اتباع کا مسلک ہے، اس قول کی بنیاد پر، یہ عمرہ حضرت عائشہ پر واجب تھا، کیونکہ نیت کر چکی تھی، پس اس کا ادا کرنا ضروری تھا،

(۳) جب قارن ہوگئیں تو عمرۂ مفردہ کی ضرورت نہیں رہ گئی، —— یہ امام احمد کے دو اقوال میں سے ایک ہے۔

(۴۴) حضرت عائشہ نے حج افراد کی نیت کی تھی، انہیں طواف قدوم سے اس لیے منع کیا گیا تھا کہ ایّام سے تھیں۔
یہ مسلک قاضی اسماعیل بن اسماعیل ابن اسحاق وغیرہ مالکی فقہا کا ہے، اور یہ ضعیف ترین مسلک ہے۔ *

حج وداع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج

اب ہم پھر اصل مبحث پر، یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج پر آتے ہیں، ا
مقام سرف سے روانہ ہونے کے بعد مکہ میں آپ نے صحابہ سے فرمایا جن لوگوں کے پاس قربانی
کے جانور نہ ہوں، وہ صرف عمرہ کریں، اور احرام اتار دیں، اور جن لوگوں کے پاس قربانی کے جانور ہوں، وہ
احرام باندھے رہیں۔

آنحضرتؐ سے ایک سوال اور اس کا جواب

اس موقع پر سراقہ بن مالک نے سوال کیا۔
"آیا یہ حکم صرف اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے
لیے؟"

آپ نے جواب دیا نہیں ہمیشہ کے لیے، اب قیامت تک کے لیے عمرہ حج میں داخل ہوگیا ہے'!"
اس حدیث کی روایت چودہ صحابہ نے کی ہے، اور یہ ساری روایتیں بالکل صحیح ہیں، جن چودہ
بزرگوں نے اس واقعہ کی روایت کی ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:
ام المومنین عائشہ، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت فاطمۃ الزہراء۔ بنت رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق، حضرت جابر بن عبداللہ، ابوسعید الخدری
براء بن عازب، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، ابو موسیٰ الاشعری، عبداللہ بن عباس، سبرہ بن معبد الجہنی
سراقہ بن مالک المدلجی رضی اللہ عنہم، یہ احادیث و روایات صحیحین (بخاری و مسلم) بقیہ کتب صحاح
اور مسند وغیرہ میں ہیں۔

صحیح بخاری میں ابن شہاب سے مروی ہے کہ میں عطاء کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے اس
بارے میں سوال کیا، انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے جابر بن عبداللہ نے بیان کیا۔ اور آپ کے ساتھ قربانی کے

جانور تھے، لوگوں نے حج افراد کا ارادہ کیا، آپؐ نے ان سے تمتع کے لیے کہا، انھوں نے عرض کیا۔

"ہم حج تمتع کس طرح کر سکتے ہیں جب کہ ہم حج (افراد) کی نیت کر چکے ہیں' ؟"

آپ ؐ نے فرمایا، "جو میں کہتا ہوں وہ کرو، اگر میرے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی وہی کرتا جو تم سے کہہ رہا ہوں، لیکن اب یہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک قربانی کے جانور اپنے محل پر نہ پہنچ جائیں، تب ہی احرام کھول سکتا ہوں!"

چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا،!

صحیح مسلم میں حضرت حفصہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو سال حجۃ الوداع کے موقعہ پر حکم دیا کہ احرام دیں۔

حضرت حفصہ کہتی ہیں میں نے سوال کیا۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے؟"

فرمایا "میں قربانی کے جانور روانہ کر چکا ہوں، اب اس وقت تک احرام نہیں اتار سکتا جب تک قربانی نہ کر لوں،!"

صحیح مسلم میں حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق کی حدیث ہے کہ ہم لوگ (حج وداع کے موقعہ پر) احرام باندھ کر نکلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا،

"جس کے ساتھ قربانی کے جانور ہوں، وہ احرام باندھے رکھے، جس کے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوں وہ اتار دے،!"

چنانچہ میں نے احرام اتار دیا۔

اہل بیت، صحابہ کرام اور کبار تابعین کا مذہب

غرض یہ بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہ کثرت مرویات سے بہ صراحت ثابت ہے، اس کے راویوں میں صحابۂ کرام اور کبار تابعین ہیں، یہ منقولات شک سے ماوراء اور موجب یقین ہیں، کسی شخص کے لیے بھی ان سے انکار کرنا ممکن نہیں، یہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب ہے حبر الامت ابن عباس رضؓ کا اور ان کے اصحاب کا۔ نیز ابو موسیٰ اشعری رضؓ کا بھی یہی مذہب ہے، امام اہل السنت والحدیث احمد بن حنبل، ان کے اتباع، اور اہل حدیث کا مذہب بھی یہی ہے، عبداللہ بن حسن عنبری قاضی بصرہ بھی یہی مذہب رکھتے تھے۔

... ...

اہلِ ظاہر کے عذرات و اعتراضات

لیکن اہلِ ظاہر، اور ان احادیث سے اختلاف رکھنے والے چند عذر اس مذہب (مسلک) کو قبول کرنے میں پیش کرتے ہیں:

(۱) یہ حدیثیں منسوخ ہو چکی ہیں،

(۲) یہ حدیثیں صرف صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر صحابی کے لیے اس حکم میں مشارکت جائز نہیں۔

(۳) خلاف حکم سے یہ حدیثیں معارض ہیں،

یہ ہیں وہ تمام عذرات اور اعتراضات جو ان احادیث پر وارد کیے جاتے ہیں، اب ہم ایک ایک کر کے ان عذرات و اعتراضات کا جواب دیں گے۔

کیا یہ حدیثیں منسوخ ہو چکی ہیں؟

جو لوگ ان احادیث کو منسوخ مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابو داؤد کہتے ہیں کہ مجھ سے فاریابی نے ان سے ابان ابن ابی حازم نے، ان سے ابو بکر بن حفص نے، ان سے ابن عمرؓ نے ان سے حضرت عمرؓ نے جب وہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے بیان کیا کہ:

"اے لوگو! ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے متعہ کو جائز قرار دیا تھا، پھر اسے ہم پر حرام کر دیا۔!"

بزار کہتے ہیں یہ حدیث سند اور متن سے محروم ہے، سند کا جہاں تک تعلق ہے وہ قطعاً ناقابل قبول ہے، رہا متن، تو یہاں متعہ سے مراد عورتوں سے متعہ ہے نہ کہ حج تمتع، اور بے شک عورتوں سے متعہ کو پہلے آپؐ نے حلال کیا تھا، پھر حرام کر دیا تھا،

اور حضرت عمرؓ سے یہ روایت صحیحہ ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا، "میں حج کے ساتھ تمتع ضرور کرتا ہوں۔!"

تمتع یا قِران کا صحابہ کے ساتھ اختصاص؟

اب رہا، حج تمتع یا قِران کا صحابہ کے ساتھ اختصاص کا معاملہ، اس کے جو دلائل دیئے جاتے ہیں یہ ہیں!:

——: عبداللہ بن زبیر حمیدی، سفیان، یحییٰ بن سعید اور مرقع کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ ابوذر نے کہا۔:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فسخ حج ہمارے لیے خاص تھا۔
وکیع، موسیٰ بن عبیدہ اور یعقوب بن زید کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ ابوذرؓ نے فرمایا:
"ہمارے بعد کسی کے لیے بھی روا نہیں کہ حج کو عمرہ کے ساتھ ملائے، یہ ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک رخصت تھی"!
بزار، یوسف بن موسیٰ، اسمد بن فضل، محمد بن اسحاق، عبدالرحمان الاسدی، یزید بن شریک کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے ابوذرؓ سے پوچھا؛ "رسول اللہ نے کس طرح حج تمتع کیا تھا آپ تو ساتھ تھے بتایئے"!"
ابوذرؓ نے جواب دیا، تمہیں اس سے کیا؟ یہ تو وہ چیز تھی جس میں ہمارے لیے رخصت تھی!
صحیح مسلم میں ابوذرؓ کی حدیث ہے کہ "حج میں متعہ (تمتع) اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا"!"
اس حدیث کے دوسرے الفاظ یہ ہیں، "دو متعہ کسی کے لیے جائز نہیں ہیں سوا ہمارے، متعۃ نساء، اور متعۃ حج،
اسی طرح کی روایتیں سنن ابوداؤد اور نسائی وغیرہ میں بھی ہیں، غرض یہ ہے وہ مجموعۂ روایات جس سے یہ حج قران یا تمتع کے مخالف استدلال کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا،
لیکن یہ تمام آثار بین طور پر باطل ہیں، ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔
ان راویوں میں ایک مرفع ہے، جس سے روایت قبول نہیں کی جاتی، پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کی روایت مخصوص صحیحہ غیر مدفوعہ سے معارض ہے پھر اسے کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے؟ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مدعیان نسخ واختصاص کا دعویٰ، مخالف اصل ہے بغیر برہان و دلیل کے قبول نہیں کیا جا سکتا،
بلال بن حارث والی حدیث بھی یکسر غلط ہے، یہ اس حدیث کو ثقات اثبات کے روایات پر کس طرح مقدم رکھا جا سکتا ہے؟ ابن عباسؓ زندگی بھر اس کے خلاف فتویٰ دیتے رہے اور اس کے مخالفوں سے بحث کرتے رہے۔ اور رسول اکرمؐ کے ممتاز اور اہل صحابہ زندگی بھر اس کے خلاف عمل کرتے رہے یعنی حج تمتع کرتے رہے، اس کثیر جماعت صحابہ میں سے کسی نے بھی نہیں کہا یہ تمتع ہمارے لیے خاص ہے، یا ہمارے لیے رخصت ہے، بلکہ اسے عام قرار دیا اور تمام مسلمانوں

کے لیے بتایا، حدیث اختصاص کے بارے میں امام احمد کہتے ہیں خدا تعالیٰ ابوذر پر رحم کرے، تمتع کی اجازت تو اللہ کی کتاب نے دی ہے، باقی رہا حضرت عثمان رضؓ کا قول، یہ حج تمتع صرف صحابہ کے لیے تھا دوسروں کے لیے نہ تھا، تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو قول ابوذر رضؓ کا ہے، علاوہ ازیں قول ابوذر و عثمان تین امور پر محتمل ہے'':

(۱) صحابہ کے لیے جواز کا اختصاص، جو لوگ حرمت نسخ کے قائل ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں۔

(۲) صحابہ کے ساتھ وجوب کا اختصاص، ہمارے شیخ ابن تیمیہ یہی رائے رکھتے ہیں وہ فرماتے ہیں صحابہ کے لیے نسخ فرض تھا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا، لیکن امت کے لیے یہ بات جائز، اور استحباب کے درجہ میں ہے، اور قیامت تک یہی صورت رہے گی لیکن ابن عباس رضؓ اسے قیامت تک ساری امت کے لیے واجب قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہر قارن اور مفرد (حج قران یا افراد کی نیت کرنے والا) کے لیے جس کے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوں یہ فرض ہے کہ احرام اتار دے۔

(۳) احتمال ثالث یہ ہے کہ صحابہ کے بعد کسی کے لیے بھی روا نہیں ہے کہ بغیر قربانی کے جانوروں کے قارن یا مفرد کی حیثیت سے حج کی ابتدا کرے، لیکن یہ احتمال بھی احادیث ثابتہ وصحیحہ سے تعارض ہے لہٰذا ناقابل قبول ہے۔

باقی رہی صحیح مسلم میں ابوذر رضؓ کی روایت کہ حج میں متعہ (تمتع) صحابہ کے لیے خاص تھا، یہ بات اگر اصل متعہ کے لیے ہے کہ تمام مسلمان اس پر متفق ہیں، اور متعہ نسخ کے بارے میں ہے تو یہ قول فاسد ہے، اس کی صراحت عمران بن حصین رضؓ کی اس رائے سے ہوتی ہے جو عثمان رضؓ اور ابوذر رضؓ کی رائے سے زیادہ اہم ہے اور جسے بخاری نے روایت کیا ہے، عمران بن حصین رضؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ؐ کے ساتھ حج تمتع کیا، اسی اثنا میں قرآن کی آیت نازل ہوئی (اس بارے میں) صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ کتاب اللہ میں آیت متعہ نازل ہوئی، یعنی متعۃ الحج، رسول اللہ ؐ نے ہمیں اس کا حکم دیا پھر کوئی ایسی ناسخ آیت نازل نہیں ہوئی، نہ رسول اللہ ؐ نے ہمیں کبھی منع فرمایا، یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہو گئی، اب اگر کوئی شخص اپنی رائے سے کچھ کہتا ہے تو جو چاہے کہے۔ (یعنی حضرت عمر رضؓ)

ایک سائل کو ابن عمر رضؓ کا جواب

ایک مرتبہ عبداللہ رضؓ بن عمر رضؓ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا، اور ان سے کہا گیا،

"آپ کے والد نے تو اس سے منع کیا ہے؟"

ابن عمر رضؓ نے جواب میں کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا میرے باپ کا قول؟"

ابن عباس نے ایک شخص سے جو اس بارے میں، ابوبکرؓ کے قول سے معارضہ کراتا تھا کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہیں تم پر آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں، میں کہتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے، اور تم کہتے ہو، ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ کہا ہے'!"

معصوم کے قول پر غیر معصوم کا قول نہیں مانا جاسکتا

یہ ہے اہل علم کا جواب، نہ یہ جواب کہ عثمانؓ و ابوذرؓ رسول اللہ ؐ کے قول و فعل سے تمہارے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے۔

ابن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ ہمارے مقابلہ میں رسول اللہ سے زیادہ واقف تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نص کے مقابلہ میں صحابہ یا تابعین میں سے ایک شخص بھی اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتا، معصوم کے قول پر غیر معصوم کے قول کو تقدم نہیں حاصل ہو سکتا، اور نص معصوم سے ثابت ہوتا ہے کہ حج تمتع قیامت کے لیے ہے، اس کی تائید میں، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص، ابن عباس، ابوموسیٰ اشعری، سعید بن المسیب اور جمہور تابعین ہیں، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ بعض صحابہؓ کی محض رائے تھی، نہ کہ رسول اللہؐ سے حدیث مرفوع،

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب تمتع سے منع کیا، تو ان سے ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا،

"یا امیرالمومنین کیا آپ نسک و عبادت میں ایک نئی بات رائج نہیں کر رہے ہیں؟"

اور یہ ابوموسیٰؓ برابر عہد خلافت ابوبکرؓ میں، اور صدر خلافت عمرؓ میں، برابر (تمتع) کا فتویٰ دیتے رہے، یہاں تک کہ عمرؓ نے اس سے منع کر دیا، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ ان کی رائے میں حضرت عمر نے نسک و عبادت میں ایک نئی بات رائج کی، لیکن یہ بھی ثابت اور صحیح ہے کہ بعد میں اپنے اس قول (نہی) سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا،

احادیث نسخ کے تعارض کا مسئلہ اور رواۃ پر بحث

باقی رہا احادیث نسخ میں تعارض کا معاملہ تو اس سلسلہ میں جو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں ان میں ایک حدیث عمرؓ سے ابوالاسود کی ہے، صاحب جزم اسے منکو قرار دیتے ہیں، لہٰذا اس سے روایت کس طرح جائز ہو سکتی ہے، اسی طرح عبداللہ مولیٰ اسماء کی حدیث ہے کہ اسماء

بنت ابو بکر صدیق نے کہا کہ میں نے اور میری بہن عائشہ رضہ نے اور زبیر نے اور فلاں فلاں نے مسح بیت اللہ کے بعد احرام اتار دیے۔ پھر رات کو حج کی نیت کر کے احرام باندھ لیے، لیکن یہ حدیث دو وجہ سے باطل ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ اہل نقل اس پر متفق ہیں کہ حضرت عائشہ رضہ نے مکہ میں پہلی مرتبہ داخلہ کے وقت عمرہ نہیں کیا تھا، اسی لیے حج کے بعد تنعیم جا کر عمرہ کی نیت کر کے واپس آئیں اور عمرہ کیا، اس کے راوی بہت ثقہ لوگ ہیں، مثلاً ابو الاسود، ابن ابی ملیکہ، قاسم بن محمد، عروہ، طاؤس، اور مجاہد، دوسرا سبب بطلان کا یہ ہے کہ مسح بیت کے بعد احلال کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ جابر، انس بن مالک، عائشہ، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، سب کی روایت یہ ہے کہ احلال دخول مکہ کے دن ہوا تھا، اور احلال حج یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) کو ہوا تھا، اور ان دونوں ایام کے مابین تین دن کی مدت ہے،

آنحضرت ؐ کے سفر حج کی طرف عود

اب ہم پھر آں حضرت ؐ کے ذکر حج کی طرف عود کرتے ہیں۔

آں حضرت ؐ ذی طوی میں آکر اترے، جو آج کل آباد زاہر کے نام سے معروف ہے یہاں رات گزاری، پھر نماز صبح کے بعد غسل کیا، اور مکہ کی طرف سواری روانہ ہوئی، جہاں آپ ؐ دن چڑھے داخل ہوئے، طبرانی نے بیان کیا ہے کہ آپ ؐ باب بنی عبد مناف سے جو باب بنی شیبہ کے نام سے معروف ہے داخل ہوئے،

طبرانی کا بیان ہے کہ جب آپ ؐ کی نظر پاک کعبہ پر پڑی، تو آپ ؐ نے فرمایا،

اللھم زد بیتک ھذا تشریفا وتعظیما وتکریما ومھابتہ

یعنی اے پروردگار اپنے اس گھر کی عزت، حرمت، عظمت، اور بندگی اور زیادہ بڑھادے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ؐ ہاتھ اٹھاتے اور تکبیر کہتے تھے، اور فرماتے تھے،

اللھم انت السلام ومنک السلام، حینا ربنا بالسلام اللھم زد ھذا البیت تشریفا و تعظیما وتکریما ومھابتہ وزد من حجہ او اعتمرہ تکریما وتشریفا وتعظیما وتعظیما وبرا

یعنی (مذکورہ بالا دعا کے علاوہ) اے پروردگار، جو اس تیرے گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے، اس کی بھی بزرگی، عزت، بڑائی، اور عظمت میں اور زیادہ اضافہ کر!

جب آپ ؐ مسجد میں آئے، تو کعبہ کی طرف بڑھے، یہاں آپ نے تحیۃ المسجد نہیں پڑھی، کیونکہ مسجد حرام کی تحیہ طواف ہے، جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اسے چوما، مگر اس کے لیے نہ کسی

مجھے مزاحم ہوئے، نہ رکن یمانی کا رُخ کیا، نہ ہاتھ اٹھائے، نہ یہ فرمایا کہ میں طواف کی نیت کرتا ہوں۔ نہ طواف کا نماز کی طرح تکبیر سے افتتاح کیا، جیسا کہ ناواقف اور لاعلم لوگ کرتے ہیں، کہ یہ بدعت اور منکر ہے، نہ آپ ﷺ حجر اسود کے پورے جسم سے مقابل ہوئے، بلکہ حجر اسود کی طرف کچھ رخ سا کر لیا، داہنی طرف سے طواف شروع کیا، کعبہ آپ کے بائیں جانب تھا، باب کعبہ کے پاس کھڑے ہوکر کوئی دعا نہیں مانگی، نہ میزاب کے نیچے ایسا کیا، جب آپ ﷺ رکنین، یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان پہنچے تو فرمایا،

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

یعنی اے ہمارے رب، ہمیں دنیا اور آخرت میں اچھائیاں عطا کر، اور دوزخ کے عذاب سے بچالے،

آپ ﷺ نے طواف کس طرح کیا؟ طواف کے پہلے تین پھیروں میں آپ ﷺ اس طرح چلے کہ آپ ﷺ کی رفتار تیز تھی، لیکن چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ، چادر یوں اوڑھے تھے کہ اس کا ایک سرا بغل کے نیچے سے نکال کر شانے پر ڈال لیا تھا، جب حجر اسود کے سامنے آئے۔ تو اس کی طرف اشارہ فرماتے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اسی سے اسے چھوتے، اور پھر لکڑی کو چھو کر آگے بڑھ جاتے، اس چھڑی کا سرا مڑا ہوا تھا،

یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے رکن یمانی کو چھوا، مگر اسے چومتے نہیں تھے، نہ اسے چھو کر ہاتھ کو چومتے تھے۔ دارقطنی نے ابن عباس رضؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکن یمانی (حجر اسود) کو چومتے تھے، اور اس پر اپنا رخسار مبارک رکھ دیتے تھے، اس روایت کے راویوں میں ایک عبداللہ بن مسلم بن ہرمز ہے، امام احمد اسے صالح الحدیث کہتے ہیں، لیکن بعض اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، اس جگہ رکن یمانی سے مراد، حجر اسود ہے، طبرانی نے اسناد جید کے ساتھ روایت کیا ہے، کہ آپ جب رکن یمانی کو چھوتے تھے تو فرماتے تھے۔

بسم اللہ واللہ اکبر اور جب حجر اسود کے پاس آتے تو فرماتے اللہ اکبر،

مقام ابراہیم پر ورود طوائف کعبہ سے فراغت کے بعد آپ ﷺ مقام ابراہیم کے پیچھے آئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی، (یعنی مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو) پھر دو رکعت نماز پڑھی، جس میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص پڑھی، نماز کے بعد حجر اسود کی طرف متوجہ ہوئے، اور اسے پھر چھوا، اس کے بعد صفا کی

طرف تشریف لے گئے، جب قریب پہنچے تو قرآن کی یہ آیت پڑھی، انما الصفاد المروۃ من شعائر اللہ یعنی صفا اور مروہ شعائر الٰہی میں سے ہیں، (آیت ختم) اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا، ابدأ بما بدأ اللہ یعنی خدا نے جس سے ابتداء کی ہے میں بھی اسی سے ابتدا کرتا ہوں۔

نسائی کی روایت میں ابدأ علی الامر ہے،

پھر آپ صفا پہ چڑھ گئے، یہاں تک کہ بیت اللہ نظر آنے لگا، پھر آپ نے خدا کی وحدت اور کبریائی بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہٗ الملک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیئ قدیر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ انجز وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

یعنی خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، سب کچھ اس کا ہے، وہی سزوار ستائش ہے اور وہی ہر چیز پہ قادر ہے، خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور تمام جتھوں کو تنہا شکست دی،!

پھر آپ نے دعا فرمائی، اور یہ الفاظ تین مرتبہ دوہرائے، پھر آپ پا پیادہ مروہ آئے، اور بطن وادی میں پہنچ کر سعی کرنے لگے،

صحیح مسلم میں ابوالطفیل کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباس سے عرض کیا، ارشاد فرمایئے کیا واقعی صفا اور مروہ کے مابین سوار ہو کر طواف کرنا سنت ہے؟ کیونکہ آپ کی قوم کے لوگ تو اسے سنت ہی خیال کرتے ہیں، ابن عباس نے کہا، وہ ٹھیک بھی کہتے ہیں اور غلط بھی کہتے ہیں، میں نے کہا ٹھیک کس طرح اور غلط کس طرح کہتے ہیں؟ کہنے لگے، لوگوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ کھوے سے کھوا چھلنا شروع ہو گیا، اور رسول اللہ اپنے سامنے سے لوگوں کو ہٹاتے نہیں تھے، چنانچہ جب ہجوم بہت بڑھ گیا، تو آپ سوار ہو گئے، ورنہ پا پیادہ چلنا اس موقع پر زیادہ افضل ہے،!

طواف قدوم آپ نے سوار ہو کر کیا یا پا پیادہ؟

طواف قدوم کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا آپ اس موقع پر پا پیادہ تھے یا سوار؟

صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے گرد اونٹ پر بیٹھ کر طواف فرمایا اور اسی طرح رکن کو چھوا، کیونکہ لوگوں کو سامنے سے

ہٹانا آپؐ کو پسند نہ تھا، سنن ابوداؤد میں ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج ناساز تھا آپؐ سواری پر سوار رہے، اور اسی طرح طواف کیا، رکن کے پاس جب پہنچے تو چھڑی سے اسے چھوا، طواف سے فراغت کے بعد اونٹ کو بٹھایا اور دو رکعتیں پڑھیں، ابوالطفیل کی روایت ہے کہ جس چھڑی سے آپؐ نے حجر اسود کو چھوا، اسے چوما بھی، اور بیہقی نے مسلم کے اسناد کے ساتھ جو روایت کی ہے اس میں اونٹ کا ذکر نہیں ہے، ممکن ہے یہ طواف قدوم کے بجائے طواف اقامۃ کا واقعہ ہو۔

اعتکاف

دل کے روگ کا تنہا اور شافی علاج

رغبت الی اللہ کا وسیلہ قلب کی اصلاح واستقامت اللہ کی طرف لے جانے والی راہ، ذات الہٰی پر اعتماد کلی سے حاصل ہوتی ہے، خدا کی طرف رغبت ہی دل کی بے کلی کو دور کر سکتی ہے، کیونکہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف میلان ہی دل کے روگ کا تنہا اور شافی علاج ہے، اور چونکہ خورونوش میں زیادتی، لوگوں سے بیکار ملنا جلنا، لغوگوئی، اور زیادہ سونا ایسے افعال ہیں جن سے (قلب) کی پریشانی بڑھتی اور تشتت افتراق واقع ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اللہ کے راستے میں آڑ بنتی! اس میں ضعف و کمی پیدا کرتی ہیں، اسی لیے پروردگار عزیز و رحیم نے بندوں پر اپنی رحمت کے باعث روزہ فرض کر دیا کہ کثرتِ خورونوش میں کمی ہو جائے اور قلب سے شہوانی اخلاط ہٹ جائیں۔ جو اللہ کی طرف رغبت کرنے میں مارج ثابت ہوتے ہیں، یہ چیزیں بندے پر خود اسی کی بھلائی، فائدے، اور مصلحت کے لیے فرض کیں، کہ وہ دنیا و آخرت میں ان سے متمتع ہو،

نیز اعتکاف مشروع فرمایا۔ جو اصل مقصد ہے جس سے آدمی کا دل خود بخود خدا کی طرف راغب ہوتا ہے، وہ اس پر بھروسہ کرتا ہے اور مخلوقات کی مصروفیات سے علیحدہ ہو کر صرف خدائے عزوجل کی (عبادت میں) مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ قلب گہوارۂ افکار و آلام نہیں رہتا، ذکر و محبت الہٰی کا نشیمن بن جاتا ہے، پھر یادِ الہٰی کے سوا کوئی اور کوئی یاد باقی نہیں رہ جاتی، بس یہی خیال رہتا ہے کہ خدا کی رضا اور قرب حاصل ہو، چنانچہ وہ مخلوق کی بجائے اللہ تعالیٰ سے اُنس حاصل کرتا ہے۔ اور اللہ بھی اسی سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے۔ کہ جس دن قبر میں وحشت ہوگی۔ اور کوئی انیس نہ ہوگا اور نہ سامانِ فرحت ہوگا وہاں پر وہ اس کا انیس ہوگا۔

دراصل اعتکاف کا سب سے بڑا مقصود یہی ہے، اور چونکہ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے

کہ اعتکاف روزے کے ساتھ ہو۔ اسی لیے اعتکاف کو بھی رمضان کے آخری عشرہ میں مشروع کیا گیا جو روزے کے باقی تمام ایام سے افضل ہے

بغیر روزے کے اعتکاف بے معنی ہے | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے کبھی بھی افطار کی حالت میں اعتکاف کیا ہو۔ بلکہ حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں، کہ روزے کے بغیر اعتکاف ہوتا ہی نہیں۔

اور اللہ تعالےٰ نے بھی روزے کے ساتھ ساتھ ہی اعتکاف کا ذکر فرمایا ہے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیشہ روزے کی حالت ہی میں اعتکاف کیا، اسی لیے جس مسئلہ پر جمہور سلف قائم ہیں وہی ترجیح رکھتا ہے، یعنی "اعتکاف میں روزہ شرط ہے" اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ بھی اسی مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔

رہا کلام۔ تو امت پر لازم کیا گیا کہ زبان کو ہر اس بات سے روکے۔ جس کا آخرت میں کچھ فائدہ نہیں۔

۔ اور کثرت خواب کے علاج کے لیے قیام لیل مشروع ہوا۔ جو بیکار جاگتے رہنے سے افضل ہے۔ اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔ (قیام الیل) معتدل قسم کی بیداری ہے۔ جس میں قلب و جسم کو تقویت ملتی ہے۔ اور بندے کے ذاتی مصالح میں رکاوٹ بھی نہیں پیدا ہوتی، پس ارباب ریاضت و سلوک کا مدار بھی یہی ارکان اربعہ ہیں، اس سے بڑھ کر خوش بخت کون ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ مسنونہ پر گامزن ہو۔ اور غلو کرنے والوں یا از حد کاہلوں اور کمی کرنے والوں کے طریقہ پر نہ چلے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزے۔ قیام اور کلام کے متعلق ہم عرض کر چکے ہیں اب ہم اعتکاف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ بیان کرتے ہیں۔ آپؐ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو اپنے پاس بلا لیا۔ ایک بار آپ نے اعتکاف چھوڑ بھی دیا، لیکن شوال میں قضا ادا کر لیا۔ ایک بار آپؐ نے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا۔ پھر درمیانی عشرہ میں پھر آخری عشرہ میں۔ آپ لیلۃ القدر کی تلاش کر رہے تھے۔ پھر معلوم ہوا۔ کہ یہ آخری عشرہ میں ہے۔ چنانچہ آپ نے (اسی عشرہ) میں اعتکاف پر مداومت فرمائی۔ یہاں تک کہ اللہ عزوجل سے جا ملے۔

اعتکاف کے لیے آپ خیمہ گاڑ دینے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ آپ کے لیے مسجد میں خیمہ گاڑ دیا جاتا جس میں آپؐ اپنے خدائے رحیم و کریم کے ساتھ تنہائی اختیار کرتے۔ جب آپ اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز پڑھتے، پھر خیمہ لگانے کا حکم فرماتے، چنانچہ (خیمہ) لگا دیا جاتا۔ پھر آپ نے اپنی ازواج مطہرات رضہ

کے لیے حکم فرمایا۔ چنانچہ ان کے خیمے بھی لگا دیئے گئے۔ چنانچہ جب آپ نے فجر کی نماز پڑھی اور ان خیموں کو دیکھا۔ تو اپنے خیمے کے متعلق حکم دیا کہ اسے اکھاڑ دیا جائے!

اور ایسا بھی ہوا کہ ماہِ رمضان میں آپ نے اعتکاف ترک کر دیا۔ اور شوال کے پہلے عشرہ میں اعتکاف فرمایا۔ آپؐ ہر سال دس دن تک اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے۔ جس سال آپ کی رحلت ہوئی، اس سال آپ بیس دن اعتکاف میں بیٹھے۔ اور ہر سال ایک بار حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے ساتھ قرآن مجید کا دورہ کرتے (دہراتے) لیکن اس سال دو مرتبہ دہرایا۔ آپؐ بھی حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن مجید سناتے اور اس سال دو بار سنایا۔

حالت اعتکاف کے معمولات

جب آپ اعتکاف میں بیٹھتے۔ تو اپنے خیمہ میں تنہا داخل ہو جاتے اور اعتکاف کی حالت میں انسانی ضرورت کے سوا آپ گھر تشریف نہ لے جاتے۔ آپ مسجد سے اپنا سر حضرت عائشہ رضؓ کے حجرہ کی طرف باہر نکالتے۔ تو وہ آپ کا سر دھوتیں اور کنگھی کرتیں۔ اور آپ مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے، اور (ام المومنین) ایام سے ہوتیں۔ نیز بعض دوسری ازواج مطہراتؓ آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوتیں اور آپ اعتکاف میں ہی ہوتے۔ جب وہ واپس ہوتیں۔ تو آپ بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ آپ ان کو الوداع کہتے۔ اور (اس وقت رات ہوتی) بحالت اعتکاف آپؐ اپنی ازواج مطہراتؓ میں سے کسی کے ساتھ مباشرت نہ فرماتے۔ نہ تقبیل کرتے۔ جب آپ اعتکاف میں بیٹھتے۔ تو آپ کا بستر بچھا دیا جاتا۔ اور معتکف میں آپ کا بستر رکھ دیا جاتا، اور جب آپ کسی ضرورت سے باہر تشریف لے جاتے۔ اور کسی مریض کے پاس سے گزرتے تو اس سے کچھ نہ پوچھتے اور نہ دم کرتے۔ ایک مرتبہ آپ ترکی قبہ میں معتکف ہوئے۔ اور اس پر چٹائی ڈال دی۔ یہ تمام باتیں اس لیے تھیں تاکہ اعتکاف کا اصل مقصد اور روح حاصل ہو، بخلاف آج کل کے جہلاء کے کہ اپنی جائے اعتکاف دس آدمیوں کے برابر وسیع کر لیتے، اور زائرین کے لیے مجلس بنا لیتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کر ڈالتے ہیں۔ یہ ایک الگ رنگ ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔

حج اور عمرہ

ایک بہت اہم اور تحقیقی بحث

ہجرت کے بعد آپ نے کتنے عمرے کیے؟ بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چار عمرے ادا کیے سب کے سب ذی القعدہ کے مہینہ میں تھے۔

پہلا حدیبیہ کا عمرہ ہے۔ یہ چھ ہجری میں ادا کیا چنانچہ مشرکین نے خانہ کعبہ کے پاس قربانی کرنے سے روکا۔ اسی لیے آپؐ نے اور صحابہؓ نے حلق کروایا (سر منڈوایا) اور احرام اتارا اور واپس مدینہ میں تشریف لے آئے۔

دوسرا عمرۂ قضیہ، یہ اگلے سال ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے۔ تین روز قیام فرمایا۔ پھر عمرہ ادا کرنے کے بعد واپس ہوئے۔ اس میں اختلاف ہے، کہ کیا یہ عمرہ سال گذشتہ کے عمرہ کی قضا تھی جبکہ آپ کو روک دیا گیا تھا؟ یا یہ نیا عمرہ تھا؟

علمائے کرام کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں، اور احمد بن حنبلؒ سے دو روایات ہیں ایک یہ کہ یہ قضاء کا عمرہ تھا۔ ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور دوسرے کہتے ہیں یہ قضاء نہیں تھا۔ یہ مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

جو قضا کے قائل ہیں انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اس کا نام عمرۂ قضاء تھا۔ اور یہ نام اپنے حکم کے تابع ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں قضاء مقاضاۃ کے ہم معنی ہے، کیونکہ اس عمرہ میں اہل مکہ کے خلاف فیصلہ ہو گیا تھا۔ نہ کہ یہ قضی یقضی قضاء سے ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے اس کا نام عمرۂ قضیہ ہے۔ مروی ہے کہ جن لوگوں کو کعبہ تک نہ جانے دیا گیا، ان کی تعداد چودہ سو تھی۔ اور عمرہ قضیہ میں یہ تمام صحابہؓ تشریف نہیں لائے۔ اگر قضاء کا عمرہ ہوتا۔ تو ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا۔ یہی زیادہ صحیح مذہب ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ آنے والے صحابہؓ کو اس کی قضاء کرنے کا حکم نہیں دیا۔

تیسرا عمرہ وہ تھا۔ جو آپؐ نے حج کے ساتھ ہی (حجِ قران) کی صورت میں ادا فرمایا! یہ دس سے زیادہ دلائل کی بنا پر قران کا تھا، جنہیں ہم انشاء اللہ آئندہ ذکر کریں گے۔

چوتھا جعرانہ سے چل کر عمرہ ادا فرمایا! جب آپ حنین کے لیے تشریف لے گئے۔ پھر وہاں سے لوٹ کر مکہ تشریف لائے۔ تو جعرانہ سے عمرہ ادا فرمایا۔

صحیحین میں حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے یہ تمام عمرے آپ نے ذی قعدہ میں ادا فرمائے۔ سوا اس کے جو حج سے متعاون تھا، حدیبیہ[1] کا عمرہ یا زمانہ حدیبیہ کا عمرہ۔ اگلے سال ذی[2] قعدہ کا عمرہ۔ جعرانہ[3] سے عمرہ جب آپ نے وہاں حنین کا مالِ غنیمت تقسیم فرمایا۔ اور حج کے ساتھ عمرہ، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے: کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے، ایک رجب میں کیا لیکن یہ ان کا وہم ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ کو جب اس کی خبر ہوئی۔ تو فرمایا! اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمان پر رحم فرمائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی عمرہ کیا۔ یہ آپؐ کے ساتھ تھیں اور حضورؐ نے رجب میں قطعاً عمرہ نہیں کیا۔ اور دارقطنی رحؒ نے حضرت عائشہ نے جو روایت کی ہے: کہ میں بھی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے مہینہ میں عمرہ کے لیے گئی۔ تو آپؐ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا، آپؐ نے قصر کیا۔ اور میں نے مکمل نماز ادا کی۔ پھر میں نے عرض کیا: آپؐ پر میرے ماں باپ فدا ہوں آپؐ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا۔ آپؐ نے قصر کیا اور میں نے مکمل نماز ادا کی۔

آپؐ نے فرمایا اے عائشہ رضؓ تم نے اچھا کیا۔"

آں حضرت نے رمضان میں کبھی عمرہ نہیں کیا

یہ حدیث غلط ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں قطعاً عمرہ نہیں کیا۔ اور آپ کی عمر کا شمار بھی منضبط ہے اور ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ام المومنین رضؓ پر رحم فرمائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں بالکل عمرہ نہیں کیا اور حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ذی قعدہ میں عمرہ کیا (ابن ماجہ۔) وغیرہ۔

اور اس میں اختلاف بھی نہیں۔ کہ آپ کے عمرے چار سے زیادہ نہ تھے۔ اگر آپ نے رجب میں بھی عمرہ کیا ہوتا تو پانچ ہوتے۔ اور اگر رمضان میں بھی عمرہ کیا ہوتا۔ تو چھ ہوتے۔ ہاں اگر یہ صورت ہو۔ کہ بعض کہیں کہ آپ نے رجب میں عمرہ کیا۔ اور بعض کہیں کہ آپ نے رمضان میں عمرہ کیا۔ اور بعض یوں کہیں کہ آپ نے ذی قعدہ میں عمرہ ادا کیا۔ تو یہ بھی خلاف واقع ہے۔ بلکہ آپ کے جملہ عمرے تو ذی قعدہ میں ہوئے، جیسا کہ حضرت انس رضؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے۔

اور سنن ابوداؤدؒ میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال میں عمرہ کیا، یہ اگر درست ہو۔ تو جعرانہ کے عمرہ میں ہو سکتا ہے۔ جب آپ شوال کے مہینہ میں تشریف لے گئے (حقیقت یہ ہے) کہ آپ نے وہاں ذی قعدہ میں احرام باندھا تھا۔!

مکہ کے باہر آپؐ نے کوئی عمرہ نہیں کیا

آپ نے زندگی بھر ایک عمرہ بھی مکّہ سے باہر جاکر نہیں کیا جیسا آج کل عام طور پر لوگ کرتے ہیں، آپؐ نے تمام عمرے مکہ میں داخل ہوتے ہوئے کیے، نزول وحی کے بعد آپ ۱۳ سال تک مکہ میں مقیم رہے، مگر کوئی روایت ایسی منقول نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ مکّہ سے باہر جاکر آپ نے اس ساری مدت میں عمرہ کیا ہو۔ آپؐ نے جو عمرہ کیا ہے اور جو مشروع ہے وہ داخل مکہ کا عمرہ ہے یہ نہیں کہ حرم سے باہر چلے جائیں، اور عمرہ کی نیت کر کے پھر واپس آجائیں[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی طرح عمرہ کرتے رہے۔

حج کے مہینہ میں عمرہ کرنا افضل ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مکہ میں پانچ مرتبہ داخل ہوئے پہلی مرتبہ حدیبیہ تک پہنچے لیکن داخل ہونے سے روک دیئے گئے باقی چار مرتبہ میقات سے احرام باندھ لیا، حدیبیہ کے موقعہ پر ذالحلیفہ سے احرام باندھا تھا، دوسری مرتبہ آپ نے عمرہ ادا کیا تین دن قیام کیا پھر واپس تشریف لے آئے، تیسری مرتبہ فتح کے ساتھ ماہ رمضان میں بغیر احرام کے داخل ہوئے، پھر حنین واپس آگئے، اُس کے بعد عمرہ کی نیت کر کے جعرانہ سے مکہ میں داخل ہوئے، یہ عمرہ آپ نے رات کو کیا، اور رات ہی کو واپس آگئے مکہ سے نکل کر جعرانہ تک عمرہ کے لیے نہیں گئے جیسا کہ اہل مکہ آج کل کرتے ہیں، آپ نے مکّہ میں داخل ہوتے وقت احرام باندھا اور رات کو جب عمرہ کر لیا تو فوراً جعرانہ واپس آگئے اور رات وہیں گزاری جب صبح ہوئی تو سرف کی گھاٹی سے نکل کر شارع عام پہ آگئے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے

---

[1] عمرہ کا ثواب بھی تقریباً حج ہی کی طرح ہے، اس کے ارکان تین ہیں:

(۱) کعبۂ شریف کا طواف کرنا۔

(۲) صفا اور مروہ کے مابین سعی کرنا،

(۳) سر منڈانا، یا بالوں کو زیادہ سے زیادہ چھوٹا کرا دینا۔

ان ارکان کے بعد عمرہ کرنے والا، حج کی پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور بغیر کسی پابندی کے مکہ میں باشندے کی طرح مکہ میں رہ سکتا ہے، (رئیس احمد جعفری)

لوگ اس عمرہ سے ناواقف ہیں۔

آپ کے تمام عمرے حج کے مہینہ میں ہوئے برعکس مشرکین کے کہ وہ اشہر حج میں عمرہ کو مکروہ سمجھتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ یہ بڑی گناہ کی بات ہے رسول اللہ صلی اللہ صلعم کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا افضل ہے۔

آپؐ نے سال میں صرف ایک عمرہ کیا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال میں ایک ہی عمرہ کیا ایک سال میں دو مرتبہ نہیں کیا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے سال میں دو مرتبہ بھی عمرہ کیا ہے دلیل میں وہ سنن ابو داؤد کی حدیث پیش کرتے ہیں جو حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے، کہ آپ نے دو عمرے کیے ایک ذیقعدہ میں دوسرا شوال میں گویا ایک ہی سال میں دو عمرے کیے لیکن یہ حدیث وہم پر مبنی ہے، کیونکہ ایسا واقعہ کبھی رونما نہیں ہوا۔

لیکن یہ مسئلہ بہر حال اختلافی ہے امام مالک فرماتے ہیں کہ ایک سال میں ایک سے زائد عمرہ میری نظر میں مکروہ ہے، لیکن اصحاب مالک میں سے مطرف اور ابن المواز کا قول ہے کہ ایک سال میں ایک سے زائد عمرہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، ابن المواز کا قول ہے کہ حضرت عائشہ نے ایک ہی مہینہ میں دو عمرے کیے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ طاعات کی صورت میں اگر کوئی شخص رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کا جویا ہو تو اسے کیوں روکا جائے؟ اور اس کی ممانعت میں کوئی نص بھی وارد نہیں ہوئی ہے۔ جمہور کا قول یہی ہے البتہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ پانچ دن مستثنیٰ کرتے ہیں جن میں عمرہ نہیں کیا جا سکتا،

(۱) یوم عرفہ کو عمرہ ناروا ہے،

(۲) یوم نحر (قربانی) کے موقع پر بھی نہیں کیا جا سکتا،

(۳) اور ایّام تشریق میں بھی نہیں،

امام ابو یوسف کے نزدیک یوم نحر اور ایام تشریق میں عمرہ ناروا ہے شافعیہ کے نزدیک منیٰ میں رمی کے لیے رات گزارنے والے کو ایام تشریق میں عمرہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سال میں ایک مرتبہ عمرہ کیا کرتے تھے آپ کا ارشاد ہے کہ

ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک یعنی اس درمیانی وقفہ کا کفارہ ہے،!!

حج کس سال فرض ہوا؟

اس باب میں کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت کے بعد مدینہ سے، حج وداع کے سوا، آپ نے کوئی حج نہیں کیا، اور یہ بات بھی متفقہ ہے کہ یہ واقعہ ۱۰ھ کا ہے۔

ترمذی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کیے، دو حج ہجرت سے پہلے، اور تیسرا ہجرت کے بعد مع عمرہ کے، ترمذی کہتے ہیں کہ حدیث سفیان کے پیش نظر یہ حدیث غریب ہے، وہ کہتے ہیں میں نے امام بخاری سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا، انھوں نے کہا، میں اس سے واقف نہیں، ایک اور روایت کے مطابق وہ اس حدیث کو محفوظ نہیں خیال کرتے،

جب فرضیت حج نازل ہوئی، تو بغیر کسی تاخیر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے چل کھڑے ہوئے، حج ۹ھ یا ۱۰ھ میں فرض ہوا، باقی رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ واتموا الحج والعمرۃ للہ تو یہ آیت ۶ھ میں حدیبیہ کے سال نازل ہوئی تھی، لیکن اس سے فرضیت حج نہیں ثابت ہوتی، اس میں صرف اتمام حج اور اتمام عمرہ کا حکم ہے، اور یہ مفہوم وجوب کا مقتضی نہیں ہے،

حج کے لیے آں حضرتؐ کی مدینہ سے روانگی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا عزم فرمایا اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپؐ حج کو تشریف لیے جا رہے ہیں تو سب نے تیاریاں شروع کر دیں، تاکہ آپ کا شرف معیت حاصل کریں، حوالی مدینہ کے لوگوں کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی گروہ در گروہ اسی مقصد سے آنا شروع ہو گئے راستے میں بھی، لوگوں کی جماعتیں، جو حد شمار سے خارج تھیں ساتھ ہوتی گئیں، آگے پیچھے، داہنے بائیں حد نظر تک خلقت نظر آ رہی تھی،

مدینہ سے آپؐ ظہر کے بعد روانہ ہوئے، یہ ذی قعدہ کا مہینہ تھا، ظہر کی چار رکعتیں پڑھ کر آپؐ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا، اور انہیں احرام، اور اس کے واجبات وسنن کی تعلیم دی، ابن حزم کہتے ہیں یہ جمعرات کا دن تھا، لیکن یہ بات صحیح نہیں آپؐ سنیچر کے دن حج کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔

احرام کے لیے الگ سے دو رکعتوں کی سند نہیں

غرض آپؐ نے مدینہ منورہ میں ظہر کی چار رکعت نماز ادا کی[1] پھر تیل ڈالا، لباس بدلا، چادر اوڑھی، اور ظہر و عصر کے مابین روانہ ہو گئے، مقام "ذوالحلیفہ" میں پڑاؤ کیا، یہاں عصر کی دو[2]

---

[1] یعنی پوری نماز پڑھی، قصر نہیں کیا (جعفری)

رکعتیں پڑھیں[1] شب یہیں گزاری، یہاں آپؐ نے پوری پانچ نمازیں پڑھیں، عصر، مغرب، عشاء، دوسرے دن کی فجر اور ظہر، تمام ازواج مطہرات ہمراہ تھیں، ایک ایک کرکے آپؐ سب کے ہاں تشریف لے گئے جب احرام باندھنے کا ارادہ کیا، تو غسل کیا، یہ غسل جنابت کے علاوہ تھا، ابن حزم نے غسل جنابت کے علاوہ کسی دوسرے غسل کا ذکر نہیں کیا ہے، یہ ترک ذکر یا تو سہواً ہے یا عدم ثبوت کی بنا پر،

ظہر کی دو رکعتیں (قصر) پڑھنے کے بعد مصلّے پر بیٹھے بیٹھے آپؐ نے تہلیل کی۔ اور آپؐ سے منقول نہیں کہ احرام کے لیے الگ سے دو رکعتیں پڑھی ہوں، (سوا فرض ظہر کے)

آنحضرتؐ کا یہ حج، حج قرآن تھا!

ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ آپؐ کا حج، دراصل حج قران تھا اور اس دعوے کے ثبوت میں بیس سے زیادہ حدیثیں ہمارے پاس موجود ہیں۔

منجملہ ان کے صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے جو قتیبہ نے لیث سے۔ انہوں نے نافع سے، انہوں نے ابن عمر سے روایت کی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حج کو عمرہ کے ساتھ ملا لیا، اور حج و عمرہ کے لیے ایک ہی طواف کیا۔

اسی طرح صحیح مسلم میں عمران بن حصین کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ جمع کیا، اس لیے کہ آپ جانتے تھے کہ یہ آپؐ کا آخری حج ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ میں اختلاف ہے

تمتع یا حج و عمرہ کا جمع کرنا، صحیحین (بخاری و مسلم) سے بھی ثابت ہے، سعید بن مسیب کی روایت ہے کہ مقام عسفان میں علی اور عثمان کا اجتماع ہوا، عثمان نے تمتع سے یعنی حج اور عمرہ کو جمع کرنے سے منع کیا۔

علیؓ نے کہا، "جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، اس سے تم روک کس طرح سکتے ہو؟"

عثمانؓ نے کہا، "اپنی یہ باتیں رہنے دو!"

علیؓ نے جواب دیا، "میں تمہیں کس طرح ایسی بات کرنے دوں؟ یہ نہیں ہو سکتا،

چنانچہ جب عثمان نے علی کو اپنی رائے پر مصر دیکھا تو حج اور عمرہ کو جمع کر لیا،

یہ تو مسلم کے الفاظ تھے، بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ علیؓ اور عثمانؓ میں اختلاف رائے پیدا ہو جب کہ

---

[1] یعنی پوری نماز نہیں پڑھی، قصر کیا۔ (جعفری)

یہ دونوں مقام عسفان میں تھے، یہ اختلاف تھا جمع تمتع کے بارے میں، علی نے کہا،
"تمہارے اس فعل کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اس سے لوگوں کو روکو، !"
پھر جب گفتگو بڑھی تو عثمان نے بات مان لی۔
بخاری ہی میں مروان بن حکم کی حدیث ہے کہ جب عثمانؓ نے تمتع یعنی حج وعمرہ کو جمع کرنے سے روکا، تو میں نے دیکھا کہ علی نے دونوں کو جمع کر لیا، اور بہ آواز بلند کہا،
"لبیک بحجۃ وعمرۃ، !"
پھر فرمایا۔ "کسی شخص کے کہنے سے میں سنت رسول اللہ علیہ وسلم ترک نہیں کر سکتا، !"
بخاری کی اس روایت سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں؛

— • حج وعمرہ کے ملانے (قرآن) کو، یعنی جمع کرنے کو یہ اصحاب "تمتع" کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

— • آں حضرتؐ سے قرآن یا تمتع ثابت ہے،

— • حضرت عثمان رضؓ کو بھی یہ فعل رسولؐ تسلیم تھا، ورنہ جب حضرت علیؓ نے انہیں ٹوکا تھا کہ آپ اس کام سے کیسے روک سکتے ہیں، جو رسول اللہؐ سے ثابت ہے تو حضرت عثمانؓ کو اگر اس واقعہ کی واقفیت سے انکار ہوتا تو صاف صاف انکار کر دیتے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے تردید نہیں کی بلکہ سنتِ نبوی کی اقتدا کی یعنی حج وعمرہ کو جمع کیا،

— • اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کی یہ سنت منسوخ نہیں ہوئی تھی،

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے، آخری عمرہ وہ تھا جسکے ساتھ آپ نے حج بھی جمع کر لیا تھا، یہ حج وداع کا واقعہ ہے،
تمتع سے مراد قرآن یعنی حج اور عمرہ کا ملانا ہے، اس باب میں احادیث تقریباً متفق علیہ ہیں اور کچھ اختلاف ہے تو بہت معمولی سا، صحابۂ کرام سے ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے تمتع کیا۔ اور یہ حضرات (صحابہ) تمتع سے مراد قرآن (یعنی حج و عمرہ کا ملانا) لیا کرتے تھے

....

عمران بن حصین کی روایت: قارن اور متمتع ایک ہیں

بخاری و مسلم میں مطرف نے حضرت عمران بن حصین کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ کو جمع کیا اور اس کام سے کبھی نہیں روکا، یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہوگئی، اور قرآن میں بھی ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے اس کا عدم جواز ثابت ہوتا ہو،

ایک اور روایت انہی عمران بن حصین کی ہے کہ رسول اللہ نے حج تمتع کیا۔ اور ہم نے بھی آپؐ کے ساتھ دونوں کو ملایا۔

اور یہ عمران اجل سابقین اوّلین میں شمار ہوتے ہیں، یہ خبر دیتے ہیں کہ آپؐ نے تمتع کیا۔ آپؐ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا، صحابہ کی زبان میں قارن، متمتع کو کہتے تھے، اسی طرح جملہ خلفائے راشدین یہ بات مانتے تھے، عمران نے اصح اسانید کے ساتھ روایت کی ہے کہ آں حضرتؐ نے حج و عمرہ کا قران کیا، جسے دوسرے الفاظ میں وہ تمتع کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اسی طرح انس صحابی ہیں جو کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حج و عمرہ کا ساتھ ساتھ تلبیہ کرتے دیکھا،

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تلبیہ

نماز ظہر کے بعد آپؐ نے بہ آواز بلند تلبیہ کیا، جو یہ تھا:

یعنی: اے پروردگار میں حاضر ہوں، حاضر ہوں، اے پروردگار، تیرا کوئی ساجھی نہیں، میں حاضر ہوں، بے شک ہر طرح کی حمد، اور نعمت کا تو ہی سزاوار ہے، حکومت اور فرماں روائی بھی تیری ہی ہے، کوئی تیرا ساجھی نہیں۔

یہ تلبیہ آپؐ نے بہ آواز بلند کیا۔ یہاں تک کہ تمام صحابہ نے اسے سن لیا۔ آپؐ نے حسب فرمان خداوندی انہیں یہ حکم دیا کہ وہ بھی زور زور سے تلبیہ کہیں۔

کیا محرم، محمل یا ہودج کا استعمال کر سکتا ہے؟

یہ سفر حج آپؐ نے سواری پر کیا، نہ محمل استعمال کیا، نہ ہودج، نہ عماری،

اس بارے میں کہ محرم (احرام باندھنے والے) کو آیا محمل، ہودج، یا عماری پر بیٹھنا چاہیے یا نہیں؛ اختلاف ہے، ایک قول جواز کا ہے، یہ امام شافعی، امام ابوحنیفہ، اور امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے، دوسرا قول ممانعت کا ہے یہ امام مالک کا مذہب ہے،

حج سے متعلق بعض اہم فقہی مسائل

آں حضرتؐ کی سنت طیبہؐ کے استنباط مسائل

اسی سفر حج کے مابین مقام ذوالحلیفہ میں حضرت ابوبکرؓ کی بیوی اسماء بنت عمیس کے ہاں زچگی ہوئی، یہ نومولود، محمد بن ابوبکر تھے،

رسول اللہ ؐ نے اسماء کو حکم دیا کہ وہ غسل کر لیں، سفر جاری رکھیں اور احرام باندھ لیں،

اس واقعہ سے تین ۳ سنتیں ثابت ہوئیں!

۱- محرم کے لیے غسل جائز ہے،

۲- محرم ہونے کے باوجود، وہ عورت غسل کر سکتی ہے جو ایام سے ہو

۳- جو عورت ایام سے ہو، اس کے لیے احرام باندھنا جائز ہے،

محرم صید حلال کا گوشت کھا سکتا ہے

اس کے بعد تلبیہ کے ساتھ پھر سفر جاری ہو گیا، مقام روحاء میں جب یہ قافلہ پہنچا تو ایک گورخر نظر آیا، آپؐ نے صحابہ سے فرمایا،

"اسے چھوڑ دو، ممکن ہے اس کا مالک آ جائے"!

اتنے میں مالک آ گیا، اور اس نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ اس گورخر کو قبول فرمایئے"!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا انھوں نے سب میں تقسیم کر دیا۔

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ:

— : محرم صید حلال کا گوشت کھا سکتا ہے، جو غیر محرم نے پیش کیا ہو بشرطیکہ وہ خاص اس

کے لیے شکار نہ کیا گیا ہو،

— کسی چیز کا ہبہ کرنا صرف مخصوص الفاظ ہی کے ذریعہ نہیں ہوتا مثلاً "میں نے یہ چیز آپ کو ہبہ کی"، بلکہ ایسے الفاظ سے بھی جائز ہے جن سے یہ مطلب نکلتا ہو،

— ایسا گوشت جس میں ہڈیاں بھی ہوں، اندازے سے تقسیم کیا جا سکتا ہے،

— صید کی ملکیت اثبات اور ازالۂ امتناع سے ثابت ہوتی ہے۔

— گورخر کا گوشت حلال ہے،

— تقسیم کا کام انجام دینے کے لیے توکیل (کسی کو اپنا وکیل بنانا) جائز ہے، ٭

قربانی اور متعلقہ مسائل

اونٹ اور گائے کا مسئلہ اس باب میں اختلاف ہے کہ ایک گائے اور اونٹ کتنے افراد کی جانب سے درست ہوگی۔ ایک قول میں سات آدمیوں کی طرف سے درست ہے یہ شافعیؒ اور احمدؒ کا قول ہے۔ ایک قول دس کا بھی ہے یہ اسحاق کا قول ہے۔ اور ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں مغانم تقسیم کیے تو اونٹوں کو دس کے برابر بتایا۔ اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی اور ازواج مطہراتؓ کی تعداد نو تھی۔ اور حضرت سفیانؓ نے ابو زبیر سے انہوں نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا۔ کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج میں دس آدمیوں کی طرف سے ایک اونٹ ذبح کیا۔ یہ حدیث مسلمؒ کی شرط پر ہے لیکن انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی بلکہ انہوں نے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، حج میں تہلیل کہہ رہے تھے ہمارے ہمراہ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ جب ہم مکہ پہنچے تو ہم نے کعبہ مکرمہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی، اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے میں شریک ہو جائیں۔ اور ہم میں سے ہر سات آدمیوں کی جانب سے ایک اونٹ کافی ہوگا۔ اور سند میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرمایا کہ ہم سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ قربانی کا موقع آیا۔ تو ایک گائے میں ہم سات آدمی اور ایک اونٹ میں دس آدمی شریک ہوئے (نسائی۔ ترمذی۔ حسن غریب) اور صحیحین میں انہی سے مروی ہے، کہ حدیبیہ کے سال ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک اونٹ سات آدمیوں اور ایک گائے بھی سات آدمیوں کی طرف سے قربانی کے لیے ذبح کی، اور حضرت حذیفہ فرماتے ہیں " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج کے موقع پر ایک گائے میں سات آدمیوں

—— کو شریک فرمایا۔ (مسند احمد)

ان احادیث کی تخریج تین وجوہ سے ہو سکتی ہے، یا تو یہ کہا جائے کہ سات کی احادیث بکثرت اور زیادہ صحیح ہیں۔ اور یا یہ کہا جائے گا۔ کہ غنائم کے سلسلہ میں اونٹ دس بکریوں کے برابر ہوگا۔ تاکہ تقسیم برابر رہے، لیکن قربانی کے معاملہ میں جبکہ اندازۂ شرعی مطلوب ہو۔ تو سات کی طرف سے درست ہوگا۔ اور یا یہ کہا جائے گا۔ کہ یہ (اندازے) اختلاف ازمنہ اور اختلاف اوطان کے سبب مختلف ہو جاتے ہیں۔ بعض مواقع پر اونٹ دس کے برابر تھا۔ تو آپؐ نے دس کی طرف سے فرما دیا۔ اور بعض اوقات سات کے برابر تھا۔ تو سات کی طرف سے درست بتایا۔

اور ابو محمد رح فرماتے ہیں۔ کہ آپؐ نے اپنی ازواج مطہراتؓ کی جانب سے ہدی کے طور پر ایک گائے ذبح فرمائی۔ اور قربانی کے طور پر ایک گائے ذبح فرمائی۔ اور اپنی جانب سے دو دنبے (بھیڑیں نر) قربانی کیے، اور اپنی جانب سے ترسیٹھ ہدی ذبح کیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں نحر کیا

اور انہیں بتایا۔ کہ منیٰ تمام کا تمام منحر (جائے قربانی) ہے۔ اور مکہ کا میدان راستہ بھی ہے اور منحر بھی ہے"

یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں۔ کہ نحر صرف منیٰ سے مختص نہیں۔ بلکہ مکہ کے میدان میں جہاں بھی نحر (قربانی) کر دی جائز ہے، جیسے آپؐ نے عرفہ میں وقوف کیا۔ تو فرمایا۔ میں نے یہاں وقوف کیا (لیکن)، ہمارا عرفات جائے وقوف ہے۔ اور آپؐ نے مزدلفہ میں وقوف کیا تو فرمایا۔ کہ میں نے یہاں وقوف کیا۔ (لیکن) مزدلفہ سب کا سب جائے وقوف ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ کہ کیا منیٰ میں آپؐ کے لیے کوئی بناء (خیمہ وغیرہ) بنا دیا جائے؟ تاکہ گرمی سے حفاظت ہو سکے۔ تو آپؐ نے فرمایا۔

"نہیں؟ یعنی ہر اس آدمی کے لیے جائے وقوف ہے جو وہاں پہلے پہنچ جائے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ (منیٰ) میں تمام مسلمانوں کا اشتراک ہے۔ اور جو بھی کسی جگہ پہلے پہنچ جائے، وہ وہاں کا زیادہ حقدار ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے کوچ کر جائے البتہ اس (جگہ) کا وہ مالک نہیں بن سکتا۔

قربانی کے بعد حلق

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نحر سے فارغ ہوئے تو حجام کو بلایا۔ اور سر کا حلق کرایا۔ اور حجام معمر بن عبداللہ استرا لیے آپ کے سر پر

کھڑے تھے، اس کے چہرے کو دیکھا اور فرمایا: اے معمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے اپنی کنپٹیوں پر اختیار دیا ہے حالانکہ تیرے ہاتھ میں استرا ہے۔

معمرؓ نے عرض کیا اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول، بے شک یہ مجھ پر اللہ کی نعمت ہے، آپؐ نے فرمایا: ہاں! (بے شک)

امام احمدؒ نے نیز بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں اسے روایت کیا ہے، اور بعض کا خیال یہ ہے، کہ حجام جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حلقِ راس کیا۔ وہ معمر بن عبد اللہ بن حنظلہ بن عوف ہیں۔

پھر آپؐ نے حجام سے فرمایا: لے (مونڈ) اور اپنی دائیں جانب کی طرف اشارہ فرمایا، جب وہ فارغ ہوا۔ تو آپؐ نے اپنے پاس والوں پر وہ بال تقسیم فرما دیے۔ پھر حلاق (حجام) کو اشارہ کیا۔ تو اسی نے بائیں طرف کا حلق کیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ ابو طلحہؓ یہاں ہے؟ چنانچہ موئے مبارک اُن کو عطا فرما دیے۔ اسی طرح صحیح مسلمؒ میں ہے۔ اور صحیح بخاریؒ میں حضرت ابن سیرینؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کروایا تو ابو طلحہؓ نے سب سے پہلے موئے مبارک حاصل کیے۔ اور یہ روایت مسلمؒ کی ہدایت کے مناقض نہیں، کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ابو طلحہؓ کو بھی دوسروں کی طرح دائیں طرف سے حاصل ہوئے، اور بائیں طرف سے مخصوص طور پر حاصل ہوئے۔ لیکن امام مسلمؒ نے حضرت انسؓ سے یہ بھی روایت نقل کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمرہ پر رمی کیا، اور قربانی کے جانور کو نحر کیا۔ اور حلق کیا۔ تو حلاق (حجام) کی طرف دائیں جانب (سر سے) بڑھائی، اُس نے حلق کیا پھر آپؐ نے ابو طلحہؓ انصاری کو بلایا۔ اور یہ (حصہ) انہیں عطا فرمایا۔ پھر آپؐ نے بائیں جانب اس کی طرف بڑھائی، اور فرمایا: کہ حلق کرو۔ (مونڈو) اس نے حلق کیا۔ تو آپؐ نے ابو طلحہؓ کو موئے مبارک عطا کر کے فرمایا: اسے لوگوں میں تقسیم کر دو۔

اس روایت میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ابو طلحہؓ کے حصہ میں دائیں طرف کے موئے مبارک آئے اور پہلی روایت میں بایاں حصہ مذکور تھا۔ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد مقدسی بتلاتے ہیں۔ مسلمؒ نے حفص بن غیاث اور عبد الاعلیٰ بن عبد الاعلیٰ سے انہوں نے ہشام بن حسان سے انہوں نے محمد بن سیرین سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا: آپؐ نے ابو طلحہ کو بائیں طرف کا حصہ عطا فرمایا۔ نیز انھوں نے سفیان عیینہ سے انہوں نے ہشام بن

حسان سے روایت کیا کہ آپؐ نے ابو طلحہؓ کو دائیں جانب کے بال عطا فرمائے۔ اور ابن عونؒ کی وہ روایت جو انھوں نے ابن سیرینؒ سے نقل کی ہے، میرا خیال ہے کہ وہ سفیان کی روایت کو قوی کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں، کہ ابن عون کی روایت سے ان کا مطلب یہ ہے جو ہم نے ابن سیرینؒ سے بخاری کے طریق پر نقل کیا۔ اور بتایا کہ ابو طلحہؓ نے اُس میں سبقت حاصل کی وہ ان سے مخصوص تھا۔ اور جس کا یہ خیال ہو کہ ابو طلحہؓ کے لیے جو حصہ مخصوص ہوا وہ بایاں تھا (واقعہ یہ ہے) کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا عام بھی پھر تخصیص فرمادی، اور عطا کرنے میں بھی آپ کی عادت طیبہ تھی۔ اکثر روایات کا یہی مطلب ہے۔ امام احمدؒ نے محمد بن زید کی حدیث نقل کی۔ انہیں ان کے والد نے بتایا۔ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جائے نحر میں موجود تھے۔ آپ قربانیاں تقسیم فرما رہے تھے تو قریش کے ایک آدمی کو کچھ نہ ملا۔ اور نہ اس کے ساتھی کو (کچھ ملا) پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑا سامنے رکھ کر سر کا حلق کروایا۔ اور اسے موئے مبارک عطا فرمائے۔ اس نے ان میں سے کچھ حصہ لوگوں کو تقسیم کر دیا۔ پھر آپؐ نے ناخن کتروائے۔ اور اس آدمی کے ساتھی کو دے دیے، اس نے بتایا۔ کہ آپؐ کے بال ہمارے پاس مہندی اور کسم میں رنگے ہوئے موجود ہیں۔ اور حلق کروانے والوں کے لیے تین بار بخشش کی دعا فرمائی۔ اور قصر کرانے والوں کے لیے ایک بار دعا فرمائی۔ نیز زیادہ تر بلکہ بہت ہی کثرت کے ساتھ صحابہؓ نے حلق کروایا۔ اور بعض نے قصر بھی کروایا۔ یہ وہی قول (پورا ہو رہا ہے)، کہ لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رؤسکم و مقصرین۔

یعنی بلاشبہ تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ اگر اللہ نے چاہا امن سے حلق کرواتے ہوئے اپنے سروں کا اور قصر کرواتے ہوئے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کا قول۔ کہ "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو احرام کے لیے احرام سے قبل اور حلال ہونے سے قبل خوشبو لگائی۔" یہ اس بات کی دلیل ہے حلق نسک میں سے ہے اور مطلقاً ممنوع نہیں۔

آں حضرتؐ کا طواف افاضہ

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل سوار ہو کر مکہ کی طرف تشریف لے گئے۔ اور طوافِ افاضہ کیا۔ یہی آپؐ کا طوافِ زیارت بھی تھا۔ یہی ابتدائی طواف تھا۔ اور اس کے علاوہ آپؐ نے کوئی طواف نہیں کیا۔

اس مسئلہ میں تین گروہوں کا اختلاف ہے۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے۔ کہ آپؐ نے دو طواف کیے ایک طواف قدوم اور دوسرا طواف افاضہ۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے۔ کہ چونکہ آپؐ قارن تھے۔ اس لیے آپؐ نے اس طواف کے ساتھ ساتھ سعی بھی کی۔

(تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ آپؐ نے اس دن طواف نہیں کیا بلکہ طوافِ زیارۃ کو رات تک موخر کر دیا۔

اس اشکال میں ہم صائب رائے پیش کرتے ہیں، اور ہم غلط فہمی کا سبب بھی واضح کرینگے اللہ تعالٰی ہی توفیق دینے والا ہے۔

اثرمؒ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے ابو عبداللہ سے دریافت کیا۔ کہ جب متمتع واپس ہو۔ تو کتنے طواف اور سعی کرے؟ انہوں نے فرمایا، کہ حج کے لئے طواف اور سعی کرے۔ اور پھر زیارت کے لیے طواف کرے۔

شیخ رہ مغنی میں فرماتے ہیں، کہ جب قارن اور مفرد یوم النحر سے قبل مکہ نہ پہنچ سکیں۔ اور نہ انہوں نے طوافِ قدوم کیا ہو۔ تو اس صورت میں دونوں کا یہی حکم ہے۔ کیونکہ وہ دونوں طوافِ زیارت سے طوافِ قدوم سے ابتدا کر رہے ہیں،

امام احمد رحمۃ اللہ نے اس پر نص بتائی ہے۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ جن لوگوں نے خانہ کعبہ اور صفا و مروہ کے عمرہ کا ارادہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے طواف کیا۔ پھر احرام اتارا۔ پھر منی سے واپس آ کر حج کے لیے دوسرا طواف کیا اور جنہوں نے حج و عمرہ اکٹھا ادا کیا۔ تو انہوں نے ایک ہی طواف کیا۔ اس لیے احمدؒ نے حضرت عائشہ رضؓ کے قول سے یہ سمجھا۔ کہ ان کا طواف حج کے لیے تھا۔ اور طوافِ قدوم تھا۔ فرمایا، کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ طوافِ قدوم مشروع ہے۔ اس لیے طوافِ زیارت اسے ساقط نہیں کرتا۔ جیسے مسجد میں داخل ہوتے وقت فرض نماز پڑھنے سے قبل تحیۃ المسجد کی حیثیت ہے۔

خرقی رہ نے مختصر میں لکھا ہے۔ کہ اگر متمتع ہو۔ تو اسے چاہیئے کہ کعبہ شریف کا سات چکر سے طواف کرے۔ جس طرح اس نے عمرہ کے لیے کیا تھا۔ پھر لوٹ آئے اور خانہ کعبہ کا زیارت کی نیت سے طواف کرے۔ اور یہی اللہ تعالٰی کا فرمان ہے۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ : یعنی اور انہیں چاہئے کہ وہ بیتِ عتیق (قبلہ مکرمہ)

کا طواف کریں۔

(اس سابقہ عبارت میں اشکال ہے) اور اس اشکال کا سبب یہ ہے کہ ام المومنین رضہ (عائشہ رضؓ) نے متمتع اور قارن میں فرق کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ حج قران والوں نے منیٰ سے واپس ہونے کے بعد ایک طواف کیا اور جن لوگوں نے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ انھوں نے منیٰ سے واپسی کے بعد حج کے ارادہ سے دوسرا طواف کیا" اس لیے یہ یقیناً طوافِ زیارۃ کے علاوہ کوئی اور طواف ہے۔ کیونکہ (طوافِ زیارت) میں قارن اور متمتع دونوں شریک نہیں۔ اس لیے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ شیخ ابو محمد رؒ نے (حضرت عائشہ رضؓ) کا قول متمتعین میں یہ دیکھا۔ کہ انھوں نے منیٰ سے واپسی کے بعد ایک اور طواف کیا۔ (شیخ رؒ) نے فرمایا؛ اس میں کوئی ایسی عبارت نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو۔ کہ انھوں نے دو طواف کیے۔ (اس مقام پر) شیخ رہ کا اعتراض درست ہے۔ لیکن اشکال پھر بھی رفع نہیں ہو سکتا۔ ایک گروہ تو یہ کہتا ہے: کہ یہاں عروہ یا ان کے لڑکے ہشام کی طرف سے اضافہ کلام ہے۔ جو الفاظ حدیث میں داخل ہو گیا۔ اور اب الگ ہو کر معلوم نہیں ہوتا۔

"اگر یہ (روایت درست ہو) تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا۔ کہ یہ مرسل ہے اور اس طرح بھی اشکال دور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے صائب رائے یہی ہے۔ کہ جس طواف کے متعلق حضرت عائشہ رضہ نے بتایا اور متمتع و قارن کے درمیان فرق کیا۔ اسے صفا اور مروہ کے درمیان کا طواف (سعی) سمجھا جائے۔ نہ کہ کعبہ مشرفہ کا طواف۔ اس طریقہ پر تمام اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ ام المومنین رضؓ نے قران والوں کے متعلق بتایا کہ انھوں نے (صفا و مروہ) کے درمیان ایک ہی طواف پر اکتفا کیا۔ اور یوم النحر کو دوسرا طواف ان کی طرف منسوب نہیں ہوا۔ یہی حق ہے۔ اور متمتعین کے متعلق فرمایا؛ کہ انھوں نے (صفا و مروہ) کے درمیان منیٰ سے واپسی کے بعد حج کے لیے دوسرا طواف کیا۔ یہ پہلا عمرہ کے لیے تھا۔ جمہور علماء کا بھی یہی قول ہے۔ اور حدیث کا یہ مطلب ان کی طرف سے دوسری مروی حدیث کے مطابق ہو جاتا ہے۔ جو انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ذکر کیا۔

"تجھے تیرے حج اور عمرہ کے لیے خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان (سعی) کافی ہے اور (حضرت عائشہ رضؓ) قارن تھیں۔ نیز یہ تاویل جمہور علماء کے مطابق بھی ہے۔ لیکن یہاں حضرت جابر رضؓ کی روایت سے اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ جو صحیح مسلم میں مروی ہے: کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضؓ نے صفا اور مروہ کے درمیان ایک ہی طواف کیا" اب جو یہ کہتا ہے۔ کہ متمتع کو ایک ہی سعی کافی ہے۔ یہ روایت اس کے مطابق ہے۔ ایک روایت امام احمد رحؒ سے بھی (اسی کی حمایت میں)

منقول ہے۔ اس پر ان کے بیٹے عبداللہ وغیرہ کی نص مذکور ہے۔ اس بنا پر کہا جائے گا۔ کہ حضرت عائشہ رضہ نے ثابت کیا اور حضرت جابر رضہ نے نفی کی۔ اور ثابت کرنیوالا نفی کرنے والے سے مقدم ہوتا ہے: یا یوں کہا جائے گا کہ حضرت جابر رضہ کا مطلب تھا۔ کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج قران کیا۔ اور ابوبکر، عمر، طلحہ، علی رضی اللہ عنہم کی طرح ہدی لے گئے۔ اور بائیں جانب چلے۔ تو انہوں نے ایک ہی سعی کیا۔ اور اس سے عام صحابہ رضہ مراد نہیں ہو سکتے۔ یا حضرت عائشہ رضہ کی حدیث معلول سمجھی جائے گی۔ یعنی اس میں قول ہشام داخل ہے (ام المومنین رضہ) کی روایت میں علمائے کرام کے یہ تین طرق ہیں:

فقہا اور اکابر کے اقوال

اور جس کا خیال یہ ہے کہ متمتع حج کا احرام باندھنے کے بعد اور منی کی طرف نکلنے سے قبل طواف کرے اور قدوم کی سعی کرے۔ یہ اصحاب شافعی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور میں نہیں جانتا کہ یہ منصوص ہے یا نہیں۔ ابو محمدؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا اور کسی صحابی رضہ نے کیا۔ نہ آپؐ نے اس کا حکم فرمایا اور نہ کسی نے نقل کیا ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ میں اس بات کو ضروری نہیں سمجھتا۔ کہ اہلِ مکہ حج کا احرام باندھ لینے کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کریں یا طواف کریں یہاں تک کہ منی سے واپس آجائیں۔ (منی سے واپس ہونے کے بعد یہ لازم ہیں) اور ابن عباس رضہ کے قول پر جمہور علماء مالکؒ۔ احمدؒ ابو حنیفہؒ اور اسحاق وغیرہ کا فتویٰ ہے اور جنہوں نے اس مذہب کو پسند کیا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ جب (اہلِ مکہ) حج کا احرام باندھ لے۔ تو وہ آنے والے کی طرح ہو جاتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ طواف کرے اور قدوم کے لیے سعی کرے۔ ان کا کہنا ہے، کہ طوافِ اوّل عمرہ کی طرف سے تھا۔ اب طواف قدوم باقی رہ گیا۔ جو اس نے ابھی تک نہیں کیا۔ اس لیے احرام حج کے بعد اس کے لیے یہ مستحب ہے۔

یہ دونوں دلیلیں ضعیف اور کمزور ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے جب عمرہ کا طواف کیا تو آپ قارن تھے گویا آپؐ کے طواف۔ نے طوافِ قدوم سے مستغنی کر دیا، جیسے کوئی مسجد میں داخل ہو۔ اور جماعت کھڑی دیکھے۔ اب اس کے داخل ہونے پر وہ (جماعت) ہی تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہوگی۔ اور اس سے مستغنی کر دے گی۔ نیز صحابہ رضہ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کا احرام باندھا۔ تو انہوں نے اس کے بعد طواف نہیں۔ حالانکہ ان میں سے زیادہ تر متمتع تھے۔

اور حسن نے امام ابو حنیفہ رحہ سے روایت کیا ہے۔ کہ اگر وہ زوال سے قبل ترویہ کے دن احرام باندھتے۔ طواف کرتے اور سعی قدوم کر لیتے اور اگر زوال کے بعد احرام باندھتے۔ تو طواف نہ کرتے۔ اور

انہوں نے دونوں اوقات میں فرق کیا۔ اس طرح کہ وہ زوال کے فوراً بعد منیٰ کی طرف نکل گئے۔ چنانچہ خروج کے باعث وہ کسی دوسری طرف مشغول نہ ہوئے (لیکن) اگر زوال سے قبل ہوتا تو نہ نکلتے۔ بلکہ طواف کرتے۔ ابن عباس رضؓ اور جمہور کا قول ہی صحیح اور صحابہؓ کے عمل کے مطابق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ہی توفیق ہے۔

آپؐ نے دن میں طواف کیا

امام بیہقی رحؒ فرماتے ہیں۔ کہ ان روایات میں صحیح تر نافع رحؒ کی حدیث ہے۔ جو انہوں نے حضرت ابن عمر رضؓ سے نقل کی اور نیز حضرت جابر رضؓ کی حدیث اور حضرت ابی سلمہ کی حدیث جو انہوں نے حضرت عائشہ رضؓ سے نقل کی ہے۔ یعنی آپؐ نے دن کو طواف کیا۔

میں کہتا ہوں۔ کہ طواف کے تسمیہ (نام رکھنے) سے غلطی پیدا ہوگئی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف وداع کو رات تک موخر کر دیا۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضؓ سے ثابت ہے۔ انہوں نے بتایا۔ کہ ہم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے۔ اس طرح حضرت عائشہ رضؓ نے حدیث ذکر کی حتیٰ کہ بتایا۔ " ہم محصب میں اترے تو آپؐ نے عبدالرحمان بن ابوبکر رضؓ کو بلایا۔ اور فرمایا۔

حرم سے اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ نکلو۔ پھر طواف سے فارغ ہو جاؤ۔ اس کے بعد میرے پاس یہاں محصب میں واپس پہنچ جاؤ۔

فرماتی ہیں کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے عمرہ پورا کر دیا۔ اور ہم نصف شب کے وقت طواف سے فارغ ہوئے۔ پھر ہم آپؐ کے پاس محصب آ گئے۔

آپؐ نے دریافت فرمایا، تم دونوں فارغ ہو گئے؟ ہم نے عرض کیا جی ہاں!

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ تو آپؐ خانہ کعبہ کے پاس سے گزرے۔ اور اس کا طواف کیا۔ پھر اس کے بعد آپؐ نے مدینہ کی طرف رخ مبارک کر کے سفر شروع کر دیا۔ اس طرح یہ وہ طواف ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف شب تک موخر کر دیا تھا۔ اور ابو زبیر یا جس نے اسے روایت کیا اس نے غلطی کی۔ اور بتا دیا۔ کہ یہ طواف زیارت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس طواف میں اور نہ طواف وداع میں رمل کیا۔ بلکہ آپؐ نے طواف قدوم کیا

تکمیل طواف کے بعد زمزم پر تشریف آوری

اور لوگ پانی پی رہے تھے۔ آپؐ نے اگر لوگ تم پر غالب نہ آ جاتے تو میں اترتا۔ اور تمہارے ساتھ پیتا۔ پھر انہوں نے آپؐ کو ڈول دیا۔ آپؐ نے کھڑے ہو کر پیا۔ کہتے ہیں

کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت اس عمل رسول سے منسوخ ہو گئی۔ بعض کہتے ہیں۔" بلکہ یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ نہی اختیاری ہے۔ اور ترک اولیٰ بعض کے نزدیک فعل ضرورتاً تھا اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

کیا آپؐ اس طواف میں سوار تھے یا پیادہ ؟ تو صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنی سواری پر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اور آپؐ اپنے عصائے مبارک سے حجر اسود استلام (چھونا) کر رہے تھے۔ تاکہ لوگوں کو دکھا سکیں۔ اور لوگ آپؐ سے (مسائل) دریافت کر سکیں۔ کیونکہ انہوں نے آپؐ کو گھیر رکھا تھا۔ اور صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے فرمایا: کہ حجۃ الوداع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ ہی پر طواف کیا۔ اور آپؐ عصائے مبارک سے استلام (چھونا) کر رہے تھے۔ اور یہ طوافِ وداع نہ تھا کیونکہ یہ رات کا وقت تھا۔ اور وہ سب سے طوافِ قدوم بھی نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ طواف قدوم میں صحیح روایت سے رمل ثابت ہے۔ اور یہ بھی کسی نے نہیں کہا۔ کہ سواری نے آپؐ کو لیکر رمل کیا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے خود رمل کیا۔ دوسرے قول عمر بن شرید ہے۔ کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ طواف کیا۔ تو آپؐ کے قدمِ مبارک زمین پر ہوں گے۔ یہاں تک کہ آپؐ ایک گروہ کے پاس تشریف لے آئے۔ اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ جب صحابہؓ نے آپؐ کے ہمراہ طواف کیا۔ تو واپسی تک آپؐ کے قدم مبارک زمین سے نہ لگے۔ اس سے طواف کی دو رکعتوں کی نفی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ان کی حالت معلوم ہی ہے۔

آپ کی منیٰ کی طرف تشریف آوری

اس میں اختلاف ہے۔ کہ آپؐ نے اس دن نماز کہاں پڑھی؟

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نحر (قربانی) کے دن تشریف لے گئے۔ پھر واپس ہوئے۔ اور منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اور صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ بالکل اسی طرح حضرت عائشہؓ کی روایت ہے ان دو اقوال میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں اختلاف ہے۔

ابو محمد بن حزمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اور جابرؓ کا قول اولیٰ ہے۔ اور ایک جماعت نے ان کا اتباع کیا ہے۔ اس قول کو کئی طرح سے ترجیح دی گئی۔ ایک یہ کہ یہ دو راویوں کی روایت ہے۔ اور یہ صورت ایک سے بہتر ہے۔ دوسرے حضرت عائشہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ تمام لوگوں سے اخص ہیں اور انہیں وہ قرب و تخصیص حاصل ہے۔ جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ تیسرے حج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت جابر رضؓ کی سیاقِ حدیث اوّل سے آخر تک سب سے زیادہ مکمل ہے اور انہوں نے اس واقعہ کو اس اہتمام سے حفظ وضبط کیا ہے، کہ اس کی جزئیات بلکہ دو امور تک جو مناسکِ (حج) سے غیر متعلق ہیں۔ انہیں بھی یاد رکھا ہے، یعنی راستہ میں اجتماع کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول اور پھر وادی میں آپ کی قضائے حاجت اور خفیف سا وضو، اب جس نے اس قدر یاد رکھا ہے۔ اس نے یقیناً یوم النحر کو مقام نماز زیادہ اہتمام سے یاد رکھا ہوگا۔

دوسرے گروہ نے بعض امور کی بنا پر حضرت ابن عمر رضؓ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ مثلاً یہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ تو صحابہ رضؓ نے بھی اکیلے یا چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں منیٰ میں نماز نہیں پڑھی۔ انہیں تو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا واجب تھا۔ جو آپؐ کی طرف سے نائب ہو۔ اور یہ بات کسی نے نقل نہیں کی۔ اور نہ کسی نے یہ کہا ہے۔ کہ آپؐ نے (فلاں) کو نائب مقرر کیا۔ جو انہیں نماز پڑھائے۔ دوسرے اگر آپؐ نے مکہ میں نماز پڑھی ہوتی۔ تو آپؐ کے پیچھے اہل مکہ میں سے کچھ مقیم لوگ بھی ضرور ہوں گے۔ اور آپؐ نے انہیں اپنی اپنی نمازیں مکمل کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ لیکن یہ منقول نہیں۔ کہ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سلام کے بعد اپنی اپنی نمازیں مکمل کیں۔ جب یہ منقول نہیں بلکہ اس کی مکمل نفی معلوم ہے۔ تو پتہ چلا۔ کہ آپؐ نے مکہ میں اس وقت نمازِ (ظہر) نہیں پڑھی۔ تیسرے حضرت ابن عمر رضؓ کی حدیث متفق علیہ ہے۔ اور حضرت جابر رضؓ کی روایت مسلم کے افراد میں سے ہے۔ اس لیے حضرت ابن عمر رضؓ کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اور چونکہ اس کے راوی زیادہ ثقہ و احفظ ہیں۔ اس لیے حاتم بن اسماعیل کی حفظ عبید اللہ کے مقابلہ میں اور جعفر کی نافع کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے؟ چوتھے حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث وقتِ طواف سے متعلق مضطرب ہیں۔ کیونکہ ان سے یہ روایت تین طرق سے مروی ہے۔ ایک یہ کہ آپؐ نے دن کو طواف کیا۔ دوسرے آپؐ نے رات تک طواف موخر کر دیا۔ تیسرے یہ کہ آپؐ دن کے آخری حصہ میں چلے۔ چنانچہ اس میں وقت افاضہ اور جائے نماز ٹھیک طور پر متعین نہیں، بخلاف ابن عمر رضؓ کے (کہ وہاں ہر بات متعین ہے) پانچویں حضرت عائشہ رضؓ کی روایت واضح نہیں۔ کہ آپؐ نے مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم دن کے آخر میں چل پڑے اور آپؐ ظہر کی نماز

پڑھ چکے تھے!" پھر آپؐ منیٰ کی طرف تشریف لائے۔ اور وہاں ایام تشریق کی راتوں میں ٹھہرے رہے۔ یہاں تک کہ جب سورج زائل ہو جاتا تو آپ ہر جمعہ کو سات کنکر مارتے۔ اس لیے (روایت حضرت عائشہ رض) میں اس بات کی صراحت نہیں کہ آپؐ نے مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ بخلاف حضرت ابن عمر رض کی روایت کے کہ یہ واضح طور پر اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نحر کے دن چلے۔ پھر آپ نے واپس آتے ہوئے منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اس لیے جس حدیث پر محدثین متفق ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اس حدیث کی کیا حیثیت ہے جس سے استدلال میں ان کا اختلاف ہے؟

اور اسی دن حضرت عائشہ رض نے ایک طواف اور ایک سعی کی۔ اور یہ (ایک طواف اور ایک سعی) ہی نے ان کے حج و عمرہ کے لیے کفایت کیا۔ نیز حضرت صفیہ رض نے طواف کیا تو اس کے بعد وہ ایام سے ہو گئیں۔ تو انہیں طواف وداع کے لیے یہ طواف کافی ہو گیا۔ چنانچہ وداع کا (طواف) نہیں کیا۔ اس طرح عورت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سنت مقرر ہو گئی۔ کہ اگر حج قران میں عورت طواف (وداع) سے قبل ایام سے ہو جائے، تو اسے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔ اور اگر طواف افاضہ کے بعد ایام سے ہو، تو طواف وداع کی جانب سے یہ کافی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی دن منیٰ میں تشریف آوری

یہاں رات گزاری جب صبح ہوئی تو زوال آفتاب تک انتظار کیا۔ جب (آفتاب) ڈھل گیا۔ تو آپؐ جمار کی طرف پاپیادہ چل پڑے۔ اور سوار نہ ہوئے۔ اور جمرہ اولیٰ سے ابتدا کی جو مسجد خیف سے متصل واقع ہے۔ آپؐ نے اسے ایک ایک کر کے سات کنکریاں ماریں۔ اور ہر کنکری پر آپ اللہ اکبر کہتے جاتے پھر جمرہ سے بڑھ کر اس کے سامنے آ گئے۔ اور قبلہ رخ کھڑے ہو گئے۔ پھر ہاتھ اٹھا کر سورۂ بقرہ کے برابر طویل دعا مانگی۔ اس کے بعد وسطی جمرہ کی طرف تشریف لائے اس پر ویسے ہی کنکریاں ماریں۔ پھر وادی کے متصل بائیں طرف اترے اور قبلہ رخ کھڑے ہو کر اور ہاتھ اٹھا کر پہلے کی طرح طویل دعا مانگی۔ اس کے بعد آپؐ تیسرے جمرہ کی طرف تشریف لائے۔ یہ جمرۂ عقبہ کہلاتا ہے۔ آپؐ وادی کے درمیان میں اور جمرہ کے بالکل مقابل آ گئے۔ اس طرح کہ کعبہ کو بائیں طرف منیٰ کو دائیں طرف کیا۔ اور (جمرہ عقبہ) کو سات کنکریاں ماریں۔ اور جہلاء کے فعل کی طرح اوپر

کے حصہ پر نہیں ماریں - اور نہ اسے دائیں جانب کیا - اور رمی کے وقت آپؐ نے قبلہ کی طرف رخ کئے رکھا - جیسا کئی فقہاء سے مروی ہے - جب آپؐ نے رمی مکمل کر لی - تو فوراً واپس تشریف لائے - اور وہاں ٹھہرے نہ رہے - ایک قول یہ ہے - کہ آپؐ پہاڑ کے پاس جگہ کی قلت کے باعث (نہ ٹھہرے) اور زیادہ صحیح قول یہ ہے - کہ آپ کی دعا اس رسم سے فارغ ہونے سے قبل عبادت میں داخل تھی - چنانچہ جب آپؐ نے جمرۂ عقبہ کی رمی کر لی - تو فراغت سے قبل عبادت کے اندر رہی رمی اور دعا دونوں چیزیں مکمل ہو گئیں - اور عبادت کے اندر کی دعا عبادت سے فارغ ہونے کے بعد کی دعا سے افضل ہوتی ہے - نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں بھی یہی سنت طیبہ تھی - کہ آپ نماز کے اندر ہی دعا کیا کرتے - اور بعد میں آپ سے ثابت نہیں ہے - کہ آپؐ دعا کرنے کے (مسلسل) معتاد ہوں - اور جس نے آپؐ سے (دعا بعد نماز) روایت کی - اس نے غلط کہا - اور یہ بھی غیر صحیح روایت ہے کہ آپؐ سلام کے بعد عارضی سی دعا کرتے - اس کی صحت میں مشکوک ہے - الغرض اس میں کوئی شک نہیں آپ کی اکثر دعائیں اور جو آپؐ نے حضرت صدیق رضؓ کو تعلیم دی تھی - وہ بھی نماز کے اندر ہی تھی - اور حضرت معاذ بن جبل کی حدیث کہ "ہر نماز کے آخر میں اسے نہ بھلانا:

اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک : یعنی ! اے اللہ اپنے ذکر کرنے شکر کرنے اور اپنی حسن عبادت کرنے میں میری نصرت فرما !

اس لیے دبر الصلوٰۃ سے مراد نماز کا آخری حصہ ہے - جیسا دبر الطیران کا لفظ ہے - اور کبھی سلام کے بعد بھی مراد ہوتا ہے - جیسا آپؐ کا یہ ارشاد کہ ہر نماز کے بعد تسبیح کہو (حدیث)

رمی نماز ظہر سے پہلے یا بعد؟

میرے دل میں ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہا - کہ آپ نماز ظہر سے قبل رمی کرتے تھے یا بعد میں ؟ غالباً آپؐ نماز سے قبل ہی رمی کرتے تھے - پھر واپس آ کر نماز ادا کرتے - کیونکہ جابرؓ وغیرہ نے بتایا ہے ، جب سورج ڈھل جاتا تب آپؐ رمی کرتے - نیز ایام منیٰ میں رمی کرنے کا وقت ایسا ہی ہے جیسا نحر کے دن طلوع آفتاب کا معاملہ ہے - اور یوم النحر کو جب رمی کا وقت آجاتا - تو آپؐ اس دن اس سے زیادہ کسی چیز کو عبادات پر مقدم نہ رکھتے - کیونکہ ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا - کہ جب سورج ڈھل جاتا - تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمار فرماتے - ابن ماجہؒ نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے - کہ جب آپؐ رمی سے فارغ ہو جاتے

توظہر کی نماز ادا فرماتے، ترمذیؒ نے اسے حسن بتایا ہے لیکن ترمذیؒ کے اسناد میں حج بن ارطاۃ ہے اور ابن ماجہؒ کے اسناد میں ابراہیم بن عثمان بن شیبہ ہے، جن سے استدلال نہیں ہوتا۔ لیکن اس مسئلہ میں اس کے علاوہ کوئی اور روایت نہیں امام احمدرحہ نے نقل کیا ہے کہ آپ نحر کے موقع پر سوار ہو کر رمی کرتے۔ اور ایام منیٰ میں جانا اور آنا پیدل ہوتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج میں دعا کے وقفات تھے وقفہ اوّل صفا پر۔ وقفہ دوم مروہ پر۔ سوم عرفہ میں چہارم مزدلفہ میں۔ پنجم جمرۂ اولیٰ کے قریب۔ اور ششم جمرۂ ثانیہ کے قریب۔

منیٰ میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا خطبہ

اپنی وفات کی پیش گوئی نحر کے دن کا خطبہ گذر چکا ہے اور دوسرا ایام تشریق کے وسط میں ارشاد فرمایا، ایک روایت میں یہ نحر کا دوسرا دن تھا جو وسطی دن ہوتا ہے اور جو اسی کا قائل ہے اس نے سرا بنت نبہان کی روایت سے استدلال کیا ہے۔

فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا "کیا تم جانتے ہو آج کونسا دن ہے؟

فرماتی ہیں کہ وہ دن تمہارے قول کے مطابق یوم الرؤس تھا۔

صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا یہ ایام تشریق کا وسطی دن ہے۔

پھر آپؐ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کونسا شہر ہے؟

صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، یہ جگہ مشعرِ حرام ہے، پھر فرمایا کہ شاید اب دوبارہ میں تم سے نہ مل سکوں، یاد رکھو تمہارے خون، تمہارے مال، تمہاری آبرو تم پر اسی طرح حرام ہیں جیسے تمہارے اس شہر میں آج کے دن کی حرمت ہے۔ یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔ پھر وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پرسش کرے۔ خبردار تمہارا قریب دور والے کو (یہ بات) پہنچا دے۔ خبردار، کیا میں نے پہنچا دیا۔

اور جب ہم مدینہ واپس آئے تو کچھ ہی مدت گذری کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے (ابوداؤد)

یوم الرؤس سے مراد بالاتفاق نحر کا دوسرا دن ہے۔

سورۂ "فتح" کا نزول اور امام بیہقیؒ نے موسیٰ بن عبیدہ ربذی سے حدیث نقل کی ہے۔ انھوں نے

صدقہ بن یسار سے انھوں نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایام تشریق کے وسط میں سورہ (اذا جاء نصر اللہ والفتح نازل ہوئی اور معلوم ہو گیا۔ کہ یہ وداع (کا حج ہے)۔

چنانچہ آپؐ نے اپنی سانڈنی قصویٰ کو کوچ کا حکم دیا۔ وہ چل پڑی اور لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا، اے لوگو! الخ پھر خطبہ روایت کیا۔ یہیں آپؐ نے عباس بن عبدالمطلب کے تعاقب حجاج کی اجازت طلب کی جو مرحمت فرمادی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن میں جلدی نہیں فرمائی، بلکہ دیر کی اور ایام تشریق میں رمی کے تین دن پورے کیے اور بدھ کو ظہر کی نماز پڑھ کر آپؐ محصب کی طرف تشریف لے گئے۔ یہ ایک ریگستانی میدان ہے خیف بنی کنانہ کے قریب۔ یہاں آپؐ نے دیکھا کہ ابو رافعؓ نے آپؐ کا خیمہ نصب کر دیا ہے۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نہیں دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے انھیں یہ توفیق ہوئی تھی۔ آپؐ نے یہاں ظہر عصر مغرب اور عشا کی نماز ادا فرمائی اور کچھ دیر سو گئے۔ پھر آپؐ مکہ تشریف لائے اور رات کو سحری کے وقت طوافِ وداع کیا۔ اور اس طواف میں آپؐ نے رمل نہیں کیا۔ پھر آپؐ مدینہ تشریف لے گئے اور محصب کی طرف واپس نہیں ہوئے۔

تحصیب (محصب میں اترنے) کے متعلق سلف میں اختلاف ہے کہ آیا یہ سنت ہے یا اتفاقاً منزل بن گئی؟ اس مسئلہ میں دو قول ملتے ہیں۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ یہ حج کے سنن میں سے ہے کیونکہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب منیٰ سے جانے کا ارادہ کیا تو فرمایا۔ ہم کل ان شاء اللہ خیف بنی کنانہ میں اتریں گے جہاں (کفار نے) کفر پر قسم کھائی تھی، یعنی اسی محصب میں۔

یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ قریش اور بنی کنانہ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف قسم کھائی کہ نہ ان سے نکاح کریں گے اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق رکھیں گے جب تک کہ وہ آپؐ کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ اس لیے حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ شعائر اسلام کے اظہار کا ارادہ فرمایا، جہاں (کفار) نے کفر و شرک، اللہ اور اس کے رسول کے خلاف دشمنی کا اظہار کیا تھا۔

اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت طیبہ تھی کہ کفر و شرک کے مقامات پر شعائر توحید قائم فرمائے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لات و عزیٰ کے مقامات پر مسجد طائف بنائی جائے۔

اور صحیح مسلم میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی یہاں

اترتے تھے اور مسلم کی ایک روایت میں ان سے مروی ہے کہ یہ تحصیب کو سنت سمجھتے تھے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ (حضرت ابن عمرؓ) یہاں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز پڑھتے تھے، اور سو جاتے تھے اور پھر فرمایا کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح کیا تھا۔

دوسرے اکابر ابن عباسؓ۔ عائشہؓ کا خیال یہ ہے کہ یہ سنت نہیں بلکہ اتفاقاً منزل بن گئی

تین قابل بحث مسائل

ایک یہ کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر کعبہ کے اندر داخل ہوئے یا نہیں؟

دوسرے کیا آپؐ نے (طواف) وداع کے بعد ملتزم میں وقوف کیا؟

تیسرے یہ کہ کیا آپؐ نے وداع کی شب کو صبح کی نماز مکہ میں پڑھی یا اس سے باہر پڑھی؟

پہلے مسئلہ کے متعلق بیشتر فقیہہ کا خیال یہ ہے کہ آپؐ حج کے موقع پر کعبہ میں داخل ہوئے، اور زیادہ تر لوگ دخول کعبہ کو اقتدائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا پر سنن حج میں شمار کرتے ہیں حالانکہ جہاں تک حدیث سے واضح ہوتا ہے بات یہ ہے کہ نہ حج نہ عمرہ کے موقع پر آپؐ کعبہ میں داخل ہوئے، بلکہ فتح مکہ کے سال کعبہ مشرفہ میں داخل ہوتے۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے، فرمایا کہ فتح مکہ کے سال نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسامہؓ کی اونٹنی پر داخل ہوئے اور کعبہ کے صحن میں اونٹنی کو بٹھایا۔ پھر آپؐ نے عثمان بن طلحہ کو چابی لانے کا حکم دیا۔ وہ لے کر حاضر ہوا اور دروازہ کھولا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ اسامہؓ۔ بلالؓ اور عثمان بن طلحہ اندر داخل ہوئے، اور ان پر دیر تک دروازہ بند کر دیا گیا۔ پھر جب کھولا تو عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے سبقت کی اور حضرت بلالؓ کو دروازے پر دیکھا۔ میں نے دریافت کیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں نماز پڑھی؟

انھوں نے بتایا، دو مقدم ستونوں کے درمیان۔ راوی کہتے ہیں کہ میں یہ معلوم کرنا بھول گیا کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔

دوسرا مسئلہ، ملتزم میں وقوف

مروی ہے کہ آپؐ نے یہ فتح کے دن کیا سنن ابی داؤد میں عبدالرحمٰن بن ابی صفوان سے منقول ہے، فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو میں چلا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو کعبہ سے باہر دیکھا اور وہ باب سے لے کر حطیم تک استلام رکن کر رہے تھے۔ انھوں نے کعبہ پر اپنے رخسار رکھ دیئے اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تھے۔

اور ابو داؤد نے عمرو بن شعیب سے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے دادا سے روایت کرتے ہوئے فرمایا: کہ میں نے حضرت عبداللہ رضؓ کے ہمراہ طواف کیا۔ جب ہم کعبہ کے پچھلی جانب پہنچے تو میں نے کہا کیا آپ رضؓ تعوذ نہ کریں گے؟

انھوں نے کہا، نعوذ باللہ من النار۔ "ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں آگ سے (یعنی تعوذ کیا) پھر وہ چل پڑے، حتیٰ کہ حجر اسود کا استلام کیا۔ پھر باب اور رکن کے درمیان کھڑے ہو گئے اور اپنے سینہ، پیشانی، بازوؤں اور ہتھیلیوں کو اس طرح رکھ دیا اور انھیں خوب پھیلا دیا (یعنی دیوار سے چپک گئے) اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا۔

اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپؐ نے وداع کے وقت کیا ہو۔ یا کسی دوسرے وقت میں یہ واقعہ ہوا ہو لیکن مجاہدؒ اور شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ طوافِ وداع کے بعد ملتزم میں کھڑا ہو۔ اور دعا کرے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ رکن اور باب کے درمیان التزام کیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے کہ ان دونوں کے درمیان جو بھی التزام کر کے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اسے وہی کچھ ہی دے گا۔

تیسرا مسئلہ، شب وداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز صبح کی جگہ

صحیحین میں حضرت ام سلمہ رضؓ سے مروی ہے، فرمایا کہ میں نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے تکلیف ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کے پیچھے سے سوار ہو کر طواف کر لو۔

فرماتی ہیں کہ میں نے طواف کیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خانہ کعبہ کے ایک حصہ میں نماز پڑھ رہے تھے اور آپؐ والطور وکتاب مسطور کی تلاوت فرما رہے تھے۔

اس کے متعلق یہ بھی احتمال ہے کہ یہ صبح کی نماز یا کوئی دوسری نماز ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ طوافِ وداع یا کسی دوسرے موقع پر ہو۔ ہم نے اس پر غور کیا تو صحیح بخاریؒ میں یہ واقعہ مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا اور ام سلمہ رضؓ نے ابھی تک کعبہ مشرفہ کا طواف نہ کیا تھا۔ اب (ام سلمہ رضؓ) نے جانے کا ارادہ کیا، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا جب کہ صبح کی نماز قائم ہو گئی اور لوگ نماز پڑھ رہے ہیں تو تم اپنے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کر لو۔ چنانچہ انھوں نے (طواف) کیا اور نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ وہ بھی چل پڑیں"۔

یہ بالکل ناممکن ہے اس لیے کہ اگر یہ یوم النحر تھا تو بلاشبہ یہ طوافِ وداع ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے اس دن صبح کی نماز کعبہ کے پاس پڑھی اور ام سلمہ رضؓ نے سنا کہ آپؐ "الطور" کی تلاوت فرما رہے تھے۔

حج وداع کے بعد

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی طرف کوچ

کیا بچہ کا حج ہوسکتا ہے؟

جب آپؐ روحاء کے مقام پر پہنچے تو ایک سوار ملا۔ اس نے سلام کیا اور پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟

بتایا گیا کہ مسلمان ہیں۔

پھر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

بتایا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس پر ایک عورت نےگھوڑے سے اپنے بچے کو اٹھا لائی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا اس کا بھی حج ہوسکتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا، ہاں اور تجھے اجر ملے گا۔ جب آپؐ ذوالحلیفہ پہنچے تو یہاں رات گزاری، اور جب آپؐ نے مدینہ کو دیکھا تو تین بار تکبیر کہی۔ اور یہ الفاظ کہے:

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر آیبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللّٰہ وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

"یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود اور کارساز نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ہم رجوع کرنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، سجدہ کرنے والے اور اپنے پروردگار کی حمد کرنے والے ہیں، اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تنہا تمام گروہوں کو شکست دی۔"

پھر آپؐ دن کے وقت معرس کی راہ سے مدینہ میں داخل ہوئے۔
جب آپؐ تشریف لے گئے تھے تو شجرہ (درختوں) کے راستہ گئے تھے۔

حجۃ الوداع کے سلسلہ میں محمد ابن حزم کی غلط فہمی

وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لے جاتے وقت لوگوں کو بتایا کہ رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے، یہ سراسر وہم قبیح ہے کیونکہ آپؐ نے حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ واپس آکر یہ الفاظ فرمائے تھے۔ آپؐ نے ام سنان انصاریہ سے فرمایا کہ تجھے ہمارے ہمراہ حج کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟

اس نے عرض کیا ہمارے پاس صرف دو اونٹ تھے چنانچہ میرے لڑکے کے والد اور میرے بیٹے نے ایک اونٹ پر حج کیا اور ہمارے لیے ایک اونٹ چھوڑ دیا، ہم اس پہ پانی ڈھوتے ہیں (یعنی سواری نہ تھی)۔

آپؐ نے فرمایا، کہ جب رمضان آئے تو عمرہ کرلینا کیونکہ رمضان میں عمرہ کرنا تیرے لیے حج سے کفایت کرے گا (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کرنے کے برابر اجر ملے گا (صحیح مسلم)

اسی طرح آپؐ نے مدینہ واپس تشریف لانے کے بعد ام معقل سے فرمایا، جیسا کہ ابو داؤد نے یوسف بن عبداللہ بن سلام سے انھوں نے ام معقل سے روایت کیا، وہ بتاتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا، تو ہمارے پاس ایک اونٹ تھا جسے ابو معقل نے اللہ کے راستہ میں آزاد کردیا چنانچہ ہمارے ہاں بیماری آئی اور ابو معقلؓ فوت ہوگئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے۔

جب آپؐ واپس تشریف لائے تو یہ حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا: ہمارے ساتھ (حج کے لیے) نکلنے میں تمہیں کون سی رکاوٹ پیش آگئی تھی؟

انھوں نے عرض کیا ہم نے پختہ ارادہ کرلیا تھا لیکن ابو معقل فوت ہوگئے۔ ہمارے پاس سفر حج کے لیے ایک ہی اونٹ تھا اور ابو معقلؓ نے اس کے لیے اللہ کے راستہ میں وصیت کردی۔

آپؐ نے فرمایا، تم اس اونٹ پر کیوں نہ چلی آئیں؟ کیونکہ حج بھی اللہ کے راستہ میں عبادت ہے اب جب کہ ہمارے ساتھ تمہارا یہ حج فوت ہوگیا تو رمضان میں عمرہ کرلینا کیونکہ وہ بھی یقیناً حج ہے

ہدایا ضحایا اور عقیقہ

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

سورۃ انعام کی آیت یہ سورہ انعام کے ازواج مقام ہشت گانہ سے مختص ہیں۔ ان کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی قسم کا ہدی۔ قربانی یا عقیقہ مروی نہیں۔ اور یہ قرآن مجید کی چار آیات سے ماخوذ ہے۔

ایک آیت، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ

دوسری آیت ، وَیَذْکُرُوْا اسْمَ اللّٰہِ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ۔

اور تیسرے اللہ تعالیٰ کا فرمان ومن الانعام حمولۃ وفرشا کلوا مما رزقکم اللہ ولا تتبعوا خطوات الشیطن انہ لکم عدو مبین

اور چوتھے خدائے رحمٰن کا فرمان کہ ھدیا بالغ الکعبہ

اس سے معلوم ہوا کہ جو ہدایا کعبہ مشرفہ میں پہنچتے ہیں۔ وہ ان آٹھ اقسام میں سے ہوتے ہیں اور یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا استنباط ہے۔

یہ ذبائح اللہ کے تقرب کا ذریعہ اور اس کی عبادت ہیں۔ اور ان کی تین اقسام ہیں۔

ہدی ، اضحیہ ، عقیقہ۔

نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری اور اونٹ کا ہدی پیش کیا اور ازواج مطہرات کی جانب سے گائے کی ہدی (قربانی) پیش کی، نیز آپؐ نے اپنے مقام، عمرہ، حج میں ہدی (قربانی) پیش کی۔ اور آپؐ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ بکری کے قلادہ ڈالتے اسے اشعار نہ کرتے۔ جب آپؐ ہدی بھیجتے۔ جب آپؐ مقیم ہوتے تو کسی حلال چیز کو حرام نہ کرتے، اور جب آپ اونٹ بطور ہدی کے لے جاتے

تو اسے قلادہ بھی ڈالتے، اسے اشعار بھی کرتے، داغ بھی لگاتے، چنانچہ آپؐ اس کے کوہان کے دائیں جانب سے ذرا سا شق فرماتے یہاں تک کہ خون بہنے لگتا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اشعار دائیں جانب ہی ہوتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کیا اور ہدی لے جانے والے کو اجازت دی کہ جب تک اسے دوسری سواری نہ ملے تب تک اعتدال سے اس پر سواری کرے۔ اگر اسے اس بات کی ضرورت لاحق ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو دودھ جانور کے بچہ سے بچ رہے اسے پینے کی اجازت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ آپؐ اونٹوں کے بائیں پاؤں کو باندھ کر تین پاؤں پر کھڑا کر کے انھیں نحر کرتے اور نحر کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتے۔

اور آپ قربانی کے جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح فرماتے۔

بسا اوقات آپ یہ کام کسی دوسرے کے سپرد بھی کر دیتے، جیسا کہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سو میں سے بقایا اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔

اور جب آپؐ بکری کو ذبح کرتے تو اپنا پاؤں چہرے پر رکھتے۔ پھر بسم اللہ اللہ اکبر کہتے اور ذبح کرتے۔

اور گزر چکا ہے کہ آپؐ نے منیٰ میں نحر کیا اور فرمایا کہ مکہ کا تمام میدان ہی نحر ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں، اونٹوں کا منحر مکہ میں ہے لیکن اسے خونریزی سے پاک فرمایا گیا اور منیٰ بھی (حدود) مکہ میں سے ہے اور ابن عباسؓ مکہ میں نحر کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہدایا اور قربانی میں سے کھانے کی اجازت دی اور تحفہ (زاد) کی بھی اجازت دی اور تین دن سے زیادہ جمع رکھنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ اس سال لوگوں پر تکلیف تھی چنانچہ آپؐ کا خیال تھا کہ انھیں وسعت حاصل ہو جائے۔

اور ابو داؤدؒ نے جبیر بن نفیر سے انھوں نے ثوبانؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی، پھر آپؐ نے فرمایا۔

اے ثوبانؓ ہمارے لیے اس بکری کو ٹھیک کرو (یعنی پکا دو وغیرہ)۔

تو میں مدینہ آنے تک آپؐ کو اسی بکری میں سے کھلاتا رہا۔

مسلمؒ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا" اس گوشت کو ٹھیک کر دو۔"

بتاتے ہیں کہ میں نے اسے ٹھیک کیا۔ آپؐ مدینہ پہنچنے تک اس ہی سے کھاتے رہے بسا اوقات آپؐ نے ہدی کا گوشت تقسیم فرمایا، اور بسا اوقات یوں بھی فرمایا جو چاہے ایسا کرے اور جو چاہے ویسا کرے اور بیاہ وغیرہ میں (پیسے وغیرہ) بکھیرنے کی ممانعت کا جواز بھی اس سے ثابت کرتے ہیں اور دونوں کا فرق غیر واضح ہے۔

طلوع آفتاب اور رمی کے بعد قربانی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی، عمرہ کے ہدی کو مروہ کے پاس اور قِران کے ہدی کو منیٰ میں ذبح کرتے۔

حضرت ابن عمرؓ بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال ہونے سے قبل ہدی ذبح نہیں کی اور نہ نحر کے دن سے پہلے ذبح فرمائی اور نہ کسی صحابیؓ سے ایسا فعل ثابت ہے۔

نیز آپؐ ہمیشہ طلوع آفتاب اور رمی کے بعد ہی نحر کرتے۔

نحر کے دن یہ چار امور مرتب تھے۔ پہلا رمی پھر نحر پھر حلق پھر طواف۔

آپؐ نے اسی ترتیب سے انھیں ادا فرمایا۔ طلوعِ آفتاب سے قبل نحر کرنے کی آپؐ نے اجازت نہیں دی اور (آفتاب سے قبل نحر کرنا) یقیناً آپؐ کی سنتِ ہدیٰ کے خلاف ہے، اس کا حکم اضحیہ جیسا ہوگا، جب کہ وہ آفتاب کے طلوع ہونے سے قبل ذبح کر لی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی قربانی کا ناغہ نہ فرماتے

آپؐ دو مینڈھوں کی قربانی دیتے۔ آپؐ نماز عید کے بعد ان کو نحر کرتے۔

فرمایا کہ جس نے نماز سے پہلے ذبح کر لیا اس کی کچھ بھی قربانی نہیں، بلکہ وہ ایک قسم کا گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کو مہیا کیا۔ آپؐ کی سنت طیبہ کا یہی مطلب ہے اور محض وقت نماز و خطبہ کا کچھ اعتبار نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ پہلے انھیں ادا کیا جائے اور ہم اللہ کے اسی دین سے حامل ہیں۔

اور آپؐ نے حکم فرمایا کہ بھیڑوں میں سے بالکل نوجوان ذبح کرو، نیز وہ دو سال کا ہو، یعنی جو مسنتہ ہوتا ہے۔

اور مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا، تشریق کے تمام ایام میں ذبح جائز ہے، لیکن یہ حدیث منقطع ہے۔ اس کا وصل ثابت نہیں۔

قربانی کے گوشت کا ذخیرہ

اور تین دن سے زیادہ قربانی کے گوشت کو جمع نہ کرنا تو اس کا مطلب

یہ نہیں کہ ایام ذبح تین ہی ہیں، کیونکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرنے والے کے لیے ذبح کے دن سے لے کر تین دن سے زیادہ تک گوشت جمع رکھنا جائز نہیں۔ اگر اس نے تیسرے دن تک ذبح رکھنا موخر کر دیا تو اسے اجازت ہے کہ ذبح کے وقت سے لے کر تین دن تک گوشت کا ذخیرہ کرے۔
اور جن لوگوں نے تین دن تک محدود رکھا، انھوں نے یہ سمجھا کہ قربانی کے تین دنوں میں پہلے دن سے شروع ہو کر تیسرے دن کا یہ حکم ہے)۔
حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایام نحر یوم الضحیٰ (عید کا دن) اور اس کے بعد بھی تین دن ہیں۔
اہل بصرہ کے امام حسنؒ اور اہل مکہ کے امام عطاء بن ابی رباح اور اہل شام کے امام اوزاعیؒ اور فقہائے اہل حدیث کے امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے اور ابن منذرؒ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور چونکہ یہ تینوں ایام، ایام منیٰ، ایام رمی، ایام تشریق ہونے کے باعث مخصوص ہیں۔ ان میں روزہ رکھنا حرام ہے اس لیے یہ بھی ان احکام میں شریک ہیں۔ اب نص و اجماع کے بغیر ان میں جواز ذبح الگ کیا جا سکتا ہے؟ نیز دو مختلف روایات جو ایک دوسرے کو قوت دیتی ہیں۔ مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
تمام منیٰ جائے نحر ہے اور تمام ایام تشریق ذبح کے دن ہیں۔
جبیر بن مطعم کی روایت میں انقطاع ہے۔ اسامہ بن زید نے عطاء سے انھوں نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا۔ یعقوب بن سفیان کہتے ہیں کہ اسامہ بن زید اہل مدینہ کے ہاں ثقہ اور مامون ہیں۔

مسئلہ ہذا سے متعلق اقوال اربعہ

اس مسئلہ میں چار اقوال ہیں، ایک تو وہ ہے (جو گذر چکا ہے) دوسرا یہ کہ ذبح کا وقت یوم نحر اور دو دن بعد میں ہے یہ امام احمدؒ۔ ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ احمدؒ فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کئی کا یہی قول ہے۔ اثرمؒ نے ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے یہی نقل کیا ہے۔
تیسرا، یہ کہ نحر کا وقت ایک ہی دن ہے۔ یہ ابن سیرینؒ کا قول ہے کیونکہ یہ اسی نام (اضحیہ) (یوم الضحیٰ) سے مخصوص ہے اس لیے اس کے حکم کا اختصاص بھی اس دن سے ہوگا پس یہ ایک دن ہی ہوگا، جیسے کہتے ہیں، عید الفطر۔
چوتھا، سعید بن جبیر اور جابر بن زید کا قول ہے کہ یہ دوسرے مقامات میں ایک دن مانا جاتا ہے اور منیٰ میں تین دن، کیونکہ یہاں، رمی، طواف اور حلق وغیرہ مناسک ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے

دیگر امصار کے مقابلہ میں یہاں تین روز ہونے چاہئیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنتِ طیبہ آپ کی سنت تھی کہ جس نے قربانی کا ارادہ کیا ہو اور دسویں تاریخ آجائے تو وہ اپنے بال وغیرہ نہ ترشوائے۔

صحیح مسلم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارہ میں ممانعت ثابت ہے۔ دار قطنی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ روایت ام سلمہ رض پر موقوف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ قربانی کا جانور بہترین خوبصورت اور تمام عیوب سے پاک ہو۔

اور آپؐ نے کان کٹے اور نصف سینگ ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی سے منع فرمایا۔ ابو داؤد رح نے اس سے زیادہ نقل نہیں کیا۔

آپؐ نے حکم دیا کہ آنکھوں اور کانوں کو دیکھ لیا جائے، یعنی یہ تندرست ہوں اور کانی، مقابلہ مدابرہ اور شرقاء و خرقاء کی قربانی نہ دی جائے۔

مقابلہ وہ ہوتی ہے جس کے کانوں کا اگلا حصہ کٹا ہو۔ اور مدابرہ جس کے کانوں کا پچھلا حصہ کٹا ہو۔ شرقاء وہ ہے جس کے کان چر گئے ہوں اور خرقاء جس کے کانوں میں سوراخ کیا گیا ہو۔ (ابو داؤد)

نیز آپؐ سے منقول ہے کہ چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز نہیں۔ کانی جس کا عیب واضح ہو بیمار جس کا مرض نمایاں ہو، لنگڑا جس کا لنگڑاپن واضح ہو۔ ٹوٹا ہوا جس میں مغز نہ رہا ہو۔ اور کمزور، جس میں شدت ضعف سے گودا بھی نہ رہا ہو۔

نیز نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصفرہ، مستاصلہ۔ بخقاء، مشیعہ اور کسری کی قربانی سے بھی منع فرمایا۔

مصفرہ وہ ہے جس کا کان اس قدر معدوم ہو کہ کان کا سوراخ ظاہر ہو جائے اور مستاصلہ وہ ہے جس کا سینگ جڑ کے قریب یعنی نہ ہونے کے برابر ہو۔ بخقاء وہ ہے جس کی آنکھ بدترین حد تک کانی ہو چکی ہو۔ مشیعہ وہ ہے جو کمزوری کے باعث ریوڑ کے پیچھے نہ چل سکے اور کسری جس کے (اعضاء) ٹوٹے ہوئے ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ، عیدگاہ میں قربانی ابو داؤد میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ وہ عیدگاہ میں

عیدالاضحیٰ کے دن آپ کے ہمراہ حاضر ہوئے۔ جب آپؐ نے خطبہ مکمل کر لیا تو منبر سے اتر آئے اور ایک مینڈھا لایا گیا۔ آپؐ نے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور بسم اللہ اکبر پڑھا، اور فرمایا کہ یہ میری طرف سے اور میری امت کے ہر اس آدمی کی جانب سے ہے جس نے ذبح نہیں کیا۔

اور صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں نحر اور ذبح کیا کرتے۔

ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے قربانی کے دن دو سینگوں والے خوبصورت دو مینڈھے ذبح کیے۔ جب آپؐ نے انھیں لٹایا تو پڑھا:

وجهت وجهى للذى فطرت السمٰوٰت والارض حنيفاً وما انا من المشركين ان صلاتى ونسكى ومحياى ومماتى لله رب العالمين لاشريك لـه وبذالك امرت وانا اول المسلمين، اللهم منك ولك عن محمد وامته بسم الله والله اكبر

"یعنی، میں نے اس ذات کی طرف رخ کر لیا، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔ ایک طرف ہو کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں، بے شک میری نماز میری قربانی میرا جینا میرا مرنا اللہ تعالےٰ کے لیے ہے (جو) تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کا مجھے حکم دیا گیا اور میں پہلے مسلمان ہوں۔ اے اللہ (یہ مال) تیری طرف سے تھا اور تیرے لیے ہی (حاضر) ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور ان کی امت کی طرف سے، اللہ کے نام سے اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔"

پھر ذبح کر دیا، اور لوگوں کو حکم دیا کہ جب ذبح کریں تو اچھی طرح ذبح کریں اور جب قتل کریں تو اچھے انداز سے قتل کرے (یعنی چھری تیز ہو اور جلدی ذبح کریں)۔

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کو لازم کیا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ ایک بکری ایک آدمی اور اس کے گھر والوں کی طرف سے خواہ ان کی تعداد کتنی ہی ہو، کافی ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت عطاء بن یسارؒ نے فرمایا کہ میں نے ابوایوب انصاریؓ سے پوچھا نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قربانی کیسے ہوتی تھی؟

تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر آدمی اپنی جانب سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے بکری کی قربانی دے تو وہ کھائیں اور کھلائیں (ترمذی حسن صحیح)

ملہ الدین یسر کے معنی ہیں۔ (رئیس احمد جعفری)

حضرت امام ابو حنیفہ رح کی سیاسی زندگی

مصنفہ :۔ علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم

اس کتاب میں معلومات کا اتنا ذخیرہ یک جا کیا گیا ہے کہ اس سے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں، مولانا مناظر احسن مرحوم نے اس کتاب میں بنی اُمیہ کی سیاسی غلطیوں کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے اور ان اسباب محرکات پر روشنی ڈالی ہے جو ان کے زوال اور بنی عباس کے عروج کا موجب بنیں، لیکن اسلامی دنیا نے بنی عباس سے جو امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ بے بنیاد نکلیں اور لوگوں کو جلد معلوم ہو گیا کہ تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد بنی عباس کے فرمانرواؤں کا عام طور سے وہی تھا جو ان کے پیش روؤں نے اختیار کیا۔

حضرت امام ابو حنیفہ رح کی سیاسی زندگی بنی امیہ کے زوال اور بنی عباس کے عروج کے اس پس منظر میں بیان کی گئی ہے اور فاضل مصنف نے امام صاحب رح کے سیاسی عقیدوں اور سرگرمیوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ مولانا مناظر احسن مرحوم کی رائے ہے کہ امام صاحب رح نے جو اتنے وسیع پیمانے پر اپنا تجارتی کاروبار پھیلا رکھا تھا تو اس کی تہ میں بھی ان کے سیاسی اور مذہبی مقاصد کارفرما تھے، امام صاحب رح کی ساری زندگی تبلیغ حق میں گذری، انھوں نے حق کی خاطر بنی عباس کے خلاف حضرت زید کی مالی امداد کی۔ حق کی خاطر بنی عباس کی جانب سے قاضی القضاۃ کا جو عہدہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کی بجائے جیل خانے میں قید و بند کی سختیاں گذارنا منظور کیا، انھوں نے جابر اور ظالم حکمراں کے ہاتھوں جام شہادت پینے کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔

امام ابو حنیفہ رح کی سیاسی زندگی آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے اور اس دور میں جب علماء سوء جاہ و منزلت کی خاطر حکمرانوں کے سامنے جھکنے میں باک نہیں محسوس کرتے ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو امام حنیفہ رح کا پیرو اور مقلد کہتے ہیں، اس کتاب میں تقویت ایمانی کا پورا پورا سامان موجود ہے، ہمیں امید ہے کہ اہل علم اس کتاب سے سبق لیں گے۔

قیمت :۔

بارہ روپے ۔ مجلد بڑا سائز

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ

تاریخ اور سیاست کی روشنی میں

مصنفہ
ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجمہ
مولوی عبدالحمید نعمانی

تاریخ کا سب سے زیادہ المناک مختلف فیہ اور نزاعی موضوع

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں اس موضوع سے اہم کوئی اور موضوع نہیں ہو سکتا یہ موضوع ہے اشک و آہ کا، گریہ پیہم اور گریہ بے اختیار کا، نوحہ و ماتم کا، ایک ہولناک انقلاب کا۔ ایسا انقلاب جس نے تاریخ اسلام کا رخ بدل دیا اس موضوع پر اب تک صدہا نہیں ہزارہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ کتابیں یا تو سراسر عقیدت کا نتیجہ ہیں یا اندھا دھند آزاد خیالی بے راہ روی اور کج رائی کی۔ غالی متعصب کے یگانہ اور بے ہمتا مورخ ادیب اور محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے کافی غیر جانبداری کے ساتھ بلکہ تھوڑی دیر کیلئے یہ فراموش کر کے کہ خود ان کا مسلک کیا ہے خالص تاریخی واقعات و حقائق کی روشنی میں یہ کتاب لکھی ہے اس کتاب میں جذبات سے اپیل نہیں کی گئی ہے۔ آنکھ بند کر کے کوئی بات تسلیم نہیں کی گئی ہے، نہ محض از راہ عقیدت کسی بات کو تسلیم کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مستند ترین ماخذوں کو سامنے رکھ کر مستند ترین واقعات تاریخی ترتیب کیساتھ سامنے رکھ دیئے گئے ہیں اور فیصلہ خود مصنف نے نہیں کیا، قارئین پر چھوڑ دیا ہے وہ خود ان واشگاف حقائق اور واقعات کی روشنی میں جو فیصلہ چاہیں کریں۔ جو رائے چاہیں قائم کریں جس نتیجہ تک خود پہنچنا چاہیں پہنچیں حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اسے پڑھنے کے بعد پردہ آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتا ہے اور سنگین، برہنہ اور ٹھوس حقائق نظر کے سامنے آجاتے ہیں، جنہیں نہ جھٹلایا جا سکتا ہے نہ جن کی تردید کی جا سکتی ہے نہ جن کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ہے تاریخ نگاروں کے لیے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا ہے اور ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے جس کی تقلید اور پیش روی پر دوسرے لوگ مجبور ہیں۔

اس نادر روزگار کتاب کے حقوق طبع و اشاعت پاکستان کے لئے خاص طور ہم نے حاصل کیے ہیں طباعت کتابت اور گٹ اپ کے لحاظ سے یہ اپنی مثال آپ ہے۔

صفحات ۵۷۶

بڑی سائز — قیمت بارہ روپے مجلد

صحابیات

مصنفہ

علامہ نیاز فتح پوری مدیر رسالہ نگار

آفتابِ رسالت جب طلوع ہوا تو اس کی ضیاباریوں نے انسانی زندگی کے ظلمت کدہ کو روشن کیا، مردوں کی سیرتیں اور کردار بدل بدل گئے، صحرا نشینانِ عرب ممالک قیصر و کسریٰ کے حاکم بن گئے، عورتیں جو دنیا میں ایک ذلیل و حقیر مخلوق شمار کی جاتی تھیں گھر کی پروردگار اور خاندان کی نگہبان قرار پائیں، دنیا تو دنیا ہے، جنت الفردوس کو ان کے قدموں کے تلے رکھ دیا گیا اور حق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کی بہادر، غیور اور دیندار مسلمان خواتین نے اپنی سیرت و کردار سے یہ ثابت کر دکھایا، کہ وہ اس عالم انسانیت کی "نصف بہتر" کا مقام رکھتی ہیں،

کیا آج آپ یہ ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آپ کی بہو بیٹیاں بھی ویسی ہی ثابت ہوں، کیا ہے کوئی مسلمان جو اپنی بیٹی کو بی بی خاتونِ جنت کی سیرت و کردار پر نہ دیکھنا چاہتا ہو، سوچئے کہ یہ سیرت و کردار ہم اپنی نو نظر بیٹیوں میں یورپ و امریکہ کے فلمی ستاروں کا حال پڑھا کر پیدا کر سکتے ہیں یا عہد رسالت کی مقدس بیبیوں کا تذکرہ پڑھا کر؟

اس کتاب میں اردو زبان کے مشہور صاحب طرز جناب نیاز فتح پوری نے ایسی ۵۰ خواتین کا مکمل تذکرہ لکھا ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ سے دین و دنیا کا علم سیکھا، ان میں آپ کی ازواج مطہرات، بنات طیبات، اور دیگر رشتہ دار و غیر رشتہ دار خواتین شامل ہیں،

اعلیٰ کتابت و طباعت۔

مجلد رنگین و خوش نما گرد پوش

قیمت ——— فی جلد چھ روپے

تاجدار دو عالمؐ	عبدالرحمن عزام بے۔	۳/۷۵	حضرت ابوذر غفاری	مولانا مناظر احسن گیلانی	۴/۲۵
فلسفہ عجم	علامہ اقبال	۴/۲۵	تذکرہ شاہ ولی اللہ	مولانا مناظر احسن گیلانی	۴/۵۰
اسلامی معاشیات	مولانا مناظر احسن گیلانی	۱۲/-	مکاتیب امام غزالی	احمد غزالی	۳/۷۵
الدین القیم	مولانا مناظر احسن گیلانی	۴/۲۵	داستان کربلا	عبدالرحمن صدیقی	۳/۷۵

مقالات جمال الدین افغانی ۳/۲۵